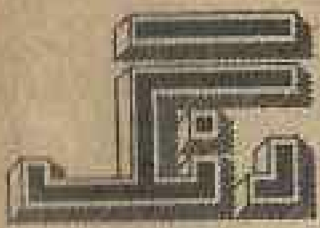

دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب
سب رنگ
ڈائجسٹ



















پبلشر، ایڈیٹر
شکیل عادل زادہ نے حسن ذکریا
کے اہتمام سے پاکستان ہیرالڈ پریس سے
چھپوا کر ... سے شائع کیا
پتہ
۲۶-۲۷ پریس چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
ذیلی دفتر
... پشاور
جلد ۹
مارچ۔ اپریل
شمارہ ۲-۳
فی پرچہ
۶ روپے
زر سالانہ
... روپے
ٹیلیفون نمبر
۲۱۱۹۶۲-۲۱۱۹۶۱
تار کا پتہ
سب رنگ
سرورق
... کراچی
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
Regd. No. S 2732

بے تقویم

نجومی نے ہاتھ دیکھ کے کہا "اے شخص! تیری عمر دراز اور تیرا اقبال بلند ہے۔ تو نوزائیدگان کو جوان و کامران دیکھے گا۔ ایک عہد تیرے سامنے کروٹیں بدلے گا، ایک تاریخ تیرے آگے انگڑائی لیتی گزرے گی۔ تیری لکیر مستحکم اور بے عیب ہے۔" نجومی نے اُسے درازعمری کی بشارت دی اور شخص مذکور آنے والے دنوں کے خواب دیکھتا ہوا اپنی راہ لگا۔ نجومی روز ایسی بشارتیں عام کرتے ہیں مگر ہر بار زندگی کو اعداد سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب کہ اصل بات تو کمیت جمع کیفیت کی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کس کے نصیب میں کتنے دن، کتنی راتیں لکھی ہیں۔ کتنی روشن راتیں، کتنے بے نور دن۔ کوئی لگا بندھا حساب تو نہیں لیکن آدمی زندگی کے نصف ہی سے سیر کام ہوتا ہے۔ بعضوں کو اس سے بھی کم ملتا ہے اور بعضوں کو ملتا ہی نہیں۔ ایک تو وہ جو نوشتہ ہے، پر ایک وہ بھی ہے جو آدمی خود رقم کرتا ہے۔ خال خال ایسے لوگ ہوں گے جنھوں نے زندگی سے لمحہ لمحہ وصول کیا اور اُسے ادا بھی کیا ہو؟

آدھے سے مراد کھلی اور بند آنکھیں، سوتے اور جاگتے حواس نہیں ہیں۔ یہ بیداری و خوابیدگی زندگی کا لازمہ اور زندگی میں شامل ہے۔ خوابیدگی زندگی سے منہا نہیں کی جا سکتی مگر کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں اور بیدار حواس کی بے نوری، بے سمعی اور بے حسی و خوابیدگی کا شمار کس مد میں ہو؟ ایسے لمحے بے حد و حساب ہیں جن کا جاگنا اور سونا برابر ہے۔ کھلی آنکھوں کے معنی دیکھنا ہی نہیں اور کھلے کانوں کا مطلب سننا ہی نہیں ہے۔ کیا دیکھا اور کیا سنا! دیکھنے اور سننے کے اس اسراف کا تخمینہ لگایا جائے تو گھاٹا ہی گھاٹا نظر آئے گا، زیاں ہی زیاں۔ کہیں نصف سے زیادہ اور کہیں صرف چند ساعتیں ہی حاصل نکلیں گی۔

نفس کے اُلجھنے، اعصاب کے جھٹکے، خون کی جلن۔ آدمی ہاتھ پر کشیدہ لکیر ضرور پوری کر دیتا ہے مگر یومِ حشر سے پہلے ایک عرصۂ محشر طے کر کے۔ لمحے چپکے سے گزر جاتے ہیں، پتہ نہیں چلتا۔ شاید کبھی آدمی کو لوٹ کے دیکھنے کی فرصت ہوئی ہو تو بے شمار لمحوں کے ضیاع و زیاں کا احساس ستاتا ہو گا۔ جاگنے میں سونے کا زیاں۔ پسِ دیوار جس شخص کی باتیں کی گئیں، جس کی خردہ گیری کی گئی اور فیصلے صادر کیے گئے، اُن ساعتوں کا زیاں۔ کس کے چٹکی بھری، کس کے تنکا چبھویا، کس کی نانِ جویں حرام قرار دی گئی۔ کس کے کردار پہ داغ چھینٹے گئے۔ کسے بدنگاہی سے دیکھنے کا زیاں کیا، کسے جھوٹ سمجھا، کسے غلط گردانا، کس کے گھر ساز و سامان آنے پہ خون کھولایا گیا۔ یہاں کیا کہا گیا! وہاں کیا سنا گیا! کون تھا، کون تھا! کون کیا کر رہا ہے؟ کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے۔ جھانک کے دیکھو، جاگ کے دیکھو، ہر شخص کسوٹی پر، ہر شخص موردِ الزام، ہدفِ ملامت، نامعتبر، گردن زدنی۔ کوئی کن سوئیاں لے رہا ہے کوئی گواہی دے رہا ہے۔ فیصلہ کرنے والوں کو خبر نہیں کہ دیوار کے پار اُن کے بارے میں بھی کچھ لوگ ایسے ہی حکم لگا رہے ہیں اور وہ بھی زندگی نصف کر رہے ہیں، یہ بھی زندگی آدھی۔ کبھی ایسا سوچا ہے۔ نجومی نے یہ نہیں بتایا نا!

چل اے قلم سوئے شہر جاناں چل، قلندر صفت چل، فقیرانہ چل۔ لالہ رخوں کی بستیوں میں جا، سیمیں بدنوں کی گلیوں کا رخ کر۔ صدائیں لگا، دھوم مچاتا ہوا چل۔ تیر چلاتا، آگ لگاتا ہوا چل۔ جو تیرے پاس ہے، جتنی آوازیں، جتنے ارادے، جتنی آنکھیں، جتنے آنسو، آج سب لٹا، تمام کر دے۔ چل اے قلم ماہ پاروں کو ایک اور جوہر سے منکشف کر، سوز دروں کے جوہر دے۔ کلی کو شگفتگی کی نوید دے اور شگفتگی کو دوام دے۔ زلفِ عنبریں کو شکن در شکن کر دے۔ زمیں کو آدمی سے آشنا کر۔ آدمی میں زمیں کا حوصلہ پیدا کر۔ وہ تمنا بن جا، وہ بنا جو کبھی نہ بنایا گیا ہو۔ ہوا کے رخ چراغ لے کے چل، آنکھوں میں چاندنی کے در آ اور دلوں میں قیامت کی طرح برپا ہو۔ خوشبو مثال سانسوں میں گھل جا اور لہو مانند جزو جاں بن جا۔ جفا پیشگاں سے جفا چھین لے۔ سنگ ریزوں پہ پھونکیں مار اور انھیں تخلیق کے شعور سے بہرہ مند کر۔ سارے درد اپنے بدن میں بھر لے۔ تمام منجمد اپنے سینے میں اتار لے۔ ایسا راگ الاپ جو ریشم سے نرم، پنکھڑی سے لطیف ہو اور ساری خاک ریشم ریشم ہو جائے۔ شمشاد قدوں کی آغوش تیری پناہ، عنبریں لبوں کے جام تیری غذا اور گنگناتی نگاہیں تیری قبا ٹھہریں۔ نقش بنا، نقش مٹا، رنگ کھیل، ہر آنکھوں کو خون دل میں ڈبو لے، حلقۂ زنجیر توڑ دے۔ ایسی طرزِ فغاں ایجاد کر کہ شش جہاتِ عالم میں پھر کوئی آواز نہ چہکے۔ زمیں سے غذا اٹھا اور ہاتھ نگاہیں کافی، ہونٹ شافی ہیں۔ قرینے قرینے کوچے کوچے ایک جہاں تیری دید کو ترسے۔ کسی کو تیرے نظارے کی تاب ہو نہ تیرے جمال کا یارا۔ صحراؤں پر رقص کر اور بادل بن جا۔

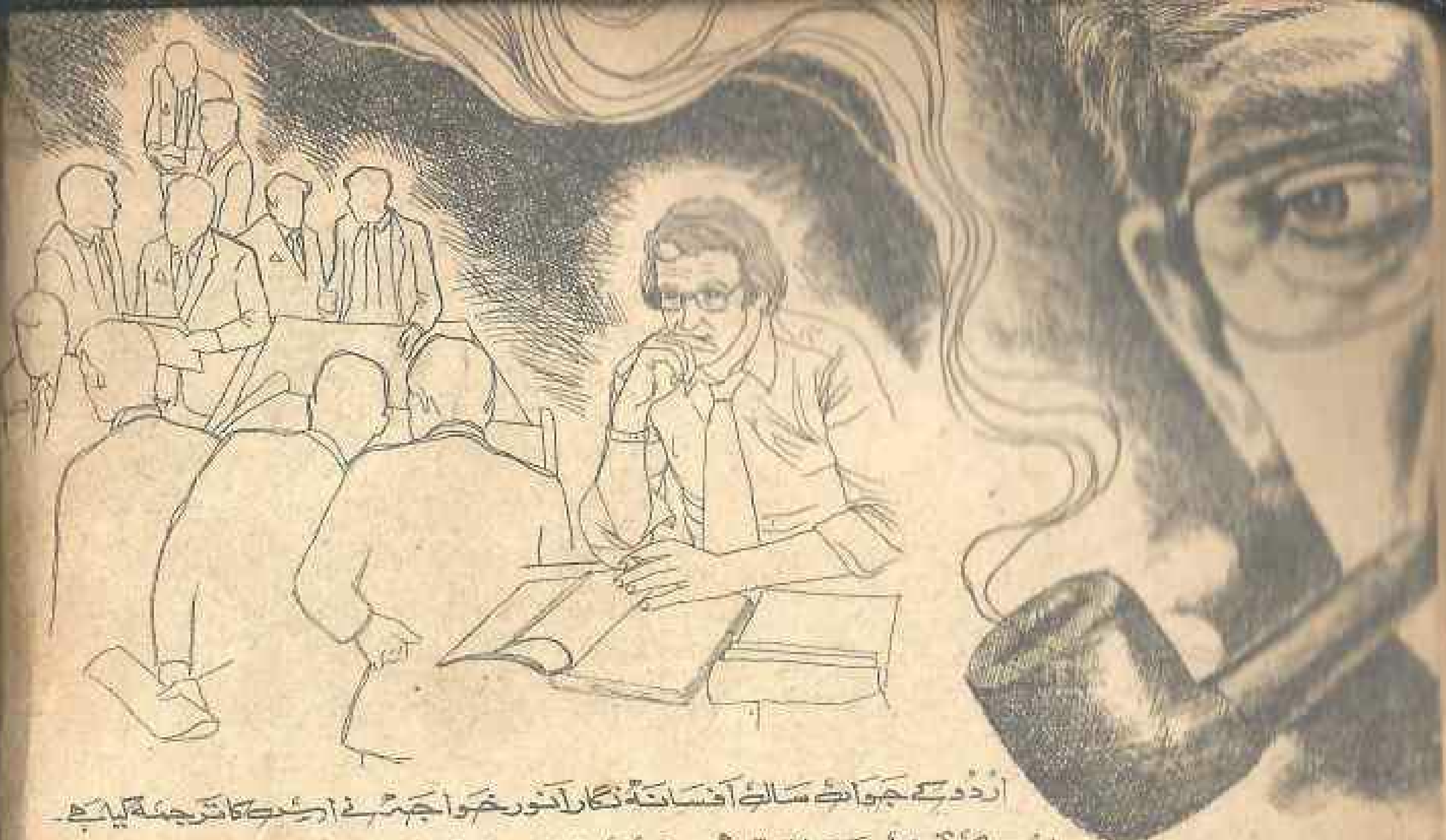
یا پھر ایسی آگ جلا کہ سب راکھ ہو جائے۔ ایک ایسا نعرۂ مستانہ بلند کر کہ سمتیں تھرتھرائیں، ہوا کی باگ پکڑ یا خود ہوا بن جا اور ایک طوفان اٹھا کر سمندروں کو روندتا چل یا خود اس کا روپ دھار لے، ساری زمین پر قبضہ کر لے۔ وقت کی طنابیں کھینچ لے، جو دیوار درمیاں ہو، وہ تیری آہٹ سے پاش پاش ہو۔ کہسار تیری چاپوں کی دھمک سے اپنے بدن تڑوائیں، سائے سفید کو سیاہ، سائے سیاہ کو سفید کر دے، تیرے اشارے نور بکھیریں، تیرے اشارے ظلمت کر دیں۔ کبھی جانِ شیریں، کبھی تیشۂ فرہاد بن جا۔ کوہ و بیاباں سے سیلِ تندرو اور گلستانوں سے جھونکے نغمہ خواں کی طرح گزر۔ نعرہ زناں، رقص کناں چل۔ چل مرے گھوڑے ہنہناتے ہوں، چل مرے خامے بسم اللہ۔ الا اللہ، الا اللہ، الا اللہ۔

کیسے کیسے خیال، ہزاروں خیال، ہزاروں ہیولے، قلم کو زبان کے اظہار کی سکت ہے نہ اپنے رختِ سفر پر اعتماد، سب ہذیان ہے۔ گر ارادے میں طلب کا کوئی جذبۂ صدق مضمر ہے تو اسباب بھی نکل آئیں گے۔ سنا ہے نیت کی ناآسودگی پہلی شرط ہے۔ سو کچھ اسی کا اعتماد حاصل ہے۔ سب رنگ یہی شیشۂ احساس یہی نگار خانۂ خیال ہے۔ ہم کیا، ہماری بساط کیا، عناصر کا ایک مجہول ظہورِ ترتیب، طاقتِ پرواز میں کوتاہی ہو سکتی ہے مگر قوتِ ارادہ میں کوئی نقص نہیں ہے۔ ایک اسی اعتبار پر زندہ ہیں کہ شاید بیلی گیتی کی شکنیں کبھی سنور جائیں اور کوئی سمت نظر آ جائے۔ شہرِ جاناں کی سمت۔ جیسے جیسے دھوپ اور اندھیرا سر سے گزر رہا ہے، پیچ و تاب اضطراب بھی بڑھا ہے۔ راستے میں ایک سرشاری فزوں محسوس ہوتی ہے۔ شور مچانے کو جی کرتا ہے اور دل چاہتا ہے، بس خیال کے تانے بانے بنتے رہیں، اصنام تراشتے رہیں، مضامینِ نو کے انبار لگا دیں۔ نئے پیکر نئے خیال، ساز بہ ساز، جلوہ بہ جلوہ، منظر بہ منظر، طلسم ہی طلسم، نیرنگی نیرنگی۔ فکر کو بیڑیوں سے آزاد کریں۔ ایک گھر، ایک چار دیواری اور ایک شخص ہی سے واسطہ کیوں رہے۔ اپنے آپ کو پھیلائیں، سارے گھروں کے حصار توڑ دیں، سارے چہروں سے نقابیں اتروا لیں اور ان سے کہیں لو ہم آ گئے، ہم آ گئے، ہمیں پہچانو، ہمیں پیار کرو اور اپنے سینے میں چھپا لو۔ ہم مسافر ہیں، گم گشتۂ منزل، بس اب ہر منزل ہماری ہے۔ چند لمحے سانسیں استوار کر کے پھر کہیں چل پڑیں گے۔

وعدہ مکمل طور پر پورا نہیں ہوا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ پہلے کی نسبت دوری میں کچھ کمی ہو گئی۔ کم از کم آدھے وقت کو منا لیا ہے۔ وہ ایک جستوں میں اور بن جائے گا، وقت ہی مابین ایک بڑا رقیب ہے۔ کسی دن اس کا پتھر بھی پگھل جائے گا۔ اس ناگز ذات میں میں نے کبھی کسی مخصوص تحریر کا ذکر نہیں کیا کہ سب رنگ کی ساری تحریریں گھر کے افراد کا درجہ رکھتی ہیں۔ پہلی بار امبر بیل کا ذکر کرنے کو طبیعت جھجکتی ہے۔ امبر بیل سے مجھے بھی ایسا ہی شغف ہے جیسا دوسروں کو۔ تاہم اس کا صحیح اندازہ کچھ ان شکایت ناموں ہی سے ہوا جو صبح و شام چلے آتے ہیں۔ ابتدا میں انھیں محفوظ کرنا شروع کیا تھا، بعد میں گنتی یاد نہیں رہی۔ چند ایک کے سوا سبھی نے شکوہ کیا ہے کہ یہ کیا غضب کیا۔ اس شیش محل پر پردہ کیوں ڈال دیا۔ یاراں، یہ نظر بندی عارضی ہے، بے شک نظارہ کھلا رہتا لیکن سفید پوشی کے جرم پہ آنچ آ رہی تھی، کوئی رفو بے داغ نہ تھا۔ شمعی لباس میں جلتا ہوں، ایک دن دھجیاں بجا کے آئے تو جی پہ کیسی گزری ہو گی۔ اپنے بھرے ہوئے بیرے [illegible] رہا ہوں۔ آرزو ہے کہ کسی دن سب کو دنگ کر دوں۔ مجھے احساس ہے کہ کوئی آپ سے اس طرح اجازت لینے کی جرأت نہ کرتا اور نہ آپ اس سرگرانی کے متحمل ہوتے لیکن آپ سے درخواست کبھی اور نے نہیں کی تھی، وہ میں نے کی تھی۔ اس ناز پرور کو اور نیاز پیشہ نے۔ امبر بیل کے پیکر دیکھنے کو ابھی بھی آنکھیں بے چین ہیں، ایک ذرا سانس کا وقفہ دیجیے، پھر مشغل جائیں گے۔

جو میں بار بار کہتا ہوں اور بار بار کہتا رہوں گا کہ بس ایک اماں سے دست کش نہ کیجیے۔ میرا نام انھی لوگوں میں قائم رکھیے جن سے آپ شاد ماں اور ناشاد ہوتے ہیں، جن پر آپ کو غصہ اور پیار آتا ہے۔ آپ جن سے روٹھتے اور درگزر کرتے آئے ہیں، جو آپ کو ستاتے اور منا لیتے ہیں۔ ان لوگوں میں نہیں جو آپ سے اور آپ ان سے کچھ کہتے سنتے نہیں، صرف چہرے کی شناسائی مقصود نہیں، کچھ اور بھی مطلوب ہے۔ میں اپنے اس حق کے لیے آپ سے سدا جھگڑتا رہوں گا۔ فگار انگلیوں کا حق۔ خوں چکاں خامے کا صدقہ، کس کا گریباں چاک ہے۔ آئینہ تو سامنے ہے پھر پہچانتے ہیں کیا جھجک ہے۔

شکیل عادل زادہ عفی عنہ



اردو کے جوان سال افسانہ نگار انور خواجہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

ایک آدمی کا قصہ جس نے ایک دن اپنے آپ سے سچ بولا تھا

پروفیسر اپنی کلاس میں لیکچر دے رہا تھا۔ اس کی کلاس قدیم ادب کے موضوع سے متعلق تھی۔ قدیم ادب کا موضوع کالج میں زیادہ مقبول نہیں تھا۔ طلبہ و طالبات کی بڑھتی تعداد سائنسی مضامین پڑھتی تھی لہٰذا قدیم ادب کے حصے میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ملا کر کل چھ طالب علم آئے تھے۔ ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور قلم کاپیوں پر چل رہے تھے۔ پروفیسر یکساں اور بے رنگ آواز میں انھیں دانتے کے جہنم کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ یہ تفصیلات اس کے منہ سے ایسے نکل رہی تھیں جیسے وہ ہوا سے مخاطب ہو۔

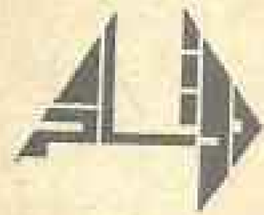
پروفیسر ہولس کو قدیم ادب پڑھاتے ہوئے کئی برس ہو گئے تھے۔ اب تو اسے سارا نصاب زبانی یاد ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی تنہائی میں گزر رہی تھی۔ وہ مدت سے اپنی ذات کے جہنم میں جل رہا تھا۔ اس کے خیالات دانتے کے جہنم کی طرح سیاہ اور دردناک تھے۔ آج کل کلاس کی ایک لڑکی روینا اس کی کمزوری بنی ہوئی تھی۔ روینا ہفتے میں تین دن منگل، بدھ اور جمعے کو کلاس میں آتی تھی۔ پروفیسر اس کی قربت سے عجیب اذیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ روینا کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے بھی اسے جھجک ہوتی تھی کہ کہیں طلبہ کو اس کے دل کا حال نہ معلوم ہو جائے، وہ نہ جانے کیا سمجھیں۔ پروفیسر روینا پر بس ایک سرسری نظر ڈال لیتا۔ یہ سرسری نظر اس کے دلی جذبات کی عکاس نہیں ہوتی تھی۔ بسا اوقات وہ ایک احساسِ جرم کے تحت اپنی نظر راستے ہی میں روک لیتا۔ پورے گھنٹے ذہن میں ایک اذیت اور کشمکش سی رہتی۔

پروفیسر ہولس روینا کے سلسلے میں اپنے جذبات کا تجزیہ نہیں کر سکا تھا۔ روینا کوئی خوب صورت لڑکی نہیں تھی۔ پروفیسر کو اپنی کلاس میں بے شمار لڑکیوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ ان میں سے کئی جوانی کے خمار سے بے حد خوب صورت نظر آتی تھیں مگر پروفیسر نے ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے ان کے حسن کو ایک خوب صورت مجسمے یا ایک حسین تصویر کی طرح سراہا ضرور ہوگا لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھا۔ البتہ روینا اس کی نظر میں پُراسرار طور پر ان حسین لڑکیوں سے مختلف تھی۔

پڑھاتے پڑھاتے پروفیسر نے ایک دفعہ پھر روینا کی طرف دیکھا۔ وہ پیچھے کی ایک کرسی پہ بیٹھی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ خود بخود پیچھے بیٹھنے لگی تھی حالانکہ آگے کی بہت سی کرسیاں خالی ہوتی تھیں۔ اس کے گھٹنے اسکرٹ سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ٹانگیں گول اور صحت مند تھیں لیکن اتنی دل کش نہیں تھیں کہ کسی مرد کو پاگل کر دیں۔ وہ مردوں کو متوجہ کرنے والا بھڑکیلا لباس نہیں پہنتی تھی، خصوصاً پروفیسر ہولس کی کلاس میں نہایت عام لباس پہن کر آتی تھی۔ اس کا سر ایک خاص انداز میں کاپی پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے بال بھورے اور چمکیلے تھے۔ انھیں اس نے رنگا نہیں تھا، یہ قدرتی رنگت تھی۔ پروفیسر کی کلاس میں روینا سے قبل بھی بھورے بالوں والی بعض لڑکیاں آ چکی تھیں لیکن ان کے لیے اس نے اپنے دل میں کوئی تڑپ محسوس نہیں کی تھی۔ شاید والٹر اسکاٹ کی کسی ہیروئن کا نام بھی روینا تھا مگر پروفیسر اب چالیس سال کا ہو گیا تھا، رومانی ناموں میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ روینا میں کوئی خاص وصف تھا جبھی پروفیسر کشاں کشاں اس کی طرف چلا جا رہا

... ایک تازہ تر تحریر

... کے قلم کا افسونہ



تھا۔ وقت کی گاڑی پل پل کرکے گزر رہی تھی۔ پروفیسر کا اضطراب
بھی بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس اضطراب میں ایک مزا بھی تھا،
عجیب واہیات سا مزا۔ پروفیسر ایک عاشق کی طرح ہفتے کے
ان تین دنوں کا انتظار کرتا مگر یہ دن آتے تو اس کی ساری اُمنگیں
خاک میں مل جاتیں۔ وہ پہلے سے زیادہ ناآسودہ اور ملول ہو جاتا۔
رُونیا کی محض موجودی اُسے کرب میں مبتلا کر دیتی۔ پروفیسر کا جی چاہتا
کہ وہ فوراً چلی جائے پھر جب وہ چلی جاتی تو پروفیسر کا کرب دوسرا
روپ اختیار کر لیتا۔ اُسے اپنی ساری شخصیت ٹوٹتی پھوٹتی معلوم
ہوتی۔ رُونیا کے سامنے وہ اپنی پیشانی عرق آلود محسوس کرتا حالانکہ
کمرہ خاصا ٹھنڈا ہوتا تھا۔ وہ خود پر قابو پانے کے لیے مٹھیاں بھینچ لیتا۔

وہ دانتے کے جہنم کا عذاب تشبیہی انداز میں بیان کر رہا تھا۔
اس نے سوچا کہ دانتے نے جہنم کو بالکل میرے حالات کے مطابق
پیش کیا ہے۔ شاید میں اپنی ہی اذیت بیان کر رہا ہوں۔ وہ بار بار
گھڑی دیکھتا۔ وقت اتنے آہستہ گزر رہا تھا جیسے جہنم میں وقت
نے ابدیت حاصل کر لی ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس کے لہجے
اُس کے انداز سے اس کا اندرونی کرب تو ظاہر نہیں ہو رہا ہے
لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ طلبہ و طالبات کے سر کاپیوں پر جھکے ہوئے
تھے، انہی میں وہ بھورے بالوں والا سر بھی تھا، اس سر نے رُونیا
کے گرد ایک غبار سا پیدا کر رکھا تھا۔ پروفیسر نے سوچا کہ وہ بیہودگی
کے خیالات کب تک اپنے دماغ میں پالتا رہے گا۔ اچانک گھنٹہ
ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ پروفیسر نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے
رٹے ہوئے انداز میں کہا: "اچھا، آج کا سبق ہم یہاں ختم کرتے ہیں۔"
رُونیا اور دوسرے طلبہ نے تشکر کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
سرخ بالوں والی ایک لڑکی پروفیسر کو دیکھ کے عام انداز میں مسکرائی۔
کسی طالبِ علم نے رُک کر پروفیسر سے کوئی سوال نہیں کیا۔ غالباً
گھنٹہ ختم ہونے کے بعد سبھی نے سکھ کی سانس لی تھی۔ کوئی بھی قدیم
ادب سے گہری دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ طلبہ نے کتابیں اٹھائیں،
کوٹ سنبھالے اور باہر نکل گئے۔ وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں
کوئی جلدی نہیں ہے حالانکہ وہ جلد از جلد کلاس سے نکل جانا
چاہتے تھے۔ سب کے ساتھ رُونیا بھی نکل گئی۔ وہ ان سب کے
درمیان میں تھی۔ پروفیسر ہولس نے برآمدے سے گزرتے ہوئے ان
کی گفتگو سنی۔ وہ دانتے کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہے
تھے۔ پانچ بجے کا وقت اور جمعے کا دن تھا۔ طلبہ ہفتے کے آخر
کی سرگرمیوں اور ملاقاتوں پر بات چیت کر رہے تھے۔ شاید ایک
لڑکا رُونیا سے وعدہ لینے کی کوشش میں تھا۔ رُونیا نہ غیر معمولی
خوب صورت تھی، نہ غیر معمولی مقبول لیکن کالج میں لڑکوں کی

تعداد زیادہ تھی اس لیے ایک لڑکی پر کئی کئی لڑکے توجہ دیتے تھے۔
پروفیسر نے سوچا کہ وہ اب رونیا کو پیریڈ سے پہلے نہیں دیکھ سکے گا۔ یعنی بہتر گھنٹے۔ چلو ٹھیک ہے۔ اتنے وقت کے لیے وہ رونیا کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے کے عذاب سے چھوٹ جائے گا لیکن اس خیال سے اُسے اذیت بھی ہو رہی تھی کہ وہ بہتر گھنٹے اس سے کیسے جدا رہ سکے گا۔
کسی ارادے کے بغیر اپنے فوری جذبات پر عمل کرتے ہوئے اُس نے جلدی سے اوور کوٹ پہنا، بریف کیس اور ہیٹ اُٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ رونیا زینوں سے نیچے نہ صرف ایک نوجوان بلکہ دو نوجوانوں کے ساتھ خوش گپیاں کر رہی تھی۔ حسد کے باعث پروفیسر ہولس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ عقبی دروازے سے نکل جائے یا وہیں رونیا کے انتظار میں کھڑا رہے۔ ابھی وہ اِس کش مکش میں تھا کہ دونوں نوجوان رونیا کو چھوڑ کر مردانہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔ پروفیسر کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی اور اس نے ایک دم اُس خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔
جب تک وہ زینے اُترتا، رونیا اُس سے تقریباً پچاس فٹ دُور جا چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زور سے آواز لگا کر اُسے رُکنے کے لیے کہے یا دوڑ لگا کے اُسے پکڑ لے۔ لوگ ایک پروفیسر کو ایک طالبہ کے پیچھے یوں بھاگتے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ اُس نے اپنے آپ کو مجبور کر کے صرف تیز چلنے تک محدود رکھا لیکن اُس کا قد چھوٹا تھا اس لیے وہ فاصلہ ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لڑکی بھی تیز چل رہی تھی۔ سرما کی سرد ہوا اُس کا اسکرٹ اور کوٹ اُڑا رہی تھی۔ اُس کے بھورے بال لٹوں کی صورت میں اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔ چھوٹی ایڑی کے جوتے میں اُس کی ٹانگیں زیادہ مضبوط اور توانا لگ رہی تھیں۔ اُس کی چال زیادہ دل کش اور بدن کی حرکات زیادہ دل فریب معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ موٹے پتلے اور بھدے بدن کی کوئی پڑھاکو لڑکی نہیں تھی کہ پروفیسر فطری طور پر اُس کی طرف توجہ دیتا۔ وہ پروفیسر کے آدرش سے بالکل مختلف لڑکی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ اُس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یکایک رونیا دائیں طرف مڑ گئی۔ اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو پروفیسر کو اپنا تعاقب کرتے ہوئے دیکھ لیتی لیکن اُس نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر انجنیئرنگ اور طبیعات کے شعبوں کے درمیان والا راستہ اختیار کیا۔ پروفیسر اب بھی جرأت نہ کر سکا کہ اُسے آواز دے کر روک لے۔ رونیا ایک مختصر راستے کی طرف بڑھی۔ وہاں درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے پیچھے ہائی اسٹریٹ تھی۔ اکثر لڑکے چکر لگا کر جانا نہیں چاہتے تھے اس لیے درختوں کے جھنڈ والا مختصر راستہ اختیار کرتے تھے۔

شاید رونیا ہوسٹل واپس ہونے سے قبل عجلت میں کچھ چیزیں خریدنا چاہتی تھی اُسی لیے اُس نے یہ مختصر مگر سنسان راستہ تنہا اختیار کیا تھا۔
پروفیسر نے سوچا کہ وہ اُسے بڑھ کر رات کے کھانے کی دعوت دے سکتا ہے۔ یہ ایک معقول طریقہ ہے۔ شاید رونیا ہوسٹل کا ایک ہی طرح کا کھانا کھاتے کھاتے اکتا جاتی ہو گی اور اُس کی دعوت قبول کر لے گی۔ پروفیسر کو معلوم تھا کہ اکثر طلبہ باہر کے کھانے کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ رونیا جیسے ہی جھنڈ میں داخل ہوئی سرما کی دھند نے اُسے گھیر لیا اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی بڑا جنگل نہیں تھا۔ کالج کی انتظامیہ مستقبل میں اِسے پھیلا کر ایک چھوٹا سا جنگل بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ پروفیسر نے دوڑ لگائی اور رونیا کے قریب پہنچ کر غبار میں اُس پر گرتے گرتے بچا۔ ”مس رونیا! مس رونیا!“
رونیا انتہائی تیزی سے مڑی۔ پروفیسر نے اندازہ لگایا کہ شاید اُس کی آواز نے لڑکی کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ اُس نے فوراً معافی مانگی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ڈرا دیا۔“
رونیا نے اپنی دل کش آواز میں جواب دیا۔ ”میں خوف زدہ نہیں ہوں۔“ ایسا لگتا تھا کہ اُس نے یہ جملہ پروفیسر کو نہیں، اپنے آپ کو یقین دلانے کے لیے کہا ہے۔
”میں نے تمھیں یہ مختصر راستہ اختیار کرتے دیکھا یا شاید یہ سمجھا کہ یہ تم ہو۔ اتفاق سے میں خود بھی اِسی طرف آ رہا تھا۔ یہ جگہ ذرا ویران ہے اِس لیے میں نے سوچا کہ تمھارا ساتھ دے دوں۔“
اُس کا لہجہ اُس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔ رونیا آنکھیں نکالے اُسے دیکھ رہی تھی جیسے اُسے یقین ہو کہ پروفیسر نے جان بوجھ کر اُس کا تعاقب کیا ہے اور کلاس سے نکلنے کے بعد سیدھا اُس کے پیچھے آیا ہے۔
دونوں خاموش رہے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا کہیں۔ وہ ایک خاموش اور ویران جھنڈ میں کھڑے تھے۔ ہائی اسٹریٹ کاروں اور لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہو گی لیکن وہاں کا شور یہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ اُن کے عقب میں کیمپس پر بھی خاموشی طاری تھی۔ دن کی کلاسیں ختم ہو گئی تھیں۔ شام کی کلاسیں شروع ہونے میں ابھی بہت وقت تھا۔ درختوں سے پرندوں کی چہکار بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس سکوت اور رونیا کی موجودگی نے پروفیسر کے خون کی گردش تیز کر دی تھی۔ اُس کے دماغ میں وہ باتیں گڈمڈ ہو گئیں جو وہ رونیا سے کہنے کے لیے اکثر سوچتا تھا۔ وہ رونیا کو کھانے کی دعوت دینا بھی بھول گیا۔
رونیا بولی۔ ”میں جلدی میں ہوں۔“ یہ کہہ کے اُس نے اپنی

جگہ سے حرکت نہیں کی یا وہ حرکت کر ہی نہ سکی۔ ساحل کی خاموشی سے اُس کی رنگت اور زرد ہو گئی تھی۔ اُس کا چہرہ خوف ناک حد تک سفید دکھائی دینے لگا جیسے کسی بے جان چیز کا چہرہ ہو۔ پروفیسر کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہوا کہ وہ رسمی باتیں چھوڑ دے اور سیدھے سیدھے اپنے دل کی بات کہہ ڈالے۔ "مس رونیا! جب بھی میں تم سے گفتگو کی کوشش کرتا ہوں تم جلدی میں ہوتی ہو۔" یہ بات اُس نے کچھ کہہ دی۔ وہ اپنی جرأت پر حیران رہ گیا۔

"معلوم نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں نے تم سے بارہا کہا کہ کسی روز میرے دفتر آکر مجھ سے بات کرو۔ تم نے کئی دفعہ وقت بھی مقرر کیا لیکن آئیں نہیں۔ میں انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ بعد میں ہمیشہ تم نے یہ بہانہ کیا کہ تم بھول گئی تھیں۔ پھر تم نے دوبارہ وقت مقرر کیا لیکن تم پھر بھول گئیں۔ راہ داری میں بھی تم مجھ سے کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتی ہو۔ میں نے کئی بار تمھیں پکارا بھی لیکن تم نے ایسا ظاہر کیا جیسے سُنا نہ ہو۔ اچھی لڑکی! ایک پروفیسر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے طلبہ سے ذاتی ملاقاتیں کرے۔ اسی طریقے سے اُستاد یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اُس کے شاگرد کیا پڑھ رہے ہیں، کتنا آگے بڑھ رہے ہیں۔ تم بہت حساس لڑکی ہو۔ مجھے یقین ہے، تمھیں اِن ملاقاتوں سے بے حد فائدہ ہوگا۔ میں اپنے طلبہ کی ترقی چاہتا ہوں۔" وہ خاموش ہو گیا۔ یہ ساری باتیں کتنی جھوٹی اور منافقانہ تھیں۔

رونیا ایک ذہین لڑکی تھی۔ پروفیسر جھوٹ بول کے اُسے قائل نہیں کر سکتا تھا۔ "مجھے جانا ہے۔" وہ بولی لیکن اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ شاید وہ ڈر رہی تھی کہ پروفیسر اُسے جانے سے روک دے گا۔

"سنو رونیا!" پروفیسر التجا کے انداز میں بولا۔ "تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ مجھ سے دُور دُور کیوں رہتی ہو؟ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ کیوں بنا دیتی ہو؟" وہ اُس کے قدموں میں بچھا جا رہا تھا لیکن اُسے کسی سبکی کا نہ احساس تھا، نہ پروا تھی۔ کم سے کم اتنا تو تھا کہ آج وہ پہلی دفعہ اپنے دل کی گہرائی سے ایک بات کہہ رہا تھا۔

رونیا نفی میں سر ہلانے لگی۔ "آپ میرے اُستاد ہیں، ایک پروفیسر ہیں اور میں۔۔۔۔"

"اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا نوجوان طلبہ کو تم سے گفتگو کا زیادہ حق حاصل ہے؟ اگر میں ایک طالب علم ہوتا اور تمھارے برابر بیٹھتا تبھی کیا تم مجھ سے بات چیت کرتیں؟ دیکھو، میں بھی ایک انسان ہوں اور تم ایک دل کش لڑکی ہو۔ میں ایک باعزت اور غیر شادی شدہ آدمی۔۔۔۔"

"آپ بڈھے ہیں!"

رونیا کے منہ سے یہ الفاظ پروفیسر کو ایسے معلوم ہوئے جیسے بڈھا ہونا ایک غلیظ، قبیح اور نفرت انگیز گالی ہو۔ یہ ایک توہین آمیز طمانچہ تھا۔ یہ اُس کی ہتک تھی۔ کیا وہ اِسی سلوک کا مستحق تھا؟ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "میری عمر انتالیس سال ہے۔" یہ ایک چھوٹا سا جھوٹ تھا۔ اُس کی عمر چالیس سال تھی۔ "میں کوئی امیر یا وجیہ آدمی نہیں ہوں۔" یہ بات بتاتے ہوئے اُسے خود سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ "مگر تمھارے کئی نوجوان دوست بھی امیر یا وجیہ نہیں ہیں۔ اُن کی لیاقت بھی مجھ سے کم ہے۔ میں اُن سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ میں نے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں۔ میری علمیت کا اندازہ میرے لیکچروں سے نہ لگاؤ۔ وہ تو مجھے خود معلوم ہے، غیر دلچسپ اور ٹھس ہوتے ہیں، لیکچر مجھے نصاب کے مطابق دینے پڑتے ہیں۔ کلاس سے باہر میں بہت دلچسپ اور ذہانت کی باتیں کر سکتا ہوں بشرطیکہ مجھے یہ معلوم ہو کہ تم میری باتیں غور سے سنو گی۔ رونیا! تم مجھے تحریک دے سکتی ہو۔ میرے خیالات کو جلا بخش سکتی ہو کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

رونیا نے بھاگنے کی کوشش کی۔ پروفیسر ہولس نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ اُس کی گرفت میں پھڑپھڑائی لیکن خود کو چھڑا نہ سکی۔ پروفیسر کو پہلی دفعہ اپنی مردانہ طاقت کا احساس ہوا۔ اِس طاقت کے آگے ایک لڑکی بے بس تھی۔

"سر! مجھے چھوڑ دیجیے۔ جانے دیجیے مجھے۔" رونیا نے التجا کی۔ خوف سے اُس کی آواز بھاری اور بھدی ہو گئی تھی۔ "اگر آپ نے مجھے چھوڑ دیا تو میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ آپ فکر نہ کیجیے۔"

"تم کسی کو بتاؤ گی؟ کسے بتاؤ گی؟" پروفیسر نے اُسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا اور اُس کے چہرے پر جھک کے کہنے لگا۔ "میں تمھارے ساتھ کون سی خطرناک بات کر رہا ہوں۔ جب تم لڑکوں کے ساتھ جاتی ہو تو وہ تمھیں مجھ سے زیادہ کھینچتے ہوں گے۔ اُن پر تمھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا ہوگا۔ پھر مجھ سے یہ مختلف سلوک کیوں کر رہی ہو؟"

رونیا نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اُس کی آواز گلے میں گھٹ کے رہ گئی۔ اُس نے منہ کھولا، چیخنے کی خواہش آنکھوں میں چمکنے لگی۔ اِس چمک نے پروفیسر ہولس کو خوف زدہ کر دیا۔ معاً اُس کے ہاتھ لڑکی کے گلے کی طرف بڑھے تاکہ وہ اُس کی چیخ روک دے۔ اُس نے شدت اور قوت سے لڑکی کی گردن دبائی۔ لڑکی گر پڑی۔ ساتھ ہی پروفیسر بھی گرا لیکن اُس نے لڑکی کی گردن پر گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اُس کے دماغ میں ایک خیال، صرف ایک خیال تھا کہ لوگ نسوانی چیخ سن کر دوڑتے ہوئے آئیں گے اور اُنھیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک پروفیسر کو ایک طالبہ نے کس طرح

وقف کر دیا۔ بہتر یہ ہے کہ لڑکی کی چیخ کو باہر نکلنے کا موقع نہ دیا جائے۔
اس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ لڑکی کا چہرہ نیلا اور سفید پڑتا گیا۔ یہاں تک کہ بے حس ہو گیا اور کالا پڑ گیا۔

وہ بہت تھا اسی دیر تک کوئی مدافعت نہیں کی، کوئی جنبش نہیں کی۔ آخر پروفیسر ہولس آہستہ سے کھڑا ہوا۔ لڑکی زمین پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس کا رنگ ارد گرد کے سایوں سے زیادہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ پروفیسر چند لمحوں تک ساکت و صامت کھڑا رہا تاکہ سانس معمول پر آجائے۔ اس کا ذہنی انتشار تیزی سے دُور ہونے لگا۔ اُسے ایک نئی حقیقت کا احساس ہوا۔ اس نے یعنی پروفیسر ہولس نے، ایک معقول آدمی نے، قتل کر دیا ہے۔ وہ قاتل بن گیا ہے۔ اُسے یہ تصدیق کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ لڑکی مر گئی ہے۔ وہ مر چکی تھی اور درختوں کے مردہ پتوں پر اس کے پیروں کے پاس پڑی تھی۔ وہ اس کی ٹانگیں چمکتی ہوئی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور اُسے گھور رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے کتاب گر گئی تھی اور زمین پر کھلی پڑی تھی۔ پروفیسر نے سرگوشی کی۔ "مجھے بڑا افسوس ہے رونیا! میں یہ نہیں چاہتا تھا۔"
اب رونیا کے لیے وہ اپنے دل میں محبت بھی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آخری سانس کے ساتھ پروفیسر کی محبت بھی اُڑ گئی تھی۔ جس چیز سے پروفیسر نے محبت کی تھی، وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا، رونیا کے ساتھ فنا ہو گیا تھا۔ ایک مردہ بدن سے کون محبت کر سکتا ہے۔
پروفیسر سے ایک خوف ناک حماقت سرزد ہو گئی تھی۔ اب اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا۔ رونیا مر چکی تھی، اس کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی تھی، اُسے دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن پروفیسر تو زندہ تھا اور اُسے زندہ رہنا تھا۔ خود کو بچانے کی قدیم جبلی خواہش اس کے دماغ کو پیغامات بھیج رہی تھی۔ کیا اُسے کسی نے لڑکی کے پیچھے جھنڈ میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟ نہیں، شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سارا کیمپس ویران پڑا تھا۔ اگر کسی نے اُسے دیکھا بھی ہو گا تو کیا وہ اُسے اِس کم روشنی میں پہچان سکتا ہے؟ اگر اُس کی یہاں موجودگی ثابت بھی ہو جائے تو کیا اُسے اِس جرم میں ملوث کیا جا سکتا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ مگر یہ ممکن ہے بھی کیونکہ وہ مقتولہ کا استاد ہے۔ آج اُس نے اُس کا تعاقب کیا تھا۔ آج سے پہلے کئی بار وہ راہ داری میں اور زینوں پر اُسے روک کر اپنے دفتر میں آنے کا وقت مقرر کر چکا تھا۔ ممکن ہے مرنے والی نے اس کے پُرہوس رویّے کا ذکر اپنی کسی سہیلی یا کسی دوست سے کیا ہو۔ اِس صورت میں اُس پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔
واردات کی جگہ سے غیر حاضری؟ وہ اپنی غیر حاضری ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر اُس نے لڑکی کو ارادتاً قتل کیا ہوتا تو کوئی منصوبہ بناتا لیکن یہ تو ایک قطعی غیر ارادی، جذباتی اور جنونی قتل ہے۔ اُسے تو کوئی جنون نہیں، وہ ایک صحیح الدماغ آدمی ہے۔ اس نے لڑکی کی چیخ روکنے کا فیصلہ بڑے منطقی انداز میں کیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ لڑکی کی چیخ اس کی عزت اور نوکری دونوں کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ فرض کیا کہ وہ ایک جنونی قاتل ہے جو اُس لڑکی کو قابو میں کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھانا چاہتا ہو، وہ ایک سفاک شکاری ہے جس سے اس کا شکار چھین لیا گیا ہو، وہ ایک پاگل آدمی ہے جو تشدد اور انتقام سے اپنے ناآسودہ جذبات کی تسکین کر رہا ہو۔ ایسا آدمی کیا کرے گا؟ کس طرح قتل کرے گا؟ یہ قتل کس طرح واقع ہونا چاہیے۔ یہ واردات ایک پروفیسر کی واردات نہیں لگنی چاہیے بلکہ ایک سفاک درندے کی درندگی معلوم ہونی چاہیے۔
وہ نہایت سکون سے ایک نتیجے پر پہنچا۔ اپنی جیبیں ٹٹول کے اُس نے ایک چھوٹا سا زنگ آلود چاقو نکالا۔ اس سے وہ اپنے پائپ میں جمی ہوئی گندگی صاف کرتا تھا۔ آج اُسے اس چاقو سے دوسرا کام لینا تھا۔ وہ اس ہول ناک کام کے لیے تیار نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ اُس نے جھک کے چاقو کھولا۔ چاقو کند تھا اور اس مقصد کے لیے نہیں بنا تھا پھر بھی کچھ کام چل گیا۔ اُس نے لاش پر کئی زخم لگائے، زخم گہرے نہیں تھے لیکن خون نکلنے لگا۔ یہی اہم بات تھی۔ اُس نے رونیا کی پیشانی، رخسار، گردن اور ٹانگیں چیر پھاڑ ڈالیں پھر سوچا کہ اتنا کافی ہے، اب خاصا خون نکل گیا ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اپنی دانست میں وہ ابھی تک خطرے میں تھا۔ اُسے چاقو اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ اگر وہ اُسے اِدھر اُدھر پھینک دیتا تو لوگ پہچان لیتے کہ یہ کس کا چاقو ہے۔ اُس نے چاقو رومال میں لپیٹ کے اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ اُس کا رومال اور ہاتھ خون سے لتھڑ گئے تھے، کپڑوں پر کئی جگہ خون کے دھبے پڑ گئے تھے۔ اُس نے سوچا کہ اُسے اپنے کپڑے صاف کرنے ہوں گے اور اُنھیں ضائع کرنا ہو گا۔ یہ کام کرنے کے لیے اُس کے پاس بہت وقت تھا۔ اُس نے پلٹ کر کیمپس کا راستہ لیا۔ یہ ایک صحیح فیصلہ تھا کیونکہ کیمپس ویران اور خاموش تھا۔ لائبریری پہنچنے تک کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ وہاں سے وہ سیدھا بورڈنگ ہاؤس کی طرف گیا۔ رات کے کھانے پر وہ تاخیر سے نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔
لاش اُسی شام دیکھ لی گئی۔ دوسرے دن اخباروں نے بڑی بڑی سُرخیاں لگائیں۔ ہولس نے صبح کا ناشتہ نہیں کیا، دیر تک سوتا رہا۔ سنیچر کو دیر تک سونا اُس کا دستور تھا لیکن آج دراصل وہ سو نہیں رہا تھا بلکہ لیٹا ہوا نیچے سے آنے والی آوازیں سن رہا تھا۔

لوگ اطمینان [illegible] کر رہے تھے۔ پروفیسر اطمینان سے اٹھا [illegible] سب لوگ کیمپس جانے کے لیے [illegible] پروفیسر بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گیا تاکہ کسی کو اس پر [illegible]

کیمپس میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ اساتذہ، طلبہ اور شہری جمع تھے۔ سب لوگ گھاس والے قطعے اور درختوں کے جھنڈ میں پھیلے ہوئے تھے۔ پروفیسر نے اطمینان کی سانس لی۔ قدموں وغیرہ کے نشانات ہجوم نے گڈمڈ کر دیے تھے۔ لاش بہت دیر پہلے لے جائی جا چکی تھی۔ قتل کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ لاش عریاں تھی اور اس پر جنسی تشدد کے نشانات تھے۔ لوگ لاش کے زخموں کی وجہ سے قاتل کے لیے نفرت اور غصے سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نکتے پر سبھی متفق تھے کہ قتل کسی پاگل، کسی جنونی نے کیا ہے۔ ہجوم میں ایک طرح کا لذیذ خوف دوڑ رہا تھا۔

ہولس مطمئن واپس آیا۔ کسی نے پولیس کے سامنے یہ شبہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ رونیا کو پروفیسر ہولس نے قتل کیا ہے۔ ہولس کو یقین تھا کہ تفتیش کے دوران پولیس اس سے بھی پوچھ گچھ کرے گی۔ پولیس ہر اس آدمی سے پوچھ گچھ کرے گی جو رونیا سے واقف تھا۔ اس نے سوچا کہ اب تک اس نے اپنے آپ کو اچھی طرح محفوظ رکھا ہے۔ رات کو کسی نے اسے ہوسٹل میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا اور دروازہ مقفل کر کے اس نے کپڑوں کا غور سے معائنہ کیا۔ خوش قسمتی سے اس کے کپڑوں پر خون کے بہت کم چھینٹے لگے تھے۔ اس نے صابن اور پانی سے کپڑوں، جوتوں، رومال اور بریف کیس کا سارا خون دھو ڈالا۔ اب اس کے کپڑوں پر کوئی دھبا نظر نہیں آتا تھا لیکن اس نے سوچا کہ وہ بار بار کپڑوں کا جائزہ لے گا، ایسا نہ ہو کہ کوئی داغ رہ جائے۔ وہ رومال سرخ ہو چکا تھا جس میں اس نے چاقو لپیٹا تھا۔ رومال جلا کے اس نے راکھ غسل خانے میں بہا دی۔ چاقو کی وجہ سے وہ پریشان تھا۔ نیا چاقو دیکھ کر شاید کسی کو شک ہو جاتا لہٰذا اس نے چاقو خوب دھو کر صاف کر لیا، اب یہ چاقو کیمیائی تجزیے کے بعد بھی صاف نکلے گا۔

دوپہر کے کھانے پر بھی لوگوں میں قتل کے متعلق بحث ہو رہی تھی۔ سب لوگ کیمپس ہو آئے تھے اس لیے ذرا کھل کر اس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ ہوسٹل کی مہتمم مسز فنچ نے بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہر شخص اس کی بات توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ پچاس سال کی ایک خوش مزاج سمجھ دار صحت مند اور محنتی عورت تھی۔ اس کے شوہر مسٹر فنچ ایک لیکچرر تھے۔ مسز فنچ کہہ رہی تھی، "ہائے بے چاری لڑکی۔ آہ، اس کے ساتھ کیسا ہولناک واقعہ پیش آیا۔ توبہ ہے توبہ۔"

"اور کیسی جوان تھی۔" ایک کنواری عورت مس جانسن نے افسوس سے کہا۔ اس عورت کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جوانی کے اصولوں کی پرستار ہے۔ وہ نائب لائبریرین تھی۔

ریاضی کے لیکچرر ٹرمبل نے مقتولہ کے متعلق کہا۔ "وہ ایک نفیس لڑکی تھی۔" ٹرمبل سبک دوشی کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں ریاضی کے ہندسے پڑھتے پڑھتے خاصی کمزور ہو گئی تھیں۔ اس نے موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔

مسز فنچ نے پوچھا۔ "مسٹر ٹرمبل! کیا آپ اسے جانتے تھے؟"

"ہاں کچھ کچھ۔ سرخ بالوں والی لڑکی تھی۔"

"نہیں، اس کے بال بھورے تھے۔" ہولس نے تصحیح کی۔

"اوہ، ہاں۔" ٹرمبل بولا۔ "میں بھول گیا تھا۔"

نفسیات کے استاد جولس کا چہرہ چمک اٹھا۔ یہ گہرے رنگ اور گول چہرے کا ایک میانہ قد جوان تھا۔ اس کی طبیعت میں تیزی و طراری تھی۔ چشمے کے پیچھے اس کی آنکھیں بے چین رہتی تھیں۔ اس نے ہولس سے پوچھا۔ "وہ لڑکی تمھاری کلاس میں تھی نا ہولس؟"

"ہاں، میری کلاس میں تھی۔" ہولس نے جواب دیا۔

"تو پھر تم کیوں نہیں بولتے کچھ؟" مسز فنچ نے کہا۔ "ہمیں بتاؤ کہ وہ کیسی لڑکی تھی؟"

"بس عام سی لڑکی تھی جیسی دوسری لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

"دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔" نفسیات کے استاد جولس نے کہا۔ "اسی لیے تو میرا مضمون نفسیات ایک دلچسپ علم ہے۔"

"واقعی۔" ہولس نے خوش دلی سے کہا۔ "تمھارا مضمون بے حد دلچسپ ہے۔"

"ہاں۔" جولس نے فخر سے کہا۔ "مجھے لڑکی سے اتنی دلچسپی نہیں، وہ ایک عام سی لڑکی تھی جیسا تم نے ابھی کہا۔ بیس سال کی ایک نوجوان اور پرکشش لڑکی، مردوں میں زیادہ دلچسپی لینے والی لیکن مجھے جس شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، وہ قاتل کی شخصیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ ایک خاص طرح کا آدمی ہے۔"

"کس طرح کا آدمی؟" ہولس نے تجسس سے پوچھا۔

"کوئی پاگل ہو گا۔" مسز فنچ نے رائے ظاہر کی۔

"کوئی بھوت پریت؟" نائب لائبریرین مس جانسن بولی۔

"ہاں کسی حد تک کہہ سکتے ہیں۔" جولس نے کہا۔ "لیکن ایک

[illegible] غیرمعمولی آدمی ہوتا ہے۔ ہم سب کبھی نہ کبھی یہ [illegible] قتل کریں لیکن ہم میں سے اکثر اتنی جرأت پیدا [illegible] جذبات اتنے مشتعل نہیں ہوتے کہ جوشش [illegible] قتل کرنے کے لیے حوصلہ اور جذباتی اشتعال [illegible] نہیں ہوتا پھر بھی اسے آپ غیرمعمولی کیفیت [illegible] حالت ہوتی ہے مگر روبینا کے قاتل نے جس [illegible] بگاڑی ہے، اُس سے ایک غیرمعمولی کیفیت [illegible] ہوتا ہے۔"

"[illegible] کی غیرمعمولی کیفیت؟" پولس نے یہ سوچ کے سوال [illegible] ماہر نفسیات بھی جیولس کی طرح کوئی نظریہ [illegible]۔

"یہ بات میں کسی سند کے بغیر کہہ رہا ہوں۔" جیولس کو اپنی [illegible] کی نمائش کا بہت شوق تھا۔ اس کے لیے اُسے یہ موقع [illegible] ہاتھ آیا تھا۔ "ایک عام آدمی کو لیجیے۔ فرض کیا کہ اُس کے پاس قتل کرنے کا معقول جواز ہے۔ وہ ایک دلیر آدمی ہے یا [illegible] جذبات کا مالک ہے۔ قتل کا فعل اور مقتول کی تباہی اُس کے جذبات کو تسکین دیتی ہے۔ مثال کے طور پر میری ایک بیوی ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ بے وفا ہے۔ اِس صورت میں اُسے قتل کرنے کا عمل اور یہ حقیقت کہ وہ مر چکی ہے میرے حاسدانہ اور رقیبانہ جذبات کو تسکین دینے کے لیے کافی ہے۔ میں اُس کی لاش چیروں گا، پھاڑوں گا نہیں۔ چیرنے پھاڑنے کا عمل کس بات کی غمازی کرتا ہے؟ اِس بات کی کہ قاتل یقیناً ذہنی پراگندگی میں مبتلا ہے لیکن یہ پراگندگی کس نوعیت کی ہے؟ گلا گھونٹ کر جان لینے سے اُسے تسکین نہیں پہنچی۔ یہ حقیقت اُس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں کر سکی کہ روبینا مر چکی ہے۔ قاتل کچھ اور بھی چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے روبینا کی لاش بگاڑ دی۔"

"واہ جیولس، تم واقعی ایک زیرک شخص ہو۔" مسز فینچ نے اُس کی تعریف کی۔

"یہ تو صرف سرسری تجزیہ ہے مسز فینچ! اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں۔" جیولس نے فخر سے کہا۔

"کیا باتیں ہیں؟" مس جانسن آنکھیں نکال کر پوچھنے لگی۔

"سوال یہ ہے کہ کیا قاتل کو لاش بگاڑنے کے بعد دلی تسکین حاصل ہو گئی ہے؟"

سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ٹرمبل نے دریافت کیا: "اِس سوال سے تمھارا کیا مطلب ہے جیولس؟"

جیولس نے اُن کے سروں کے اوپر دیکھتے ہوئے کہا: "میرا تجزیہ ہے کہ قاتل ایک تنہا آدمی ہے۔ اِس نوع کے واقعات میں تنہائی ضرور ایک عنصر ہوتی ہے۔ یہ تنہائی صرف چند لمحات کی یا عارضی حالات کی نہیں ہے بلکہ قاتل مزاج کے اعتبار سے ایک تنہا فرد ہے اور بچپن کے خراب حالات کی وجہ سے ابھی تک بچپنے کی حدود سے نہیں نکلا ہے۔ پختہ عمر تک پہنچ کر بھی اُسے کوئی مقام حاصل نہیں ہوا، میرا مطلب ہے کوئی ایسا مقام جس کی وجہ سے وہ مشہور و معروف ہو جاتا اور ہم عصروں میں اُس کی عزت و توقیر بڑھتی۔ اب یہ واقعہ بھی اُس کی ناکامیوں میں شامل کر لینا چاہیے۔ مقتولہ نے ضرور اُس کی محبت ٹھکرا دی ہوگی۔ یہ قاتل یقیناً ایک کنوارا اور گوشہ نشین آدمی ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی غار وغیرہ میں رہتا ہوگا۔ وہ لوگوں سے ملتا جلتا ہے لیکن کسی مرد یا عورت سے اُس کی دوستی نہیں ہے، نہ کوئی اُس کا رازداں ہے۔ وہ ایک خوف ناک تنہائی کا شکار ہے۔ اُسے ہمیشہ رد کیا گیا ہے، اُسے ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور اسے ہمیشہ کنارے پر رکھا گیا ہے۔ فرض کیجیے اگر آپ اِس حالت میں ہوں تو کیا آپ کے دل میں انسانوں کے لیے کوئی محبت باقی رہ سکتی ہے؟"

حاضرین میں سے صرف مسز فینچ شادی شدہ تھی۔ نائب لائبریرین مس جانسن، پولس اور جیولس سب کنوارے تھے۔ مس جانسن اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی، اُس کے چہرے پر خجالت سی

تھی۔ ٹرمبل اپنے تھکے ہوئے دماغ کے ساتھ پلکیں جھپکاتا رہا۔ پروفیسر ہولس اس بات پر خوش تھا کہ اُس نے کامیابی سے ایک پاگل کا روپ دھار لیا ہے لیکن جب جولس نے اپنے تجزیے کی مزید تشریح کی تو اُسے ذرا پریشانی ہوئی۔ جولس کہہ رہا تھا۔ ”رُونیا کے قتل کے سلسلے میں دو امکانات ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ قاتل اُسے جانتا تھا اور رُونیا نے قاتل کو ٹھکرا دیا ہوگا۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ قاتل اس لڑکی کے لیے اجنبی تھا لیکن اُس نے لڑکی کو تمام انسانوں کی نمائندہ سمجھ کر اس سے انتقام لے لیا۔“

استدلال کا یہ طریقہ ہولس کے حق میں جاتا تھا۔ گویا کوئی بھی شخص رونیا کا قاتل ہو سکتا ہے جو رُونیا سے ذاتی طور پر واقف بھی نہ ہو۔ جولس نے گفتگو جاری رکھی۔ ”لیکن میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ کیا وہ قاتل انسانوں کے اس قدر خلاف ہے کہ قتل کے بعد اُسے لاش بگاڑ کے تسکین حاصل ہوئی ہے؟ یا اُس کے بعد بھی اُسے تسکین حاصل نہیں ہوئی؟ اور اُسے....“ وہ ڈرامائی انداز سے رُک گیا۔ ”دوبارہ کسی پر قاتلانہ حملہ کرنا پڑے گا؟“

”یہ بات بعید از قیاس ہے۔“ پروفیسر ہولس نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔

جولس نے سرد نگاہ سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”ہولس تمھیں اس بات کا کیسے یقین ہے؟“

ہولس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ توازن کھونے لگا ہو۔ یہی حالت رات کو درختوں کے جھنڈ میں قتل کے ارتکاب کے بعد ہوئی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، سب اُس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ“ وہ اٹکا۔ ”ایک آدمی کتنا ہی دُنیا کے خلاف ہو، انسانوں سے کتنا ہی متنفر ہو، اُس کے انتقامی جذبے کو تسکین دینے کے لیے ایک قتل کافی ہے۔“

”لاش بگاڑنے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟“

”اس سے قاتل کو مزید تسکین پہنچی ہوگی۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ قاتل کی بھوک اور تیز ہو گئی ہو؟“

ہولس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ خود پر قابو پانا اُسے مشکل معلوم ہونے لگا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“ اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”دیکھتے ہیں، کون غلط کہہ رہا ہے۔“ جولس نے اپنی باتوں سے جو سنسنی پیدا کر دی تھی، اُس سے وہ بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ اُس نے مزے لینے کے لیے مس جانسن کو مخاطب کیا اور بہت رازداری سے سرگوشی میں بولا۔ ”اگر میں ایک عورت ہوتا تو جب تک قاتل پکڑ نہ لیا جاتا، میں بہت محتاط رہتا۔“ مس جانسن پیلی پڑ گئی۔

پولیس چیف کیگل نے اس واقعے کی تفتیش اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ کسرتی جسم کا ایک گنجا آدمی تھا۔ اُس کی بے فریم عینک سے جھانکتی ہوئی کالی آنکھیں بہت تیزی سے گہرائی میں اُتر جاتی تھیں۔ وہ انتہائی ذہانت سے ہر بات کا جائزہ لیتا تھا۔ کوئی چیز اُس کی آنکھوں سے زیادہ دیر اوجھل نہیں رہتی تھی۔

اُس نے دوسرے کئی پروفیسروں کے علاوہ مقتولہ کے اُستاد پروفیسر ہولس سے بھی پوچھ گچھ کی۔ سوالات بے ضرر قسم کے تھے لیکن ہولس کیگل کے انداز سے بور ہو گیا۔ کیگل نے اُس سے یہ نہیں کہا کہ وہ قتل کے وقت جائے قتل سے اپنی غیر موجودگی ثابت کرے۔ کیگل نے کوئی اور بات بھی براہِ راست نہیں پوچھی۔ بس یہ گزارش کی کہ ”پروفیسر ہولس! آپ لڑکی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر کے قانون سے تعاون کیجیے۔“ ہولس کو شک ہوا کہ کیگل اُس کے جوابات سننے کے بجائے اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ ہولس انتظار کرنے لگا کہ لٹکتی تلوار کب گرے گی۔ وہ کیگل سے اس سوال کی توقع کر رہا تھا کہ پروفیسر ہولس! سُنا ہے آپ اُس لڑکی میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے؟ لیکن یہ سوال نہیں کیا گیا۔ ہولس نے سوچا، ممکن ہے کہ کیگل بہت سی ایسی باتیں جانتا ہو مگر اُسے بتانا نہ چاہتا ہو۔ بہرحال پوچھ گچھ ختم ہونے کے بعد اُس نے اطمینان کی سانس لی۔

پھر ایک دوسری بات سے اُس کی پریشانی دوبارہ شروع ہو گئی۔ اخباری اطلاع کے مطابق ایک ماہر ڈاکٹر نے مقتولہ کی لاش کا خردبین سے معائنہ کیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ لاش پر زخم ایک کند چاقو سے لگائے گئے تھے۔ یہ خاصی تجسس کی بات تھی۔ اگر قاتل اپنے شکار کی لاش بگاڑنے کا منصوبہ پہلے سے بنا کر آتا تو اپنے ساتھ تیز چاقو لاتا۔ زخموں میں پائے جانے والے مواد کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا۔ پتہ چلا کہ وہ تمباکو کا جلا ہوا میل تھا جو پائپ کے منہ میں ہوتا ہے۔ قاتل پائپ پینے والا آدمی تھا اور اُس نے وہ چاقو استعمال کیا تھا جس سے وہ پائپ کا میل کھرچ کر نکالتا تھا۔ کیمپس میں پائپ پینے والوں کی کمی نہیں تھی۔ درجنوں پروفیسر اس لَت میں مبتلا تھے۔ لڑکے بھی فیشن کے طور پر پائپ پی لیتے تھے۔ اُن کے علاوہ سینکڑوں، ہزاروں شہریوں کو پائپ پینے کا شوق تھا۔ پولیس کس کس کو پکڑتی؟ یہ کوئی مفید سراغ نہیں تھا اس لیے ہولس نے پریشان ہونا چھوڑ دیا۔

اِس دوران جولس نے ایک اخباری نمائندے کو انٹرویو دیا۔ انٹرویو میں بھی اُس نے وہی باتیں دُہرائیں جو ہولس سُن چکا تھا۔ جولس نے پھر زور دے کر کہا تھا کہ جس پاگل شخص نے

اور ہلاک کیا تھا، وہ شاید دوبارہ ایسی واردات کرے۔ پولس
کا یہ بیان لفظ بہ لفظ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن صحافتی اعتبار سے
اچھا خاصا بیان تھا۔ اخبار نے اسے نمایاں شائع کیا۔ شہر بھر
میں آگ لگ گئی۔ مخصوصاً عورتیں بے حد خوف زدہ ہو گئیں۔
اولس جہاں بھی گیا اُس نے جیولس کے انٹرویو کا اثر دیکھا۔ اب
کوئی لڑکی کیمپس میں اکیلی گھومتی نظر نہیں آتی تھی۔ شہر میں بھی
بہت کم عورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ اکثر عورتیں زیادہ تر گھروں
میں رہتیں یا بہت ضروری اشیا خریدنے باہر نکلتیں۔ پولس کو
یہ سب کچھ بالکل بیکار معلوم ہوتا تھا۔ اُس کا دل چاہتا، لوگوں کو
بتا دے کہ رونیا کا قاتل اب کسی کو ہلاک نہیں کرے گا۔ ویسے
اُس نے محسوس کیا کہ جیولس کے خیالات اُس کی کامیابی کی وسیل
تھے۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ رونیا کا قتل ایک پڑھے لکھے صحیح الدماغ
آدمی کی غلطی کے بجائے کسی پاگل کا تشدد معلوم ہو۔ جیولس نے
یہی بات چاروں طرف پھیلا دی تھی۔ اب سراغ رسانوں کو یہ
معلوم کرنے میں بہت وقت ہوگی کہ ایک پاگل آدمی نے لاش
چھپانے کے لیے پائپ کا گندہ چاقو کیوں استعمال کیا؟
پولس کو امید تھی کہ پولیس بھی جیولس کے خیالات قبول کر لے
گی۔ جیولس نے تشریح و توضیح سے اپنے خیالات کو ایک باقاعدہ
شکل دے دی تھی۔ وہ مستقل یہی کہہ رہا تھا کہ قاتل دوبارہ قتل
کرے گا۔ وہ رونیا کی ہلاکت کے سلسلے میں اس کے سوا کوئی بات
نہیں کرتا تھا۔

ایک دن پولس نے کھانے کی میز پر جیولس سے کہا۔
"جیولس! مجھے اب بھی تمھاری رائے سے اختلاف ہے۔ میرا
خیال ہے ایک وجہ ایسی ہے کہ رونیا کا پاگل قاتل دوبارہ کسی
کو ہلاک نہیں کرے گا۔"

"کیا مطلب؟" جیولس نے پوچھا۔

"اُسے دوبارہ موقع ہی نہیں ملے گا۔"

"کیوں نہیں ملے گا موقع؟"

"اب کوئی لڑکی اور عورت اکیلی گھومتی نظر نہیں آتی۔
ہر عورت کے ساتھ کوئی نہ کوئی مرد ضرور ہوتا ہے۔"

جیولس کو یہ بات ماننی پڑی۔ مس جانسن ہی کی مثال
سامنے تھی۔ اُسے کیمپس سے گزارنے کے لیے بوڑھے ٹرمبل کو
ساتھ جانا پڑتا تھا۔ کبھی ٹرمبل یا کوئی اور ساتھی نہ ملتا تو مس جانسن
طلبہ کو رشوت دیتی کہ وہ اُسے پہنچا آئیں، اس خدمت کے
عوض وہ اُن کے لیے کتابیں اور دوسرا تحقیقی مواد فراہم کرنے
کا وعدہ کرتی۔ مس جانسن ایک اعلا درجے کی ڈرپوک عورت



ایک کنوارا شادی کے بارے میں کب سوچتا ہے؟
جب اس کی سوچ جواب دے جاتی ہے۔

کیا آپ اپنی بیوی کو تفریح کے لیے ساتھ لے جاتے ہیں۔
جی نہیں۔ میں شادی شدہ عورتوں کے ساتھ تفریح کا قائل نہیں ہوں۔

شادی کے موقع پر موسیقی کا اہتمام کیوں کیا جاتا ہے؟
دولہا کو یقین دلانے کے لیے کہ یہ خوشی کا موقع ہے۔

ہماری بیشتر فلموں کا انجام شادی پر کیوں ہوتا ہے؟
ہمارے فلم بین طربیے یعنی کامیڈی کے مقابلے میں المیے یعنی ٹریجڈی
زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مجھ سے شادی کے لیے ہزاروں بار درخواستیں کی گئیں۔"
"کس نے کیں؟"
"میرے والدین نے۔"

"ہماری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن یہ کل کی سی بات معلوم
ہوتی ہے۔ کل کا دن کیسا واہیات تھا۔

طلاق کے بعد میں نے اُس کی بہن سے شادی کر لی۔ اس طرح مجھے تنی
ساس سے نجات مل گئی۔



بستولے فاطمہ کے چھوارے

تھی مگر جیولس یہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ یہ حالات
مستقل رہیں گے۔ اُس نے کہا۔ "وہ آدمی ابھی چھپا ہوا ہے کیونکہ
ابھی دوسری واردات کا موقع نہیں ہے۔ یہ قلعہ بندی ہمیشہ نہیں
رہے گی۔ عورتیں رفتہ رفتہ احتیاط چھوڑ دیں گی۔ اور آخر سارا واقعہ
بھول جائیں گی۔ انسان کا حافظہ نہایت کمزور ہوتا ہے۔"

"میں کبھی بے احتیاطی نہیں کروں گی، نہ یہ واقعہ بھولوں
گی۔" مس جانسن بولی۔

"دوسرے بھول جائیں گے اور آخر قاتل کو پھر موقع ملے گا۔"

"وہ شاید کسی اور جگہ چلا جائے۔" پولس نے کہا۔ "ہو سکتا
ہے وہ کوئی مسافر ہو۔"

"شاید۔" جیولس نے اتفاق کیا۔ پولس نے محسوس کیا کہ اگر
جیولس کا نظریہ سچ ثابت نہ ہو سکا یعنی رونیا کے قاتل نے دوسرا
قتل نہ کیا تو جیولس کو بہت رنج ہو گا۔

جیولس کی پیشین گوئی درست نکلی۔ ایک جوان لڑکی کے
ہنگامہ خیز قتل میں بھی لوگوں کی دلچسپی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ گرجا
میں مقتولہ کے لیے ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ اُس کی مغفرت کی دعا
مانگی گئی اور لاش تجہیز و تکفین کے لیے اُس کے پیدائشی شہر بھیج دی
گئی۔ چند روز بعد خوف کی لہر چھٹ گئی۔ لڑکیاں ایک عمارت سے
دوسری عمارت تک اکیلی بھی جانے لگیں مگر درختوں کے جھنڈ کی طرف

اب بھی کوئی لڑکی اکیلی نہیں جاتی تھی۔ رات کے وقت تو کوئی مرد بھی اُدھر جاتا نظر نہیں آتا تھا۔ پولیس چیف کیگل نے رضاکاروں کا ایک دستہ بنا لیا تھا۔ یہ دستہ رات کے اندھیرے میں جھنڈ کے اِردگرد کڑی نظر رکھتا تھا۔ شاید کیگل بھی جیولس کی بات کا قائل ہو گیا تھا کہ قاتل دوبارہ کسی پر حملہ کرے گا۔ رضاکار ہتھیاروں سے لیس ہو کے پیدل گشت کرتے تھے۔ اُن کے علاوہ بعض مقامات پر باوردی اور بعض مقامات پر سادہ لباس والے سپاہیوں کا بھی پہرا رہتا تھا۔

ہولس اکثر کیمپس اور اُس کے گردونواح میں ٹہلتا۔ وہ اِس بات پر حیران ہوتا کہ اُس کے ہاتھوں نے کیسی سنسنی پیدا کر دی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر اُسے خوشی ہوتی کہ اِن لوگوں کی ساری احتیاط، ساری تلاش بے کار ثابت ہو گی۔ اُس کے ٹہلنے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک مرد تھا۔ جیولس نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ قاتل کسی مرد پر حملہ کرے گا۔ لوگ اب دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے تھے۔

تقریباً تین ہفتے بعد کا ذکر ہے۔ ہولس معمول کے مطابق ٹہل رہا تھا۔ اُس نے ایک عجیب بات دیکھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ عام حالات سے قطعِ نظر روبنا کے قتل کے بعد سے یہ وقت تاریک جھنڈ کی طرف جانے کے لیے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اُس رات بادل گھرے ہوئے تھے، موسم بھیگا بھیگا اور سرد تھا اور کہیں کہیں دھند کے مرغولے آ رہے تھے، اُن کی وجہ سے سڑکوں کی روشنیاں دُھندلا گئی تھیں۔ اِس ماحول میں ہولس نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے یہ وہم ہوا کہ وہ روبنا ہے۔ دہشت سے ہولس کی سانس رُکنے لگی۔ لڑکی بجلی کے کھمبے کے نیچے سے گزری۔ اِس سردی میں بھی اُس کا سر کھلا ہوا تھا مگر اُس کے بھورے بال چمک رہے تھے۔ وہ ایک بھاری کوٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُس کا قد روبنا کے قد کے برابر تھا مگر ہولس نے خود کو یقین دلایا کہ یہ روبنا نہیں ہو سکتی۔ اُس نے روبنا کا تابوت اپنی آنکھوں سے ریل میں چڑھتے دیکھا تھا۔ اُسے حیرت ہوئی کہ اِس وقت یہ بے وقوف لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟ کیا اِسے معلوم نہیں کہ یہاں ایک قتل ہو چکا ہے؟ وہ کوئی طالبہ تھی۔ اُس کے بازو میں کتابیں دبی ہوئی تھیں۔ آخر یہ لڑکی دوسری لڑکیوں سے زیادہ دلیری کا مظاہرہ کیوں کر رہی ہے؟ ہولس کو لڑکی کی یہ جرأت اچھی نہیں لگی۔ ایک بے قابو تجسس کے تحت اُس نے لڑکی کا تعاقب کیا۔ لڑکی انجینئرنگ کی عمارت سے نکل کر طبیعات کی عمارت کی طرف بڑھی۔ ہولس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہی راستہ روبنا نے اختیار کیا تھا۔ ہولس لڑکی کے پیچھے چلتا رہا۔ اُس کا تجسس بڑھتا گیا۔ لڑکی زیادہ تیز نہیں چل رہی تھی۔ ہولس کو اپنی رفتار کم کرنی پڑی تاکہ درمیانی فاصلہ قائم رہے۔ لڑکی نے چلتے چلتے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ اُس نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور مختصر راستے کی طرف مڑ گئی۔ یہ راستہ تاریک جھنڈ سے گزرتا تھا۔ روبنا یہیں قتل ہوئی تھی۔ ہولس نے سوچا کہ یہ تو سراسر حماقت ہے۔ چند لمحوں بعد لڑکی اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُسے تاریکی نے ہڑپ کر لیا۔ صرف اُس کے بھورے بالوں کا گچھا تصور میں جھولتا رہا۔ ہولس پھرتی سے آگے بڑھا مگر بھورے بالوں والی لڑکی غائب ہو چکی تھی۔ اب شاید وہ جھنڈ میں ہو گی۔ وہ اُسے پکارنا چاہتا تھا۔ پکارنے کے لیے اُس کا منہ کھلا بھی لیکن بر وقت اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ ایک فاش غلطی سے بچ گیا۔ بعد میں وہ لڑکی کہہ سکتی تھی کہ پروفیسر ہولس نے اُسے اُس جگہ سے آواز دی تھی جہاں روبنا کا قتل ہوا تھا۔ اگر وہ لڑکی کو سمجھا بھی دیتا کہ اُس نے اُسے صرف خطرے کے پیشِ نظر پکارا تھا تب بھی بات نہ بنتی۔ اپنی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

وہ لائبریری پہنچ گیا۔ یہاں آ کے نہ جانے کس جذبے نے اُسے پسینے میں شرابور کر دیا۔ لائبریری میں کچھ وقت گزار کے نو بجے کے قریب اُس نے مس جانسن کو اُس کے گھر تک پہنچایا اور برآمدے میں بیٹھ کر جیولس کا انتظار کرنے لگا۔ اِس اثنا میں مسز فنچ نے اُسے چائے پلائی۔ جیولس ساڑھے دس بجے آیا۔ ہولس نے فوراً اُس سے کہا: "جیولس! میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیوں؟ کیا پریشانی ہے تمھیں؟" جیولس تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا مگر ہولس کی بات سننے کے لیے تیار ہو گیا۔

"آج میں نے ایک لڑکی کو اندھیرا ہونے کے بعد تنہا گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔" اُس نے جیولس کو یہ نہیں بتایا کہ لڑکی درختوں کے جھنڈ میں چلی گئی تھی، اِس طرح یہ بات کھل جاتی کہ اُس نے لڑکی کا تعاقب کیا ہے۔

"دیکھ لیا، میں نے کیا کہا تھا۔" جیولس مسکرایا۔ "مجھے معلوم تھا کہ لڑکیاں رفتہ رفتہ غیر محتاط ہو جائیں گی۔"

"لیکن کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اِس معاملے میں آدمی کو اتنا غیر محتاط نہیں ہونا چاہیے۔ تمھیں یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ اب ایک دوسرا قتل ہو گا؟"

"ہاں، میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔" جیولس نے زور دے کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔" جیولس ٹہلنے لگا۔ "میں خود پریشان ہوں۔ ابھی صرف ایک لڑکی اکیلی گھومتی ہے، کچھ دنوں بعد دوسری لڑکیاں بھی گھومنا شروع کر دیں گی۔ مجھے ڈر ہے کہ اِس طرح قاتل کو دوسرا موقع مل جائے گا۔"

"وہ قتل بھی کر گیا اب وہ دوسرا قتل نہیں کرے گا۔" ہولس
نے کہا۔ "اب وہ جرأت نہیں کر سکتا۔ اُسے معلوم ہے
کہ پولیس اُس کی تلاش میں ہے۔"
جولس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُس کے متعلق تمہارا حسن ظن
غلط ہے۔ وہ ہمت نہیں ہارے گا۔ اُسے خطرات مول لینے کی
عادت ہے۔ پہلا قتل کرتے وقت بھی اُس نے خطرہ مول لیا
تھا۔ اب دوبارہ بھی وہ کوشش کرے گا۔ ویسے بھی اُس کے پاس
اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ آدمی مجبور ہوتا ہے تو آزاد نہیں
رہتا، وہ مجبوری کا غلام ہو جاتا ہے۔"
"مجبوری؟" ہولس نے پلکیں جھپکائیں۔
"ہاں! وہ دوسرا قتل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ دوسرا قتل
اُس کا مقدر ہو چکا ہے۔"
ہولس کھڑا ہو گیا۔ "یہ واہیات بات ہے۔" وہ پھٹ پڑا۔
"ہولس! یہ بالکل منطقی بات ہے۔ پہلا قتل انتقام کی تسکین
کے لیے کیا گیا تھا۔" جولس نے دھیمے انداز میں گفتگو شروع کی۔
واقعی اُس کی آواز ہولس کے دل میں اترتی گئی۔ "یہ انتقام
معاشرے کے خلاف ہو سکتا ہے کیونکہ معاشرے نے اُس شخص کو
رد کر دیا تھا۔ کیا یہ حالات بدل گئے ہیں؟ کیا گزشتہ دو ہفتوں
میں اُسے نئے دوست مل گئے ہیں؟ کیا اُس کے حالات خوشگوار
ہو گئے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ اداس ہے۔
معاشرے نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ قتل کا ارتکاب کرے۔ اب
وہ ندامت محسوس کر رہا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ وہ دوبارہ ایک
معقول انسان نہیں بن سکتا۔ اُس نے ایک انسانی جان ضائع کر
دی ہے۔ اُس کے ہاتھ خون آلود ہیں۔ یہ تمام چیزیں بھی معاشرے
کی غلطی سے رونما ہوئی ہیں۔ کیا تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اب اُس
آدمی کے دل میں انسانوں کے خلاف پہلے سے زیادہ غصہ بھرا
ہوا ہے۔ اُس کی مجبوری اب پہلے سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ
اس مجبوری پر قابو نہیں پا سکتا۔ میں اپنے آپ کو اس المیے کا ایک
تماشائی سمجھتا ہوں۔ ایک قتل تو میں نے دیکھ لیا ہے اور مجھے معلوم
ہے کہ ابھی کئی قتل اور ہوں گے۔ یہ بات ایسی ناگزیر ہے جیسے
کل صبح سورج نکلنا۔"
ہولس نے بے اختیار کہا۔ "جولس! تم نے اپنے دلائل
بہت منطقی انداز میں پیش کیے ہیں۔ میں قائل ہو گیا ہوں مجھے
قائل ہونا پڑا ہے۔"
جولس نے سر ہلا کر اُس کی تعریف قبول کی۔ "ایسے موقعوں
پر میں سوچتا ہوں کاش میں کسی اور پیشے میں ہوتا تا کہ مجھے انسانی



نفسیات کے بارے میں اتنی معلومات نہ ہوتیں۔" وہ اپنے کمرے
کی طرف بڑھا۔ "اچھا ہولس! شب بخیر۔"

ہولس اپنے بستر پر اکڑا ہوا لیٹا تھا۔ اُسے نیند نہیں آ رہی
تھی۔ اُس کے خیالات پراگندہ اور جذبات غلط ملط تھے۔ وہ سوچ
رہا تھا کہ جولس کی سوچ تو منطقی ہے لیکن اُس نے آغاز غلط جگہ
سے کیا ہے۔ روبنا کو کسی پاگل نے قتل نہیں کیا تھا، میں نے کیا
تھا۔ البتہ میری احتیاطی تدابیر کی وجہ سے یہ قتل کسی پاگل کا کام
سمجھ لیا گیا۔ جولس اِس نکتے سے بے خبر ہے، ہمیشہ بے خبر رہے۔ اِس
لیے کوئی بھی جولس کو غلط خطوط پر سوچنے سے نہیں روک سکتا اور
اِسی طرح میں بھی شہر کی عورتوں کو خوف زدہ ہونے سے روک نہیں
سکتا۔ تمام کی تمام عورتیں خوف زدہ ہیں مگر وہ بھورے بالوں والی
لڑکی؟ اُس نے وہی مختصر راستہ اختیار کیا تھا جس پر چل کے
روبنا موت کے منہ میں پہنچ گئی تھی۔ وہ لڑکی دیوانی معلوم ہوتی
ہے۔ جولس کے اندازے کے مطابق اگر پہلا قاتل دماغی طور پر
غیر متوازن ہوتا اور اپنا پہلا قتل کسی مجبوری کے زیر اثر کرتا تو یقیناً
وہ دوسرا قتل بھی کرتا۔ اُس کی پُر تشدد انتقامی کارروائی قابل
فہم ہوتی، اگر اُس کا بچپن خراب گزرا ہوتا، اگر اُس نے تنہائی کے
دُکھ اٹھائے ہوتے، اگر نوجوانی میں اُسے پے در پے ناکامیوں
سے سابقہ پڑا ہوتا پھر پوری طرح جوان ہو کر بھی اُس کی خواہشات
نا آسودہ رہتیں اور اُسے اُس کے ساتھیوں نے برابری کی بنیاد
پر قبول نہ کیا ہوتا۔ ایسا آدمی ضرور قاتل ہو سکتا ہے۔
ہولس یادوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ اندھیرا چھایا
ہوا تھا۔ کوئی شخص اُس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے خود

سے اعتراف کیا کہ وہ اپنی ماں کا لاڈلا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کی پرستش کی تھی لیکن کیوں کی تھی؟ یہ اُسے معلوم نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت نحیف و نزار تھا۔ اُس سے وہ کام نہیں ہو پاتے تھے جو اُس کا باپ چاہتا تھا یا اِس کی صرف وجہ یہ ہو گی کہ اُسے اپنی ماں زیادہ پسند تھی۔ وہ اپنے لمبے بھورے بالوں کے باعث اسے بہت خوب صورت لگتی تھی مگر اُس کے بھورے بالوں کا رُونیا کے بھورے بالوں سے کوئی تعلق نہیں۔ رُونیا اُس کی ماں سے مشابہ نہیں تھی۔ رُونیا تو اُس کے باپ کی طرح ایک مضبوط بدن کی لڑکی تھی۔ بھورے بال تو محض اتفاقی تھے پھر اُسے خیال آیا کہ جب اُس کا باپ مر گیا تھا تو وہ اپنی ماں کو دلاسے دیتا تھا پھر بھی اُس کی ماں اُسے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ کاش وہ اپنی ماں کے سامنے جوانی کی عمر کو پہنچتا لیکن وہ تو کچھ اور چاہتی تھی کیونکہ وہ جوان تھی، حسین تھی اور اپنا حُسن ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پہلے اُسے صرف ایک مرد کی ضرورت تھی پھر اُس کی ضرورت بڑھ کر کئی مردوں تک پھیل گئی۔ طرح طرح کے اسکینڈل بننے لگے۔ آخر ہولس اپنی ایک پھوپھی کے پاس جا کر رہنے لگا۔ اسکول اور کالج میں اُس نے جو لڑکیاں پسند کیں، وہ سب بھورے بالوں والی تھیں۔ اُن سب کے نام تو اُسے یاد نہیں تھے۔ بہرحال ایک لمبی فہرست تھی۔ وہ کسی طرح بھی ایک منچلا نوجوان نہیں تھا۔ اُس نے تقریباً ایک درجن بھورے بالوں والی لڑکیوں کو شادی کی پیش کش کی تھی۔ سوچتے سوچتے اُس کے جسم میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ انگلیوں کے پوروں تک ایک سنسنی پھیل گئی۔ اُس کی یادداشت بالکل صاف تھی۔ اُس نے جب بھی شادی کی پیش کش کی، اُسے ٹھکرا دیا گیا۔ وہ اندھیرے میں لیٹا کانپتا رہا۔ کم بخت جولس نے اندھیرے میں تیر چلا دیا تھا۔ اُس نے حسین قاتل کا نقشہ کھینچا تھا، ہولس کا معاملہ اُس سے قطعی مختلف تھا۔ رُونیا کا گلا گھونٹتے وقت اُس نے صرف رُونیا کو مارا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کو یا اُن لڑکیوں کو نہیں مارا تھا جنھوں نے اُسے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ نہ تنہا تھا، نہ ناخوش کیا وہ وہی کام نہیں کر رہا تھا جو اُسے سب سے زیادہ پسند تھا۔ بیشتر لوگ اپنے پیشے سے اتنے مطمئن نہیں ہوتے جتنا وہ تھا۔ وہ اپنی محبت دوسروں تک پہنچانا چاہتا تھا اسی لیے اُس نے ایک اُستاد کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ پیشہ اُس نے دانستہ منتخب کیا تھا اور یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ اُستاد کی تنخواہ قلیل ہوتی ہے اور ایک بیوی کے اخراجات اس تنخواہ میں برداشت کرنا مشکل ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ بھورے بالوں والی لڑکیوں نے اُس سے شادی نہیں کی۔

تنہائی؟ تنہائی سے چھٹکارا پانا ایک کنوارے کے لیے ناگزیر ہے۔ اُس کے بہت سے ساتھی پروفیسروں نے غربت کا خطرہ مول لیتے ہوئے دس پندرہ سال پہلے شادیاں کر لی تھیں۔ شادی شدہ اور کنوارے مردوں میں کوئی بات مشترک نہیں رہتی اس لیے اُن کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی۔ دیوار بلند ہوتی گئی۔ ہولس کی دلچسپیوں کا مرکز اُس کے طالبِ علم تھے۔ اُس نے اُن کے جوان اور تازہ دماغوں کو بنانے سنوارنے کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ سالہا سال سے اُن کے تر و تازہ چہرے قطار در قطار دیکھتا اور خاموشی سے کہتا: ”میں آپ لوگوں سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی اِسی کام میں صَرف کر دی ہے۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ طالبِ علم اور اُستاد ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے اُن میں دوستی کا رشتہ ہوتا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھیے، اپنا دوست کہیے۔ مجھ سے بات کیجیے۔ مجھ پر ثابت کیجیے کہ آپ لوگ مجھے زندہ سمجھتے ہیں، میں بھی گوشت پوست کا ایک آدمی ہوں، میں بھی جذبات رکھتا ہوں۔ مجھے تسلیم کیجیے۔ میں ہولس ہوں ایک آدمی ہوں۔ مجھے پہچان لیجیے۔ بس میری یہی خواہش ہے۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ مجھ سے بات کیجیے۔“

لیکن رُونیا نے اُس سے بات نہیں کی تھی، اُسے ٹھکرا دیا تھا اِسی لیے اُس نے اُسے ہلاک کر دیا۔ وہ اِسی سلوک کی مستحق تھی۔ ہولس اب سمجھا کہ اُس نے رُونیا کو کیوں قتل کیا تھا۔ اگر اُسے موقع ملا تو وہ یہ قدم دوبارہ اُٹھائے گا۔ رُونیا دوسری لڑکیوں سے مختلف نہیں تھی پھر اُس نے رُونیا ہی کو کیوں منتخب کیا تھا؟ کیا محض اس لیے کہ وہ بھورے بالوں والی لڑکی تھی؟ یہ تو کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اگرچہ اُسے رُونیا سے محبت نہیں تھی پھر بھی اُس نے جھنڈ میں اُس سے محبت کا اقرار کیا تھا۔ کیا اُس اقرار میں کوئی سچائی تھی؟ وہ اُس سے محبت کرتا تھا لیکن ویسی محبت نہیں جیسی وہ سمجھتی تھی۔ اُس کی محبت محض رومانی نہیں تھی کیونکہ وہ رومان کی عمر سے گزر چکا تھا۔ اُسے جسمی آسودگی کی خواہش بھی نہیں تھی۔ جسمی خواہش کا تو وہ جوانی میں بھی غلام نہیں تھا۔ رُونیا سے اُس کی محبت ایک پدرانہ شفقت سمجھنی چاہیے یہ ایک پیشہ ورانہ محبت تھی۔ ایسی محبت وہ اپنے تمام طلبہ کے لیے محسوس کرتا تھا لیکن اُن سب نے اُسے نظرانداز کیا۔ ہمیشہ نظرانداز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف رُونیا سے نفرت نہیں کرتا تھا بلکہ اُسے سبھی سے نفرت تھی، تمام کے تمام طلبہ سے۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا لیٹا تھا۔ اُس کی مٹھیاں بند ہو رہی تھیں اور کھل رہی تھیں۔ وہ ایک نئے اور عجیب جذبے سے دوچار تھا۔ جذبہ اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اُس وقت بھی محسوس

میں کیا تھا جب اس نے رونیا کی گردن دبوچی تھی۔ یہ کوئی جذبہ تھا یا مجبوری تھی؟

جھنڈ کی طرف جانے والی بہادر لڑکی کی ایک خاص چال تھی۔ ہولس نے اس پر نظر رکھی لیکن اس کے زیادہ قریب نہیں گیا۔ قریب جاتا تو اسے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ اسے جانتا ہے یا نہیں اور اس نے اسے کہیں دیکھا ہے یا نہیں؟ وہ یہ جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ لڑکی اس کے لیے نامعلوم رہے۔ بے شمار طالبات میں سے ایک۔ وہ اسے دور دور سے دیکھتا رہا۔ لڑکی روزانہ رات کو آٹھ بجے لائبریری سے نکلتی تھی۔ لائبریری میں شاید وہ کوئی تحقیقی کام کر رہی ہوگی، ممکن ہے کوئی مقالہ لکھ رہی ہو۔ وہ ہمیشہ تنہا جاتی اور وہی مختصر راستہ اختیار کرتی، جھنڈ کا خطرناک راستہ۔ ہولس تین راتوں تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔ ہر رات وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس سے قریب ہوتا جاتا۔ تیسری رات وہ اس کے پیچھے پیچھے جھنڈ تک گیا۔

جھنڈ سے لوٹ کے اس نے جیولس سے ملاقات کی۔ اسے خاصا انتظار کرنا پڑا۔ جیولس ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ ہولس نے چائے پیتے وقت اس سے کہا۔ "جیولس! ممکن ہے رونیا کا قاتل خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

جیولس نے ابرو ٹیڑھے کیے اور عینک سے اسے دیکھا "لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا؟"

"فرض کرو اگر وہی مجبوری جس کا تم نے ذکر کیا تھا اسے دوبارہ محسوس ہوئی یعنی قتل کرنے کی خواہش پھر ابھری اور فرض کرو، اس کی شخصیت کا ایک دوسرا حصہ بہتر حصہ جو قتل کرنا نہیں چاہتا، اس کی قاتلانہ خواہش سے نبرد آزما ہو گیا تو اس کے دل و دماغ میں ایک کشمکش شروع ہو جائے گی۔ بہتر حصہ خراب حصے کو قتل سے روکنے کے لیے قاتل کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔"

جیولس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بھلا وہ اپنے آپ کو اس معاشرے کے حوالے کیوں کرے گا جس سے اسے شدید نفرت ہے۔"

"اس لیے تاکہ دوسری زندگی کا چراغ نہ بجھے۔"

"لیکن وہ دوسری زندگی کو کیوں بچانا چاہے گا؟ دوسری زندگی اسے اتنی عزیز کیوں ہوگی؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔"

جیولس فتح مندی کے احساس سے مسکرایا۔ "واقعی تمہیں نہیں معلوم اس لیے کہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دوسری زندگی کو بچانے کی خواہش، یا ترحم کا جذبہ اس جنونی قاتل کے لیے قطعاً اجنبی ہے۔ اپنا پہلا قتل بھی اس نے نفرت کی وجہ سے کیا تھا۔ کیا وہ نفرت ختم ہو چکی ہے؟ اب کیا وہ اپنے دل میں ترحم محسوس کر کے کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے؟ یہ بات بعید از قیاس ہے میرے دوست! تم ذرا اس کی موجودہ حالت کا تجزیہ کرو۔ رونیا کی موت سے اسے قدرے تسکین ضرور ہوئی ہے لیکن اس کا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا، اسے مکمل تسکین حاصل نہیں ہوئی۔ دوسری طرف وہ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا ہے اس لیے پولیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچی ہے۔ میں نے پولیس چیف کیگل سے بات چیت کی تھی۔ وہ مایوس ہو گیا ہے۔ رونیا کے قاتل کو معلوم ہے کہ وہ انتقام لے سکتا ہے اور بچ بھی سکتا ہے۔ بھلا اس موقع پر وہ کیوں رک جائے جب کہ وہ جیت رہا ہے۔ وہ اپنا کام ختم کیوں نہ کرے؟ ابھی اس نے اپنا کام پوری طرح کہاں ختم کیا ہے۔ اس لیے ابھی وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔"

ہولس نے اعتراف کیا۔ "تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو جیولس!"

جیولس چائے کا آخری گھونٹ پی کے کھڑا ہو گیا۔ "ہولس پیارے! تم اپنی دنیا میں رہو، افسانے اور شاعری کی فرضی دنیا میں۔ حقیقی زندگی کے مسائل ماہرین کے لیے چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے۔" ہولس نے اتفاق کیا۔ "اب میں اس موضوع پر بحث نہیں کروں گا۔"

جمعے کی رات ایک ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات تھی۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ شہر میں کسی قاتل کا خوف ہو یا نہ ہو ایسی شدید سردی میں کون گھر سے باہر نکلتا ہے۔ نہایت ٹھنڈی ہوا درختوں کے درمیان سے سیٹیاں بجاتی اور ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخیں جھکاتی اور توڑتی گزر رہی تھی۔ ہولس لائبریری کے باہر گھپ اندھیرے میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اسے سرد ہوا کی کوئی فکر نہیں تھی اس نے اپنے کوٹ کے کالر بھی نہیں اٹھائے تھے۔ اس کے ہیٹ کا چھجا جھکا ہوا تھا تاکہ چہرہ نظر نہ آئے۔ اس احتیاط کے علاوہ ویرانی بھی بہت تھی۔ شاید ہی کسی نے اسے دیکھا ہو۔ آج اس کے پاس اس کا ساتھی، اس کا نشان بریف کیس بھی نہیں تھا۔ بریف کیس اس کے راستے میں خواہ مخواہ رکاوٹ پیدا کرتا اور خون آلود ہو جاتا۔ خون کے چھینٹوں کا مسئلہ حل کرنے کے لیے آج اس نے ایک نیا منصوبہ سوچا تھا۔ البتہ چاقو آج بھی پرانا تھا۔ گزشتہ دفعہ وہ خون کے دھبوں سمیت سیدھا سنر گنج کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ آج اس نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ آج اس کے پاس ایک ناقابل

[illegible] تھا۔ اُس سے وہ اپنے ہاتھ اور چاقو پونچھ کر اُسے
[illegible] میں پھینک دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کپڑے سے
کسی طرح اُس کا سراغ نہیں مل سکتا تھا۔

ہولس بالوں والی لڑکی مقررہ وقت پر بہت سی کتابیں
اُٹھائے ہوئے لائبریری سے نکلی اور ہولس کے سامنے سے گزری۔
ہولس سے لڑکی بیس فٹ دور ہوگی۔ ہوا سے بچنے کے لیے
اُس نے سر جھکا رکھا تھا۔ کھمبے کی مدھم روشنی میں اُس کے چھوٹے
اور پھیلے ہوئے نقوش نظر آنے لگے۔ ہولس کو اُس کا چہرہ صرف ایک لمحے
نظر آیا لیکن اُس نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اُسے نہیں جانتا۔ اِس
بات سے اُسے اطمینان ہوئی۔ ایک اجنبی کو قتل کرنے کا خیال بہت
پُرلطف تھا۔ اُس نے ایک جھلک سے بعض دوسری کئی باتوں کا
بھی اندازہ لگا لیا۔ لڑکی کی ٹانگیں پُرکشش نہیں تھیں، نہ اُس کی
چال میں کوئی خوبصورتی تھی۔ اِس بات سے ہولس کو ذرا اطمینان ہوا۔
وہ صرف خوبصورت لڑکیوں سے نفرت نہیں کرتا تھا بلکہ اُسے
بدصورت لڑکیاں بھی بُری لگتی تھیں۔ شاید یہ لڑکی اپنی بدصورتی
ہی کے سبب رات کو تنہا گھومنے کی جرأت کر لیتی ہے۔ گویا
اُس نے بدصورتی کو ڈھال سمجھ لیا ہے۔ ہولس نے اُسے آگے جانے دیا۔
وہ کھمبوں کی عمارات سے آگے نکل گئی اور لمبے لمبے ڈگ بھرنے
لگی۔ جب وہ جھنڈ کے پاس پہنچی تو ہولس اُس کے بالکل قریب پہنچ
چکا تھا لیکن لڑکی کو پتہ نہیں چلا کہ کوئی اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ پتہ
نہ چلنے کا سبب ہوا کا شور تھا۔ ستاروں، کیمپس کے قمقموں اور سڑک
کی بتیوں سے کچھ کچھ روشنی جھنڈ تک پہنچ رہی تھی، بے حد مدھم۔ لڑکی
کا سر کدو کی طرح نکلا ہوا تھا۔ ہولس کو کوئی جلدی نہیں تھی اُس نے
انتظار کیا۔ جب لڑکی اور ہولس جھنڈ میں بالکل گھر گئے تو ہولس نے
درمیانی فاصلہ کم کر دیا اور ایک دم لڑکی کے سر پر پہنچ گیا۔ اُس نے
فاصلہ ناپ کر لڑکی پر چھلانگ لگائی اور اُس کے اوپر جا گرا۔ اب
اُس کے ہاتھ اُس کی گردن میں تھے۔ اگرچہ اُس کی گرفت اتنی مضبوط
نہیں تھی جتنی وہ چاہتا تھا پھر بھی یہ گرفت لڑکی کی چیخ حلق میں
روک سکتی تھی۔ اُس نے اپنا پورا زور لگایا اور لڑکی کو ساتھ
لیتا ہوا زمین پر گرا۔ اب لڑکی نیچے تھی، ہولس اُوپر لیکن لڑکی نے
بہت بہادری سے اُس کا مقابلہ کیا۔ وہ خاصی طاقتور نکلی۔ ہولس
کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ جب کسی کو گلا گھونٹ کر مارنا مقصود
ہو تو پیچھے سے حملہ نہیں کرنا چاہیے نیز نرخرے پر انگلیاں نہیں
بلکہ انگوٹھا رکھنا چاہیے۔ ہولس نے ایک لمحے کے لیے گرفت ڈھیلی
کی تاکہ دوسری جگہ سے گرفت مضبوط کرے لیکن یہ اُس کی دوسری
غلطی تھی۔ لڑکی نے کوشش کی کہ اپنا پرس کھول لے۔ اُس کے پاس
ایک چیز تھی، سیٹی۔ ہولس نے گھبرا کر دوسری گرفت مضبوط کرنے کی
کوشش کی، وہ لڑکی کا نرخرا دبانے لگا لیکن ایک لمحے کی تاخیر ہو
گئی۔ اُس کے شکار کے منہ سے ایک لفظ نکلا، صرف ایک لفظ۔ یہ
کوئی اُونچا اور خطرناک لفظ نہیں تھا لیکن اِس ایک لفظ سے ہولس
پر سارا معاملہ منکشف ہو گیا۔ "بچاؤ۔" یہ کسی عورت کی آواز نہیں
تھی بلکہ پروفیسر جیولس کی آواز تھی۔ جیولس نے بالوں کی ٹوپی پہن
کر اور سردی سے فائدہ اُٹھا کر اپنے آپ کو ایک لڑکی کے روپ
میں ڈھال لیا تھا۔ اُسے اپنے تجزیے پر اتنا یقین تھا کہ اُس نے
خود کو چارے کے طور پر قاتل کے سامنے ڈال دیا۔ ہولس نے جھک
کر نفرت سے اُسے دیکھا۔ جیولس: "یہ قدم اُٹھانے پر مجھے تم نے
مجبور کیا۔ مجھے اپنی باتوں سے بہلا کر تم نے قتل پر آمادہ کیا۔ تم ایک
ایک بدنصیب آدمی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ آج تم موت کی نیند
سو جاؤ گے۔ تم اسی سلوک کے مستحق ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ تم ہو۔"

معاً ایک دھماکا ہوا۔ دھماکے کی آواز بند بند سی تھی۔ شاید
اِس کا سبب یہ تھا کہ اُن دونوں کے جسم بے حد قریب تھے۔ ہولس
نے اپنے بازو میں درد کی ایک تیز لہر محسوس کی۔ جیولس کے پاس
پستول تھا لیکن پستول سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ ہولس کا
ہاتھ اُس کے نرخرے پر دبتا گیا۔ پستول سے دوسری گولی نہیں
چل سکی۔ آخر ہولس نے جیولس کو چھوڑ دیا، اب اُسے مزید گرفت
میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اچانک سڑک سے لوگوں کی
آوازیں آنے لگیں۔ گولی کی آواز سن لی گئی تھی۔ لوگ اِسی طرف
آ رہے تھے۔ "آؤ، آؤ، اب کیا ہو سکتا ہے۔" وہ پستول کے
زخم کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکے گا۔

ہولس نفسیات کے پروفیسر کی لاش سے لڑھک کر دوسری
طرف ہو گیا۔ اُس نے اپنی جیب سے چاقو نکالا۔ چاقو اگرچہ
تیز نہیں تھا لیکن ہولس نے اپنی کلائی کے پاس سے خون
کی رگ کاٹ ہی لی پھر وہ رینگتا ہوا ایک راستے پر موکے
جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔ اب آنے والے اُسے بروقت تلاش
نہیں کر سکیں گے، وہ زندہ نہیں پکڑا جا سکے گا۔ وہ وہیں لیٹا
رہا اور اپنے جسم سے زندگی نکلتی ہوئی محسوس کرتا رہا۔ میری
زندگی؟ جیولس غلطی پر تھا۔ کیا وہ میری زندگی کے متعلق کچھ
جانتا تھا؟ میری زندگی تو بہت . . . بہت خوش حال
گزری ہے۔



وہ تھرڈ ریٹ جو کرشن جی نے لکھے ہیں
ایک گھٹیا کہانی جسے بڑوں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تھا
کرشن چندر کا تازیانہ

وہ کہنے لگا۔ "نوکر تو نہیں البتہ ایک نوکرانی کا ضرور بندوبست کر سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آیندہ سٹہ میری معرفت کھیلا کریں۔"

میں نے کہا۔ "تم تو مذاق کرتے ہو۔"

وہ بولا۔ "جی نہیں۔ مذاق اور آپ سے! سچ کہتا ہوں مجھے کمیشن ملتا ہے۔ سٹے باز جو رقم داؤ پر لگاتے ہیں اُس پر مجھے پانچ فی صد کمیشن ملتا ہے۔ اس دفتر کے سب ملازم میری ہی معرفت سٹہ کھیلتے ہیں ورنہ آپ ہی بتائیے کہ جو تنخواہ مجھے یہاں ملتی ہے اُس میں کسی بھلے مانس کا گزارا کیسے ہو سکتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ اُس کی عمر کتنی ہے؟...... کیا...... کے....؟"

بیس برس کے تجرد نے مجھے بوکھلا دیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ "جی نہیں کوئی چودہ پندرہ برس کی ہوگی۔ رنگ نہ گندمی، نہ سانولا۔ بس بیچ کا رنگ جیسے فاختہ کے سینے کا ہوتا ہے۔ بس آپ اُسے ایک فاختہ ہی سمجھیے۔"

"میں نے کہا۔" میں شکاری نہیں ہوں۔ مجھے تو نوکر چاہیے۔"

وہ بولا۔ "کھانا پکانا، سینا پرونا سب جانتی ہے۔ پھر آپ اکیلے ہیں، وہ آپ کے گھر کا سب کام سنبھال لے گی۔"

"مگر جبھی نوکرانی، لوگ کیا کہیں گے۔"

وہ ہنسا۔ "آپ کی آزاد خیالی تو دفتر بھر میں مشہور ہے۔ اور آپ تو لوگوں کو اخلاق کا سبق دیتے ہیں اور اشتراکی بنا ناپسند کرتے ہیں دیکھیے نا اگر اب آپ بھی؟...... اور پھر وہ بے چاری یتیم ہے۔"

"یتیم ہے؟" میں نے ترس کھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، اُس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ وہ اب تک اپنے چچا کے پاس تھی۔ جب وہ تیرہ برس کی ہوئی تو چچا نے اُس پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔"

"تمھارا مطلب ہے۔ اُس کے دامنِ عصمت؟"

"جی ہاں اس کا دامنِ عصمت پارہ پارہ کرنا چاہا۔ اُس کی زندگی کی متاعِ عزیز لوٹ لینی چاہی۔ اُس کی دوشیزگی کی معصومیت اپنی رندی و ہوس ناکی کی شکار بنانی چاہی۔ اُس کی باکرہ روح کی مقدس عفت اپنی بہیمیت و شیطنت......"

میں نے کہا۔ "یہ بکواس ختم کرو۔ میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔"

وہ بولا۔ "جی۔ دیکھیے نا۔ لوگ سچائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ زنا بالجبر کہہ دینا گناہِ عظیم ہے۔ دفتر کے بڑے بابو بھی کہتے ہیں اور پھر میں مترجم ٹھیرا۔ جو وہ کہتے ہیں، اُسی طرح کرتا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے یہ فعلِ شنیع اپنی زبان میں ادا کرنے کے لیے ایک سو فقرے یاد کر رکھے ہیں۔ دفتر کے بڑے بابو کہتے ہیں کہ سچائی عریاں صورت میں کبھی پیش نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہمیشہ لباس پہنا کر۔"

میں نے کہا۔ "مگر ذکر تو نوکرانی کا ہو رہا تھا۔"

وہ بولا۔ "جی نہیں۔ ذکر اُس کے چچا کا ہو رہا تھا۔ جس نے اُس پر ہاتھ صاف، یعنی میرا مطلب ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ آگے چلو۔"

"تو وہ اپنے چچا کے گھر سے بھاگ نکلی اور اپنی موسی کے گھر آگئی یہاں موسی نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی، اُسے اچھے کپڑے پہنائے دو چار اپنے زیور نکال کر اُسے دے دیے۔ اُس کی آنکھوں میں کاجل لگایا اُسے اپنے سینے سے لگایا۔ کیوں جی جب عورت عورت کو سینے سے لگاتی ہے تو اس سے عریانی تو پیدا نہیں ہوتی؟"

میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بڑے بابو نے کسی غلط ترجمے پر تمھیں ڈانٹ پلائی ہے۔ بہرحال۔ خیر، آگے بڑھو۔"

"تو صاحب" وہ بولا۔ "لڑکی بالکل نوجوان تھی اور اُس کی موسی کا خاوند ذرا آں...... میرا مطلب ہے کہ ذرا 'وہ' تھا چنانچہ وہ بھی لڑکی پر عاشق ہو گیا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ موسی کا خاوند اور موسی کا بیٹا دونوں اُس پر عاشق ہو گئے۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت......"

"پھر کیا ہوا؟"

"ہوتا کیا۔ موسی نے دو طمانچے لگا کر لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔ اب وہ اپنے پھوپھا کے گھر پہنچی۔ پھوپھا ذرا شریف قسم کا بدمعاش تھا۔ یعنی اُسے بڑے دم دلاسے دے کر اپنے گھر رکھا۔ اکیلا تھا وہ آپ کی طرح چنانچہ جہاں اور لوگ کامیاب نہ ہوئے وہ کامیاب ہو گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد اُس نے لڑکی کو پیشہ کرنے پر مجبور کر دیا۔"

"پیشہ کرنے پر؟"

"جی ہاں۔ آپ کو اس کا مطلب سمجھاؤں؟ یعنی اُس لڑکی کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ چند روپہلی ٹکیوں کے عوض اپنی عصمت و عفت اپنی



انداز کا بے حیا پن، دوشیزگی یعنی اپنی متاعِ عزیز، خزینۂ حیات.....“

”خدا کے لیے“ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”مجھے تمہارے تجربے سے کوئی سروکار نہیں۔“

وہ مسکرایا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ آپ عریاں پسند ہوتے جا رہے ہیں“

”مجھے آپ کی عریاں پسندی سے کیا سروکار۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اُس شریف بدمعاش پھوپھا نے اُس بدقسمت لڑکی کو بازار کی فاحشہ بن جانے پر مجبور کر دیا۔ چند ہفتے اسی طرح گزرے پھر وہ بیمار ہو گئی۔ سوزاک۔“

”سوزاک؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔

وہ چڑ کر بولا۔ ”آپ بدکتے کیوں ہیں، کس شہر میں، کس گلی میں، ہندوستان کے کس گاؤں میں آپ نے اِس کا نام نہیں سُنا؟ زندگی کے کس موڑ پر آپ نے اِس منحوس بیماری کا نام نہیں سُنا؟ کیا کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے باز حملہ نہیں کرتا؟ کیا وہ اشتہار آپ نے نہیں دیکھے، پیپ جلن دو دن میں بند، وہ کون سا مکان ہے، کون سا شہر ہے، کون سا گاؤں ہے؟ مندر سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک وہ کون سی دیوار ہے جہاں اِس خوف ناک بیماری کی پیپ اور جلن دو دن میں بند کر دینے کا ذکر نہ ہو، وہ کون سا شریف گھر ہے؟“

میں نے کہا۔ ”اب تم گالی دینے پر اُتر آئے ہو۔“

”چلیے نہ سہی۔ سوزاک نہ سہی۔ یہ سمجھ لیجیے اُسے ایک خوف ناک شرم ناک بیماری لاحق ہو گئی۔ گو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کس کے لیے شرم ناک کہا جائے۔ اُس لڑکی کے لیے یا اُس شریف سماج کے لیے، جو اُس سے دن رات پیشہ کراتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے یہ وعظ سننا پڑے گا.....“

وہ بولا۔ ”معاف کیجیے گا۔ واقعی میں بہت باتونی ہوں جھکی ہوں۔ مختصر بیان کرتا ہوں۔ تو صاحب! اب وہ لڑکی وہاں سے بھاگ نکلی۔ پھوپھا اُس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی چیخنے لگی۔ اتفاق سے میں سڑک سے گزر رہا تھا۔ اِدھر دفتر سے آ رہا تھا۔ بغل میں فائل دابے.....“

”ہیرو ہو گئے تم؟“ میں نے طنزاً کہا۔

”جی نہیں“ اُس نے کہا۔ ”بھلا دفتر کا مترجم کبھی ہیرو ہو سکتا ہے۔ بھلا چالیس روپے تنخواہ پانے والا کبھی ہیرو ہو سکتا ہے؟ ہاں تو صاحب! میں اُسے اُس کے پھوپھا سے چھڑا کر اپنے گھر لایا۔ یہاں میں اپنے بڑے بھائی اور بھابی اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں رہتا ہوں۔ وہ لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بھابی نے میری شرافت کو سراہا اور اُس لڑکی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا لیکن صاحب! اُس لڑکی کی قسمت ہی بُری ہے۔ میں اگر اُس لڑکی سے دو باتیں بھی کر لوں تو بھابی خفا ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ لڑکی کبھی میرا بستر بھی ٹھیک کر دے تو آگ بگولا ہو جاتی ہیں۔ اب گھر میں ہر وقت چخ چخ سی رہتی ہے۔ سکون تباہ ہو گیا ہے۔ لڑکی

کے علاج پر میں نے چند روپے کیا صرف کر دیے، اب تک گالیاں پڑ رہی ہیں۔ بھابی نے آج لڑکی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں اس کا جی چاہے چلی جائے۔ میں اسے گھر پر نہیں رکھ سکتی۔"

"تو اس لیے تم اُسے میرے ہاں بھیجنا چاہتے ہو؟ ایک بدمعاش عورت کو میرے ہاں ملازم کرانا چاہتے ہو؟" میں نے غصّے سے کہا۔

اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ "مجھے آپ کے معصوم چہرے اور گنجے سر نے دھوکا دیا۔ میں سمجھتا تھا، آپ کو غریبوں سے ہمدردی ہے مگر آپ محض باتیں ہی باتیں بناتے ہیں یا ان پر عمل بھی کرتے ہیں؟"

"مگر وہ لڑکی؟" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "بیمار ہے۔ اُسے سوزاک ہے۔ میں اُسے کیسے؟ میں خود بیمار ہو جاؤں گا۔ تم سمجھتے نہیں، یہ چھوت کی بیماری ہے اور..... ذرا سوچو تو۔"

"سنیے۔ اب وہ اچھی ہے۔ میں نے اسّی روپے صرف کیے ہیں اُس کے علاج معالجے پر۔ دیکھیے۔ آج بھابھی اُسے گھر سے نکال دیں گی۔ میں اُسے پھر قحبہ خانے کے جہنّم میں واپس نہیں بھیجنا چاہتا۔ اُس کا اس دُنیا میں کوئی نہیں ہے اور میری تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اُسے ایک الگ مکان لے کر دوں۔"

"ایک الگ مکان؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

وہ بولا۔ "ہاں۔ میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

چاند میرے گھر نوکرانی بن کر آ گئی۔ میں نے کہا۔ "چاند۔"

وہ بولی۔ "جی۔"

"دیکھو۔ میری عمر پینتیس سال سے کچھ زیادہ ہے۔ میرا سر گنجا ہو چکا ہے، میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ میں عورتوں سے دُور بھاگتا ہوں۔ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ لوگ مجھے ازلی شریف سمجھتے ہیں، میری شرافت پہ بٹّا نہ لگانا۔ مجھے زیادہ پریشان نہ کرنا۔ بال سنوار کر آنکھوں میں کاجل لگا کر مجھے دعوتِ نظارہ نہ دینا۔ بس چپکے سے گھر کا کام کاج کرتی جاؤ۔ پندرہ روپے تنخواہ اور روٹی کپڑا۔"

وہ بولی۔ "یہ دعوتِ نظارہ کیا ہوتا ہے جی؟"

میں ہنسا۔ "کچھ نہیں۔ میں ذرا ترجمہ کر رہا تھا۔ اب تم کچن میں جا کر برتن صاف کر دو۔ صبح مجھے دو انڈے نیم برشت اور ایک گلاس دُودھ کا چاہیے۔ دوپہر کو کھانا جس میں ٹماٹر اور کدو اور شلغم کبھی شامل نہ ہوں، سہ پہر کی چائے میں دفتر ہی میں پیوں گا۔ شام کے کھانے میں چاول ضرور ہونے چاہئیں۔ سوتے وقت میرے گنجے سر میں روغن بادام کی مالش تمھیں کرنی ہو گی۔ اس کے بعد تم اپنے کمرے میں سو سکتی ہو۔ ہاں، اندر سے زنجیر ضرور لگا لینا ورنہ میں فرشتے وار نہیں ہوں۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ چھوٹی سی لڑکی تو وہ تھی۔ وہ عورت کہاں تھی، ابھی تک نوجوانی کے سن میں بڑی مشکل سے آئی ہو گی لیکن اُس کا جسم نہیں، اُس کی آنکھیں کہے دیتی تھیں کہ اُس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ جہنّم کے وہ شعلے جن کے متعلق ہمارے ہندستانی شاعر کبھی شاعری نہیں کرتے، سماج کے وہ گھناؤنے مناظر جن کا حُسن ہمارے افسانہ نگار کبھی بے نقاب نہیں کرتے، خرید و فروخت کے وہ ادارے جن کا ذکر ہمارے چیمبر آف کامرس میں کبھی نہیں ہوتا لیکن جو ہمارے پاک دور، ہمارے ہندوستان کی ہر گلی میں، ہر گاؤں میں پائے جاتے ہیں، اس لڑکی نے اپنے جسم اور اپنی رُوح کے ہر سانس میں گھُٹتے ہوئے، اسے اُجاڑتے ہوئے تباہ و برباد کرتے ہوئے، اُسے نوچ نوچ کر چیرتے پھاڑتے ہوئے ایک بھوکے وحشی بھیڑیے کی طرح بھنبھوڑتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک زخمی تھیں۔ اس کا اوپر کا لب اندر بھنچا ہوا تھا کسی اذیت ناک کرب کی وجہ سے اور اس کا نچلا ہونٹ ذرا آگے جھکا ہوا تھا اور کسی مرد کو اپنے قریب آتے دیکھ کر تھرتھرانے لگتا تھا اور سینے کے خم کانپنے لگتے تھے۔

میں نے اُسے ہنسانے کی کوشش کی۔ "میاؤں۔"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ کچن میں دال بگھار رہی تھی پوچھنے لگی۔ "کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں بلّی ہوں، تم چوہا بلکہ چوہیا۔ ہی ہی ہی۔"

وہ خاموش رہی، میں شرمندہ ہو گیا اور اپنا گنجا سر کھجانے لگا۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔

ایک دن کہنے لگی۔ "میں دُھوپ میں تمھارا کھانا لے کر آتی ہوں۔ میرے پاؤں جلتے ہیں۔"

میں نے اُس کے گندے، گرد و غبار میں اَٹے ہوئے پاؤں پر نظر ڈال کر کہا۔ "ارے رے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔"

میں نے اُسے بازار سے ایک جوتی خرید کر دی اور سفید دھوتیاں جن کے کنارے رنگین تھے۔ اپنا گنجا سر چھپانے کے لیے میں ایک سمور کی ٹوپی لایا، ایک سینٹ کی شیشی، کریم اور اُس کے لیے ہیئر کلپ۔ جب بھی وہ نہ مسکرائی۔

"بطور ایک ماہ بعد میں نے اُسے پندرہ روپے دیے۔ لو یہ تمھارے ہیں۔ انھیں تم جس طرح چاہو، خرچ کر سکتی ہو۔" اس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر آنکھیں جھکا کر پیسے لے لیے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور بھی زیادہ اداس ہو گئی ہے۔ "چاند۔" میں نے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"جی کچھ نہیں۔"

رات کو وہ میرے گنجے سر پہ روغن بادام کی مالش کر رہی تھی کہنے

[illegible] بھی وہاں سوتا ہوگا؟"
[illegible] نہیں؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟" میں نے
[illegible]

[illegible] "آج صبح آپ نے مجھے پندرہ روپے جو دیے تھے۔" میں
[illegible] "پھوپھا مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستر پر سو جاتے
[illegible] اور پھر مجھ سے سب روپے بھی چھین لیا کرتے تھے۔
[illegible] روپے چھیننا چاہتے ہو تو ابھی واپس لے لو۔"
[illegible] "نہیں یہ شبہ کیسے ہوا ہے؟"
[illegible] "تو آپ یہ روپے مجھ سے واپس نہیں لیں گے؟"
"اور مجھے......" اس نے اشارہ کرکے کہا "یہاں بھی نہ
[illegible]"

"نہیں، ہرگز نہیں، تم کیوں اس طرح......؟" وہ چپ چاپ
[illegible] اس کی آنکھیں حیران تھیں۔

ایک دن وہ کچن میں بیٹھی شیشہ سامنے رکھے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور ایک گیت گا رہی تھی۔ کچھ عجیب سا گیت تھا۔ فحش، بازاری لیکن اس میں بھی عورت نے مرد کے خلاف اور سماج کے خلاف جو مرد کا سماج [illegible] بیان کیا تھا۔ اک عجیب سا گیت تھا جس کے الفاظ اجازت [illegible] کہ انہیں یوں ادب کی زبان میں بیان کیا جائے۔ اس گیت کا [illegible] ہے۔ وہ گیت تھا، ایک بازاری عورت کی گالی بھی تھی جو اس نے [illegible] مردوں کے خلاف بکی تھی اور چاند اسے آہستہ آہستہ نفرت کے احساس سے متاثر ہو کر گا رہی تھی۔ یہ گیت رات کے اندھیرے میں [illegible] تھا، یہ گیت قحبہ خانے کی غلام فضا میں اجاگر ہوا تھا، یہ گیت صدیوں [illegible] ظلم و جبر و استبداد کے خلاف عورت کی سسکی، کچلی، زخمی روح کا احتجاج تھا۔ ایک موٹی، مسلسل سی گالی لیکن احتجاج کی روح تو پاک صاف تھی۔ اس کا غم اور غصہ تو شعلے کی طرح کندن تھا۔ گیت اچھا تھا لیکن ماحول نے اسے ایک غلیظ سانس عطا کی تھی۔ اس مفلس و نادار دوشیزہ کی طرح جو اپنی معصومیت گندے چیتھڑوں میں چھپائے ہوئے ہو۔ "چاند! کیا گا رہی ہو؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔ وہ چپ ہو گئی۔ "چاند!"

وہ بولی: "جی کچھ نہیں۔"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ اوپر کا لب اندر بھنچا ہوا تھا اور نچلا لب ذرا آگے جھک کر کانپ رہا تھا اور دانتوں کی لڑی بیچ میں جھلک رہی تھی۔ مجھے اس وقت وہ اس بے بس ہرنی کی طرح نظر آئی جو چاروں طرف سے ناامید ہو کر ایک کونے میں آکر کھڑی ہو گئی ہو، آخری مدافعت کے لیے۔

میں نے کہا: "تمہیں معلوم ہے، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آج کل وہ تمہارے لیے بہت سٹا کھیلتا ہے۔ شاید اس کی قسمت پھر جائے اور وہ تمہارے لیے ایک گھر لے سکے۔"

وہ کہنے لگی: "پھوپھا کے ہاں ہر مرد یہی کہا کرتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا؟" اس نے آئینہ الٹا کر دیا اور کنگھی بھی زمین پر رکھ دی۔

اس روز قیمے کے پراٹھے اور مرچوں کا اچار اور مکھن دسترخوان پر تھا اور ہم لوگ کھا رہے تھے۔ میں اور چاند اور وہ۔ چاند کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی اور گالوں پر ہلکی سی سرخی آ گئی تھی جیسے پکتے ہوئے آٹے کی جلد ملائم پڑ گئی ہو۔ جسم گدرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کی حزیں چمک بھی اس قدر اداس نہ تھی پھر بھی لبوں پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لڑکی اب کبھی مسکرا نہیں سکتی، جیسے یہ لڑکی اب کبھی عورت نہیں بن سکتی جیسے یہ چاند ہمیشہ کے لیے گہنا گیا ہے جیسے اس روح کو کبھی قرار، سکون، اعتماد اور محبت عطا نہیں ہو سکتی جیسے یہ زندگی کبھی خوشی، مسرت اور بہجت سے معمور نہیں ہو سکتی۔ جیسے یہ حیات اس مرمریں ٹھلیا کی طرح ہے جس میں لوگوں نے جابجا سوراخ کر دیے ہوں۔ ادھر پانی ڈالو، ادھر غائب۔ اس خالی گیت کو جو ایک تلخ گالی تھا، اب کوئی خوشی سے معمور نہیں کر سکتا۔ وہ دسترخوان پر بیٹھی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے اسے اپنے

ساتھ دستر خوان پر شریک کیا تھا کیونکہ وہ بھی موجود تھا لیکن چاند کو اس عزت افزائی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ نہ ہمارے ساتھ بیٹھنے کی خوشی تھی۔ قیمے کے پراٹھے اور مکھن کی ڈلی اُسے مرغوب نہیں کر سکی۔ رنگین کنارے والی دھوتی اور اونچی ایڑی کا سینڈل پہننے کی خوشی بھی نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی اور ہم لوگ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے کام لے کر اُسے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ بالکل ٹھس بیٹھی تھی۔ خاموش، اداس پژمردہ۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ سماج کے عفریت کا گناہ عصمت دری سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اُس کی عصمت چھن جانے کا مجھے اتنا افسوس نہیں تھا۔ ہر عورت کی عصمت ایک دن چھین لی جاتی ہے، اپنے خاوند کے ہاتھوں یا کسی غیر مرد کے ہاتھوں۔ افسوس تو یہ تھا کہ سماج نے اس چودہ برس کی لڑکی کی مسکراہٹ چھین لی تھی، اس کا اعتماد چھین لیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ہنسی چھین لی تھی اور جب کسی انسان سے اُس کی ہنسی چھین لی جائے تو اُس سے بڑھ کر بدقسمت فرد کوئی نہیں ہو سکتا۔

کھانا کھا کر مجھے گہری نیند آئی۔ جب آنکھ کھلی تو چھ بجے تھے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا لیکن دھوپ بالکل ماند پڑ گئی تھی اور سائے گہرے ہو گئے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چل رہا تھا۔ میں آہستہ سے اُٹھا کیونکہ ستے بازوں کا دلال ابھی تک غالیچے پر چیت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ سونے دو کم بخت کو۔ اُسے کیا معلوم، بہار کسے کہتے ہیں۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو شمال سے بادلوں کے پرے کے پرے صف باندھ کر چلے آ رہے تھے۔ میں نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ آہا۔ آج بارش ہو گی۔ جب گنجے سر پر بارش کی پہلی بوندیں پڑتی ہیں تو روح کو وہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے جو قیمے کے پراٹھے کھانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر یقین نہ آئے تو سر منڈا کر دیکھیے۔ اولوں سے بچیے لیکن بارش کی بوندیں اپنے سر پر برس جانے دیجیے۔ تراوٹ حاصل ہوتی ہے، بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور غسل خانے کی طرف جانے لگا۔ غسل خانے کے باہر پتھر کے چبوترے پر چاند بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں طشتری تھی اور طشتری میں آم کی کیری کے قتلے سرخ مرچ اور نمک اور نیبو کے رس میں پڑے ہوئے تھے وہ مجھے دیکھ کر ایک چور کی طرح جھینپی۔ میں نے کہا "مزے دار ہیں؟

"بے حد۔ کھاؤ گے؟"

میں نے سر ہلایا۔ اُس نے ایک قتلہ مجھے دیا۔ وہ میرے بالکل قریب آگئی۔ آہستہ سے کہنے لگی "میں نے پتھر مار کر اُس پیڑ پر سے یہ امبیاں توڑی ہیں۔ بے حد مزے دار ہیں نا؟"

"ہوں۔ ہوں" میں نے کھاتے ہوئے کہا "کیسے چٹپٹے اور مزے دار ہیں۔"

یکایک وہ مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اُس کے سارے چہرے پر، سارے جسم پر، ساری فضا پر پھیلتی گئی۔

اُس کا اوپر کا ہونٹ جو اندر بھنچا ہوا تھا، آہستہ سے نرم پڑتا گیا اور اپنی اصل حالت پر آتا گیا۔ اُس کا غم پرانا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ پرانی نہیں تھی، نئی تھی، نوجوان تھی، خوب صورت تھی، معصوم اور غیر ملوث تھی۔ اُس حیا پرور کلی کی طرح جو کھلنا چاہتی ہو اور پھر شرما کر پرتوں کی اوٹ میں چھپ جانا چاہتی ہو لیکن اب یہ مسکراہٹ کھلتی گئی۔ گیت نے اپنا غلیظ لباس اُتار پھینکا اور اُس کے جسم میں خوشی کا نغمہ پھیرنے لگا۔ ہم دونوں ہنسنے لگے، قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں نے کہا "کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ ایک پتھر اور مارو۔ امبیاں تو بڑی مزے دار ہیں۔" اُس نے پتھر اُٹھایا اور اُس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

"یہ تم نے کیا کیا؟ اُسے اپنے گھر بھیج دیا؟"

میں نے کہا "میں نے اپنی ماں جی کو لکھ دیا ہے کہ چاند میرے ایک عزیز دوست کی منگیتر ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ وہ چاند کی دل جوئی کریں گی۔"

"لیکن وہ وہاں خوش رہ سکے گی؟"

میں نے کہا "میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ وہاں اُس سے کوئی عشق کرنے والا نہیں ہے۔ چاند کو اب عشق کی ضرورت نہیں ہے، اُسے رنگین دھوتیوں اور سینڈلوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خوشی قیمے کے پراٹھوں میں بھی نہیں اور دستر خوان پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے میں بھی نہیں اور اُس سے ازراہِ ترحم شادی کرنے میں بھی نہیں۔ ان چیزوں سے اُس کی مسکراہٹ، اُس کی خوشی لوٹ کر نہیں آسکتی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے اُس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا "میں گنجا ہوں اور تم اندھے فلسفی ہو اور دنیا ناپاک پھوپھاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ ذرا اُسے میری ماں کی مامتا اور شفقت کی چھاؤں میں دم لینے دو، چھوٹے چھوٹے بچوں کے معصوم قہقہوں سے اپنے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ اُسے ہنسنے دو اور اُسے بھول جانے دو۔"

یکایک وہ سمجھ گیا اور دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر میری گنجی چاند پر چپتی لے کر بولا "تم کوسے جذباتی ہو۔ میرا شبہ درست نکلا۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری عقلیت کے پس پردہ جذباتیت ہے۔ کون تھی وہ جس نے تمہیں یہ کرب ناک شنوٹیت عطا کی؟ جس نے تمہاری آنکھوں کا نور چھین لیا؟ جس نے تمہارے گھنے بالوں کے جنگل اُجاڑ دیے؟ جس نے تمہاری مسکراہٹ میں یاس و قنوط کی تلخی جھلکا دی؟ کون تھی وہ؟"

میں نے کہا "زندگی ایک جوا ہے۔ یہ بتاؤ، آج سٹے میں کیا لگے؟ نو سے دو یا پانچ سے سات؟"

نئے اردو افسانوں میں ادب میں ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ وہ شکستہ حویلیوں ویرانیوں، صحنچیوں کے پاسبان ہیں اور ویرانیوں میں پھیلی ہوئی تہ در تہ اداسیوں کے ترجمان۔ چٹختی اینٹیں، منہ کھولے در و بام اور سسکتے شہ نشین۔ اندھے جھروکے اور ٹوٹے پھوٹے مکین۔ اس مٹتی ہوئی تہذیب کی اداسی کو افسانہ بنا دینے کا نام قاضی عبدالستار ہے



اردو کی دوسری منتخب کہانی

اردو کے ایک منفرد ممتاز افسانہ نگار قاضی عبدالستار کے قلم سے

۱۹۵۰ء میں جو سیلاب آیا تھا، اس نے سیتا پور سے لے کر لکھیم پور کھیری تک سارے گانجر کا علاقہ تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا لیکن گھاگھرا نے تو کمال ہی کر دیا۔ صدیوں کا بنا بنایا راستہ چھوڑ کر، سات میل پیدل چل کر آئی اور سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح چھوٹے موٹے دیہات زمین کے برابر کرتی ہوئی رونق پور میں داخل ہو گئی۔ رونق پور پہلے ہی سے خالی ڈھابلی کی طرح ننگا پڑا تھا۔ سارے گاؤں میں بس حویلی کھڑی تھی۔ حویلی کی کھڑکیوں سے اِکا دُکا بدحواس آدمیوں کے چہرے نظر آ جاتے تھے جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے لٹک رہے ہوں۔ حویلی کچی تھی لیکن کوئی سو برس سے گھنگھور برساتوں کے خلاف سینہ تانے کھڑی تھی۔ اس کی دیواروں کی چوڑان پر جہازی پلنگ بچھائے جا سکتے تھے۔ مشہور تھا کہ ایک نو سکھیا چور رونق پور کے خاندانی چوروں کا مہمان ہوا۔ لال ٹپکاتی نظروں سے حویلی دیکھ کر ہتھیلیاں کھجانے لگا اور کنکھیوں سے ہاتھ کی صفائی دکھانے کی اجازت مانگنے لگا۔ گھر والے کو دل لگی سوجھی، اس نے کچھ اتا پتہ بتا کر آدھی رات کو روانہ کر دیا۔ مہمان چور ایک دیوار پر سابر لے کر جٹ گیا۔ کھودتا رہا یہاں تک کہ سویرا ہو گیا مگر دیوار اسی طرح کھڑی تھی، اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی۔ وہ بے چارا ناکام واپس ہوا۔

لیکن بنانے والوں نے حویلی بنائی تھی، جل بھون نہیں بنایا تھا۔ اوپر سے منھ یا گھٹ برس رہا تھا اور نیچے سے بڑھائی ہوئی مست ہتھنی کی طرح گھاگھرا چوٹیں کر رہی تھی۔ پہلے پھاٹک گرا، پھر دیوان خانہ، جب ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کے کئی درجے بیٹھ گئے تو چودھری گلاب رائے کی نمک حلالی کو غیرت آئی۔ علاقے بھر کے نامی نامی کہاروں اور مچھیروں کی چھوٹی سی فوج بنا اور ان کے بازوؤں کے بجرے پر چڑھ کر تھان گاؤں سے نکلے اور رونق پور کی حویلی میں اتر گئے۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کو کانپتی ہوئی آواز سے مخاطب کیا "حضور! اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ حکم دیجیے نوجوان پر کھیل کر پالکی چڑھا لاؤں۔ سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ گھاگھرا کی پاگل موجوں کی دل ہلا دینے والی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ چودھری گلاب رائے نے دھیرے سے کچھ اور کہا تو جواب ملا "تم کیسی چھوٹی باتیں کرنے لگے ہو چودھری گلاب! خدا نہ کرے میری زندگی میں وہ دن آئے کہ میں حویلی کے باہر پاؤں نکالوں اور مرنے والے کے نام پر بٹا لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے یہاں جہاں اب حویلی ہے رونق پور کا قلعہ تھا۔ انھی دنوں گھاگھرا کی موجوں کی طرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں، ان سے آگ برسی تھی اور قلعہ جل کر راکھ ہو گیا تو کیا ہم بھاگ گئے تھے؟ ہم مٹ گئے تھے۔ ہم آج پھر مٹ جائیں گے۔" چودھری گلاب کھڑے لرزتے مالکن کے تیج دان کی گڑگڑاہٹ سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ میر محمد علی بیگ مر چکے تھے۔ میر محمد علی بیگ کی بیوہ پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی تھی۔ میر محمد علی بیگ نے تقدیر ہی چھوڑا ہی کیا تھا اور انھیں چھوڑنے کی بڑی ہی کیا تھی۔ نہ آل نہ اولاد۔ ایک میاں، بیوی اور اتنی بڑی جائداد۔ مالکن نے گنے پاتے بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں، قبرستان ہی گئے ہیں۔ برسوں کی کھوٹ کٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری گلاب الہ آباد

[illegible] نے مان لیا ہے۔ میر محمد علی بیگ قبرستان [illegible] مالکن ساری رات جانماز پر [illegible] کی نماز پڑھتی رہیں، عمر بھی ساری [illegible] رہیں، چلّیں بھرتی رہیں جو سنگ سنگ [illegible] ہی پٹواری نے حویلی کے پھاٹک کے [illegible] میں داری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ پھر تو جیسے [illegible] پھیلی ہوئی زمینیں باغ اور درخت [illegible] بٹ گئے، اُڑ گئے۔ جیسے بندوق کا فائر [illegible] کے غول اُڑ جاتے ہیں مگر مالکن نے ہمت نہ [illegible] دے کر اَن گنت مقدمے لڑاتی رہیں۔ [illegible] میں فوجیں لڑائی تھیں۔ حضرت محل کی [illegible] مالکن بھی ہار گئیں لیکن حضرت محل کی طرح دلّی پر [illegible] نہیں مگر کب تک؟ ایک ایک کر کے آدمی [illegible] نکلنے لگیں۔ آخر چودھری گلاب نے بھی آنا جانا [illegible] کا دوزخ بھرنے کے لیے تیرے میرے مقدمے [illegible] عید بقر عید اور ہولی دیوالی پر آنے سیر دو سیر مٹھائی کا [illegible] کر وضع داری نبھائے جاتے۔

مقدمے جونک کی طرح لگ گئے۔ مالکن کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اندر سے باہر تک سب اُجڑ گیا۔ گائے بیل، ادھے پالکی، خیمے، شامیانے، دری قالین، کرسی میزیں اور دیغ پتیلے سب باورچی خانہ زندہ رکھنے کے لیے جل مرے۔

ایک دن وہ نماز پڑھ کر اُٹھیں۔ مونج کی پٹاری کے پان دان سے کھجور کی گٹھلیوں کے دوہرے اور تمباکو کی پتی کی چٹکی کا پھنکا لگایا اور کھنڈر کے اُس حصے کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا اور بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے کمرے کے کونے میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کے منہ دیکھے جو اُن کے پیٹ کی طرح خالی تھے تو گھٹنوں پر ہتھیلیاں جما کر دھیرے دھیرے جھکتی ہوئی وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔ جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ اُن کی لنگڑاتی ہوئی نگاہیں اُس ویران سنسان لق و دق کھنڈر میں گھومتی رہیں جس کی چھتیں گر چکی تھیں، دھنیاں جھل چکی تھیں اور دروازے کی جوڑیاں بک چکی تھیں اور جس کی فضا پرچھائیوں کی طرح چلتے پھرتے حکم کے پابند نوکروں چاکروں کی صورت جگوں کو ترس چکی تھی اور ترستے ترستے شاید فراموش کر چکی تھی۔ اُن کی بجھو کی آنکھوں سے میلے میلے دو آنسو ٹپک کر بوند لگے موتی

[illegible] کے پیچھے دوپٹے میں کھو گئے۔ پھر انھوں نے ایک جانی پہچانی پُر جلال آواز محسوس کی اور کسی نے اُن کے ادھیڑ کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ کانپنے لگیں لیکن دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے پھیپھڑے سے ابھرتی ہوئی مقدس آواز سنتی رہیں جو محبت کی خلعت پہنے تھی اور ریاست کا چھتر لگائے تھی "زیب النسا بیگم! تم اُن شمشیر زادوں کی اولاد ہو جن کی تلوار نے سلطنتوں کی تقدیریں لکھی ہیں تم اُن درویشوں کی بیٹی ہو جن کے قلم نے تخت و تاج کے فیصلے کیے ہیں۔ تم تلوار نہیں اُٹھا سکتیں، تم قلم نہیں چلا سکتیں لیکن سوئی تو پکڑ سکتی ہو۔ تمھارے ہاتھ کے انگرکھے پہن کر میں نے چھتر منزل کلب کی مہموں کے ساتھ ڈنر کھائے ہیں۔ اب کوئی انگرکھے نہیں پہنتا تو کوئی نہ کوئی کُرتے ضرور پہنتا ہوگا۔ میں نے لکھنؤ سے کنا ڈو کے جو کُرتے سلائے تھے اُن کی سلائی اُس سستے زمانے میں کیا تھی؟ پانچ روپے فی کُرتا۔ تم ویسا کُرتا تین دن میں سی سکتی ہو، نہیں اُس سے اچھا کُرتا دو دن میں سی سکتی ہو صرف دو دن میں۔"

جب وہ اُٹھیں تو اُن کی بے پناہ بے قراری کو قرار آ چکا تھا جیسے ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اُٹھی ہوں، جیسے دن بھر کی سخت محنت کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں خوب دیر تک نہا کر نکلی ہوں۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اُٹھا رہی تھیں کہ اُس طرف سے آواز آئی جہاں کبھی ڈیوڑھی ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے دوپٹا اس طرح بنا کر اوڑھا کہ بوند اِدھر اُدھر ہو گئے اور کچے آنگن میں چپلیاں دھیرے دھیرے رکھتی ہوئی اُس پھاٹک کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں جو کبھی ڈیوڑھی کے لمبے چوڑے نقشین دروازے کا سہارا تھا۔

"میں ہوں مالکن! گلاب رائے۔"

"اچھے ہو چودھری گلاب؟"

"مالکن کی دعا ہے۔"

"کیسے آ گئے؟"

"ایک سندیسا آیا ہے۔"

"کیا؟"

"پاکستان سے خاں صاحب آئے ہیں، وہ جو بڑی مسجد کے پچھواڑے رہتے تھے۔"

"وہ مٹے خاں؟ جن کا ایک بھائی ہمارے ہاں سپاہیوں میں تھا؟"

"جی ہاں۔ موٹر پر آئے ہیں وہ لکھنؤ سے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے بھائی افضال علی صاحب جو سندھ میں بڑے کمشنر ہیں انھوں نے پتا بتا کر کہلا بھیجا ہے کہ آپ پاکستان چلی آویں۔"

"افضال علی میرا بھائی تھوڑی ہے رشتے کے چچا کا بیٹا ہے۔"

"انھوں نے آپ کو بلایا ہے بلکہ خاں صاحب تو کہتے تھے کہ اُن کو پرمٹ بھی کمشنر صاحب نے اسی شرط پر بنوا کر دیا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ ہی لے کر جائیں۔"

"مجھ نصیبوں جلی پر اب ایسا بھیڑی وقت نہیں پڑا ہے کہ موئے سپاہی پیادوں کے ساتھ دوسرے ملک میں ماری ماری پھروں۔ اُس ماٹی ملے سے کہنا کہ اپنے ہوتوں سوتوں کو سمیٹ لے جائے اپنے پاکستان کو۔ مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے۔ جب تک حکم نہیں ہوتا تبھی یہ تک بیٹھی ہوں۔"

"وہ کہہ رہے تھے،...."

"گولی مارو چودھری گلاب! کتنا سُننا کا ہے کا۔"

"جی، بہتر ہے۔"

"ہاں، میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی۔"

"حکم؟"

"یہاں رونق پور میں یا کسی اور گاؤں میں کوئی؟"

"جی میں نے کہا سرکار! میں سمجھا نہیں؟"

"کوئی کُرتے پہنتا ہے؟" مالکن نے ایسی بھرائی ہوئی ہچکی مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سُن کر پھٹ پڑی ہو۔

بوڑھا اور مزاج داں چودھری گلاب اس عجیب و غریب سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ "کُرتے؟"

"ہاں، تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب! تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے واقف ہو۔ تم تو اس حویلی کی دائی گیری کر چکے ہو اور دائی سے کیا پیٹ چھپانا۔ آدمی جن، سب چلے گئے۔ عورتیں اپنے گھر بار کی ہو گئیں۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی کو تے ہڑایا کرتی ہوں۔ رات تو رونے گزر جاتی ہے لیکن دن، یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں۔ ٹالے نہیں ٹلتے ہیں۔ کوئی کُرتا ہوتا ہو تو سینے پرونے میں دل اٹک جائے۔" حویلی کے بوڑھے رازدار کی تصور کی آنکھیں بھوکی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور اُس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔

"تم کھڑے کھڑے تھک گئے ہو گے چودھری گلاب؟"

"نہیں مالکن! میں شام تک حاضر ہو جاؤں؟"

"مگر دیکھو کسی دُھنیے جُلاہے کا کُرتا نہ لے آنا میرے پاس۔"

"نہیں، مالکن!"

"میرا نام نہ لینا کسی سے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے سرکار! میں کوئی آج نوکر ہوا ہوں حویلی میں؟"

سڑک کے کنارے املی کے پیڑ کی جڑ سے چودھری گلاب نے اپنا ٹٹو کھولا۔ سوار ہو کر خاں صاحب سے ملے بغیر تھان گاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر دیر تک چوپال کے ننگے کھرّے تخت پر بیٹھے سلفہ پیتے رہے۔ جب سورج سر پر آ گیا تب چودھرائن نے دروازے سے جھانک کر چوکے کے تیار ہونے کی خبر دی۔ وہ اونگھتے ہوئے اُٹھے۔ آنگن میں نیم کے چھتنار درخت کے نیچے بنے ہوئے پکے کنویں کی چبوترا پر کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ نہائے اور سر جھکا کر چوکے پہ بیٹھ گئے۔ چودھرائن روٹی سینک کر رکھتی جا رہی تھیں مگر وہاں پہلا ہی نوالہ ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ "کا تمرا کچھ جی ماندا ہے؟"

"ہاں۔"

"تھوڑا بہت تو کھائے لیو۔"

"ترے پاس بھلا کچھ روپے ہیں؟"

"روپے؟ مورے پاس تو ایک چھدام نا ہیں ہے۔ بڑکو کے کچھ دام دھرے ہیں؟"

"ہیں کوئی دس کم پچاس۔"

"لئی آؤ۔"

"ابھیں؟"

"ہاں۔"

"پہلے روٹی تو کھائے لیو۔"

"پہلے لئی آؤ۔"

چودھری گلاب نے مارکین کی تھیلی سے چالیس روپے کے کاغذ نکال کر گنے اور تھالی چوم کر کھڑے ہو گئے۔ چودھرائن پہلے تو آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہیں پھر بکنے جھکنے لگیں لیکن چودھری نے ان کی بکواس پر کان نہ دھرے۔ الگنی سے اپنا کرتا اتار کر پہنا، دھوتی بنا کر باندھی، ٹوپی سر پہ اور انگوچھا کندھے پہ رکھ کر باہر نکل آئے۔ گھاس کھاتے ہوئے ٹٹو کے منہ پر لگام چڑھا دی اور اُچک کر سوار ہو گئے۔ بھوکا ٹٹو اپنی چال پھر چل رہا تھا لیکن گلاب کے ذہن میں آٹا پیسنے والے کئی انجن ایک ساتھ دھڑ دھڑا رہے تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زمانے میں منشی تھے مگر جب حویلی اُجڑنے لگی اور بڑے چھوٹے دونوں مختار شہد کی مکھیوں کی طرح دوسرے باغوں کی طرف سدھار گئے تو مالکن نے اپنے ایک ایک تنکے کی ذمے داری چودھری گلاب کو سونپ دی۔ چودھری اُن لوگوں میں تھے جو اپنا پیٹ کاٹ کر آنے والے بُرے دنوں کا منہ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ بچا رکھتے ہیں لیکن لڑکوں کی شادی بیاہ کے جھمیلوں میں سب جمع جتھا پر لگا کر اُڑ گیا۔ اُن کا بڑا لڑکا تحصیل میں اور چھوٹا نہر کے محکمے میں چپراسی تھا۔ دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مڈل پاس تھے لیکن چودھری کی لاکھ دوڑ دھوپ کے باوجود نہ کوئی پٹواری ہو سکا اور نہ پٹرول۔ مجبوراً انھوں نے چپراسیوں میں بھرتی کروا دیا اور آئے دن منہ پھاڑے ہاتھ پسارے ان کے سامنے کھڑے رہتے۔ چودھری خود ہی کھکو بیٹھے تھے، اُن کا بھرنا کہاں سے بھرتے۔ اس وقت گھر والی کی بات سے وہ چکر میں پڑ گئے۔ بڑکو اتنا گرہست اور سگھڑ کیسے ہو گیا۔ کب سے ہو گیا، یہ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہی سب کچھ الابلا سوچتے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزازے کی دکان پر انھوں نے اپنا ٹٹو روکا اور اُتر کر بہت بڑھیا والی تن زیب کا تھان پرکھنے لگے۔ دو کرتوں کا کپڑا بغل میں مار کر وہ سیدھے حویلی پہنچے۔ دل ہی دل میں اپنے باپ منشی چودھری شتاب رائے کی پڑھائی ہوئی فارسی کا سارا آموختہ دہرا کر مالکن سے مخاطب ہوئے، انھیں یقین دلایا کہ پوری رازداری کے ساتھ وہ جیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے کرتوں کا کپڑا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے اُن کا حلق سوکھ گیا، کانٹے اُگ آئے، ساری جان پسینے میں شرابور ہو گئی۔ اُن کی مٹھی میں دبی ہوئی پچیس روپے کی پڑیا بھیگ گئی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ کر کیا بہانہ بنا کر یہ پچیس روپے مالکن کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ آخر وہ ہار کر اپنے لکڑی کے پیروں پر اپنے جسم کا منوں بوجھ گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے بنیے کی دکان پہ آ گئے۔ رام پرشاد گدی پہ بیٹھا گاہکوں کو پڑیاں باندھ رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد انھوں نے مالکن کا حساب مانگا تو پتہ چلا وہ سو سے اوپر پہنچ چکا ہے اور اسی لیے رام پرشاد نے مالکن کا سودا بند کر دیا ہے اور مالکن کا اُدرو کر جلتا ہوا چولہا بجھ گیا ہے۔

وہ رام پرشاد کی دکان کے تختے پر بیٹھے پچیس روپیوں کی پڑیا کو نہارتے رہے، بیٹھے رہے پھر اُٹھ کر اپنے ٹٹو پر سوار ہو گئے جیسے لڑائی میں ہار مان لی ہو۔

مالکن دیر تک کپڑا لیے بھلنگے کھٹولے پر پڑی رہیں۔ انھیں پہلی بار یہ معلوم ہوا تھا کہ کرتا سینے کے لیے صرف چٹکی کا ہنر اور آنکھوں کی روشنی ہی کی نہیں، سوئی اور تاگے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جتنے پیسوں میں سوئی تاگا آتا ہے اُتنے میں ایک وقت

[illegible] آ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا
[illegible] ناموں کو سُننے آگئی۔ وہ بڑبڑا کر
[illegible] ہیں اور ناؤن سے ایسے لیے
[illegible] لیتے ہیں اگر اپنے شبہے دلوں میں عذاب
[illegible] میں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈورا
[illegible] کی بھیا!"

[illegible] ؟"

[illegible] کی اتنے وقت؟"

[illegible]

[illegible] کی دُکان چلی جا۔ ایک نہین سوئی
[illegible] لیکن بنیا اس سے میرا نام نہ لے
[illegible] جواب پکڑا دے گا۔ کل میں نے ایک پیسے کا
[illegible] تم ذرا جلدی جاؤ۔"

[illegible] داہنی کنپٹی پر لکیھ ٹٹولتی ہوئی دلھنوں کی
[illegible] قدم رکھتی ہوئی آنگن سے نکل گئی۔ مالکن بیٹھی
[illegible] معلوم نہیں کیا سوچتی رہیں۔ جب ناؤن سوئی تاگا
[illegible] اس کی قینچی منگوا کر کرتا بیونتنے بیٹھ گئیں۔ قینچی
[illegible] خیال آیا کہ چودھری جیت پور کے ٹھاکر کی ناپ لو
[illegible] نہیں کرتا کیسے کاٹا جائے۔ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ ٹھاکر گاؤں
[illegible] چار میل دُور تھا۔ اب ایسا آدمی اس وقت کہاں
[illegible] اس وقت چودھری کو بلا کر لاتا۔ پھر انھوں نے دیوار پر چڑھتی
ہوئی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل ہے اور ہر منگل اُتوار کو
[illegible] بازار لگتا ہے۔ ممکن ہے ٹھاکر بازار کرنے آجائیں۔
[illegible] وہم پر بھروسا کر کے وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے
[illegible] میں گھڑے سے پانی انڈیلا۔ وضو کیا اور نماز کے لیے
وہ چٹائی بچھائی جس میں کپڑے کے پیوند لگے تھے جیسے تیسے نماز
کا فرض ادا کیا۔ گھڑی بھر وظیفہ پڑھا اور ایک لمبی سی دعا مانگی۔
"اے پاک پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں جیت پور کے
ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے دل میں نیکی ڈال دے کہ وہ خود آکر اپنے
کرتے کی ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل تک
ان کا کرتا سی دوں۔ اے پروردگارِ عالم! مجھے اتنی طاقت دے
کہ میں ساری رات بیٹھ کر لالٹین کی روشنی میں کرتا سی سکوں۔"

وہ گڑگڑاتے گڑگڑاتے نڈھال ہو گئیں اور اسی جا نماز پر
ڈھیری ہو کر پڑ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی۔ ہمیشہ
کی طرح آج بھی منزانی دو وقتی کمانے آئی تھی۔ وہ نئی اُمید سے

"کیا تمھی نے ٹیلی فون پر پولیس طلب کی تھی؟"

تازہ دم ہو کر اٹھیں۔ "بانکے کی بہو!"

"جی جی!"

"بانکے ہے گھر پر؟"

"ہیں تو بی بی۔"

"ذرا جلدی سے جا کے بلا تو لا۔ کہیو کوئی کام نہیں ہے۔
بس ایک بات پوچھنا ہے۔" وہ اُلٹے پیروں چلی گئی۔

پھر دروازے سے آواز آئی "سرکار کی بڑھتی ہو۔ راج
پاٹ بنا رہے۔"

"بانکے!"

"مالک!"

"جیت پور تمھاری جھانی ہے؟"

"ہے سرکار!"

"ٹھاکر گھنشیام سنگھ کو جانتے ہو؟"

"ان کا سرکار کون نائن جانت ہے۔ دُور دُور تک اُن کا
نام باجت ہے۔"

"بازار تو آتے ہوں گے؟"

"برابر مالک! برابر۔"

"تو ذرا تم خیال کر کے ان کو میرے پاس بُلا لانا۔ مجھے ایک
کام ہے ان سے۔"

"بہوت نیک حجور! ابھیں لیو آپ۔"

بانکے تو اپنا چمر ودھا جوتا بجاتا ہوا اور رُکی ہوئی دعائیں
دیتا ہوا چلا گیا لیکن مالکن اُسی جگہ کھڑی ہوئی اپنی زبان کی دراز ی
پر پچھتاتی رہیں اور دعا مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے
پر نہ آئیں بلکہ کسی نوکر کے ہاتھ کرتا بھیج دیں ورنہ میں کس طرح اُن
سے بات کروں گی، کیا کہوں گی۔ یا اللہ کچھ ایسا کیجیو کہ مرنے والے
کے سامنے میری آنکھیں نیچی نہ ہوں۔

بانکے نے اپنے سوپ پیٹھ پر باندھے اور اس نکڑ پر بیٹھ رہا جہاں اوجھے کھولے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بیلوں کے گھنگرو بجاتا اور دھول کے بادل اڑاتا ٹھاکر کا اونٹھا آگیا۔ وہ اپنے سوپ سنبھال کر اٹھا ہی تھا کہ ایک گاہک پھاند پڑا۔ اس نے گاہک کو ٹالنے کے لیے بڑی ترّی زبان میں بات کی لیکن گاہک نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر پیسے گنتا ہوا بانکے ٹھاکر کی طرف لپکا۔ ٹھاکر آدمیوں کو چیرتے ہوئے رام پرشاد کی دکان پر پہنچے۔ رام پرشاد نے دکان کے باہری چبوترے پر دری ڈال دی۔ ٹھاکر نے بیٹھ کر تولیے سے اپنا منہ پونچھا، اسی سے پاؤں جھاڑے۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے بانکے جھکا ہوا ڈنڈوت کر رہا تھا۔

"کا ہے رے ؟"

"ایک اُجر (عذر) ہے۔"

"ہاں۔"

"مالکن آپ کو بلائن ہیں۔"

"مالکن ؟"

"ہاں، یہاں کے سرکار کی مالکن۔"

"اچھا، کا ہے بلائن ہیں؟ کچھ اتا پتہ ہے بھلا ؟"

"یو سرکار آپ جان سکت ہو۔ ہم تو حکم کے تابع دار ہیں۔"

ٹھاکر تحصیل کے بڑے زمیں داروں اور میر محمد علی بیگ کے دوستوں میں تھے اور مرنے والے کے برفاتحے میں شریک ہوئے تھے لیکن اس کے بعد بھول کر بھی ڈیوڑھی کے سامنے سے نہ گزرے تھے، اب آج اس اچانک طلبی پر گھبرا گئے تھے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ چودھری گلاب پر نظر پڑ گئی۔

"اے چودھری! اے مالکن کا ہے بلائن ہیں ہم کا ؟"

چودھری کا خون خشک ہو گیا۔ ٹوپی کا زاویہ ٹھیک کر کے الفاظ چبانے لگے۔ "وہ...... وہ دراصل مالکن نے آپ کو اس لیے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں ان کو میری ضرورت پڑ گئی تھی اور کسی نے ان کو خبر دی تھی کہ آپ کی سواری تو تھان گاؤں سے گزرے گی ہی...... اس لیے آپ کو۔"

"اچھا، اچھا تو مطلب یہ ہے کہ اب وہاں میرے جانے کی ضرورت نہیں رہی ؟"

"آپ اب کیا کیجیے گا تکلیف کر کے۔"

ٹھاکر کے ذہن سے بوجھ ٹل گیا اور چودھری کو ایسا لگا جیسے ریل گاڑی سے گرتے گرتے بچ گئے ہوں۔

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا کرتا دیکھتی رہیں جو سن لائٹ صابن سے پھینچا گیا تھا اور سن لائٹ صابن کی بد بو میں بسا ہوا تھا۔ شکنیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں پھر یہ سوچ کر بیٹھ رہیں کہ جب رونق پور پر یہ قیامت بیتی ہے تو جیت پور پر بھی کچھ نہ کچھ گزر ہی گئی ہو گی۔ پھر وہ کرتا تراشنے لگیں۔ جب تک اندھیرا ہو گیا اور ان کو سوئی نظر آتی رہی، وہ اسی طرح بھیگی آنکھیں جھکائے اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرتی رہیں۔ روٹی دال کے خواب دیکھتی رہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد انھوں نے پیتل کی وہ لالٹین جلائی جس کی چمنی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور تھوڑی دیر بعد بھبک اٹھتی تھی جیسے مالکن کی بپتا پر روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی ہوں۔ دکھتے ہوئے سر پر چیتھڑے کی پٹی باندھے غمگین آنکھوں سے کپڑا ابھر لئے وہ بیتی رہیں۔ جھاگ ایسی سفید تن زیب کے ویرانے میں لکڑیاں بینتی رہیں، دال چنتی رہیں۔ کندن کے دانوں جیسے گیہوں کا اجلا اجلا آٹا گوندھنے کا ارمان کرتی رہیں پھر سر چکرانے لگا، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سدھ ہو کر پلنگ کے جھلنگے پر ڈھیری ہو گئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹین کے بکس میں پھول جیسی سلائی کے سچل کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے ان کے چہرے کی جھریوں کا جال اور گہرا ہوتا چلا گیا۔ کھچڑی بال ایک دم سے پک گئے جیسے پلاؤ کے چاول دودھ میں ابال کر پیالے میں چوٹی تک بھر دیے ہوں۔ گھر پر اداسی چھا گئی پہلے خود چودھرائن نے گلاب کو سمجھایا پھر لڑکوں کو حلقے سے بلا کر اس مورچے پر لگا دیا۔ پھر تینوں نے مل کر ایک دو پہر کو گھر کے آنگن میں مہا بھارت چھیڑ دی۔ دھیرے دھیرے بات بڑھتی گئی اور خون گرم ہوتا گیا۔ چھوٹے نے جو تاڑی کے ایک ہی گھڑے میں بورا گیا تھا کڑک کر کہا۔

"اے اماں تم کا جانو۔ یو بڑھوا اونی مسلمنیٹی سے پھنسا ہے۔"

بوڑھے چودھری گلاب رائے جن کی جوانی ان کے اپنے سر کی طرح بے داغ تھی، یہ بھیانک الزام سن کر دیوانے سے ہو گئے۔ وہ جہاں کھڑے ہوئے چوکھٹی اڑائے ہوئے تھے وہیں دھپ سے زمین پر بیٹھ گئے یا اس طرح گرے کہ پھر نہ سکے۔ چھوٹا لڑکا ثبوت دے رہا تھا۔

"جب بھیا دسیلاب آئی ہے تب انھیں تو جان پر کھیل کے اونی بدماس کا بچانے گئے رہیں ؟ گئے رہیں کہ نائیں گئے رہیں ؟ تم اپنے منہ سے بتاؤ اماں!"

چودھری گلاب کی بے نور آنکھوں نے گھر والی کے چہرے پر یقین کی پرچھائیں دیکھ لی جیسے شکاری نے زخمی جانور پر دوسرا فائر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی ٹانگوں پر اپنی لاش اٹھا کر اٹھے اور

لڑکھڑاتے ہوئے دروازے سے نکلے۔ اپنی چوکھٹ، اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر میں ڈالی ہوئی چوکھٹ (دہلیز) دونوں ہاتھوں سے چھو کر چومی اور اپنے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر، اپنی آنکھوں سے ایک آنسو بہائے بغیر چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں کے باہر اُس پکّے کنوئیں پر چڑھ گئے جس کی جگت (منڈیر) آدمی بھر اونچی تھی اور اس طرح ٹوٹ کر گرے جیسے گراری تک آتے ہوئے جہازی لنگرے کی رسّی ٹوٹ جائے۔ اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ سارا گاؤں ہل گیا گاؤں کا گاؤں اُمڈ پڑا۔ آدمی کنوئیں کے اندر اُتر گئے۔ چودھری گلاب نکالے بھی گئے مگر وہ تو اسی وقت مر چکے تھے، جب اپنے بیٹے کے منہ سے اپنی مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سُنی تھی۔

کہانیوں نے چٹپٹی کہانیوں سے افسانوں، گاؤں کے ان انسانوں کو جن کی زندگی ہر طرح کی بھوک سے بلبلاتی رہتی ہے جو پیدائشی محبت ہوتی ہے، اُس محبت نے چودھری گلاب کی خودکشی کے خاکے میں رنگ بھر دیا۔ اپنی مرضی کے مطابق اپنے تصور کے چٹخارے کے مطابق گہرے گہرا رنگ بھر دیا اور مشہور ہو گیا کہ مالکن تو چودھری گلاب پر میر محمد علی بیگ کی زندگی ہی میں مرتی تھیں۔ اُن کے گزرنے کے بعد اور گُل کھیلیں۔ منّے خاں نے کتنا کتنا سمجھایا لیکن وہ چودھری کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر رضامند نہ ہوئیں حالانکہ لوگ اپنی آل اولاد، اپنے محل دومحلے اور اپنے گاؤں گراؤں تک چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔

پھر مالکن کو علاقے کی وہ آوارہ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر گھورنے لگیں جن کی جوانی کی کالی رات جھوٹے عاشقوں کے گندے بوسوں کے چراغوں سے جگمگا چکی تھی۔ ایک سبب یہ بھی تھا کہ ادھیڑ مالکن کی کمر سیدھی تھی۔ ایک سفید لٹ چاندی کے جھومر کی زنجیر کی طرح اُن کے ماتھے پر جھولتی رہتی، نازک ناک نقشے کے سفید چہرے پر بھوک نے سائے تو ڈال دیے تھے لیکن برسوں کی حکومت اور امارت کی بخشی ہوئی چمک ابھی مرنے نہیں پائی تھی۔ اَن گنت جاگتی راتوں نے اُن کی آنکھوں کا نشہ سکھا دیا تھا لیکن اب بھی جب وہ سیاہ پلکیں ہٹا کر آنکھیں پوری کھول دیتیں تو بات کرنے والے کی نظریں چوروں کی طرح راستہ ڈھونڈنے لگتیں۔ نوکرانیوں کے پھٹے پرانوں کپڑوں میں بھی وہ بیگموں کی طرح جگمگایا کرتیں۔ دل چبھنے والی یادوں کے زرنگار قافلے اُن کی افسردہ آنکھوں کے سامنے ننگے پاؤں گزرا کرتے۔ جیٹھ بیساکھ کے جلتے سلگتے دن، ساون بھادوں کی روتی دھوتی کلموہی راتیں سب کھوٹے سکوں کی طرح اُن کی زندگی کی گولک میں کھن کھنایا کرتیں اور وہ ان سب کی طرف سے بے نیاز، اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور تکلیفوں کے بھاری بوجھ تلے کراہتی رہتیں۔

اُس دن جب وہ چودھری گلاب کا انتظار کرتے کرتے ہوئے سوکھ چکی تھیں اور ان بھیانک دنوں کا انتظار کرنے لگی تھیں جو فاقوں کی سوغات لے کر آنے والے تھے کہ چودھری گلاب کی خودکشی کی کہانی ٹوٹی پھوٹی دیواریں پھلانگ کر تپتے آنگن میں چڑیل کی طرح ناچنے لگی، قہقہے لگانے لگی، اُن کے منہ پر تھوکنے لگی۔ رونق پور کی مالکن کے اُس منہ پر تھوکنے لگی جس کے سامنے رونق پور کا سارا علاقہ آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جسارت نہ کر سکتا تھا۔ وہ اُٹھ کر بغیر دروازے والی کوٹھری میں گر پڑیں۔ ننگی زمین کے ٹھنڈے فرش پر گھٹنے موڑ کر اُس خدا کے سامنے گڑگڑاتی رہیں جو اپنے پیارے بندوں پر اس لیے مصیبتیں ڈالتا ہے کہ اُن کا امتحان لے سکے، اُن کے ایمان کو چمکا سکے۔ اسی دن انھوں نے رونق پور کی اپنی تیس برس کی زندگی میں پہلی بار چودھری گلاب کو مرجے کے روپ میں دیکھا کہ حویلی کے اندرونی حصّے کے دوسرے درجے کے سیاہ ستونوں والے دالان کے پیچھے لانبے کمرے میں جوٹ کی موٹی موٹی چٹائیوں پر فرشی قالین پڑے ہیں۔ تخت پر مسند لگائے میر محمد علی بیگ بیٹھے ہیں۔ دور کونے میں سلگتی ہوئی مہکتی ہوئی مشک کی کامدارنے اُن کے زانو پر پڑی ہے۔ انگلیاں گنگا جمنی منہال سے کھیل رہی ہیں اور نگاہ دیوارگیری پر جڑی ہوئی ہے۔ سامنے ہاتھی دانت کے کام کی بھاری میز ناشتے کی پلیٹوں کا بوجھ اُٹھائے کسی خوب صورت کنیز کی طرح کھڑی ہے۔ وہ اپنی مسہری سے اُٹھیں۔ ایک ہاتھ میں فرشی پاجامے کے پائنچے اٹھائے دوسرے ہاتھ میں اصطنبولی بیل کے بوجھ سے

[illegible] ہوئے زیوروں سے ہلکی ہلکی [illegible] آکر بیٹھ گئیں اور اُن کے ململ کے [illegible] انگشتانوں اور انگوٹھیوں سے سجا [illegible]

"[illegible] یوں ہو؟"

"[illegible] کتنی دیر سے اسی طرح [illegible] بیٹھے ہو۔"

"[illegible]"

"[illegible] کون؟"

"[illegible]؟"

"[illegible] کرو گے؟"

"[illegible]"

"[illegible] کرتے ہیں۔ نصیبا نہیں بناتے۔ مجھ کو کھلی [illegible] نہیں تو حکیم ڈاکٹر کیا کر لیں گے۔ میری مانو تو [illegible] دوسری شادی۔"

"[illegible]"

وہ اتنے زور سے گرجے کہ باورچی خانے میں کام کرتی [illegible] کے ہاتھ سوکھ گئے۔ کتنی ہی دیر تک ویسی ہی پرجلال [illegible] چھائی رہی پھر ایک عورت سائے کی طرح چلتی ہوئی [illegible] کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے اشارے سے پوچھا۔

"چودھری گلاب ڈیوڑھی پر کھڑے ہیں۔"

"بلاؤ۔"

دالان کے پردے بندھے تھے۔ کمرے کے دروازوں پر چلمنیں پڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اوسط قد کا سوکھا سا کالا آدمی آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے کرتے کے مونڈھے پر پیوند لگا تھا۔ دھوتی کرتے سے زیادہ اجلی تھی۔ دھوتی سے نکلی ہوئی سوکھی ماری پنڈلیاں دھول میں اَٹی ہوئی تھیں۔ پنجے جوتوں میں بند ہونے کی وجہ سے صاف تھے۔ گھٹے ہوئے سر پر رکھی ہوئی ٹوپی میں میل کی گوٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ سہما ہوا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک جھولا سنبھالے ہوئے تھا۔ "دوا لے آئے؟"

"ہاں سرکار!..." اُس آدمی نے گڑگڑا کر کہا۔

"دے دو۔"

اُس نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو اس طرح جھولا پکڑا دیا جیسے وہ جھولا نہیں شیشے کا پیالہ ہو اور اُس میں لبالب عطر بھرا ہو۔ پھر آواز آئی: "چودھری گلاب کو دو آنے پیسے اور خوراک دلا دو۔"

اب اُن کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے آپ سے ملیں تو دھوپ آنگن میں اتر آئی تھی۔ رات دماغ میں آئے ہوئے جان دے ڈالنے کے سارے منصوبے بوڑھی زخمی لالٹین کی طرح بجھ چکے تھے۔ وہ باہر نکلی ہی تھیں کہ کمر پر ٹوکرا دھرے اور ہاتھ بھر کا گھونگٹ نکالے بانکے کی بہو کمانے آگئی۔

"اے تو جیت پور جائے گی؟"

"ہاں بی بی!"

"تو ذرا ٹھاکر سے کہہ دینا کہ اگر بازار آویں تو مجھ سے مل لیں۔"

"بہت اچھا۔"

مالکن باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھی کہ دروازے پر تیز تیز آوازیں شریر لڑکوں کی طرح اچھلنے پھاندنے لگیں۔ مالکن کا اشارہ پا کر بانکے کی بہو گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک لمبی دبلی عورت کے ساتھ واپس آئی۔ وہ لال کنارے کی سفید ساڑی باندھے ہوئے تھی۔ مہترانی نے عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا: "ای نتھان گاؤں والے چودھری گلاب کی چھوٹی بہو ہیں لیلا دھر کی دُلھن۔"

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر سوچنے لگیں کہ اسے کس طرح مخاطب کریں اور کیا خاطر کریں۔ چودھری گلاب کی چھوٹی بہو نے اپنی بغل سے مڑے ہوئے کرتے نکالے اور مالکن کے ہاتھ میں پکڑا کر، ذلیل کرتی ہوئی آواز میں منمنائی۔

"ای کرتے آپ دھر لیو۔"

جملہ ختم کرتے ہی وہ تیر کی طرح باہر نکل گئی۔ مہترانی تھوڑی دیر کھڑی رہی پھر دوسرا گھر کمانے چلی گئی۔ مالکن بغل سے کورے کرتے تھامے اسی طرح آنگن میں کھڑی رہیں جیسے زندگی کی لڑائی میں ہار مان لی ہو اور مصیبتوں کی ناچتی فوجوں کے سامنے سفید جھنڈا کھول دیا ہو۔

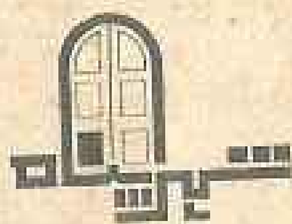
شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے جیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سے مالکن کہہ رہی تھیں: "اپنے کرتوں کی تن زیب آپ بھیجتے رہیے گا۔ فی الحال میرے یہ چاروں کرتے بجوا دیجیے۔"



دھوم کیتو کو گجراتی ادب میں اردو کے پریم چند کا درجہ حاصل ہے

گجراتی کے ایک نمایاں ادیب دھوم کیتو کی کہانی

ایک حسین عورت کی کہانی جو کبھی شکایت نہیں کرتی تھی



شمیم کام کرنے آتی تو سارے وقت کچھ نہ کچھ گنگناتی رہتی۔ وہ برتن مانجھتے وقت گاتی، پوتڑے دھوتے وقت گاتی، مکان میں صفائی کرتے وقت گاتی۔ حتاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کرسی رکھتے وقت بھی گاتی۔ اُسے آپ کتنا ہی زیادہ کام سپرد کردیں، کیا مجال کہ وہ چہرے سے ناگواری ظاہر ہونے دے لیکن اگر آپ اُسے گانے سے باز رکھیں گے تو وہ کام ضرور کرتی رہے گی مگر اس طرح بے جان سی نظر آئے گی گویا اُس کے جسم سے روح علیحدہ کرلی گئی ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اُس سے کسی کام کو کہا گیا ہو اور اُس نے انکار کردیا ہو۔ چوہا مر جائے اور اُس سے اُسے پھینکنے کو کہا جائے تو وہ بخوشی پھینک دے گی۔ کیسے ہی سوال کا جواب دینا ہو اُس کی شیریں زبان سے پہلا لفظ "جی" نکلتا لیکن جب اُس کا دو سالہ لڑکا نظیر اُس کے ہمراہ ہوتا اور نظیر کی دل جوئی نہ کی جاتی تو شمیم منہ سے کچھ نہ کہتی مگر غمگین اور دل برداشتہ ہوجاتی، گانا خود بخود بند ہوجاتا۔ بعض آدمی اپنا کام دلچسپ بنانے کے لیے اکثر گاتے ہیں، اسی طرح شمیم بھی بہت آہستہ مگر دل کش آواز میں گاتی تھی۔

سیٹھ عثمان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ شمیم اُن کی ملازمہ تھی۔ گھر کا تمام کام کاج شمیم کو کرنا پڑتا تھا۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی۔ سیٹھ عثمان نے اُس کے ساتھ دل لگی اور خوش فعلیوں کا آغاز کیا مگر ابھی بات زیادہ بڑھنے نہ پائی تھی کہ نئی سیٹھانی آگئیں۔

نئی سیٹھانی بھی دو سالہ لڑکا چھوڑ کر مر گئیں۔ شمیم بدستور ملازمت کرتی رہی۔ وہ چوبیس گھنٹے کام کرتی۔ چھٹی کے روز زیادہ کام کرتی۔ اُسے کام میں دلچسپی لینے کی عادت ہوگئی تھی انھی دنوں اُس کا شوہر چل بسا اور دو سالہ لڑکا نظیر یتیم ہوگیا مگر شمیم کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔

نظیر ایک نوکرانی کا لڑکا تھا۔ سیٹھ عثمان کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ وہ اُن کے لڑکے کے ساتھ کھیلے۔ اگرچہ اب شمیم بھی تنہا تھی اور وہ خود بھی تنہا تھے اور انھیں خود بڑے لڑکوں کی طرح کھیلنے میں اعتراض نہیں تھا۔ حکام، قانون صرف رعایا کے لیے بناتے ہیں اور اپنے لیے راستہ کھلا رکھتے ہیں۔ اسی طرح بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کے لیے قانون بناتے ہیں اور خود کو مستثنا خیال کرتے ہیں۔

عورت کو مرد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ محبت آمیز مشورں اور دل فریب اداؤں سے مرد کو لبھا سکتی ہے۔ مرد کو عورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اپنی فیاضی کا ثبوت دے سکتا ہے لہٰذا سیٹھ کے اس اعتراض میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی کہ اُن کا لڑکا نظیر کے ساتھ نہ کھیلے۔ کمی آتے آتے اعتراض ہی جاتا رہا۔ عنایات کی بارش ہونے لگی۔ "شمیم! لے یہ نظیر کو دے دے۔" ہوتے ہوتے سیٹھ صاحب بالکل ریشہ خطمی ہوگئے۔ طرح طرح محبت کی پینگ بڑھانے لگے۔ اُنھیں یہ معلوم تھا کہ شمیم ہمیشہ گاتی ہے مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ آج کل زیادہ گانے لگی ہے۔ اُنھوں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ شمیم کا گانا یا تو نظیر کے لیے ہے یا وہ اپنی خاطر گاتی ہے۔ یہ کیفیت سمجھنے کے باوجود اُنھوں نے ہمت نہ ہاری۔ ایک دن شمیم سے بولے "شمیم! اب میں کیا کروں، جس سے شادی کرتا ہوں، وہ مر جاتی ہے۔" شمیم کوئی جواب دیے بغیر کھڑی ہنستی رہی۔ سیٹھ صاحب نے کہا "تو رانڈ اور میں رنڈوا ہوگیا ہوں۔ اپنی زندگی

ترجمہ * خوشتر منگروی



"الی کوئی زندگی ہے؟"

شمیم نے ہنسنا بند کر دیا۔ اُس کی نظر سیٹھ کے چہرے سے گزرتی ہوئی کھڑکی پر جا کر ٹھہری۔ وہ سیٹھ کے انداز تاڑ گئی تھی اِس ہیر پھیر کا مطلب اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

سیٹھ چند لمحوں تک اُسے تکتے رہے پھر کہنے لگے "بولتی کیوں نہیں شمیم، کیا تجھے پہلی سیٹھانی کا زمانہ یاد آ رہا ہے؟" پہلی سیٹھانی کے زمانے میں شمیم جوان تھی۔ اُسے سیٹھ کی اُس وقت کی خوش فعلیاں یاد آ گئیں۔ اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ سیٹھ نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔ اُنھوں نے فوراً برفی کا ایک ٹکڑا شمیم کی طرف بڑھایا۔

"لے شمیم، یہ نظیر کو دے دے۔"

شمیم نے برفی کا ٹکڑا اس طرح لیا جیسے شکاری کی آہٹ پا کر ہرن چوکنے ہو جاتے ہیں۔ سیٹھ کی بدلی ہوئی نظر سے اُسے احساس ہوا کہ جس جگہ ملازمت میں اتنا عرصہ گزارا ہے، اب وہاں کی زمین پاؤں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہے۔ وہ مستقبل کے خیال سے کانپ اُٹھی۔

شمیم جن حالات سے گزری تھی، اُن سے گزرنے والا انسان بسا اوقات غیر فانی اخلاقی جرأت کا مالک بن جاتا ہے۔ گویا اتنی سی تعلیم اُس میں قوتِ ارادی پیدا کر دیتی ہے۔ جب وہ جوان تھی، سیٹھ عثمان اُس کی قربت کے لیے کوشاں تھے۔ کبھی نادانستگی میں رخسار بھی چوم لیا ہوگا یا کبھی ٹھیس کے بہانے اُس کے بدن سے دانستہ مَس بھی کیا ہوگا۔ شمیم یہ تمام حرکتیں خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتی تھی لیکن شاید اسی سبق سے اُس میں اپنی حفاظت کا اور آنے والے واقعات کی نزاکت کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مردوں کے ساتھ کام کرنے والی مزدور پیشہ عورتوں کی طرح ہنس مکھ اور ملنسار بن گئی تھی۔ ایسی عورتوں کو مردوں کے ساتھ آزادی سے ہنسنے بولنے خود کو محفوظ رکھنے، حد سے تجاوز نہ کرنے اور حسنِ تدبیر سے کام لے کر مردوں کو بنانے میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ شمیم کو بھی یہ مہارت حاصل ہو گئی تھی مگر سیٹھ نے اُس کی یہ مہارت، رضامندی پر محمول کی اور جب شمیم کا بیاہ ہوا تو عثمان سیٹھ بے حد خوش ہوئے۔ یہ خوشی اس لیے نہیں تھی کہ شمیم کو اب چین کی زندگی نصیب ہو گئی ہے یا اُسے اچھا بَر مل گیا ہے۔ سیٹھ کی یہ خوشی فریب کارانہ اور خود غرضانہ تھی۔ مبادا سیاہ کاری کا کوئی خراب نتیجہ رونما ہو تو فکر نہیں، شمیم اب شادی شدہ ہے، سیٹھ کی نیک نامی پر حرف نہیں آئے گا۔ دنیا انگشت نمائی نہ کر سکے گی۔ سماج میں رہ کر وہ باعزت

طریقے سے شمیم کے ساتھ خفیہ تعلقات قائم رکھ سکیں گے، یہ شادی اُن کی سیہ کاری کی پردہ پوشی ہو گی لیکن اُن کی یہ خوشی بے سود ثابت ہوئی۔ شمیم نے کبھی انھیں حد سے تجاوز نہ کرنے دیا۔

شمیم کا منگیتر ایک غریب آدمی تھا۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی یعنی شمیم کے جیٹھ سے ساڑھے چار سو روپے قرض لے کر شادی کی تھی۔ قرض اِس شرط پر ملا تھا کہ جب تک یہ رقم ادا نہ ہو جائے شمیم شوہر کے ساتھ نہیں رہے گی بلکہ جیٹھ کے ہاں رہے گی گویا قرض کی ادائی تک شمیم کی رخصتی نہیں ہو سکتی تھی۔ اِس کڑی شرط کے باعث دونوں میاں بیوی شادی کے باوجود محض خیالی لطف حاصل کر رہے تھے۔ شمیم اور اُس کا شوہر آپس میں ملتے تو شوہر کہتا۔ ”میرا جی ہر وقت تجھ میں لگا رہتا ہے۔ تو چاند کی طرح خوب صورت ہے، اِس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔ اگر پہلے معلوم ہوتا تو دو سال پیشتر ہی محنت مزدوری کر کے، پیسہ پیسہ جوڑ کے اتنی رقم جمع کر لیتا مگر اب ہم دونوں مل کر محنت کریں گے اور قرض کے بوجھ سے نکل جائیں گے۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا۔ ہم ایک ساتھ اٹھیں گے، ایک ساتھ بیٹھیں گے، مزے اڑائیں گے اور سکھ چین کی زندگی بسر کریں گے۔“

شمیم، عثمان سیٹھ کے گھر ایسی لگن سے کام کرتی جیسے کسی عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کر رہی ہو۔ وہ گاتے ہوئے کام کرتی اور کام کرتے ہوئے گاتی۔ ہر ہر لمحہ وصال کے خوش آیند لمحے سے نزدیک تر ہوتا جاتا۔ وہ امنگ اور حوصلے سے کام کرتی مگر سیٹھ کے سائے تک سے بچتی۔ وہ پائی پائی کا حساب رکھتی مگر نظرِ عنایت کا پیسہ واپس کر دیتی۔ ہر کام میں وہ مستعدی ظاہر کرتی مگر اپنی حفاظت کے لیے اُس نے گویا چاروں طرف پہرے بٹھا دیے تھے۔ سیٹھ عثمان کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ شادی سے پہلے سیٹھ کے مذاق برداشت کرنے والی شمیم آج بھی ویسی ہی ہنس مکھ اور زندہ دل تھی مگر اب وہ اپنی اس قدر حفاظت کرتی تھی کہ انھیں جرأت ہی نہ ہو سکی۔

شمیم کے شوہر نے رات دن ایک کر کے پیسے جمع کیے۔ شمیم نے جیٹھ اور جٹھانی کے دل موہنے کے ساتھ ساتھ جس قدر ہو سکا، کام کاج کیا۔ اس طرح دونوں نے دو برس میں ساڑھے چار سو روپے ادا کر دیے مگر اتنی مشقت کے بعد شمیم کا سہاگ مشکل سے تین سال قائم رہا پھر اُس کا شوہر مر گیا۔ شمیم تنہا رہ گئی اور دو سالہ بچے کی حفاظت کا بار بھی اُس کے سر آ پڑا۔ شمیم کام کاج کے علاوہ ہوشیاری سے ملازمت قائم رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اُسے سیٹھ سے بچنا تھا اور اُسی کے ہاں کام بھی کرنا تھا۔ اسی اثنا میں سیٹھ کی دوسری بیوی دو سال کا ایک بچہ چھوڑ کر انتقال کر گئی۔ گھر میں سیٹھ، بیوہ شمیم اور دو چھوٹے چھوٹے بچے، جملہ چار نفر رہ گئے۔

شمیم نے بھانپ لیا تھا کہ سیٹھ کی وہ ہوس پھر اُبھر آئی جو بیویوں کی زندگی میں دبی ہوئی تھی۔ سیٹھ اب اپنی ہوس کے اظہار میں جرأت مند بھی ہوتا جا رہا تھا۔ شمیم کو ملازمت، لڑکے کی پرورش اور اپنی حفاظت۔ یہ تینوں کام انجام دینے تھے۔ سیٹھ کے لڑکے کے لیے بھی اُس کے دل میں مامتا پیدا ہو گئی تھی لہٰذا اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سیٹھ کے ہاں مستقل کام کرتی رہے گی۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے اطمینان تو حاصل کر لیا مگر وہ جہاں ایک قدیم ملازمہ کی حیثیت سے اپنی عصمت سلامت رہنے کی اُمید رکھتی تھی، وہاں ہوس کی فراوانی دیکھ کر اُس کا دل کانپ اٹھتا تھا۔

یہ عصمت مآبی اُس نے اپنے دل کے استحکام سے حاصل کی تھی، جب وہ اور اُس کا شوہر شرط کی رُو سے الگ الگ رہنے پر مجبور تھے، اُس وقت اُس کا شوہر ہفتے عشرے میں ایک بار اپنے بڑے بھائی کے گھر پہنچتا مگر شمیم سے ملنے میں آزادی سے کام نہ لیتا، گردن نیچی کیے بیٹھا رہتا اور روپے ادا کر کے چلا جاتا، دوسرا ہفتہ آتا تو دوسری قسط ادا کر جاتا اور تیسرے ہفتے تیسری قسط۔ شوہر کے شریفانہ خلوص اور محبت پرستی نے شمیم کو محنت مزدوری کر کے قرض جلد ادا کرنے کی طرف آمادہ کیا تھا۔ دونوں صدقِ دل سے کمانے میں منہمک رہے۔ رقم ادا کرنے سے پہلے دونوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے میں تعریف کے لائق کامیابی حاصل کر لی تھی۔ محنت و مشقت میں وقتی جذبات سرد ہو گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ایک سچا، ایک نیا جوبن نکھر رہا ہو۔ اس طرح وہ انتظار کی گھڑیاں لطف و کیف سے گزارتے رہے۔ شمیم اس کسوٹی پر کھری ثابت ہوئی۔ اُس کی زندگی خالص سونے کے مانند ہو گئی۔ سیٹھ عثمان کا مسخرا پن اُسے نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اِس کا سبب محض یہ تھا کہ اُس کے نازک دل میں شوہر کے سوا کسی دوسرے کی محبت کی گنجائش ہی نہ تھی۔ کبھی کبھی جھلا کے وہ سوچتی کہ ملازمت بدل دے مگر یہ خیال بے کار تھا، مبادا دوسری جگہ بھی سیٹھ عثمان ہی جیسا سیٹھ ملے۔ وہ یہاں سے ہٹتی تو نظیر کی پرورش کا آسرا بھی نہ رہے گا۔ یہاں تو نظیر سیٹھ کے لڑکے کے ساتھ کھیلتا اور کھاتا پیتا تھا نیز سیٹھ کا لڑکا بھی شمیم سے ہل گیا تھا۔ انھی وجوہ سے پرانی جگہ کو چھوڑنے کے خیال سے شمیم کا دل کانپ اٹھتا تھا۔ اُسے کیا کرنا چاہیے؟ اُس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔

[illegible] آیا۔ ایک صبح شمیم کی ناک
[illegible] کسی رشتے دار نے اگلی دشمنی
[illegible] ڈال۔ ناک کے ساتھ شمیم کی خوبصورتی
[illegible] گفتگو میں مزاج کی چاشنی نہ رہی شمیم
[illegible] ہوا وہ سیٹھ کے التفات سے بچ گئی۔
[illegible] واقعہ کا ذکر کرتی تو مزے لے لے کر کہتی۔
[illegible] کی طرح ناک کاٹ لی۔"
[illegible] شمیم کو پرانی خادمہ سمجھ کر مہربانی سے
[illegible] اب مٹھائی دینا انھوں نے موقوف کر دیا۔
[illegible] کے ساتھ کھیلتا ہوا دیکھ لیتے تو آنکھیں بنا کر
[illegible] سب باتیں دیکھی ان دیکھی کر دیتی اور
[illegible] کام میں مستعدی سے مصروف رہتی۔ گانا اور کام
[illegible] اس کے یہی دو مشغلے رہ گئے تھے اگرچہ اب
[illegible] نے کا منہ چڑاتا تھا مگر دیکھنے والوں کو ایسا معلوم
[illegible] پر کبھی کوئی مصیبت نازل ہی نہیں ہوئی۔ کوئی
[illegible] نہیں آیا۔ اس طرح شمیم نے برسوں گزار دیے جوانی
[illegible] ہوگئی۔

نظیر کی شادی ہوگئی بہو گھر میں آئی تو فساد کی بنیاد پڑی۔ نظیر کی بیوی میں کوئی عیب نہیں تھا مگر وہ بڑی [illegible] [illegible] ساس کو دیکھ کر خوب ناک بھوں چڑھاتی۔ یہ امر اُسے [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ جس نے ناک کٹوائی ہو وہ اُس پر حکم [illegible] اُس نے دو چار بار ساس سے دوبدو کہہ بھی دیا کہ "بڑی [illegible] کچھ ہوں سو ہوں مگر میں نے ناک نہیں کٹائی۔" شمیم [illegible] نہایت ناگوار گزرتا مگر کیا کرتی؟ نظیر سے کہتی تو ممکن تھا وہ غصے میں آکر بہو کو مار بیٹھتا اس لیے شمیم خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی۔ جب زیادہ تنگ آتی تو گاتی ہوئی کام پر چلی جاتی۔ مصیبتیں سیکڑوں تھیں مگر لاعلاج تھیں لہٰذا ایک ہی پرانا اور تیر بہدف علاج تھا یعنی جب حد سے زیادہ دکھ پہنچتا تو وہ گاتی ہوئی کام میں مشغول ہو جاتی۔

ایک روز نظیر اچانک گھر آگیا۔ اُس کی بیوی نے گھر کو پانی پت کا میدان بنا رکھا تھا۔ شمیم خاموش کھڑی تھی۔ اُس کی نظریں ساکن تھیں اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔ شمیم نے گھر چھوڑ دینے کے لیے اپنی گٹھری باندھ کر تیار رکھی تھی مگر نظیر کو دیکھ کر ماتا کا دل پگھل گیا، جسے بچپن سے جان کی طرح سنبھال کر جوان کیا ہے۔ اُسے آج خود رنج پہنچا رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی شمیم بے بس ہوگئی۔ اُس نے نظیر سے کہا "بیٹا! میری دعا ہے خیر تیرے ساتھ رہے گی۔ تو خوش و خرم رہ اور مجھے جانے دے۔"

"دفان بھی ہو کہیں۔ تجھے روکتی کون نگوڑی ہے۔" نظیر کی بیوی بول اٹھی۔

نظیر نے بیوی کی پٹائی کے لیے چھڑی اٹھائی لیکن شمیم نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ نظیر کی بیوی رونے پیٹنے اور چلانے لگی "وہاں، مار ڈال مار ڈال بیا کے غلام! اور تجھ سے ہو ہی کیا سکتا ہے۔"

دوسرے روز صبح سویرے نظیر کانپتا ہوا عثمان سیٹھ کے پاس پہنچا "میری اماں جان آئی ہیں؟"

"یہاں نہیں آئیں۔"

"تو گئیں کہاں؟ رات کو میری بیوی نے کچھ زبان درازی کی تھی۔ صبح دیکھتا ہوں تو کھٹیا خالی تھی اور اماں جان غائب۔"

"ہیں!" عثمان سیٹھ نے حیرت سے کہا۔ "کوئی نشان؟ کوئی سراغ؟"

"اور تو کچھ نہیں، صرف یہ پرزہ کاغذ کا رکھتی گئی ہیں۔"

عثمان سیٹھ نے پرزہ ہاتھ میں لے کے پڑھا۔

"پیارے نظیر! بہو تجھے طعن کرے گی کہ تیری ماں نے کوئی خراب کام کیا ہوگا اس لیے کسی عزیز نے ناک کاٹ لی مگر یہ بات نہیں ہے بیٹا! اپنی جوانی اور تیرے بچپن دونوں کی ایک ساتھ حفاظت کے لیے میں نے اپنے ہاتھوں یہ کام کیا تھا۔"

سیٹھ نے کوشش کی کہ کاغذ کا مضمون نظیر کو معلوم نہ ہو سکے۔ اُن کے ہاتھ سے کاغذ کا پرزہ زمین پر گر گیا۔ وہ تھوڑی دیر صرف سوچتے رہے، کچھ بول نہ سکے مگر نظیر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے پھر بے ساختہ اُن کی زبان سے نکلا "نظیر بیٹے! تیری ماں کہاں گئی؟ شمیم کہاں ہے؟"

نظیر اشکبار آنکھوں سے بے زبان کاغذ کی طرف دیکھنے لگا۔



اسیر رنگ

ایک منفرد تاریخی کہانی

لاہور میں دیوالی کے دن یہ واقعہ پیش آیا۔

ایک حور شمائل دوشیزہ کی آرزو کی داستان

مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے کا ذکر ہے۔ پنجاب کے صوبے کا بندوبست سردار خان بہادر کے سپرد تھا۔ خان بہادر کا نائب نواب مومن خان تھا۔ مومن خان کی بہادری، حوصلہ مندی، وفاداری اور خاندانی شرافت دور دور مشہور تھی۔ لاہور کی تاریخ کا سنہرا باب اُسی کے دور پر مشتمل ہے۔

ایک بار دیوالی کا تہوار دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں فلک بوس عمارتوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی آہستہ آہستہ پھیکی پڑ رہی تھیں۔ ہندو دھرم کا ہر چھوٹا بڑا فرد اپنی حالت و حیثیت کے مطابق دیوالی کے دیے جلانے میں مگن تھا۔ سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ گلیوں اور بازاروں میں انتہائی رونق تھی۔ جو ہندو نہیں تھے، وہ بھی اپنے ہم وطنوں، اپنے پڑوسیوں کی خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ ہر طرف کھلونے، مٹھائیاں، پھل جھڑیاں، پھل اور طرح طرح کی چیزیں بک رہی تھیں۔ خوانچوں اور ٹھیلوں کے اِردگرد بچوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ایک میلے کا سماں تھا۔

اچانک ڈبّی بازار میں نقارے کی پُرہیبت آواز سنائی دی۔ ہر شخص خبردار ہو گیا۔ نواب مومن خان کی سواری آ رہی تھی۔ ڈبّی بازار کی ایک پُرشکوہ اور عالی شان عمارت میں دوسری منزل کا ایک دریچہ کھلا ہوا تھا۔ دریچے سے شہر کے ایک معزز رئیس کی سترہ سالہ پری جمال لڑکی رُوپا کا چہرہ چاند کی طرح جھانک رہا تھا۔ رُوپا بازار کی رونقوں کا نظارہ کر رہی تھی۔ نقارہ کی آواز سُن کے اُس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اُس نے مومن خان کی بہادری، نیک دلی، غریب پروری، انصاف پسندی اور مردانہ وجاہت کے بہت چرچے سُنے تھے۔ وہ مدت سے خواہش رکھتی تھی کہ مومن خان کو ایک نظر دیکھ لے۔ آج اتفاق سے مومن خان کی سواری خود اُس کے گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ رُوپا ہمہ تن توجہ ہو گئی۔ آخر مومن خان کی سواری نمودار ہوئی۔ رُوپا کی نظریں ایک خوش وضع، خوب رو اور شکیل و وجیہہ شخص پر جا کے ٹھہر گئیں۔ وہ شخص اپنی سبک رفتار کالی گھوڑی پر سوار تھا۔ اُس کے سرخ و سفید چہرے پر شاہانہ وقار تھا اور کمر کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ اُس کا کشادہ سینہ سونے چاندی کے تمغوں سے سجا ہوا تھا۔ اعضا مضبوط و متناسب تھے۔ اُس کی سج دھج کہے دے رہی تھی کہ بڑے بڑے شہ زور اُس کی ہمت و طاقت کے آگے تابع دارانہ سجدے کرتے ہیں۔ مومن خان کے خوش نما لبوں پر ایک دل فریب مسکراہٹ رقصاں تھی۔ چوڑی پیشانی اور جھکی ہوئی آنکھیں اُس کی بلند خیالی و شریف النفسی کی غماز تھیں۔ بھرے بھرے بازو پہاڑوں کو ہلا دینے کے دعوے دار دکھائی دے رہے تھے۔ حسین رُوپا، مومن خان کو اُس وقت تک متواتر دیکھتی رہی جب تک اُس کی سواری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ وہ اپنے آپ سے غافل، بے حس و حرکت، خاموش کھڑی تھی۔ تصور کی آنکھیں اُسے نہ معلوم کیا کیا دکھا رہی تھیں۔

رُوپا کی محویت اُس کے والد نے آ کر توڑی۔ "رُوپا! کیا دیکھ رہی ہو بیٹیا؟"

رُوپا کانپ گئی جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے جاگی ہو۔ اُس نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔ "کچھ نہیں پتا جی!" پھر اُس نے خود کلامی کے انداز میں اپنے پتا سے پوچھا۔ "یہ نواب مومن خان کی سواری تھی نا؟"

"ہاں بیٹی! اُنھی کی سواری تھی۔" اُس کے پتا نے کہا۔ "سرکار بہت اچھے حاکم ہیں۔ وہ امیر غریب، چھوٹے بڑے اور ہندو مسلمان سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ کاش اُن کا جیون ہزار سال سے زیادہ ہو۔ ایسے دیالو، ایسے نیک منش سنسار میں روز روز نہیں آتے۔"

رُوپا معمول کے خلاف آدھی رات تک پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر اُس کی آنکھ لگی تو اُسے باغ و بہار خواب نظر آنے لگے۔ شوخ کام دیو کے ہاتھوں نے ایک مہ لقا، ایک رشکِ حور و پری پر اپنا کبھی خطا نہ ہونے والا تیر چلا دیا۔

صبح رُوپا اُٹھی تو مہین پردوں سے سورج دیوتا نے اُس کے مخملیں گالوں اور ریشمیں بالوں کو ہلکی ہلکی رُوپہلی روشنی سے نہلا دیا۔ رات بھر میں رُوپا کا معصوم پُرسکون دل ایک بڑے انقلاب سے گزر چکا تھا۔

دوسرے دن رُوپا نے کسی سے سُنا کہ نواب مومن خان شکار کھیلنے کے لیے جنگلوں کی طرف نکل گئے ہیں۔ رُوپا کے رگ و پے میں بے قراری دوڑ گئی۔ آنکھوں کی شمعیں جلنے بجھنے لگیں۔ چاند



[illegible] پھڑکنے لگا۔ دل میں رہ رہ کے درد اُٹھتا رہا۔ جتنے
[illegible] باہر رہا رُوپا گھر والوں سے چھپ چھپ کر
[illegible] کے سامنے اُس کی خیر و عافیت کی التجا کرتی رہی۔ آخر
[illegible] رُوپا کے چھوٹے بھائی نے اُسے خبر دی کہ مومن خاں صحیح و
[illegible] واپس آ گیا ہے۔ رُوپا کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ اُس نے
[illegible] سے دوڑ کر اپنے چھوٹے بھائی کا منہ چوم لیا۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں جس کو دیکھا، اُسی کو چوم لیا

وقت گزرتا گیا۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں بدلتے
گئے۔ رُوپا نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح مومن خاں کو بھول جائے
اور اُس کا خیال دل سے نکال دے مگر بھولنے کی کوشش میں اُس
کی یاد اور زیادہ ستانے لگی۔ یہ روگ اب رُوپا کے بس کا نہیں رہا
تھا۔ جب بھی مومن خاں کی سواری ڈیوڑھی بازار سے گزرتی رُوپا کے
دل کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اُٹھتی۔ وہ چاہتی کہ کسی طرح اُڑ
کر مومن خاں تک پہنچ جائے مگر بازو بس پھڑپھڑا کے رہ جاتے۔

اُس کے آنچل کو چھو رہی ہے صبا وائے قسمت کہ ہم صبا نہ ہوا

دوسری طرف مومن خاں نے ایک دفعہ بھی آنکھ اُٹھا کر اُوپر
نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی اِس بے نیازی نے جلتی پر تیل کا کام کیا مگر
رُوپا اُس سے بے نیازی کا گلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مومن خاں کو کیا معلوم
کہ کسی جھلملے دریچے میں کوئی نوجوان لڑکی اُس کے لیے اپنے دل کا
دروازہ کھولے کھڑی ہے۔

رُوپا کے ماں باپ بھائی بہن پریشان تھے کہ آخر اسے کیا ہو
گیا ہے۔ نہ مسکرانا، نہ ہنس ہنس کے باتیں کرنا، نہ کسی سہیلی سے ملنا۔
نہ کھانے کا خیال، نہ پہننے کی فکر۔ وہ لوگ سوچتے سوچتے اس نتیجے پر
پہنچے کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے اب اِس کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہئیں۔
وہ رُوپا کے بیاہ کی دھن میں لگ گئے۔

وقت تیزی سے اُڑتا چلا جا رہا تھا۔ دیوالی پھر آ گئی۔ رُوپا
کی نگاہوں میں گزشتہ دیوالی کا ناقابلِ فراموش نظارہ گھوم گیا۔
آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دل میں ایک ایسا درد اُٹھا کہ اُسے
دبانا مشکل ہو گیا۔ رُوپا بے چینی سے مومن خاں کی سواری کا انتظار
کرنے لگی۔ لمحے ٹھیر ٹھیر کے، گھسٹ گھسٹ کے گزرتے رہے۔ آخر
دن ڈھلا اور شام ہوئی۔ لوگ خوشی سے دیے جلانے لگے۔ چراغ پر
چراغ روشن ہوتا گیا۔ دیکھتے دیکھتے چاروں طرف ایک دل کش نظارہ
پھیل گیا۔ مومن خاں کی آمد کے نہ آثار تھے، نہ اُمید تھی مگر رُوپا کا
دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ وہ بڑے ارمان سے اُس کا انتظار
کرتی رہی۔ آخر اُس کی مراد بر آئی، دل کی کلی کھل گئی۔ نقارے کی آواز
نے فضا میں رس گھول دیا۔ رُوپا نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ
واقعی مومن خاں کی سواری تھی۔ رُوپا بارہ زینے سے من مندر کے
اِس دیوتا کی پُوجا کر رہی تھی۔ دیوتا کو دیکھ کر پجارن کی عجیب حالت
ہوئی۔ مومن خاں اُس دن بہت خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ دیوالی کی خوشی
میں وہ بھی برابر کا شریک تھا۔ رُوپا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

وہ جذبات کے بے پناہ طوفان میں ایک ناچیز تنکے کے مانند بہہ گئی۔ دل کے بھڑکتے شعلوں نے بلند ہو کر اُس کی دماغی قوت بھسم کر کے رکھ دی۔ دل میں ایک عجیب ہوک اُٹھی، رُوپا یہ ہوک دبا نہ سکی۔ خیالات و احساسات ایک بے مہار خواہش، ایک بے قابو عزم میں تبدیل ہو گئے۔ محبت دیوانگی کی حد تک پہنچ گئی۔ عزت و ذلت، نیک نامی و رسوائی کی درمیانی دیوار ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ ننگ و ناموس کا لحاظ بے خودی کی شدت پہ قربان ہو کے رہ گیا۔ صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا اور چھلک پڑا۔ شرم و حیا نے بے حجابی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

سڑک پر دورویہ کھڑے ہوئے لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک نوجوان لڑکی دیوانوں کی طرح دوڑتی ہوئی، حفاظتی دستہ چیرتی ہوئی نواب مومن خاں کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے مومن خاں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے جلتا بھڑکتا سورج اچانک اُس کے عین سامنے آ گیا ہو، جیسے حسن کے خدا نے اُس کا امتحان لینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ رُوپا کے لمبے سیاہ بال اُس کے رخساروں اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مومن خاں گھوڑے سے اُتر گیا۔ اُسے یہ پسند نہیں تھا کہ وہ خود گھوڑے پہ سوار رہے اور بات کرنے والا نیچے کھڑا ہو۔ اُس نے نرم لہجے میں لڑکی سے سوال کیا: "شاید آپ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں؟" مومن خاں کسی کو تُو کہہ کر مخاطب نہیں کرتا تھا، ہمیشہ آپ جناب سے بات کرتا تھا۔

رُوپا منہ سے کچھ نہ بول سکی، اثبات میں سر ہلا کے رہ گئی۔ مومن خاں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا: "ہم ہمہ تن گوش ہیں، فرمائیے؟"

رُوپا نے اس طرح اُس کی طرف دیکھا جیسے اپنا مدعا آنکھوں آنکھوں میں بیان کر دینا چاہتی ہو۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ سارے لوگ حیران اور خاموش کھڑے تھے۔ رُوپا بے خیالی میں اپنا آنچل انگلیوں پر لپیٹنے لگی پھر بے ترتیب آواز میں بولی: "کتنا اچھا ہو، اگر ایشور مجھے آپ کی صورت اور آپ کی سیرت کا ایک لڑکا آپ ہی کی بیج سے عطا کرے۔" نہ جانے کس طاقت ور جذبے نے اُس کی زبان سے یہ الفاظ ادا کروا دیے۔ اُسے شاید یہ احساس ہو گا کہ کیا پتہ، دیوتا کا سامنا پھر ہو نہ ہو، وقت بھی کم ہے، جو کہنا ہے، ابھی کہہ دینا چاہیے۔ اُس کا حسین چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ خوب صورت نرگسی آنکھیں مہندی لگے پیروں میں گڑ گئیں۔

"اوہ، ہم سمجھ گئے۔" نکتہ شناس مومن خاں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس نے اطمینان سے کہا: "بی بی! آپ کے رواج اور ہیں، ہمارے رسوم اور۔ آپ ہندو ہیں، ہم مسلمان۔ اس لیے ہماری شادی دنیا کی نظر میں ایک نامناسب بات ہو گی۔ نکتہ چیں نہیں بوس[illegible] گے، حاسد نہ آپ کو چین لینے دیں گے، نہ ہمیں۔" رُوپا کے [illegible] ہونٹوں میں جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ مومن خاں نے سلسلۂ کلام [illegible] رکھا: "ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں مگر یہ بھی تو سوچیے [illegible] آپ اور ہم دُنیا کی پروا کیے بغیر شادی کر بھی لیں تو ہو سکتا [illegible] ہمارے ہاں اولاد ہی نہ ہو۔ اگر ہو بھی تو اس کی ضمانت کون دے [illegible] کہ وہ لڑکا ہو گا، لڑکی نہ ہو گی۔ خیر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ [illegible] لڑکا ہی ہو گا تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ صورت و سیرت میں [illegible] کی آرزو کے مطابق ہو، مختلف بھی تو ہو سکتا ہے۔"

رُوپا اس استدلال کا کیا جواب دیتی۔ لرزیدہ آواز میں [illegible] لگی: "میں بھگوان سے پرارتھنا..."

مومن خاں نے اُس کی بات کاٹ دی: "آپ کی پ[illegible] ضائع نہ ہو گی۔ دل سے نکلی ہوئی دُعا ضرور قبول ہوتی ہے اور [illegible] کو مژدہ دیتا ہوں کہ آپ کی دعا قبول ہو چکی ہے۔" رُوپا نے [illegible] نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ مومن خاں بولا: "اِدھر دیکھیے، آپ [illegible] ہمارے جیسا لڑکا چاہیے نا؟ ہم اپنی تلوار کی قسم کھا کر کہتے ہیں [illegible] آج سے آپ ہماری ماں ہیں۔" اُس نے اپنے بازو میں لٹکی ہوئی آب دار شمشیر چھو کر کہا: "اب ہم آپ کو ماتا کہہ کر پکارا کریں گے۔" اُس کا لہجہ مرتبے کے لحاظ سے بدل گیا: "اور آپ کی عزت اپنی حقیقی ماں کی طرح کریں گے۔ آج سے آپ ہمیں اپنا لڑکا سمجھیں۔" مومن خاں نے اپنی بات پر سچائی کی مہر لگانے میں دیر نہیں کی۔ بے شمار حاضرین کی متجسس نگاہوں نے ایک حیران کن واقعہ دیکھا۔ نواب مومن خاں اپنے عہدے اور شان کا خیال کیے بغیر اپنی منہ بولی ماں رُوپا کے قدموں پر جھکا ہوا تھا۔

اس کے بعد مومن خاں ننگے پاؤں رُوپا کے گھر گیا اور تاریخ گواہ ہے کہ وہ جب تک زندہ رہا، حقیقی والدہ کی طرح رُوپا کی عزت کرتا رہا۔ رُوپا نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ مومن خاں دسہرے، بسنت، راکھی بندھن، ویساکھی اور دیوالی وغیرہ کے تہواروں پر اُس کے گھر ہمیشہ تحفے لے جاتا اور اُس کے پاؤں چھوتا۔ نواب میر مومن خاں بخاری نسل کا سید تھا۔ اُس کا مقبرہ لاہور کے بھاٹی دروازے کے باہر داتا کے مزار کی مغربی سمت آج بھی پرانی یادیں تازہ کر رہا ہے۔



آپ اپنے رات محفوظ کر سکتے ہیں



٭ شہناز

دانش مندوں کی ایک خصوصی نشست کا رپورتاژ

دانش مندوں کے ملک میں ایک نہایت بلند و بالا عمارت تھی۔ وہ عمارت آسمان سے باتیں کرتی تھی۔ اُس کا نام تھا، ہوائی قلعہ۔ ہوائی قلعہ خصوصی طور پر دانش مندوں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ دانش مندوں کو جب بھی کسی اہم اور سنجیدہ مسئلے پر غور و خوض کرنا ہوتا، وہ ہوائی قلعے کی سب سے اوپری منزل پر اپنی بیٹھک جماتے۔ مسئلہ اگر معمولی نوعیت کا ہوتا تو وہ اس پر سوچ بچار کے لیے کسی نچلی منزل کا انتخاب کرتے۔ منزل کا انتخاب ہمیشہ مسئلے کی نوعیت اور اہمیت کے مطابق ہوتا۔

آج کا اجلاس بلند و بالا ہوائی قلعے کی ساٹھویں منزل پر ہو رہا تھا۔ یہ سب سے بلند اور سب سے آخری منزل تھی۔ شہر کے تمام دانش مند صبح تڑکے سے بیٹھے ایک مسئلے کی گتھیاں سلجھانے میں مشغول تھے۔ اُن کے اجتماع کی شہر کے بچے بچے کو خبر تھی۔ شریف اور سمجھ دار شہری پنجوں کے بل چل رہے تھے اور دھیمی دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ سارا شہر سرگوشیاں کرتا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ احتیاطی تدابیر اس لیے اختیار کی گئی تھیں کہ دانش مندوں کے کام میں خلل نہ پڑے اور وہ پوری یک سوئی اور طمانیت سے اپنا کام انجام دے سکیں۔

زیرِ غور مسئلہ انتہائی اہم تھا۔ ایک دانش مند نے ایک دکان سے جوتوں کی دو جوڑیاں خریدیں۔ ایک جوڑی سیاہ، دوسری سرخ۔ ایک دن وہ اپنے دفتر پہنچا تو لوگ اُس کے پیروں کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اُس نے بھی اپنے پیروں پر نظر کی۔ سخت شرمندہ ہوا۔ وہ دراصل غلط جوتے پہنے ہوئے تھا۔ ایک پیر میں سیاہ، دوسرے میں سرخ۔ وہ دوڑا دوڑا گھر گیا۔ گھر پہنچ کر اُسے اور پریشانی ہوئی اس لیے کہ وہاں بھی ایک غلط جوڑی پڑی تھی۔ ایک جوتا سیاہ، ایک سرخ۔ دانش مند کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے سوچا، ہو نہ ہو یہ کوئی بہت بڑی سازش ہے ورنہ بیک وقت دونوں جوڑیاں غلط جوتوں میں کس طرح تبدیل ہو سکتی تھیں؟ اُس کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔

صدیوں کی روایت کے مطابق اُس نے اپنے شہر کے دانش مندوں سے رجوع کیا۔ مسئلہ واقعی اہم تھا۔ بظاہر تو یہ ایک انفرادی اُفتاد تھی مگر اس کی طرف توجہ نہ دی جاتی تو ملک کے دوسرے شہری بھی ایسے مسئلوں سے دوچار ہو سکتے تھے۔ معاملے کی سنگینی کے پیشِ نظر سارے دانش مندوں کو ہوائی قلعے کی ساٹھویں منزل پر سر جوڑ کے بیٹھنا پڑا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کے ذہنوں میں صرف ایک مسئلہ سرابھارے کھڑا تھا۔ بے جوڑ جوڑیوں کا مسئلہ۔

اچانک گروہ کے سب سے کم عمر دانش مند نے دوسروں کو مخاطب کر کے بتایا کہ کمرے میں ایک چڑیا گھس آئی ہے۔ سب چونک پڑے۔ یہ قطعی ناقابلِ یقین بات تھی کیونکہ جب دانش مند سوچتے تھے، کسی کو اُن کے انہماک میں مخل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ جہاں ذی شعور انسانوں کا یہ حال ہو کہ پنجوں کے بل چلنا شروع کر دیں، وہاں ایک معمولی سا پرندہ کیسے یہ جرأت کر سکتا ہے۔ نوجوان دانش مند نے تمام اہلِ دانش سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”کیا آپ میں سے کسی نے اس چڑیا کو مدعو کیا ہے؟“

”نہیں۔“ ایک دانش مند نے جواب دیا۔ ”میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہاں کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر بھی ہو سکتا ہے۔“

”یہ یہاں کر کیا رہی ہے؟“ دوسرے دانش مند نے برہمی سے سوال کیا۔ ”یہ بے بلائی مہمان کس طرح چلی آئی؟“

چند دانش مندوں نے چڑیا کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ جلد از جلد کمرے سے رخصت ہو جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ سختی اور حقارت کا یہ سلوک چڑیا کو خود کمرہ چھوڑنے پر مجبور کر دے گا پھر دانش مند اطمینان و یک سوئی سے اپنے اہم ترین مسئلے پر غور و خوض شروع کر دیں گے۔

تھوڑی دیر بعد نوجوان دانش مند نے گردن اُٹھائی۔ گردن اُٹھانے کی ایک وجہ تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ چڑیا ابھی تک کمرے میں موجود ہے۔ گردن اُٹھاتے ہی وہ چیخا۔ ”چڑیا ابھی تک موجود ہے۔“ غصّے کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ ”کس قدر بداخلاق چڑیا ہے۔“ اُس نے چڑ کر حقارت سے ایک بار پھر چڑیا کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے سے رخصت ہو جائے مگر چڑیا نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں



[illegible] اسے دیکھتی رہی پھر اُڑ کر گروہ کے سب [illegible] کے گنجے سر پہ جا کر براجمان ہو گئی۔ یہ دانش مند [illegible] کے سبب صدارتی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے [illegible] پکڑنے کی کوشش کی۔ چڑیا اُڑ کر کمرے کی چھت [illegible] ہماری تذلیل کیوں کر رہی ہے؟" صدر دانش مند [illegible] ہو کر پوچھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا اور زبان لڑکھڑا [illegible] اسے ایسا سبق دینا چاہیے کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کر سکے اور اس کی نسلیں ہمارا دیا ہوا سبق یاد رکھیں۔"

دانش مند غور و خوض کا اہم اور مقدس کام چھوڑ کے بے بلائی مہمان کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ انھوں نے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن چڑیا بہرحال چڑیا تھی۔ جیسے ہی کوئی اس کے قریب پہنچتا، وہ پھر سے اُڑ جاتی۔ دانش مند کرسیوں پر چڑھ گئے مگر چڑیا ہاتھ نہ آئی۔ تمام دانش مند ایک دوسرے کی پیٹھ پر سوار ہو گئے تاکہ ایک بار صرف ایک بار چڑیا اُن کی گرفت میں آجائے مگر چڑیا اطمینان کے ساتھ ایک کونے سے دوسرے کونے اُڑ جاتی۔ اس کی اِس گستاخی پر دانش مندوں کا غصہ بڑھتا چلا گیا۔ ساتھ ہی ان کی بھاگ دوڑ میں بھی مستعدی اور تیزی آگئی۔ آخر انھوں نے کسی نہ کسی طرح چڑیا کو پکڑ لیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ چڑیا کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ سلوک کا انحصار اس بات پر تھا کہ دانش مندوں کا متفقہ فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ متفقہ فیصلے تک پہنچنے کے لیے غور و فکر اور بحث و تمحیص کی ضرورت تھی۔ وہ فوراً غور و فکر اور بحث و تمحیص کرنے لگے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک دانش مند نے کہا: "کل اس کھڑکی سے ایک گل دان نیچے گر گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے سینکڑوں ٹکڑے ہو گئے۔ اس چڑیا نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ یہ کسی رحم کی مستحق نہیں ہے۔ اسے بھی گل دان کی طرح کھڑکی سے نیچے پھینک دینا چاہیے۔ یہ دیکھتے دیکھتے سینکڑوں ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ پھر ہمیں کبھی ایذا نہ پہنچا سکے گی۔"

نوجوان دانش مند چڑیا کو مٹھی میں مضبوطی سے دبوچ کر اٹھا۔ کھڑکی کھول کے اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور چڑیا سے مخاطب ہو کر بولا: "چڑیا! ہم تیرے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے انتہائی مغموم ہیں لیکن تیری سزا یہی ہے۔ یہ تیرے لیے ایک ناقابلِ فراموش سبق ہے۔" اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور مٹھی کھول دی۔

یہ کارنامہ انجام دے کر نوجوان دانش مند نے اپنا ہاتھ اس طرح صاف کیا جیسے کوئی کپڑوں سے گرد جھاڑتا ہے۔ پھر وہ دوسرے دانش مندوں کے حلقے میں آکر بیٹھ گیا۔ دانش مند دوبارہ غور و خوض میں محو ہو چکے تھے۔ اپنے اہم ترین مسئلے کا حل وہ ابھی تک دریافت نہیں کر سکے تھے پھر بھی اُن کے چہروں پر سکون و طمانیت کا نکھار

تھا اور آنکھوں میں دانش مندی کا جمال۔ اب اُن کے کام میں مداخلت کرنے والا کوئی نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک دانش مند نے اپنے گنجے سر پر کوئی تیز اور نوکیلی چیز چبھتی ہوئی محسوس کی۔ اُس نے اپنا سر کھجایا۔ کچھ اطمینان ہو گیا لیکن ذرا ہی دیر بعد اُسے پھر سر پر شدید کھجلی محسوس ہوئی۔ اُس نے دوبارہ سر کھجایا اور دھیرے دھیرے نظریں اُوپر اٹھائیں۔ نظریں اُوپر اٹھتے ہی وہ ایک دم چونک پڑا۔ یہ اُس کا وہم نہیں تھا بلکہ حقیقت تھی۔ وہی چڑیا اُس کے سر کا طواف کر رہی تھی۔ دانش مندی اور بُردباری میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اس لیے گنجے دانش مند نے اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ اِسی طرح بیٹھا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دوسرے دانش مندوں نے یہ معاملہ بھانپ لیا، وہ غصّے سے بے تاب ہو گئے۔ اُن کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور چہروں سے قہر و جلال ٹپکنے لگا۔ وہ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے اور چڑیا کو پکڑنے کے لیے بے تحاشا دوڑنے لگے۔ اس کوشش میں ایک دانش مند گر پڑا، اُسے شدید چوٹ آئی۔ اُس کے ساتھی دانش مند چڑیا کو پکڑنے کے لیے بُری طرح لپکے۔ اُن کی ٹکر سے کتابوں کی الماریاں گر پڑیں، پورے کمرے میں کتابیں ہی کتابیں بکھر گئیں۔ دانش مندوں نے پروا نہیں کی۔ وہ چڑیا کو پکڑنے کی لگاتار کوشش کرتے رہے۔ نتیجتہً کمرے کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ دانش مندوں کی ٹانگیں، کہنیاں، سر اور ہاتھ زخمی ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر اُن کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ انھوں نے چڑیا کو پھر گرفتار کر لیا۔

نوجوان دانش مند نے چڑیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ "یہ چڑیا غالباً چھجے پر جا کر ٹِک گئی ہو گی اسی لیے گرنے سے بچ گئی۔ گر جاتی تو اِس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا یقینی تھا مگر خیر اب کے یہ ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکے گی۔" اُس نے اپنا ہاتھ لمبا کر کے چڑیا کو کھڑکی کے ذریعے چھجے سے پرے پھینک دیا۔

چند منٹ بعد چڑیا پھر لوٹ آئی۔ دانش مندوں کے غصّے کا پارہ انتہائی بلندی پر پہنچ گیا۔ انھوں نے پژمردہ اور غم زدہ لہجے میں کہا "یہ ذرا سی چڑیا ہمارا تمسخر اُڑا رہی ہے۔ کیا اسے نہیں معلوم کہ ہم اس مملکت کے دانش مند لوگ ہیں، دانش مند ترین لوگ۔ یہ آخر اب تک مر کیوں نہیں سکی؟ گل دان بلند عمارت سے نیچے گر کر سینکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتا ہے تو یہ چڑیا پرزے پرزے کیوں نہیں ہو سکتی؟"

"یہ عقدہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہا ہے۔" نوجوان دانش مند نے اپنے بے ریش چہرے پر ہاتھ پھیرے "گل دان گر کے [illegible] زمین سے جا کر ٹکرایا تھا مگر یہ چڑیا ہمارے ساتھ کوئی [illegible] چالاکی کر رہی ہے، مجھے اِس کا پورا یقین ہے۔ یہ سیدھی [illegible] جا کر نہیں ٹکراتی بلکہ آدھے راستے ہی میں کہیں رُک جاتی [illegible] کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ اپنی اِس چالاکی کے باوجود یہ [illegible] تبدیل ہو جائے گی؟"

"ہم سمجھ گئے، سمجھ گئے۔" کئی دانش مندوں نے ایک [illegible]

"یہ چڑیا ہمیں مسلسل بے وقوف بنا رہی ہے۔ کیسے [illegible] بنا رہی ہے؟ ہمیں یعنی اِس مملکت کے دانش مند ترین آدمیوں کو۔ کتنے افسوس اور رنج کا مقام ہے۔" ایک تھرتھراتی ہوئی آو[illegible]

"فکر نہ کیجیے۔" نوجوان دانش مند نے کہا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، چڑیا اب کے ہرگز واپس نہیں آئے گی۔" وہ چڑیا [illegible] گرفت میں لے کر کھڑکی کی طرف گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے کھڑ[illegible] پوری طرح کھول دی اور کھڑکی کی راہ سے چھجے پر اُتر گیا۔ چھجے پر اُترتے کے اُس نے چڑیا پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی۔ چڑ[illegible] پریشان اور بھولی بھالی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ دانش [illegible] چڑیا سے مخاطب ہوا۔ "چڑیا! تُو نے ہمیں بہت بے وقوف بنایا مگر افسوس، یہ تیری آخری چالاکی تھی۔ اب میں تیرے ساتھ خود بھی چھلانگ لگاؤں گا تاکہ دیکھوں کہ تُو سیدھی نیچے کی طرف کیوں نہیں جاتی۔ یقیناً تُو اِس بار سیدھی نیچے جائے گی اور تیر[illegible] سینکڑوں ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ بے حد افسوس ناک بات [illegible] گی مگر تُو اسی سزا کی مستحق ہے۔" اُس نے چڑیا کو مٹھی میں بند کر لیا تاکہ وہ پھسل نہ جائے پھر اِس نوجوان دانش مند نے ساتویں منزل کے چھجے سے چھلانگ لگا دی۔

دوسرے دانش مند دوبارہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انھیں یقین تھا کہ چڑیا اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ وہ اپنے نوجوان ساتھی کی ذہانت پر عش عش کر رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کے ایک دانش مند نے نوجوان کی تعریف کرتے ہوئے کہا "دوستو! دیکھ لیجیے گا، صرف چند برسوں میں وہ اتنا بڑا دانش مند ہو جائے گا، جتنا بڑا میں ہوں۔"

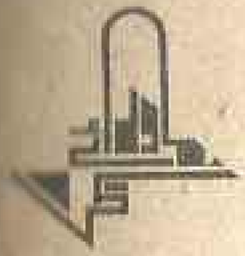


حسرت کشیدگان کے لیے ایک تلخ راز

انگریزی سے ایک مترجم و نفیس کہانی

ایک آدمی کا قصہ جو خود اپنے مداح خطرناک سازش کا شکار تھا

اس کی تحریر میں بہت سوں کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے



"ہرگز نہیں۔ کیا تم مجھے اتنا لالچی سمجھتے ہو؟ بھلا محض پندرہ ہزار ڈالر کے لیے میں بک جاؤں گا؟ اپنی زندگی داؤ پر لگا دوں گا؟" ہربرٹ نے کہا۔ "اتنے بڑے کام کے لیے اتنی سی رقم؟ تمہیں شرم آنی چاہیے ڈیوڈ!"

ڈیوڈ نے اپنے اعصاب سمیٹے اور آہستگی سے کہا۔ "اچھا بیس ہزار ڈالر؟"

"کام کی نوعیت کے لحاظ سے یہ بھی کم ہیں۔" ہربرٹ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں پچیس ہزار کی پیش کش کروں؟"

ہربرٹ چند لمحوں تک ڈیوڈ کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ ڈیوڈ کا پورا بوجھ ایک ٹانگ پر تھا۔ ہربرٹ نے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ میں انگلی گھونپی۔ "ایک لاکھ ڈالر۔ کیا سمجھے؟"

"ایک ل لاکھ۔" ڈیوڈ ہکلا گیا۔ "یہ ناممکن ہے۔ میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔"

"نہیں دے سکتے تو مت دو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔" ہربرٹ نے اس کا لجلجا ہاتھ اپنی آہنی گرفت میں لے کے ایک جھٹکے سے مصافحہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹھیرو ہربرٹ!" ڈیوڈ نے درخواست کی۔ ہربرٹ دروازے کے قریب رک کے مڑا اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے ڈیوڈ کو دیکھنے لگا۔ ڈیوڈ نے دراز قد ہربرٹ پر اوپر سے نیچے تک ایک نظر ڈالی اور بے بسی سے بولا۔ "بہتر ہے، میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح ایک لاکھ ڈالر اکٹھے کر لوں چاہے مجھے اپنے اسٹاک بیچنے پڑیں۔ تمہیں ایک لاکھ ڈالر مل جائیں گے۔" اس نے کچھ رک کے کہا۔ "تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو۔ اب تمہیں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ ہماری تیاریاں بھی سب مکمل ہیں۔"

"میں بھی تیار ہوں۔" ہربرٹ کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔

ہربرٹ ایک پرائیویٹ اسپتال کی راہ داری میں ڈیوڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے چل رہا تھا۔ راہ داری اسپیشل کمروں کی طرف جاتی تھی۔ ڈیوڈ اور ہربرٹ کے لیے ایک کمرہ تک ہو چکا تھا۔ وہ ایک خطرناک اور خفیہ آپریشن کے لیے جا رہے تھے۔ آپریشن کرنے والی مشہور سرجن ڈاکٹر فلیکر نے لی تھی۔ ہربرٹ سوچ رہا تھا یہ سودا ایک لاکھ ڈالر میں بھی سستا ہے۔ کیوں کہ اس نازک آپریشن میں اموات کی شرح ستر فی صد ہے لیکن بہر حال وہ سودا کر چکا تھا اور اب اس میں سودے سے منحرف ہونے کی جرأت نہیں تھی۔



ڈیوڈ کو حسین و جمیل ماریا سے شدید محبت تھی۔ وہ پانچ سال سے اس کی محبت میں گرفتار تھا۔ ماریا سے اس کی پہلی ملاقات تئیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس مختصر عمر میں وہ ایک بہت بڑی کمپنی کا نائب صدر بن چکا تھا۔ کمپنی اس کی ذہانت اور محنت کے باعث کامیابی سے چل رہی تھی مگر ماریا کے معاملے میں اس کی ذہانت اور محنت زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ پابندی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل رہے تھے لیکن ڈیوڈ ابھی تک کنوارا تھا۔ ماریا اس سے شادی پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ کچھ عرصے سے ڈیوڈ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ماریا میں اب پہلے والی گرم جوشی نہیں ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی لیکن کیوں؟ اس کیوں کا جواب تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماریا ایک بھرپور عورت ہے۔ اس کا رجحان اپنے ہی جیسے کسی بھرپور مرد کی طرف ہوگا۔ "شاید اسی لیے تم مجھ سے کھنچتی جا رہی ہو؟" آخر ایک روز ڈیوڈ نے ماریا سے پوچھ ہی لیا۔ اس روز وہ آخری مرتبہ ماریا کے فلیٹ گیا تھا۔ وہ ماریا کو کلب لے جانا چاہتا تھا لیکن ماریا آنا کانی کر رہی تھی۔ ڈیوڈ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "ہاں تم بھلا میرے ساتھ کیوں جانے لگیں۔ میرا قد جو چھوٹا ہے۔ تم تو کسی دراز قد مرد کے ساتھ رقص کرنا چاہتی ہو۔"

"یہ کوئی بنیادی وجہ نہیں ہے۔" ماریا نے کہا۔

"ممکن ہے نہ ہو لیکن ایک بات سن لو۔ اگر میں ٹھگنا ہوں تو تم بھی اتنی حسین نہیں ہو۔ ہاں۔"



چوتھا رنگ

جیکی ہٹ یالڈگٹ * شاہدہ شاہ

"ڈیوڈ!" ماریا نے ناگواری سے کہا۔" میری طبیعت ناساز ہے۔
... چھوڑ دو۔"
ڈیوڈ چند لمحوں تک اُسے گھورتا رہا پھر پلنگ کے قریب جا کے
... جھک گیا۔ اس کے چہرے کی برہمی نرمی میں بدل گئی۔" ماری!
... ماری!" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔
"ڈیوڈ!" ماریا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ اچھی طرح جانتی
تھی کہ ڈیوڈ کی خوشامد کا کیا مقصد ہوتا ہے۔
"ماری! آج میں جو کچھ بھی کہنا چاہتا ہوں، مجھے کہہ لینے دو۔"
اس نے ماریا کے بازو پکڑ کر اُسے پلنگ سے اٹھایا اور کوچ پر بٹھا دیا۔
پھر وہ خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔" ڈیئر! تم جانتی ہو کہ میں تم سے
کتنی محبت کرتا ہوں مگر تم.... تم مجھے خود سے دور رکھنا چاہتی ہو۔
ایسا کیوں ہے؟" ماریا پہلو بدل کر رہ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ
سکی۔ ڈیوڈ نے بات جاری رکھی۔" مجھے معلوم ہے، میں تمہارے ساتھ
چلتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔ کوتاہ قامتی کے باعث لوگ مجھے تمہارا مناسب
جوڑ نہیں سمجھتے۔ میری شخصیت بھی جاذبِ نظر نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی
اعتراف ہے کہ میں رقص میں مہارت نہیں رکھتا اور تمہیں رقص سے
والہانہ شغف ہے لیکن ماری! یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ انہیں کسوٹی
بنا لیا جائے۔ اصل چیز تو محبت ہے۔" اُس نے ماریا کا ہاتھ اپنے دھڑکتے
ہوئے دل پر رکھ لیا۔ ماریا کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ ڈیوڈ بولا۔" ڈیئر!
میری طرف دیکھو۔ کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟"
"کیوں نہیں ڈیوڈ! کیوں نہیں۔ مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔"
"تو پھر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟" ماریا خاموش
رہی۔ ڈیوڈ نے اصرار کیا۔" جواب دو؟"
"ہم دوست ہیں ڈیوڈ! صرف دوست۔" ماریا نے بڑی مشکل
سے کہا۔" میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"
ڈیوڈ کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی۔ آنکھوں میں اُداسی چھا
گئی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا پھر بولا
"تم اٹھائیس سال کی ہو چکی ہو۔ یہ عمر تمہارے شباب کی انتہا ہے۔
اب گزرنے والا ہر لمحہ تمہارا حسن ماند کرتا جائے گا۔ تم نے کبھی یہ بھی
سوچا کہ موجودہ عمر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہیں اس احمق کی پیشکش
قبول کر لینی چاہیے؟" وہ رُکا۔" میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔
غور سے سن لو میرے سوا کوئی تمہیں اتنا پیار نہیں دے سکتا۔"
ماریا ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔" کیا تم مجھے تنہا نہیں چھوڑ
سکتے ڈیوڈ؟" اس کی دلی کیفیت چہرے سے ظاہر تھی پھر بھی وہ نرمی

سے بولی: "تمھارے ساتھ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں ساری عمر کنواری رہوں۔"

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" ڈیوڈ کو غصہ آگیا۔ "میں آئندہ تم سے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کروں گا۔"

وہ ماریا کے مکان سے باہر آگیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے کو تو اُس نے کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ شادی کے موضوع پر اُس سے بات نہیں کرے گا مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اِس فیصلے پر قائم رہنا اُس کے لیے ناممکن ہے۔ وہ جب تک زندہ رہے گا، ماریا سے شادی کی کوشش جاری رہے گی۔ اس سے قطع نظر کہ ماریا اُس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

ڈیوڈ اور ہربرٹ ایک خاص قسم کی آپریشن ٹیبل پر پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ ڈیوڈ اپنے اور ماریا کے روابط بتا رہا تھا۔

"سمجھے ہربرٹ! مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے محبت تو بہت کرتی ہے لیکن چونکہ میری ظاہری شخصیت پرکشش نہیں ہے اس لیے میرے ساتھ شادی کرنے سے گریزاں ہے۔"

"شاید اسی لیے تم مجھ سے جسم تبدیل کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں اسی لیے۔ تم ایک بھرپور مرد ہو۔ میں اگر تمھاری شخصیت میں ماریا کے سامنے جاؤں گا تو وہ مجھے ٹھکرا نہیں سکے گی۔"

"تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ جسم کی تبدیلی سے حالات ابھی تبدیل ہو جائیں گے۔ یہ تو محض ظاہری تبدیلی ہو گی۔ باطنی طور پر تم وہی رہو گے جو ہو۔"

"ہاں اِس حقیقت سے میں آگاہ ہوں لیکن ماریا باطنی خوبیوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ یہی تو مسئلہ ہے۔ وہ بہت سطحی انداز میں سوچتی ہے۔ اُسے کون سمجھائے کہ صورت تو ایک فریب ہے، اصل چیز سیرت ہے۔"

"تم نے ابھی کہا کہ وہ تم سے محبت بھی کرتی ہے؟"

"ہاں کرتی ہے لیکن اب نہ جانے کیوں، اُس کی نگاہوں میں پہلے والی بات نہیں رہی۔ تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"لیکن ڈیوڈ! اگر وہ تم سے محبت کرتی ہے یا کرتی تھی تو اُکتا کیوں گئی ہے اور شادی ......"

"نہیں۔" ڈیوڈ نے ہربرٹ کی بات کاٹ دی۔ "اصل بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے نہیں، میرے ٹھگنے پن اور میرے بشرے سے اُکتا چکی ہے۔ اُس کی سرد مہری میں روح پھونکنے کے لیے ضروری ہے کہ میں خود کو ایک نئی شخصیت میں ڈھال لوں۔"

"لیکن میرے جسم میں منتقل ہونے کے بعد ماریا سے تمھارا رویہ کیا ہو گا؟" ہربرٹ نے پوچھا۔

ڈیوڈ نے جذباتی لہجے میں کہا: "میں اُس کے ساتھ نئے سرے سے تعلقات استوار کروں گا۔ اب میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ میں اُسے محبت کے ایک نئے انداز سے آشنا کروں گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مرتبہ اُسے پہلے کی طرح ڈھیل نہیں دوں گا۔"

"تم خود کو یکسر کیوں تبدیل کر رہے ہو؟ کیا اپنی موجودہ شکل و شباہت میں کچھ اصلاح نہیں کر سکتے؟"

"نہیں کر سکتا۔ سب سن لو۔ مجھ سے کچھ زبردست غلطیاں ہو چکی ہیں اُن کا ازالہ ممکن نہیں ہے۔ میری موجودہ شکل و شباہت کے متعلق ماریا کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔ تم جانتے ہو کسی کے ذہن میں جو خیالات جم چکے ہوں اُنھیں بدلنا آسان نہیں ہوتا۔"

"میرا خیال ہے۔" ہربرٹ نے اختلاف کیا۔ "کسی کے بھی خیالات آسانی سے بدلے جا سکتے ہیں مگر تمھارا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ تم ماریا سے اتنے ٹوٹ کر محبت کرتے ہو کہ وہ تمھارے دل و دماغ پر مسلط ہو چکی ہے اور تمھاری یہ کمزوری اُس کے علم میں ہے لہٰذا اب کم سے کم تم اُس کے خیالات تبدیل نہیں کر سکتے۔"

ڈیوڈ نے اقرار کیا: "یہ واقعی میں اُس سے اپنی محبت نہیں چھپا سکا لیکن اِس بار اپنا یہ جذبہ اُس وقت تک ظاہر نہیں ہونے دوں گا جب تک اُسے شادی کی انگوٹھی نہ پہنا دوں۔ اب کے پانچ سال تک اُس کے پیچھے خوار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ دیکھ لینا، میں دو مہینے کے اندر اندر اُس سے شادی کی بات کر لوں گا اور اُسے یہ احساس تک نہیں ہو گا کہ میں اُس سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔"

"تم اُسے اپنے جسم کے تبادلے سے آگاہ کرو گے یا نہیں؟"

"کروں گا مگر شادی کے بعد، شادی سے پہلے ہرگز نہیں۔"

"آمین!" ہربرٹ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ "میری خواہشات تمھارے ساتھ ہیں۔ کاش اپنا آپریشن کامیاب رہے۔"

"آپریشن یقیناً کامیاب ہو گا۔ ڈاکٹر فلیکر ایک ماہر ترین سرجن ہیں۔ وہ ایسے متعدد آپریشن کر چکے ہیں۔" ڈیوڈ نے گرم جوشی سے یقین دلایا۔

"یقیناً وہ ایسے متعدد تجربے کر چکے ہیں مگر صرف کتوں بندروں پر، انسانوں پر نہیں۔" ہربرٹ مسکرا دیا۔

"تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپریشن انسان کا ہو یا جانور کا طریقہ ایک ہی ہے۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

سید مصطفیٰ علی بریلوی کے کتب خانے سے

[illegible] ان کا تعلق مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ابتدائی دور سے تھا۔ ۱۸۹۱ء کا ذکر ہے۔ حیدر آباد دکن میں عزیز مرزا کو ان کی [illegible] کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ پھر کورٹ آف وارڈز کا کام اُن کے سپرد ہوا۔ اس سلسلے میں دکن کے نظام نے انھیں تین سو [illegible] یتیموں کے مال سے اپنا پیٹ بھرنا نہیں چاہتا۔"

[illegible] کے زمانے میں مولوی عزیز مرزا ریاست کے بیڑ نامی ایک ضلع میں کلکٹر تھے۔ اُن دنوں عدالت سے بلوے اور [illegible] عدالت عالیہ اور نظام دکن نے سزا کی توثیق کر دی۔ رواج کے مطابق دونوں قیدی ضلع کے صدر مقام لے جائے گئے تاکہ [illegible] عزیز مرزا نے انھیں اُن کی پسند کے آخری کھانے کھلانے کا حکم دیا۔ کھانے آ گئے۔ دونوں قیدی سر جھکا کے کھانے لگے۔ عزیز مرزا [illegible] تک پہنچنے سے پہلے کچھ سوچ لیا ہوتا۔ پہلے سوچ لیتے تو آج یہ نوبت نہ آتی۔" ایک قیدی نے جواب دیا "سرکار! سوچتا تو صرف مجھے [illegible] یہ تو نہ جرم سے واقف ہے نہ اس نے جرم میں کوئی مدد کی ہے۔ یہ قطعی قاتل نہیں ہے۔ بیچارہ خواہ مخواہ پولیس کے ظلم کا شکار ہو [illegible]

[illegible] شخص سے پوچھا "کیوں میاں! کیا واقعی تمھارا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے؟" اُس شخص نے ایک سرد آہ بھری "سرکار! تعلق کیسا؟ [illegible] حاکموں نے مجھے بے خطا قاتل قرار دے دیا ہے۔"

[illegible] وہ فوراً وہاں سے اٹھ گئے۔ انھوں نے مقدمے کی فائل نکلوا کر اُسے شروع سے آخر تک دیکھا۔ معلوم ہوا کہ تحقیق و تفتیش میں ایک جگہ لغزش ہو گئی تھی۔ [illegible] عزیز مرزا نے اسی وقت فائل پر لکھا "ایک شخص بالکل بے گناہ ہے۔ میں نے اس کی پھانسی ملتوی کر دی ہے۔ مقدمے پر نظرثانی کی جائے۔ [illegible] بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگوں گا۔ میرے دلائل حضور نظام کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں۔ اگر پھر بھی شاہی منشا یہی ہے کہ مقدمے پر [illegible] دونوں قیدیوں کو پھانسی دی جائے تو میں ملازمت سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ میرے بعد میرا کوئی جانشین اس عظیم گناہ کا مرتکب ہو تو ہو میں [illegible] کے دن گواہی نہیں دوں گا کہ اُن کے حکم سے ایک بے گناہ قتل کر دیا گیا تھا۔"

[illegible] کے احباب کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ انھوں نے مولوی صاحب کو سمجھایا "دیکھیے، آپ ضابطوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، آپ پر شاہی عتاب نازل ہو [illegible] پھانسی کا حکم دیا ہے۔ اس صورت میں آپ کی گردن پر گناہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گناہ تو اُس جج کے سر ہوگا جس کے غلط فیصلے سے اس شخص کی جان [illegible] تعلق؟ آپ ویسے ہی حاسدوں کے نرغے میں ہیں۔ بیٹھے بٹھائے مزید مصیبت مول لینے سے کیا فائدہ؟ یہ تو وہی بات ہوئی۔ آ بیل مجھے مار۔"

[illegible] احباب کا مشورہ نہیں مانا اور فائل حیدر آباد بھیج دی۔ نظام نے اُن کا نوٹ پڑھا اور اُس کی تائید کی۔ اس طرح ایک بے قصور کی جان بچ گئی

[illegible] کی تحریر کردہ "کتاب محفلِ عزیز" سے اقتباس

[illegible] اپنے مددگار کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ آپریشن [illegible] شروع ہونے میں دیر نہیں لگی۔

[illegible] کامیابی کی صورت میں نکلا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ ڈیوڈ [illegible] نے گویا مر کر دوبارہ زندگی پائی۔ ڈاکٹر فلیکر نے ربڑ کے [illegible] اس کے ہونٹوں پر خفیف تبسم تھا۔ فضا بہت [illegible] پستہ قد ڈیوڈ کے سر میں لمبے تڑنگے ہربرٹ کا دماغ [illegible] لمبے تڑنگے ہربرٹ کے سر میں پستہ قد ڈیوڈ کا دماغ منتقل ہو [illegible] منتقلی کے باوجود دونوں دماغ معمول کے مطابق کام کر رہے [illegible] اب وہ دونوں ایک دوسرے کی آپریشن سے قبل کی زندگی [illegible] سے شروع کر سکتے تھے۔ وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے میں [illegible] ہو چکے تھے۔ انھیں ایک دوسرے کے متعلق آپریشن سے [illegible] کی ایک ایک بات معلوم تھی۔ اب ڈیوڈ، ہربرٹ بن چکا [illegible] اور ہربرٹ ڈیوڈ۔

ڈیوڈ، اصل ڈیوڈ اسپتال سے نکلنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ [illegible] نے صحت مند اور دراز قد جسم کے ساتھ جلد از جلد باہر [illegible] چاہتا تھا۔ اس جسم کے لیے اس نے خطیر رقم خرچ کی تھی۔ ایک لاکھ ڈالر تو صرف ہربرٹ نے لیے تھے۔ ڈاکٹر کی فیس اور اسپتال وغیرہ کے اخراجات الگ تھے۔

تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں صرف ایک کمرے میں نیلا بلب روشن تھا۔ ریڈیوگرام سے جاز کی ہلکی ہلکی لہریں پھوٹ رہی تھیں اور نیلگوں ماحول پر سحر سا طاری کر رہی تھیں۔ یہ ہربرٹ یعنی سابق ڈیوڈ کا نیا فلیٹ تھا۔ ہربرٹ اور ماریا ڈانسنگ فلور پر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے موسیقی کی لہروں کے ساتھ ساتھ رقص کر رہے تھے۔ "ماریا!" ہربرٹ نے سرگوشی کی۔ "تمھیں یاد ہے۔ اپنی دوستی کو پورے دو مہینے ہو چکے ہیں۔"

"کیا یہ کوئی طویل مدت ہے ہربرٹ؟" ماریا نے مترنم لہجے میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ بھلا تمھاری رفاقت میں وقت طویل ہو سکتا ہے؟"

"اوہ! تم کتنے اچھے ہو ڈیئر!"

"ڈارلنگ! یہ بتاؤ، میرے بارے میں تمھارے خیالات کیا ہیں؟ کیا تم مجھے پسند کرتی ہو؟" ماریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے

نازک نازک ہونٹ اُس کی گردن پر رکھ دیے۔ ڈیوڈ نے سوال دُہرایا۔
"کیا تم مجھے پسند کرتی ہو؟" ماریا مُسکرا کر رہ گئی۔ ڈیوڈ اُسے سینے سے لگائے موسیقی کی لہروں پر تھرکتا رہا۔



ماریا سے دوبارہ ملاقات ڈیوڈ کے لیے زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوئی تھی۔ آپریشن سے پہلے دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پا چکا تھا۔ اُس کی رُو سے آپریشن کے بعد نئے ڈیوڈ یعنی سابق ہربرٹ نے پرانے ڈیوڈ یعنی نئے ہربرٹ کو اپنا ایک پرانا کالج فیلو کہہ کے ماریا سے ملوایا۔ نیا ہربرٹ ماریا سے تعلقات بڑھانے لگا۔ وہ یہ بات ہر وقت یاد رکھتا تھا کہ اُس سے گزشتہ زندگی کی کوئی غلطی دوبارہ سرزد نہ ہونے پائے۔ ماریا ہربرٹ سے آہستہ آہستہ متاثر ہو رہی تھی۔ ہربرٹ اُس کے ملائم شانے سہلاتا تو ماریا کے بدن میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ ہربرٹ کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور اُس کی آواز بھی مردانہ تھی۔ کچھ لڑکیاں یہ چاہتی ہیں کہ محبت کے معاملے میں مرد سبقت نہ کرے بلکہ یہ کارروائی وہ خود انجام دیں۔ ہربرٹ سابقہ زندگی میں دیکھ چکا تھا کہ ماریا اسی مزاج کی لڑکی ہے۔ چنانچہ اِس بار ہربرٹ نے پہل نہیں کی۔ ماریا کو خود قدم بڑھانے کا موقع دیا۔ نتیجہ مثبت نکلا۔ ماریا پکے ہوئے سیب کی طرح اُس کی جھولی میں آگری۔ ماریا کو شبہ تک نہ ہوا کہ ہربرٹ کے روپ میں دراصل ڈیوڈ ہے۔

ڈیوڈ اس کھیل کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ کوئی ڈیڑھ ہفتے بعد اُس نے پھر ماریا سے بات چھیڑی۔ ماریا کا مخملیں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے وہ ہربرٹ کی بھوری چمکیلی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ڈارلنگ! میں تم سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو ڈیئر!" ماریا نیم مدہوشی کی کیفیت میں بولی۔

"تمھیں یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ میں بہت جلد تم سے ایک اہم سوال کرنے والا ہوں؟"

"یاد ہے ہربرٹ! مگر کہیں تم....."

"ہاں ہاں جان!" ڈیوڈ جلدی سے بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم میری شریکِ زندگی بن جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں، ہماری مشترکہ زندگی انتہائی پُرمسرت گزرے گی۔ ہنی مون کے لیے میں ایک چھوٹا سا خوب صورت بنگلا لے لوں گا۔ اُس میں راحت و آسائش کا ہر سامان بہم ہو گا۔ ہنی مون کے دوران تمھیں میں اپنی زندگی کے ایک اہم راز سے آگاہ کروں گا۔"

"اوہ اوہ۔" ماریا کی آواز بجھ گئی۔ "میں تم سے شادی نہیں کر سکتی ہربرٹ! نہیں کر سکتی۔"

"نہیں کر سکتیں؟" ڈیوڈ دنگ رہ گیا۔ "لیکن کیوں؟" ...
... نے سکی، پریشان ہو کر رہ گئی۔ ڈیوڈ نے تشویش سے پوچھا ...
... ہے ڈارلنگ! تم یکایک اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟"

"ہربرٹ ڈارلنگ! میں تمھیں کیسے بتاؤں۔ اُف ..." ... سر تھام لیا۔

ڈیوڈ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "کیا تم ..... کسی اور سے؟"

"ہاں!" ماریا کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"تم نے پہلے تو کبھی نہیں بتایا۔ اُسے کب سے چاہتی ہو؟"

"طویل مدت سے۔" ماریا کا چہرہ پُرسکون ہو گیا۔ ... پہنچ کر مطمئن ہو جائے۔ "میں اُسے پورے پانچ سال ... ہوں۔ وہ بھی مجھے بے حد چاہتا ہے۔" ڈیوڈ کا منہ کھلا کا کھلا ... ماریا کہتی رہی۔ "وہ دیکھنے میں اتنا اچھا نہیں ہے مگر شکل ... ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ میں نے اُس کی ظاہری شخصیت ... نہیں رکھی۔" ماریا دل فریب انداز میں مسکرائی۔ "بس کوئی عجیب احساس مجھے اُس سے دور رکھتا تھا۔ تم میرا مطلب سمجھ لو، ہربرٹ ... کا قد ذرا..... چھوٹا تھا۔ نیز تحمل اور برداشت کے بجائے اُس ... جلد بازی تھی۔" ماریا نے گفتگو جاری رکھی لیکن ڈیوڈ آگے ... سن سکا۔ اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ پیشانی پر پسینہ اُبھر آیا ... اور سانس بے قابو ہو گئی تھی۔ ماریا نے کہا۔ "لیکن تقریباً دو ہفتے ... وہ یک سر بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اُس کا رویّہ معقول ہو گیا ... اُس میں مردانہ پن آ گیا ہے۔ میں پہلے اُسے دیکھ کر کوفت میں ... ہو جاتی تھی، اب یہ کیفیت ختم ہو گئی ہے۔ وہ مجھے ایک پرکشش ... لگنے لگا ہے۔" ماریا مسکرائی۔ یہی مسکراہٹ ڈیوڈ کو پاگل کر دیتی تھی۔

"وہ کوتاہ قامت ضرور ہے لیکن میرے برابر ہے۔" ماریا نے ...
"ہمارا جوڑ قطعی موزوں ہے۔ اب میں تم سے کیا کہوں، بس یہ سمجھ لو ... پرستش کے قابل ہے اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔" ... کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "اور ہربرٹ! میں بھی اُسے بے حد ... چاہنے لگی ہوں۔" ڈیوڈ کی آنکھیں ویران ہو گئیں۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ماریا اُٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے افسوس ہے ہربرٹ ... بہت افسوس ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔"

اُس نے ڈیوڈ کے رخسار پر ایک اچٹتا بوسہ دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر وہی دل آویز مسکراہٹ تھی۔



* ابو المنصور سرمدی

حالاتِ عزیزی • حیاتِ طیبہ • مجموعۂ کمالاتِ عزیزی • حیاتِ شاہ ولی اللہ • روایاتِ الطیب

[illegible] حیرت دہلوی ظہیر الدین سید احمد رحیم بخش دہلوی قاری محمد طیب

[illegible]

[illegible] مسجد میں نماز شروع ہوئی۔ امام [illegible] اکبر کہہ کر نیت باندھی۔ دفعتاً مسجد کے [illegible] بیشتر نمازیوں نے گھبرا کر نیت توڑ [illegible] ایک مشتعل ہجوم دروازے پر قابض ہو چکا [illegible] پاس خنجر تھا، کسی کے ہاتھ میں کٹار تھی، کوئی تلوار [illegible] بہت سے لوگ لاٹھیاں گھما رہے تھے۔ نیت [illegible] کے برعکس ایک بزرگ اور اُن کے چند ساتھی [illegible] نماز پڑھتے رہے۔ انھوں نے ہنگامے کے باوجود [illegible] نماز پوری کی اور سلام پھیر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ [illegible] مضطرب لہجے میں بزرگ سے کہا: "حضور! یہاں سے [illegible] فساد ہونے والا ہے۔"

[illegible] کہا: "مسجد کے چھوٹے دروازے سے نکل چلیے۔"

[illegible] حیرت سے بڑبڑایا: "کیا یہ لوگ خدا کا گھر مقتل میں [illegible] ان کا مطلب کیا ہے؟"

بزرگ نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کے کہا: "خبردار! [illegible] اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔ اگر ہماری موت یہیں لکھی ہے تو [illegible] کون روک سکتا ہے؟ اور اگر ہمارا وقت ابھی نہیں آیا ہے تو [illegible] اطمینان رکھو، ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔"

ہجوم برابر نعرے لگا رہا تھا: "پکڑ لو، کوئی بچ کر نہ جانے پائے۔ ان محمدیوں نے ہمارا دین خراب کر دیا ہے۔ یہ کافر ہیں، مرتد ہیں، انھیں قتل کر دو۔ مار ڈالو۔" کچھ لوگ مسجد کے صحن میں گھس آئے۔ اُن کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے بزرگ اور اُن کے شاگردوں کو گھیر لیا۔ بزرگ نے تحمل سے پوچھا: "کیا تم لوگ ہمیں قتل کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں قتل کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہمارا جرم؟" بزرگ نے دریافت کیا۔

ایک لمبی قبا اور عمامے والے شخص نے طنزاً جواب دیا۔

"سبحان اللہ حضرت کو اپنا جرم بھی نہیں معلوم! کیا بے نیازی ہے۔" پھر وہ غصّے سے بولا: "تُو کافر ہے۔ تُو نے کلامِ پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب اللہ کی توہین ہے۔ تُو نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ تیری سزا موت ہے۔"

بزرگ نے مجمع کو سمجھانا بجھانا چاہا مگر مجمع سنبھلنے کے بجائے بے قابو ہوتا گیا۔ اس صورتِ حال پر بزرگ کو جلال آ گیا۔ اُن کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی۔ انھوں نے چھڑی اٹھائی اور "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا۔ نعرے میں عجیب اثر تھا۔ بپھرے ہوئے لوگ کانپ کانپ اٹھنے لگے۔ بزرگ نے اپنے ساتھیوں کو دروازے کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ بزرگ دروازے سے نکلے اور بازار کھاری باؤلی کی جانب بڑھے۔ مجمع میں کوئی شخص چیخا: "لوگو! خبردار! یہ بہروپیا بھاگنے نہ پائے۔"

بزرگ رُک گئے اور مجمع کی طرف رُخ کر کے بولے: "جو شخص جس جگہ ہے، وہیں ٹھیرا رہے۔ اگر کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو وہ یہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔"

اس تنبیہ کے بعد کسی میں ہلنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بزرگ اور اُن کے ساتھی اطمینان سے روانہ ہو گئے۔

بزرگ کا نام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تھا۔ وہ گھر پہنچے تو اُن کا بڑا لڑکا عبدالعزیز اُن سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔ مسجد کے واقعے کی اطلاع گھر والوں تک پہنچ چکی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے عبدالعزیز سے کہا: "عزیز! روتا کیوں ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ دنیا والوں نے

میرے تیرے سنّی کو کس قدر اذیتیں دی تھیں؟ بیٹا! آنسو پونچھ لے اب ہم جانے والے ہیں۔ ہماری میراث علم ہے۔ اسے سنبھال۔" عبدالعزیز نے ادب سے گردن خم کر دی۔

ہجری ۱۱۷۶ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا انتقال ہوا۔ انھوں نے چار کم سن لڑکے چھوڑے تھے۔ عبدالعزیز کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی میراث ضائع نہ ہونے دی اور علم و عمل کے میدانوں میں ایسی شہرت حاصل کی جو کسی اور کے حصے میں نہ آئی۔ برِصغیر میں محدثین کے جس قدر سلسلے ہیں، اُن سب کا واسطہ عبدالعزیز اور اس کے آبا و اجداد سے ہے۔ باپ ولی اللہ، دادا شاہ عبدالرحیم، پردادا شاہ وجیہہ الدین شہید، چچا شاہ اہل اللہ، بھائی شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی، بھتیجے شاہ اسماعیل، نواسے شاہ محمد اسحاق، شاہ محمد یعقوب اور داماد مولانا عبدالحی۔

شاہ عبدالعزیز ۱۱۵۹ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تاریخی نام غلام حلیم تھا۔ اس نام کے اعداد ۱۱۵۹ ہیں۔ تیس پشتوں بعد اُن کا نسب حضرت عمر فاروق سے جا ملتا ہے۔ اُن کے دادا شاہ عبدالرحیم نے دلّی میں علمِ حدیث کی اشاعت کے لیے مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم عالم گیری عہد کے جلیل القدر علما میں تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے والد شاہ ولی اللہ کے پیدا ہونے کی بشارت شاہ عبدالرحیم کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دی تھی۔ شاہ عبدالرحیم کا کہنا ہے کہ "ایک مرتبہ میں خواجہ قطب الدین کے مرقد کی زیارت کے لیے گیا۔ میں ایک اونچے چبوترے پر کھڑا تھا کہ دفعتہً خواجہ کی روح ظاہر ہوئی اور ارشاد ہوا، عنقریب تمھارے ہاں ایک ہونہار لڑکا پیدا ہوگا۔ تم اس کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ میں حضرت کا یہ ارشاد سن کر حیران ہو گیا۔ میری بیوی ایسی عمر کو پہنچ چکی تھیں کہ اولاد ہونا محال تھا۔ آخر میں نے اس کی یہ تاویل کی کہ اس لڑکے سے خواجہ کا مطلب پوتا ہوگا۔ جوں ہی میرے دل میں یہ خیال گزرا، خواجہ نے کہا، نہیں، خاص تمھارے صلب سے لڑکا پیدا ہوگا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دن بعد مجھے دوسرے نکاح کی خواہش ہوئی اور ولی اللہ پیدا ہوا۔ ابتدا میں یہ واقعہ میرے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکے کا نام تمام خاندان میں ولی اللہ مشہور ہو گیا۔ مگر کچھ مدت گزرنے کے بعد جب مجھے یہ واقعہ یاد آیا تو میں نے اس کا نام بدل کر قطب الدین احمد رکھ دیا۔"

شاہ عبدالعزیز نے پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد فارسی کے چند مختصر رسالے پڑھے۔ پھر صرف دو تین سال میں عربی صرف و نحو کی کتابیں نکال لیں۔ بارہ سال کی عمر میں انھوں نے صرف، نحو، فقہ، اصول، منطق، کلام، عقائد، ہندسہ، ہیئت اور ریاضی وغیرہ میں کامل مہارت اور اعلا لیاقت پیدا کر لی تھی۔ ... بعد حدیث کی تعلیم شروع ہوئی۔ لوگ اُن کی ذہانت اور حا... کر دنگ رہ جاتے تھے۔ کوئی دقیق اور اہم مسئلہ ایسا نہیں تھا ... بیانی نہ کر دیتے ہوں۔ بڑے بڑے عالم حتا کہ خود شاہ ولی اللہ ... زدہ رہ جاتے۔ اُن کے خاندان میں نقلی علوم کے ساتھ سا... کا بھی رواج تھا۔ حدیث اور تفسیر کے ساتھ منطق، ریاضی، ... جغرافیے کی تعلیم بھی دی جاتی تھی لیکن شاہ عبدالعزیز کو نقل... نقلی علوم قرآن، حدیث، فقہ اور تفسیر سے دل چسپی تھی۔ انھوں ... کا ایک ایک لمحہ انھی علوم کی تدریس میں صرف کیا۔ اُن کے ... بھائی انھی کے شاگرد تھے۔ سترہ برس کی عمر میں وہ اپنے وال... جانشین ہوئے اور نہایت سرگرمی سے طلبہ کو پڑھانے لگے۔ ... کہ اُن کی وجہ سے دوامی شہرت نصیب ہوئی۔

اسی عمر میں اُن کی برجستہ گوئی اور ذہانت کے ایسے ... آئے کہ تشنہ لب عش عش کرنے لگے۔ جب انھوں نے مسندِ ارشاد سنبھا... ولی اللہ خاندان کے چند شاگرد قصبہ پھلت سے بیل گاڑی کرا... پر لے کر دلّی کی طرف چلے۔ راستے میں یہ لوگ علمی مباحثہ کرنے ... گاڑی بان ایک ہندو برہمن تھا۔ اُس نے اُن لوگوں سے کہا: "... بات بتاؤ، خدا ہندو ہے یا مسلمان؟" سب نے اپنی اپنی استعداد ... مطابق جوابات دیے مگر وہ کچھ نہ سمجھا۔ آخر عاجز آ کر اُن لوگوں ... کہا: "دلّی چل کر شاہ صاحب سے اس بات کا جواب لے دیں گے۔" دلّی پہنچ کے وہ اپنے ساتھ گاڑی بان کو شاہ عبدالعزیز کے پاس ... گئے۔ اس نے دیکھا کہ سولہ سترہ برس کا ایک لڑکا بیٹھا ہے۔ وہ حیران ہو کر بولا: "کیا بڑے مولوی صاحب یہی ہیں؟" لوگوں نے کہا: "ہاں۔" اُس نے شاہ صاحب سے کہا: "ہماری ایک بات کا جواب دو۔ خدا ہندو ہے یا مسلمان؟" شاہ صاحب نے کہا: "جو بات ہم کہیں، اُسے خوب سوچنا۔ اگر خدا ہندو ہوتا تو گئو بچھیا کیوں ہوتی؟" گاڑی بان لاجواب ہو گیا۔

شاہ عبدالعزیز نے قرآن حفظ کر کے پہلے سال سنایا تو تراویح کی نماز ہو چکی تھی۔ معاً ایک گھڑ سوار بہت عمدہ زرہ بکتر پہنے، برچھا ہاتھ میں لیے آئے اور پوچھنے لگے: "رسول اللہ کہاں تشریف رکھتے ہیں؟" لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور پوچھا: "حضرت! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ کا اسمِ گرامی؟" انھوں نے بتایا: "میرا نام ابوہریرہ ہے۔ سیدِ عالم نے فرمایا تھا کہ ہم عبدالعزیز کا کلامِ مجید سننے چلیں گے۔ یہ فرما کے مجھے انھوں نے ایک کام سے بھیج دیا، اس سبب سے میں دیر میں آیا۔" اتنا کہہ کے وہ غائب ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیز کا زمانہ مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ کا زمانہ تھا۔

[illegible] نے اپنے علم سے ... کے لیے
[illegible] تھا۔ اُن کے لیے یہ بات ناقابلِ
[illegible] اور اصلاحِ حال کا نعرہ لگائے بہت
[illegible] کہتے ہیں لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو
[illegible] شاہ صاحب کو دوچار ہونا پڑتا
[illegible] کئی محاذوں پر لڑنا پڑ رہا
[illegible] دُنیادار علما، مغل سلاطین
[illegible] اس کے ایجنٹ، وہ لوگ جو سوادِ
[illegible] انھوں نے شاہ صاحب اور اُن کے والد
[illegible] سبب ہے کہ شاہ صاحب فتنہ انگیز
[illegible] ہے۔ شاہ صاحب نے جس زمانے
[illegible] اس زمانے میں دلی کا کرتاں نجف خاں تھا۔
[illegible] بغض تھا۔ اس نے شاہ ولی اللہ کے
[illegible] تھے "تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون تحریر
[illegible] مظہر جانِ جاناں کو شہید کرایا۔ شاہ رفیع الدین
[illegible] دلی سے نکال دیا۔ یہ دونوں حضرات مستورات سمیت
[illegible] پیدل گئے۔ اس کے بعد مولانا فخرالدین نظامی
[illegible] کو تو سواری مل گئی، وہ قصبہ پھلت روانہ
[illegible] اور شاہ رفیع الدین کو سواری نہیں ملی چنانچہ
[illegible] پیدل لکھنؤ گئے اور شاہ عبدالعزیز جون پور۔ ان دونوں
[illegible] ایک ساتھ رہنے کا حکم تھا، نہ سواری پر بیٹھنے کا۔ اس
[illegible] عبدالعزیز کا سن پچھتر برس کے قریب تھا، بینائی جاتی
[illegible] ضعف سے اُن کے لیے چند قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ اس
[illegible] انھیں دو دفعہ زہر دلوایا، ایک مرتبہ چھپکلی کی چربی
[illegible] پر ملوا دی، اس سے شاہ صاحب کو برص اور جذام ہو گیا
[illegible] طبیعت وہ پیدل سفر میں انھیں لُو بھی لگی اس لیے اُن
[illegible] سخت حدت پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد نجف خاں کو
[illegible] نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ شاہ رفیع الدین لکھنؤ سے
اور شاہ عبدالعزیز جون پور سے واپس دہلی آئے۔ اُن کی غیر حاضری میں
[illegible] صوفیوں نے اُدھم مچا رکھا تھا۔ بادشاہ، شہزادوں اور شہزادیوں
[illegible] ان کا بے پناہ اثر تھا۔ عوام اُن کی مٹھی میں تھے۔ اُن کی یہ جسارت ہو
گئی تھی کہ وہ حق گو علما اور خلوت گزیں زاہدوں کے پاس آتے اور
کہتے: "اے مسجد کے مینڈھے! کچھ دلوا۔ ہم رنڈی رکھیں گے، شراب پییں
گے، بھنگ گھونٹیں گے۔ اگر نہیں دے گا تو سونٹا مار کر تیری کھوپڑی پاش
پاش کر ڈالیں گے۔" مجبور ہو کر انھیں کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ خاص کر شاہ
عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر بھی دیتے تھے۔ وہ پیسے دیتے
وقت ہمیشہ کہتے: "لو میاں صاحب! اِن پیسوں کا کھانا کھانا۔" لیکن
شاہ عبدالعزیز نے کبھی کسی کو کچھ نہیں دیا۔ اُن کے دبدبے کی وجہ سے
کسی ایسے ویسے کو تو اُن کے سامنے جانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ پھر
بھی بعض مکار طرح طرح کے حیلوں سے اُن سے کچھ اینٹھنا چاہتے اور
نامراد لوٹتے۔ ایک واقعہ مشہور ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے
مزار کا ایک مجاور علما کے پاس جاتا اور کہتا: "مجھ سے قطب صاحب نے
فرمایا ہے کہ آپ کے پاس آؤں، ایک ٹکا دوں اور کلاوہ تمرکاً باندھوں،
لہٰذا تعمیلِ حکم کے لیے حاضر ہوا ہوں۔" یہ کہہ کے وہ ٹکا پیش کرتا
اور کلاوہ باندھتا۔ عالم کو بھی کچھ نہ کچھ نذرانہ مجاور کو دینا پڑتا چنانچہ
اُس نے کسی کو نہ بخشا۔ ہر ایک سے رقمیں اینٹھیں۔ کسی نے اس سے کہا۔
"ہم تو جب جانیں کہ تو شاہ عبدالعزیز سے کچھ وصول کر کے دکھائے۔"
مجاور نے جواب دیا: "یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آج ہی اُن کے
پاس جاتا ہوں۔ قطب صاحب کا نام نامی سُن کر کون جیب خالی نہ کرے
گا۔" غرض وہ ٹکا اور کلاوہ لے کر شاہ عبدالعزیز کے ہاں گیا اور بولا: "میں
قطب صاحب کے حکم پر ٹکا نذر کرنے اور کلاوہ باندھنے آیا ہوں۔" شاہ
عبدالعزیز نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے خدام سے کہا: "کہہ دو کہ ہم
اس وقت وضو سے نہیں ہیں، پھر کسی وقت آئے۔" مجاور بلا کا ڈھیٹ
تھا۔ کہنے لگا: "بہتر ہے، میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" چند گھڑیاں اِدھر اُدھر
گزار کے وہ دوبارہ خانقاہ میں گیا۔ اس بار شاہ عبدالعزیز نے اُسے
بُلالیا۔ اُس نے ٹکا پیش کیا اور اُن کے تمرکاً کلاوہ باندھا، پھر ایک
طرف بیٹھ کر یہ انتظار کرنے لگا کہ اب شاہ عبدالعزیز کچھ دیں گے لیکن
اُنھوں نے توجہ ہی نہ کی۔ خاصی دیر گزر گئی۔ مجاور نے دیکھا کہ یہ تو
ہُوں ہاں بھی نہیں کرتے۔ آخر وہ بولا: "حضرت! مجھے کچھ تبرک مل
جائے۔" شاہ عبدالعزیز نے کہا: "آپ کو حضرت قطب نے بھیجا، آپ
نے اُن کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب جب حضرت مجھے حکم دیں گے
میں بھی آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کر دوں گا۔ فی الوقت آپ
تشریف لے جائیے۔" مجاور اپنا سامنہ لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد
اُسے کسی عالم کے پاس جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں امام شاہی فرقے نے بے حد
گمراہی پھیلائی تھی۔ اس فرقے کے لوگ چار اَبرو کا صفایا کرتے تھے۔
جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں، انھیں حلال کہتے اور حلال کو حرام
بتاتے۔ اس فرقے کا بانی ایک شخص امام شاہ تھا۔ امام شاہ کی قبر سکارپور
کے ایک باغیچے میں تھی اس لیے اُس کے سلسلے والے اپنا نام باغ کی
مناسبت سے رکھتے تھے۔ کسی کا نام گلاب شاہ تھا، کسی کا چنبیلی شاہ
اور کسی کا بہار شاہ وغیرہ۔ جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت آئی
اور اُنھوں نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے ہندوستانیوں کی فوج میں

بھرتی شروع کی تو انھیں بڑی بڑی تنخواہیں دیں۔ وسیع اختیارات بھی دیے۔ لوگ عہدے اور روپے کے لالچ میں کثرت سے بھرتی ہونے لگے۔ اس زمانے میں شاہ جہاں پور کا ایک حسین و جمیل تنومند نوجوان نسیم خاں تھا۔ اسے شعر و سخن سے بھی شوق تھا۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے "تذکرہ گلشن بے خار" میں اس کے حالات درج کیے ہیں۔ وہ انگریزی فوج میں رسال دار تھا اور رخصت لے کر اپنے وطن شاہ جہاں پور جا رہا تھا۔ راستے میں قصبہ شکار پور آیا۔ نسیم خاں وہاں ایک سرائے میں ٹھہرا۔ سرائے کے سامنے ہی وہ باغ تھا جس میں امام شاہ کی قبر تھی۔ اتفاق سے نسیم خاں کھانا کھا کر ٹہلنے نکلا اور اس باغ میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک مکان تھا۔ اس میں امام شاہ کا سجادہ نشین گلزار شاہ رہتا تھا۔ اس زمانے کے محاورے میں اس مکان کو تکیہ کہا جاتا تھا یعنی کٹیا۔ نسیم خاں مکان کے قریب گیا تو گلزار شاہ نے اس کی آہٹ سنی اور مکان کے اندر سے آواز دی "کون؟"

اس زمانے میں لوگ اپنا پورا نام نہیں لیتے تھے اس لیے نسیم خاں نے جواب دیا "نسیم۔" گلزار شاہ نے اندر سے کہا "نسیم ہے تو گلزار سے نہ جا لگے۔"

اس آواز میں عجیب جادو تھا۔ نسیم خاں کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ چند لمحوں بعد گلزار شاہ مکان سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی نسیم خاں بے خود و بدحواس ہو کر اس کے قدموں پر گر پڑا۔ پھر اس نے اسی وقت چار ابرو کا صفایا کرایا اور فقیری اختیار کر لی۔ اپنے ہمراہیوں کو بلا کے اس نے کہہ دیا کہ میرا جس قدر ساز و سامان ہے اس پر تمھیں اختیار ہے۔ جی چاہے تو میرے گھر دے دینا اور جی چاہے تو خود رکھ لینا۔ مجھے اب نہ گھر بار سے کوئی تعلق ہے نہ تم سے کوئی سروکار۔ تم سب اپنے اپنے گھر چلے جاؤ، میں یہیں رہوں گا۔" اس نے بیوی کے نام طلاق نامہ لکھا، اس پر گواہوں کے دستخط کرائے اور ان کے حوالے کر کے کہہ دیا کہ "یہ طلاق نامہ میری بیوی کو دے دینا۔"

ہمراہیوں نے بہت سمجھایا، اونچ نیچ سے آگاہ کیا کہ یوں گھر بار چھوڑنا اور فوج کی نوکری پر لات مارنا کہاں کی دانائی ہے، مصیبت میں پھنسو گے مگر گلزار شاہ کا سحر ایسا چڑھا تھا کہ نسیم خاں نے ایک نہ سنی، وہیں امام شاہ کے باغیچے میں دھونی رما کے بیٹھ گیا۔ بیوی اور اس کے گھر والے صبر و شکر کر کے خاموش ہو رہے۔ فوج نے بھی اسے واپس نہیں بلایا۔ گلزار شاہ کا یہ تصرف چونکہ عجیب تھا اس لیے عوام پر اس کا بہت اثر ہوا اور امام شاہی سلسلے کو انتہائی ترقی ہوئی۔ کچھ عرصے بعد گلزار شاہ مر گیا۔ اس کی جگہ نسیم خاں سجادہ نشین ہوا۔ بہت سے لوگ اس کے سلسلے میں داخل ہوئے اور ہر طرف نسیم خاں نسیم خان کا ڈنکا بجنے لگا۔ انھی دنوں ایک مرتبہ نسیم خاں دہلی کی سیر کے لیے آیا۔ اس نے جب شاہ عبدالعزیز کے علم و فضل اور کشف و کرامت کا حال سنا تو اس کے دل میں حسد کی آگ [illegible] اس نے سوچا کہ اگر شاہ عزیز کو نیچا نہ دکھایا تو کچھ نہ کیا [illegible] وہ اپنے مریدوں سے بولا "ابھی جاتا ہوں اور اگر شاہ صاحب [illegible] اپنے حلقۂ غلامی میں داخل نہ کروں تو نسیم خاں نام نہیں۔"

خانقاہ پہنچ کے اس نے شاہ عزیز کو نہایت تکبر سے [illegible] کہا "شاہ صاحب! شریعت کی قید میں کب تک [illegible] اس قید سے اور چھوڑو یہ شریعت وریعت۔"

شاہ عزیز نے نہایت اخلاق سے کہا "آیئے آیئے [illegible] لائیے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور [illegible] ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے نسیم خاں [illegible]

"میاں صاحب! آپ نے قرآن بھی پڑھا ہے؟"

"جی ہاں پڑھا ہے۔" نسیم خاں نے رعونت سے کہا۔

"کچھ فارسی بھی پڑھی ہے؟"

"بے شک فارسی بھی پڑھی ہے۔" نسیم خاں نے کہا۔

"اور عربی؟"

"جی ہاں۔ عربی میں بھی شُد بُد رکھتا ہوں۔" نسیم خاں بولا۔ [illegible] تک تو پڑھی ہے۔"

"گھڑ سواری بھی آتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ اچھی طرح۔" نسیم خاں نے فخر سے کہا۔

شاہ عزیز بولے "فنون سپہ گری بھی سیکھے ہوں گے؟"

"بہت اچھی طرح۔ پھکیتی، بنکیتی، تیر اندازی اور بندوق چلا[illegible] سب جانتا ہوں۔"

"میاں صاحب! اس فقیری سے پہلے آپ کیا کام کرتے تھے؟"

"فوج میں رسال دار تھا۔"

شاہ عزیز نے پوچھا کہ قرآن کتنے زمانے میں پڑھا؟ فارسی کتنی دیر میں پڑھی اور عربی میں کتنا وقت لگایا؟ سپہ گری کتنی مدت میں سیکھی اور فوج کی ملازمت کتنے عرصے کی؟ اس نے سب سوالوں کے جواب دیے۔ شاہ عزیز نے پوچھا "امام شاہی سلسلے میں کب داخل ہوئے؟" اس نے اس کا بھی جواب دے دیا۔ ان تمام باتوں کا اقرار کرا کے شاہ عبدالعزیز للکارے "او فقیر! سنبھل کر بیٹھ اور سن۔ تو نو مہینے ماں کے پیٹ کی قید میں رہا اور اپنے اختیار سے نہ نکل سکا اور مہینوں تو ماں کے دودھ کی قید میں رہا اور اس سے نہ نکل سکا اور برسوں تو انگلی پکڑنے کی قید میں رہا اور مدتوں اور گود کی قید میں رہا اور قرآن کی قید میں پہلا استاد نے چانٹے بھی مارے ہوں گے، طمانچے بھی لگائے ہوں گے اور قمچیوں سے تیری مرمت بھی کی ہو گی مگر تو اس قید سے نہ نکل سکا۔ برسوں تو فارسی کی قید میں اور عربی کی قید میں اور کشتی کی قید میں رہا اور بنکیتی اور

ہچکیتی کی قید میں رہا اور آگرے گھڑ سواری کی قید کاٹی اور تیر اندازی
کی اور انگریزوں کی قید میں رہا اور اب چار ابرو کی صفائی کی قید میں
ہے۔ پھر تو اپنے آپ کو آزاد کیسے کہہ سکتا ہے؟ سن، اس عالم کون و
مکاں میں کوئی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی قید میں نہ ہو۔ تو چار ابرو کی صفائی
کی قید میں ہے، ہم شریعت کی قید میں ہیں۔ مگر یاد رکھ تیری قید کچی
چاندی ہے، تو اس کی قیمت مانگے گا تو پہلے اسے تپایا جائے گا اور
تپائے بغیر کوئی نہیں لے گا اور ہماری قید پر شاہی سکہ لگا ہوا ہے۔ ہم
اسے جہاں چاہیں گے بھنا لیں گے۔"

اس پُرجلال تقریر سے نعیم خاں پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ
دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا شاہ عزیز کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ اسی وقت
سے اس نے فقیری کو خیرباد کہا اور شاہ عزیز کی غلامی کا حلقہ گردن میں ڈال لیا۔

دہلی میں شہدوں اور بدمعاشوں کی شوریدہ پشتی حد سے بڑھ گئی
تھی۔ کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہیں تھی۔ لوگ بازاروں میں علانیہ فسق و
فجور کرتے۔ بڑے بڑے نقد اور شریف آدمی طوائفیں ملازم رکھنا وضع
داری سمجھتے تھے۔ چند شرفا نے شاہ عزیز سے پوچھا کہ امن و امان کی اس
بگڑتی ہوئی حالت کا اصل سبب کیا ہے؟ جب کہ انگریزی حکومت کا
انتظام بظاہر عمدہ ہے۔" شاہ عزیز نے ہنس کر کہا: "انگریزوں کا انتظام
دکھانے کے لیے ہے۔ اصل انتظام جس قطب کے ہاتھ میں ہے وہ بہت
جلالی بزرگ ہیں۔ اسی سبب سے حال دگرگوں ہے۔ جب وہ تبدیل ہو
جائیں گے تو انتظام بھی درست ہو جائے گا۔" لوگوں کو ان بزرگ سے
ملنے کا اشتیاق ہوا اور وہ اصرار کر کے شاہ عزیز سے ان کا پتہ پوچھنے
لگے۔ شاہ عزیز نے ایک گلی کا نام بتایا کہ وہ اس گلی کے نکڑ پر ملیں گے
اور ان کا حلیہ یہ ہے...." لوگ گئے، وہاں ایک شکستہ حال بڑھا زمین
پر بوریا بچھائے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کے سامنے خربوزوں کا ڈھیر لگا تھا۔
معلوم ہوا کہ یہ خربوزے بیچتا ہے۔ ایک شخص نے بڑھ کر پوچھا: "بڑے
میاں! خربوزے کیسے دیے؟" جواب ملا: "دو پیسے دھڑی۔" انھوں نے دو
پیسے اُن کے آگے پھینکے اور کہا: "ایک دھڑی خربوزے تول دیجیے۔" انھوں
نے کہا: "ترازو وہ پڑی ہے اور باٹ اِدھر ہیں۔ تکلیف تو ہو گی، خود تول
لیجیے۔" لوگوں نے دھڑی بھر خربوزے بھی خود تول لے اور چونکہ بزرگ
کی آزمائش مقصود تھی اس لیے تمام خربوزے چھری سے کاٹ ویلے
اور چکھ چکھ کر پھینکنے شروع کیے کہ "بڑے میاں! یہ تو سب پھیکے ہیں۔"
انھوں نے بے نیازی سے کہا: "اچھا؟ سب پھیکے ہیں تو بھیا اپنے
پیسے لے لو یا جی چاہے تو دھڑی بھر خربوزے اور تول لو۔" انھوں نے
پانچ سیر خربوزے اور اٹھا لیے۔ انھیں بھی کاٹا اور پھیکے کہہ کہہ کر پھینک
دیا۔ بڑے میاں نے اُن کے دو پیسے اٹھا کر واپس دے دیے کہ "بھائی کہیں
اور سے جا کر خرید لو۔" انھوں نے واپس آ کر شاہ عزیز سے سب حال کہا۔

شاہ عزیز بولے: "ہم نہ کہتے تھے کہ سب انتظام کی خرابی [...]
کچھ مدت بعد یکایک دہلی کے حالات درست ہو گئے [...]
جیسی شوریدہ پشتی اور بدمعاشی نہ رہی۔ وہی لوگ جو علانیہ [...]
خفیف الحرکتی کرتے تھے اب چھپ چھپ کر کرنے لگے۔ لوگوں [...]
شاہ عزیز سے کہا کہ "حضرت! معلوم ہوتا ہے دلی کا انتظام کسی [...]
ہاتھ میں آ گیا؟" شاہ عزیز بولے: "صحیح کہتے ہو، اس مرتبہ بہت [...]
آیا ہے۔ وہ ایک سقہ ہے اور آج کل جامع مسجد کی مشرقی سیڑھیوں [...]
پاس کٹورا بجا کر پانی پلاتا ہے لیکن دیکھنا اس سے ذرا سنبھل [...]
کرنا۔" لوگ سقے کی تلاش میں جامع مسجد گئے۔ شاہ عزیز نے جو [...]
بیان کیا تھا، اس کی مدد سے لوگوں نے اسے شناخت کیا۔ اس [...]
آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرے پر دبدبہ تھا۔ لوگوں نے کہا: [...]
میاں! پانی تو پلاؤ۔" سقے نے کہا: "دو پیسے کا کٹورا [...]
لیتا ہوں۔" لوگوں نے دو پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے [...]
کٹورا بھر کر دیا۔ انھوں نے منہ سے لگاتے ہی پانی پھینک دیا [...]
میں تو بال پڑا ہوا ہے۔ اور دو۔" سقے نے کہا: "دو پیسے اور نکالو [...]
کٹورا لے لو۔ اگر منظور نہیں تو چلتے پھرتے نظر آؤ۔ یہیں بھی کسی [...]
خربوزے والا سمجھا ہے؟ اور ہاں دیکھو اس خانقاہ والے بڈھے [...]
کہہ دینا کہ اپنے کام سے کام رکھے، ہمارے معاملات میں دخل دیا [...]
خطا اٹھائے گا۔" سب کان دبا کر چلے آئے اور شاہ عزیز سے سا[...]
حال کہا۔ شاہ عزیز بولے: "ہم نہ کہتے تھے کہ بڑا سخت آدمی ہے۔ [...]
ہم پر نہ جانے کیا آفت ڈھائے۔" کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی نعی[...]
خاں کو توال شاہ عزیز اور ان کے خاندان کا جانی دشمن ہوا تھا۔

شاہ صاحب کی معرکہ آرا کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" نے نیا غضب
ڈھایا۔ اتنی ضخیم کتاب شاہ عبدالعزیز نے بکمال تمام املا کروائی تھی [...]
کی بینائی جاتی رہی تھی لیکن حافظہ بے نظیر تھا۔ مخالفین کی کتابوں [...]
احادیث سے انھوں نے تمام حوالے زبانی دیے مگر کیا مجال جو کوئی [...]
غلط درج ہوا ہو۔ "حیات ولی" کے مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے [...]
مشہور کتابوں کی طویل طویل عبارتیں صرف اپنی یادداشت کے بھروسے [...]
کو لکھوائیں حالانکہ اُن کی عمر اسی سال کے قریب پہنچ گئی تھی اور جسمی
امراض کی کثرت تھی۔ غذا کی قلت سے جسم میں طاقت نہ تھی لیکن نقاہت
کے باوجود علمی نکات اس زور و شور سے بیان کرتے گویا سمندر [...]
تلاطم خیز موجیں اٹھ رہی ہوں۔"

"تحفۂ اثنا عشریہ" لکھنؤ میں پہنچی تو نواب شجاع الدولہ کی حکومت
تھی۔ اس نے کتاب دیکھی تو اپنے ہاں کے علما سے اس کا جواب لکھوانا
چاہا لیکن ہر ایک نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر دلدار علی خاں نام کے
ایک عالم نے جواب لکھنے کا بیڑا اٹھایا مگر مشکل یہ پیش آئی کہ شاہ

[illegible] دل دار علی خاں ایسی نادر سی نثر لکھنے [illegible] سے درخواست کی گئی کہ وہ [illegible] اور کریں تاکہ مضامین کا جواب [illegible] سے ہو جائے لیکن قتیل نے [illegible] نثر لکھنے پر قادر نہیں ہوں اور اس [illegible] سے میری آشنائی ہے۔ میں [illegible] پوری قابلیت صرف کر کے اُسے [illegible] کے تمام لائق و فائق لوگوں کے پاس [illegible] کا جواب لکھ دیا جائے مگر سب نے [illegible] نہیں ہو سکتا۔ مجبور ہو کر وہ شاہ عزیز کے [illegible] تمام جگہ پھر چکی ہوں کسی نے جواب [illegible] پریشان ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ [illegible] اس کا جواب فی البدیہہ لکھوا دیا۔ وہ خط [illegible] ہے۔ میں بار بار کوشش کرتا ہوں کہ اس [illegible] آپ کو عاجز پاتا ہوں۔ خود غور فرما لیجیے کہ [illegible] کی اتنی ضخیم کتاب کے مقابلے میں نثر لکھنا [illegible] ہے۔" بہر حال دل دار علی خاں نے نواب [illegible] بھی بن پڑا، کتاب لکھی پھر مرزا قتیل کو [illegible] اس کا اسلوب دیکھ لیجیے۔ انھوں نے کتاب پر [illegible] مسکرائے۔ نواب نے پوچھا "مسکرائے کیوں ہو، کچھ [illegible] دل دار علی خاں نے کیسی لکھی ہے؟ مرزا قتیل نے [illegible] جانس کا تبلا ہا اور کہاں جامع مسجد دلّی کی سیڑھیوں پر [illegible] "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک"۔ دل دار علی خاں [illegible] کے رہنے والے تھے۔ جائس کے جلا ہے ہندوستان [illegible] ہیں۔

[illegible] کا ایک رئیس نواب سعادت یار خاں نہایت وجیہہ [illegible] ن و جمال کا مالک تھا اور اپنا حُسن دونوں ہاتھوں سے [illegible] دلّی کی ایک سے ایک طرح دار طوائف اُس پر جان دیتی [illegible] ایک رات وہ اپنی عظیم الشان حویلی کی خواب گاہ میں گہری [illegible] کے مزے لے رہا تھا۔ یکایک خواب گاہ کا دروازہ خود بخود کھل [illegible] اور ایک سحر انگیز خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ سعادت یار خاں [illegible] کر بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک عورت کا چہرہ چودھویں کے چاند کے [illegible] دمکتا دیکھا۔ عورت سر سے پاؤں تک سونے کے زیوروں میں [illegible] دل ربائی سے مسکرا رہی تھی۔ اتنے میں وہ پلنگ پر آ بیٹھی۔ نواب [illegible] ہو کر اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آخر سنبھل کر پوچھا "عورت! تو کون [illegible] اور حویلی میں کیوں کر آئی؟" عورت نے ہنس کر کہا "گھبراؤ مت

بغداد

میں ایک درویش کا بہت چرچا تھا۔ حجاج بن یوسف اُس سے ملنے کا مشتاق ہوا۔ ایک روز اُس نے درویش کو طلب کیا اور کہا "اے درویش! میرے لیے دُعائے خیر کر۔" درویش نے فوراً ہاتھ اٹھا کر کہا "الٰہی اسے موت دے۔"

حجاج نے جز بز ہو کے کہا "واہ! یہ کیا دُعا ہوئی؟"

درویش نے جواب دیا "یہ دُعائے خیر ہے، تیرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔"

حجاج نے پوچھا "کیسے؟" درویش نے کہا "تو ظلم کرنے سے چھوٹ جائے گا اور دُوسرے تیرے ظلم سے چھوٹ جائیں گے۔"

ہیں شاہ جنات سلطان محبوب شاہ کی بیٹی تھی۔ عرصۂ دراز سے تمھاری دل دادہ تھی۔ ہر چند کوشش کرتی تھی کہ تمھارے پاس آؤں مگر کوئی موقع حسبِ دل خواہ نہ ملتا تھا۔ آج اتفاق سے نخلِ مراد بر آیا۔" نواب بدحواس تو بہت ہوا لیکن طبیعت اُس نے عاشقانہ پائی تھی؛ ایسے مواقع پر چوکنا نہیں جانتا تھا لہٰذا وہ بے تامّل عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ چند ساعت کے راز و نیاز کے بعد وہ پری زاد رخصت ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ہر رات معیّنہ وقت پر آتی اور کچھ دیر نواب کی خلوت گاہ میں ٹھہر کر چلی جاتی۔ اس روش کو سال بھر گزر گیا۔ ایک رات وہی عورت سخت بدحواس اور پریشان حال آئی اور نواب سے کہنے لگی "سعادت! جلدی اُٹھ اور اپنی جان بچانے کی تدبیر کر۔ میرا باپ اپنے بھید سے واقف ہو گیا اور اُس نے غضب ناک ہو کر کئی دیو تیری ہلاکت کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ وہ دیو غالباً آج صبح تک تجھے زندہ نہ چھوڑیں۔ میری یہ ملاقات آخری سمجھ۔ اب میں یہاں سے جاؤں گی اور فوراً گراں بار زنجیر پہنا کر قید کر دی جاؤں گی لیکن یاد رکھنا میں اسی قید میں جان دے دوں گی۔ تیری جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

سعادت یار خاں پر انتہائی دہشت طاری ہوئی، ہاتھ پاؤں قابو میں نہ رہے۔ اس ناگہانی آفت سے بچنے کا اُسے اس کے سوا کوئی راستہ نہ سوجھا کہ وہ ننگے پاؤں ننگے سر بھاگا ہوا شاہ عزیز کے آستانے کی طرف گیا۔ وہاں پہنچا تو ہر چند خدام نے اُسے اندر جانے سے منع کیا لیکن وہ بے انتہا مضطرب تھا۔ اس نے خدام کی ایک نہ سنی اور جس مکان میں شاہ عزیز مراقب تھے، بے اختیار اُس میں گھس کر شاہ صاحب کے قدموں پر جا گرا۔ شاہ صاحب نے گردن اٹھائی اور کہا۔

"میاں! تمھارا آدھی رات کے وقت یوں حواس باختہ آنا کسی سخت اُفتاد سے خالی نہیں۔ جلد سارا حال کہو۔" نواب نے شروع سے آخر تک سارا حال رو رو کر بیان کیا۔ سب کچھ سننے کے بعد شاہ عزیز بولے۔ "میاں! اگرچہ تمھارا کردار اسی سزا کے لائق ہے مگر فقیر کسی کی التجا رد کرنا پسند نہیں کرتا۔ میرے جدِ امجد کی ہدایت یہی ہے۔ خیر آج کی شب اسی مکان میں آرام کرو۔ کسی حجرے میں جا کر سو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں فقیر اس عورت کے باپ کو بلا کر جان بخشی کرا دے گا۔ اطمینان رکھو۔"

نواب وہاں سے اٹھا اور ایک حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ قریب تھا کہ وہ غافل ہو کر سو جاتا، یکایک ایک بھاری پتھر نہایت ہولناک دھماکے سے نواب کی پائنتی گرا، چودہ طبق روشن ہو گئے۔ نواب چیخیں مارتا ہوا حجرے سے بھاگا اور شاہ صاحب کے اوپر جا گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑے ہوئے تھے، بتیسی بھنچی ہوئی تھی اور ہونٹوں سے کف جاری تھا۔ شاہ عزیز نے فوراً کچھ پڑھ کر دم کیا، اسی وقت اُسے ہوش آ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ شاہ عزیز کے علاوہ پانچ قوی ہیکل اور مہیب صورتوں کے لوگ ادب سے کھڑے ہیں اور شاہ صاحب اُن سے کہہ رہے ہیں: "یہی شخص تمھارا گنہگار ہے اور تمھاری خدمت میں مجھے سفارش کے طور پر پیش کرنے چاہتا ہے کہ تم اس کی خطا سے درگزر کرو۔ اب یہ میرے پاس آ گیا ہے۔ اگر تم میرا کہنا قبول نہیں کرو گے تو جیسی ذلت اِس کے ہاتھ سے تمھاری ہوئی ہے، ویسی ہی اپنی ذلت فقیر تمھارے ہاتھ سے تصور کرے گا۔" پانچوں نے شاہ عزیز کے قدموں پر گر کر بوسے دیے اور نواب کی خطا معاف کر دی۔ اس کے بعد غائب ہو گئے۔

انھی دنوں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک شخص نے اپنے لڑکے کی نسبت شہر کے کسی شریف گھرانے میں ٹھیرائی۔ لڑکے والے دلی سے دور کسی اور قصبے میں بستے تھے۔ وہاں سے دھوم دھام کے ساتھ برات آئی۔ میزبان نے دل کھول کر مہمانوں کی خاطر و مدارات کی اور نکاح کے بعد دستور کے مطابق جہیز دے کر لڑکی کو رخصت کر دیا۔ ایک منزل طے کر کے وہ کسی مقام پر رُکے۔ قیام کے دوران دُلھن اچانک کہیں غائب ہو گئی۔ لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ عورتیں رونے پیٹنے لگیں، مردوں نے جنگل کا کونا کونا چھان مارا۔ سواروں نے چاروں کھونٹ گھوڑے دوڑائے، راہ براہ ہر آدمی سے پوچھا مگر دُلھن کو جیسے زمین نے نگل لیا تھا، کہیں سراغ نہ ملا۔ اُن لوگوں میں یہ ہمت نہ تھی کہ دُلھن کو لیے بغیر اپنے شہر چلے جائیں، نہ غیرت اِس بات کی اجازت دیتی کہ دلی لوٹ چلیں۔ اسی پریشانی میں چار شب و روز گزر گئے۔ اس اثنا میں ایک مسافر اُدھر آنکلا۔ اُس نے یہ ماجرا سنا تو کہا: "میں دلی جا رہا ہوں۔ چند سوار میرے ہمراہ چلیں۔ میں اُنھیں شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ میرے نزدیک اس پریشانی کا علاج صرف شاہ صاحب کے پاس ہے۔" اُسی وقت چند آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر مسافر کے ساتھ شاہ عزیز کے ہاں گئے۔ شاہ صاحب نے سارا حال سن کر کہا: "جس روز یہ واقعہ پیش آیا، فقیر کو اسی روز خبر ہو گئی تھی اور تمھارا منتظر تھا۔ اب اطمینان سے خانقاہ میں ٹھیرو، تھکن اتارو، پھر کوئی تدبیر کرے گا۔" خدام نے ان لوگوں کو کھانا دیا، تھوڑی دیر لوگ سستائے، پھر شاہ صاحب نے اُنھیں بلایا اور کہا: "تم لوگ ماش کی دو روٹیاں تیل سے چپڑ کر چاندنی چوک لے جاؤ۔ وہاں خارشی کتا نظر آئے گا۔ ایک روٹی اُس کے سامنے ڈال دینا۔ وہ غرّائے گا، بھونکے گا اور تمھیں ڈرانے کی کوشش کرے گا۔ خبردار! خوف مت کھانا، نہ اپنی جگہ سے ہلنا۔ کتا جب روٹی کھا لے تو دوسری روٹی بھی اُس کے آگے پھینک دینا اور گھوڑے تیار رکھنا۔ کتا روٹی کھانے کے بعد جدھر جائے، تم گھوڑوں پر سوار ہو کر اس کے پیچھے جانا۔ کتا تمھاری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ میں یہ رقعہ دیتا ہوں، اسے کتے کے گلے میں باندھ دینا۔"

وہ لوگ ماش کی روٹیاں تیل میں تر کر کے چاندنی چوک پہنچے۔ وہاں اُنھیں ایک دُبلا پتلا خارشی کتا دکھائی دیا۔ انھوں نے روٹی اُس کے آگے پھینکی۔ وہ دانت نکال کر غرّایا اور اُن پر حملہ کرنے کو لپکا لیکن لوگ اپنی جگہ جمے رہے یہاں تک کہ انھوں نے دونوں روٹیاں کتے کو کھلائیں اور شاہ صاحب کا رقعہ اُس کی گردن میں دھاگے سے باندھ دیا۔ رقعہ بندھتے ہی کتا برق رفتاری سے ایک جانب دوڑا۔ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کے بیس کوس تک کتے کے تعاقب میں گئے۔ کتا ایک ویرانے میں پہنچ کر رُکا۔ وہاں اُس نے پنجوں سے کچھ زمین کھودی۔ تھوڑی سی گہرائی میں ایک دروازہ سا نظر آیا۔ وہ لوگ باہر کھڑے رہے، کتا دروازے کے اندر چلا گیا۔ لمحوں بعد چند بوڑھے انسانوں جیسے کپڑے پہنے دروازے سے نکلے۔ دُلھن اُن کے ساتھ تھی۔ انھوں نے کہا: "حضرت! شاہ صاحب سے ہمارا سلام عرض کیجیے گا کہ ہمارے محلے میں سے ایک پاجی نے یہ حرکت کی تھی۔ ہم نے اسے سخت سزا دی ہے۔ اُمید وار ہیں کہ یہ خطا معاف فرمائی جائے گی۔" یہ کہہ کر بوڑھے دوبارہ اُسی دروازے میں داخل ہو کر غائب ہو گئے۔ کتا باہر آیا، اُس نے اپنے پنجوں سے مٹی ڈال کر گڑھا بند کر دیا، پھر دلی کی طرف بھاگنے لگا۔ گھڑ سوار بھی اُس کے پیچھے پیچھے دلی آئے اور شاہ صاحب کے پاس پہنچ کے سارا ماجرا سنایا۔ شاہ صاحب نے کہا: "تم لوگوں نے رات کے وقت دُلھن کے ساتھ جنگل میں قیام کر کے غلطی کی۔ اُدھر سے ایک شریر جن کا گزر ہوا، وہ دُلھن کو اپنے

ورق گردانی

سید مصطفیٰ علی بریلوی کا مطالعہ

اکثر میرے صبر سے دوسروں کی سازشیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اگر کینہ ساز کامیاب بھی ہو گئے تو یہ شکست میرا قلب اور ضمیر مجروح نہیں کر سکی البتہ صبر تعطل کا نام نہیں ہے۔ کوشش چھوڑ دینا صبر سمجھا جائے تو یہ صبر زہر قاتل ہے۔ کوشش زندگی اور تعطل موت ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

مجھے عمر کے اوائل میں دوستی کا عظیم ترین راز معلوم ہو گیا تھا۔ کسی کو مطلب کے حصول کے لیے دوست مت بناؤ۔ خود غرضی کو کبھی بیچ میں نہ آنے دو۔ دوستوں کی مدد کرو لیکن انھیں تکمیل کا آلۂ کار نہ بناؤ۔ کیرل لے بائینڈز

کامیاب اور مطمئن زندگی کے لیے ایمان ایک ضروری جزو ہے۔ یہ ایمان خدا پر ہو، یا کسی مذہب پر ہو، یا کسی بلند نصب العین پر۔ اس کے بغیر کامیاب اور مطمئن زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

حمید نظامی

[illegible] سے ملاقات [illegible] کے پاس ایک شخص روتا ہوا آیا [illegible] شاہ صاحب نے پوچھا کہ کیا ہوا؟" [illegible] بیوی لاپتہ ہو گئی ہے۔" شاہ [illegible] شب یہیں ٹھہرو۔" وہ [illegible] جب آدھی رات کا گجر بجا تو شاہ صاحب [illegible] وہاں رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی [illegible] برخاست ہو گی تو لوگ اپنے اپنے گھر [illegible] والی طوائف اٹھے گی اور ایک ضعیف [illegible] اٹھائے اس کے ساتھ ہو گا۔ یہ رقعہ میں [illegible] اس ضعیف شخص کو دے دینا۔" فریادی فوراً پہنچا۔ [illegible] نے ضعیف شخص کو رقعہ دیا۔ رقعہ پڑھ کے [illegible] پھر رقعہ اپنے سر پر ادب سے رکھا اور [illegible] اٹھا لا۔" اس نے حکم کی تعمیل کی۔ انھوں [illegible] لکیریں کھینچیں اور کہا: "انھیں زمین پر ڈال [illegible] کی مخلوق دکھائی دے گی۔ خوف مت کھانا۔ آخر [illegible] آدمی آئے گا۔ یہ ٹھیکری دور سے اسے دکھانا۔" [illegible] طوائف کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ اس شخص نے جیسے [illegible] ڈالیں اسے طرح طرح کی مخلوق چلتی پھرتی نظر [illegible] جیسا لیکن جسم انسان کا تھا اور کسی کا چہرہ انسانی [illegible] کا تھا۔ آخر میں ایک حسین و جمیل بادشاہ تخت پر [illegible] اس شخص نے ٹھیکری اٹھا کر اسے دکھائی۔ اس نے فوراً [illegible] میں سے ایک کو بھیج کر اسے بلایا اور پوچھا: "کیسے آنا ہوا؟" [illegible] حال کہا۔ بادشاہ نے اپنے غلاموں سے پوچھا: "دیکھو کون [illegible] ہے؟" غلاموں نے بتایا کہ "بحر و بر میں ہر جگہ دیکھ لی ہے [illegible] غیر حاضر ہے۔" بادشاہ نے حکم دیا کہ "اسے فوراً حاضر کرو۔" [illegible] حاضر کر دیا گیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: "اس شخص کی بیوی [illegible]" اس نے کہا: "حضور! ابھی پیش کرتا ہوں۔" اتنے میں [illegible] سے وہ عورت آئی اور شوہر سے لپٹ گئی۔ شوہر اسے لے کر [illegible] واپس آ گیا۔

ایک دفعہ شاہ صاحب مدرسے میں بیٹھے تھے۔ چند طلبہ بھی موجود [illegible] ایک طالب علم بہت حسین تھا۔ بیٹھے بیٹھے یکایک خوف سے اس [illegible] بندھ گئی۔ شاہ صاحب نے دریافت کیا: "کیا ہے؟" طالب علم [illegible] "حضرت! سامنے ایک عورت کھڑی ہے اور مجھے ہاتھ کے [illegible] سے بلا رہی ہے۔" شاہ صاحب نے کہا: "ڈرو مت۔ اس کے [illegible] پاس جا کر پوچھو کیا کہتی ہے؟" طالب علم اٹھ کر گیا۔ عورت نے اس سے کہا: "میں تم پر روزِ پیدائش سے عاشق ہوں اور ایک جن مجھ پر ایسا ہی عاشق ہے جیسے میں تم پر ہوں۔ اس جن کو پتہ چل گیا ہے کہ میں تم پر فریفتہ ہوں۔ آج وہ مغرب کے بعد یہاں آئے گا اور تمھیں مار ڈالے گا۔" طالب علم تھر تھر کانپتا ہوا شاہ صاحب کے پاس آیا اور سب حال کہا۔ شاہ صاحب بولے: "اچھا! اس عورت سے کہہ دو کہ اب جاؤ۔" عورت چلی گئی۔ مغرب کے بعد کسی نادیدہ ہاتھ نے طالب علم کا گلا گھونٹا۔ شاہ صاحب نے اٹھ کر اسے ایک طمانچہ مارا، وہ ٹھیک ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی عورت ہنستی ہوئی آئی اور کہا: "شاہ صاحب کے طمانچے سے جن کی حالت ابتر ہے۔ شاید جاں بر نہ ہو۔" اس کے بعد وہ چلی گئی۔ پندرہ بیس روز بعد جن پھر آیا اور طالب علم کا گلا گھونٹنے لگا۔ شاہ صاحب نے دو طمانچے منہ اور گردن پر زور زور سے مارے۔ وہ عورت پھر آئی اور خوش ہو کر بولی کہ طمانچے کی ضرب سے جن کی گردن کٹ گئی ہے۔ طالب علم نے یہ کیفیت شاہ صاحب سے بیان کی۔ شاہ صاحب نے اس کی ہتھیلی پر اپنی داہنی انگلی سے کچھ خط کھینچے اور مٹھی بند کرا دی پھر کہا: "اس عورت کے سامنے جا کر مٹھی کھول دو۔" طالب علم نے یہی کیا۔ عورت کہنے لگی: "میں نے تو تمھیں کوئی تکلیف نہیں دی تھی لیکن اگر تمھاری خوشی یہی ہے تو میں جاتی ہوں، اب نہیں آؤں گی۔ تم مٹھی بند کر لو۔" طالب علم نے مٹھی بند کر لی۔ عورت چلی گئی اور پھر کبھی نہیں آئی۔

ایک دن دو نوجوانوں نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے کوئی مسئلہ

بیان کیا۔ شاہ صاحب نے اُسے حل کر دیا۔ انھوں نے خوش ہو کر کہا۔ "آپ نے درست فرمایا۔" شاہ صاحب نے پوچھا: "تم نے کیسے جانا کہ یہ جواب درست ہے؟" کہنے لگے: "ہم نے یہ مسئلہ حضرت علی کی خدمت میں پیش کیا تھا، انھوں نے بھی یہی جواب دیا تھا جو آپ نے دیا ہے۔" شاہ صاحب نے پوچھا: "اس وقت تم لوگوں کی عمر کتنی تھی؟" انھوں نے کہا: "پانچ سو برس۔" یہ کہہ کر وہ رخصت ہو گئے۔ بعد میں شاہ صاحب نے مریدین کو بتایا کہ یہ دونوں جن تھے۔

شاہ صاحب جمعے کی نماز اکثر شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ وہ جیسے ہی مسجد کے مشرقی دروازے سے داخل ہو کر صحن میں جاتے، آنکھوں پر عمامہ رکھ لیتے۔ اُن کے مرید شیخ فصیح الدین نے ایک دن عین مسجد میں داخلے کے وقت پوچھا کہ "حضرت! اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ عمامہ آنکھوں پر کیوں رکھ لیتے ہیں؟" شاہ صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے عمامہ اتار کر اُن کے سر پر رکھ دیا۔ وہ فوراً غش کھا کر گرے۔ انھیں بہت دیر بعد ہوش آیا۔ شاہ صاحب نے اُن سے پوچھا: "میاں فصیح الدین! کیا دیکھا؟" وہ بولے: "حضور! کیا کہوں؟ مسجد میں اس وقت پانچ چھ ہزار آدمی جمع تھے جن میں مشکل سے سو سوا سو شکلیں آدمیوں کی تھیں۔ باقی سب ریچھ، بندر، سور یا بھیڑیے کی شکلیں تھیں۔" شاہ صاحب نے کہا: "میں کس کس کی طرف دیکھوں۔ اسی باعث نہیں دیکھتا اور آنکھوں پر عمامہ رکھ لیتا ہوں۔"

ایک مرتبہ ایک مجذوب کہیں سے دہلی آئے اور دریائے جمنا کے کنارے ٹھیرے۔ جو شخص اُن کے قریب جاتا اُس سے وہ صرف چار پیسے مانگتے۔ اس کے سوا کوئی بات نہ کرتے، نہ کسی سے اپنا احوال کہتے۔ ایک دن خلافِ معمول شاہ عزیز مدرسے سے اُٹھے اور چند مریدوں کے ہمراہ اُن مجذوب سے ملاقات کے لیے گئے۔ مجذوب شاہ عزیز کو دیکھتے ہی تعظیماً اُٹھے اور دست بوسی کے بعد ادب سے بیٹھ گئے۔ شاہ عزیز نے اپنے ہمراہیوں کو الگ کر دیا اور مجذوب سے اُن کا حال پوچھا۔ مجذوب نے عجیب و غریب حکایت سنائی کہ "ہم دو دوست تھے۔ آپس میں نہایت محبت تھی۔ ہم نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی۔ ایک مرتبہ میرا دوست بیمار ہو گیا اور وفات پا گیا۔ جب میں اُسے دفن کرنے لگا، اس وقت ایک نہایت قیمتی کٹار میری کمر میں بندھی تھی۔ کٹار نکال کر میں نے قبر میں رکھ دی اور وہیں بھول گیا۔ پھر رات کے وقت میں بستر پہ لیٹا تو مجھے وہ کٹار یاد آئی۔ میں اُسی وقت قبرستان گیا اور قبر کھودی۔ کٹار وہیں رکھی تھی لیکن مردہ قبر میں نہیں تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ دفعتہً مجھے ایک کھڑکی نظر آئی۔ میں اندر گیا، وہ ایک پُر فضا باغ تھا اور میرا دوست وہاں بیٹھا کلام مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور [illegible] باغ کی سیر کرو۔ میں سیر کرنے لگا۔ پھر باغ کے باہر کچھ فاصلے پر آگ کے الاؤ روشن دیکھے اور بہت بڑے بڑے کڑھاؤ [illegible] لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اُن میں ڈالا جا رہا تھا۔ ایک شخص نے [illegible] سے میرا ہاتھ بھی پکڑا۔ میرے ہاتھ پہ اب تک اُس کی انگلیوں کے نشان موجود ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ تو نے مجھ سے ایک [illegible] کی مول لی تھی، وہ پیسے دے۔ میں نے کہا، میرے پاس [illegible] ہیں، یہ بیش قیمت کٹار لے لو۔ اُس نے جواب دیا: کٹار [illegible] کیا کروں گا! اتنے میں میرے مرحوم دوست مجھے تلاش کرتے [illegible] وہاں آ پہنچے۔ انھوں نے اُس شخص سے کہا کہ یہ بھائی صاحب [illegible] زندہ ہیں اور مجھ سے ملاقات کے لیے آ گئے ہیں۔ غرض [illegible] سے انھوں نے مجھے چھڑایا اور کہا کہ دوست! یہاں سے جلد [illegible] ایسا نہ ہو کہ صور پھونک دیا جائے اور قیامت آ جائے۔ میں قبر [illegible] سے نکل کر قبرستان میں آیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ سینکڑوں نئی قبریں بن گئی تھیں۔ اب وہ عمارتیں بھی نہیں تھیں جو قبرستان سے باہر میں دیکھ گیا تھا۔ پھر میں شہر [illegible] کے نقشے بھی بدل گئے تھے اور لوگوں کے لباس بھی پہلے جیسے [illegible] میں سخت بدحواس ہوا۔ مجھ پہ ایسی وحشت طاری تھی کہ جو شخص [illegible] پڑتا، اُس سے چار پیسے مانگنے لگتا۔" شاہ صاحب نے پوچھا: "وہ [illegible] کون سا تھا جب یہ واقعہ پیش آیا؟" مجذوب نے جواب دیا: "[illegible] ہمایوں کا دور تھا۔" شاہ صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا: "[illegible] اور اب یہ اکبر شاہ ثانی کا دور ہے۔" مجذوب کو شاہ عزیز نے [illegible] دم کر کے پلایا۔ مجذوب کی وحشت دور ہو گئی۔ شاہ عزیز انھیں [illegible] ساتھ ہی لے آئے۔ مجذوب مرتے دم تک شاہ صاحب کے ساتھ [illegible]

آذربائیجان سے ایک شخص اپنے بیٹے سمیت پھرتا پھرا [illegible] دہلی آیا اور شاہ عزیز سے ملا۔ شاہ صاحب نے اُسے اپنا مہمان بنا [illegible] کئی روز قیام کرنے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا تو شاہ صاحب نے اُس سے کہا: "اگر آپ اپنے بیٹے کو کچھ عرصے کے لیے میرے پاس چھوڑ دیں تو اچھا ہے۔" اُس نے جواب دیا: "حضرت! یہ اس کی خوش نصیبی ہو گی۔" وہ لڑکے کو چھوڑ کر چلا گیا۔ لڑکا شاہ عزیز سے مختلف علوم و فنون حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوا۔ ایک روز اُس نے شاہ صاحب سے کہا: "جناب! مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجیے تاکہ کسی مردِ خدا کو تلاش کروں۔ آپ کے ہاں تو کوئی بات دیکھی۔" شاہ صاحب بولے: "اچھا، تم آٹھ روز تک سورۃ انا فتحنا پڑھو، نویں دن جہاں جی چاہے چلے جانا۔" لڑکے نے آٹھ روز تک سورۃ پڑھ کر نویں دن جنگل کا راستہ لیا۔ وہاں ایک بھیڑیا اُس کی

[illegible] گھر سے نکالا اور بھیڑیہ [illegible] وہ بہت بھاگ گیا۔ [illegible] داخل ہوا تو وہاں کی [illegible] اور دلکش وضع تھے۔

[illegible] ہوئی۔ بزرگ لڑکے اصرار سے [illegible] قسم کی عمدہ عمدہ کھانے [illegible] چلے گئے۔ لڑکے نے دیکھا کہ ایک [illegible] اس نے بھیڑیے کو مارا تھا۔ لڑکے نے [illegible] اٹھانے مگر ناکام رہا۔ اتنے میں [illegible] نظر بہت پر تھی۔ صاحب خانہ پوچھنے [illegible] نے جواب دیا: "کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" انھوں [illegible] انسان ہیں نہ جن نہ فرشتے ہماری خلقت [illegible] شہر بسائے رہنے کے لیے بنایا ہے۔ [illegible] ہیں جن کی حقیقت کا علم بھی اللہ ہی کو [illegible] بھیڑیا مارا تھا، وہ ہم تھے۔" یہ کہہ کے انھوں [illegible] "ہم تمھیں زندہ نہ چھوڑتے لیکن شاہ [illegible] جاں بخشی کر دی۔ اب بولو، تم کیا چاہتے ہو؟"

[illegible] کہا: "میں بس یہ چاہتا ہوں کہ شاہ صاحب [illegible] پہنچ جاؤں۔" میزبان نے کہا: "اچھا آنکھیں بند کرو۔" [illegible] آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے ہی لمحے آواز آئی: "کھول دو۔" [illegible] کھول دی۔ اب وہ جامع مسجد شاہ جہاں آباد کے پاس [illegible] دوڑا اور جا کر شاہ صاحب کے قدموں پر گر گیا۔

[illegible] دہلی میں قحط کے آثار دکھائی دینے لگے۔ برسات [illegible] گزر گیا مگر آسمان سے ایک بوند نہ ٹپکی۔ لوگ پریشان ہو [illegible] کے پاس پہنچے کہ "حضور! کوئی تدبیر کیجیے۔" شاہ عبدالعزیز نے [illegible] بند جانی اور کہا: "چند آدمی پرانے شہر جائیں، وہاں [illegible] کا ایک گروہ ملے گا۔ ان میں سے جو ہیجڑا رقص کا لباس [illegible] پہنے ہوئے ہو، اسے الگ لے جا کر فقیر کی طرف سے [illegible] اور بارش کی درخواست کرنا۔" چنانچہ چند آدمی اسی وقت [illegible] شہر گئے۔ وہاں انھوں نے ہیجڑوں کے گروہ سے ملاقات کی [illegible] کے بتائے ہوئے رقاص کو الگ لے جا کر مدعا بیان کیا۔

[illegible] تالیاں پیٹ کر ہنسنے لگا: "ارے جاؤ بھی تم اور تمھارا بھیجنے والا [illegible] احمق ہیں۔ عبدالعزیز نے تم سے مذاق کیا ہے۔ بھلا میرا برکت [illegible] سے کیا تعلق۔ میں تو موٹی تری گناہوں کی پوٹلی ہوں، جہنم کا کندہ [illegible] راستے سے ہٹو، ہمیں اپنے دھندے پر جانا ہے۔ راہ کھوٹی ہوتی [illegible]۔" غرض اس نے اس طرح کی بہت سی باتیں اڑائیں لیکن یہ



بے تاج

عابدہ شمسی کا مطالعہ

حیدر آباد دکن کے وزیرِ اعظم مہاراجا سر کشن پرشاد ہندوستان کے ممتاز فقیہہ مفتی کفایت اللہ کے حجرے میں آ گئے۔ انھوں نے مفتی صاحب کو نظام دکن کی طرف سے ایک ہزار روپے ماہانہ، قیام کے لیے ایک بڑی حویلی اور دیگر مراعات کے ساتھ مفتیِ اعظم حیدر آباد کے عہدے کی پیش کش کی۔ مفتی صاحب نے پرکشش اور مالی فوائد سے بھرپور عہدہ قبول کرنے سے فوراً معذرت کر لی کیونکہ وہ اپنی زندگی دینی علم کی ترویج میں صرف کرنا چاہتے تھے۔ مدرسے میں انھیں صرف پچیس روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔

سر شفیع نے مولانا اعزاز علی کو پیغام بھیجا کہ "حضرت! آپ اورینٹل کالج میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لائیے۔ میں آپ کو ایک ہزار روپے تنخواہ دو ماہ کی چھٹیاں، ایک کار نیز دیگر مراعات بھی دوں گا۔" مولانا نے جواب میں لکھا: "میں آپ کا ممنون ہوں۔ مجھے دارالعلوم دیوبند سے جو تنخواہ ملتی ہے اسی میں سے پیسے بچ جاتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے بس اسی چٹائی پر بیٹھا رہوں۔"

* * * * * * *

لوگ ایک کالل کے بھیجے ہوئے تھے، برابر خوشامد کرتے رہے۔ آخر مجبور ہو کر رقاص نے کہا: "خیر صاحبو! تم تو جھاڑ کا کانٹا بن کر لپٹ گئے۔ کسی طرح پنڈ چھوڑتے ہی نہیں۔ تم کہتے ہو تو نہیں، عبدالعزیز پر نگاہ کر کے تمھاری درخواست قبول کی جاتی ہے۔ آج رات کو میں اور میرے ساتھی خواجہ نظام الدین اولیا کے اس باغ میں جمع ہوں گے جو درگاہ کے دائیں جانب ہے۔ تم حضرت شاہ صاحب سے مجھ عاجز کا سلام عرض کر کے گزارش کرنا کہ میں ایسی خدمت کے لائق نہ تھا۔ ہاں اب جو میری نسبت اس قسم کا ارشاد ہوا تو حضرت کے ارشاد کی برکت سے یہ مرتبہ مجھے حاصل ہو گیا لیکن جب تک شاہ صاحب خود زحمت نہ کریں گے یہ بلا سر سے نہ اترے گی۔" لوگ رقاص کو سلام کر کے واپس شاہ صاحب کے پاس آ گئے۔ شاہ صاحب نے کہا: "اگرچہ فقیر ضعف اور بیماری کے باعث چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا لیکن جس طرح ممکن ہو گا، عشا کے بعد آپ حضرات کے ہمراہ چلے گا۔" چنانچہ عشا کی نماز اور اوراد کے بعد شاہ صاحب رفقا اور علما کی ایک سر برآوردہ جماعت کے ساتھ وہاں گئے۔ ہیجڑے صاحب بھی باغ میں اپنے تمام ساتھیوں سمیت موجود تھے۔ شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق سب لوگ ادب سے دوزانو بیٹھے خود شاہ صاحب مراقبے میں چلے گئے یہاں تک کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ یکایک انھوں نے مراقبے سے سر اٹھا کے کہا: "لو صاحبو! یہ وقتِ اجابت ہے۔ جس شخص کی جو آرزو ہو، خدا سے مانگے۔ کوئی محروم نہ رہے گا۔" تمام حاضرین نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جس نے جو چاہا مانگا۔ شاہ صاحب نے صرف بارش کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ان مخنث بزرگوار نے

اپنی جماعت سمیت "آمین آمین" کی صدائیں بلند کیں اور اٹھ کر والہانہ انداز میں رقص کرنے اور تالیاں پیٹنا، پیٹنا شروع کر گانے لگے۔ یک بیک مغرب کی جانب سے آندھی اٹھی، ساتھ ہی بادل کی گرج اور بجلی کا کڑکا سنائی دیا۔ لوگوں کے دل دہل گئے۔ پھوار پڑنے لگی۔ شاہ صاحب نے دعا سے ہاتھ کھینچ لیے۔ "صاحبو! جلد یہاں سے شہر کا راستہ لو ورنہ پھر بارش کی شدت سے شہر پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔" لوگ اٹھ کے بھاگے اور شہر آکر پناہ لی۔ پھر تو اس قدر بارش ہوئی کہ الامان والحفیظ۔

میرٹھ کا ایک رئیس نواب مبارک علی خاں شاہ صاحب کا مخلص مرید تھا۔ اُس نے "حالاتِ عزیزیہ" میں شاہ صاحب کے متعلق عجیب عجیب واقعات تحریر کیے ہیں۔ اُس کی روایت ہے کہ "میرے روبرو شاہ صاحب نے فرمایا، پرانے شہر دہلی میں ایک شخص رہتا تھا، وہ مر گیا۔ ایک بیٹی اُس کی اولاد میں تھی۔ کچھ عرصے بعد کسی اور آدمی نے مرنے والے شخص کو خواب میں دیکھا کہ کہتا ہے میری بیٹی سے کہو خدا کے لیے میرے واسطے کچھ خیرات کرے۔ صبح خواب دیکھنے والے نے اُس شخص کی بیٹی کا حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا، وہ آوارہ ہو کر طوائفوں میں شامل ہو گئی ہے لیکن شاہ جہاں آباد ہی میں موجود ہے۔ یہ صاحب پتہ پوچھتے پوچھتے گئے تو وہ کوٹھے پر بازار میں رہتی تھی مگر اُس کے دروازے پر قفل لگا تھا۔ معلوم ہوا کہ دریا پر نہانے گئی ہے۔ یہ صاحب دریائے جمنا کے گھاٹ پر گئے۔ دیکھا کہ وہ کئی مردوں کے ساتھ مل کر نہا رہی ہے اور خوش طبعی سے مردوں پر بار بار پانی اچھالتی ہے۔ انھوں نے کنارے ہی سے اُسے اُس کے باپ کا پیغام دیا۔ لڑکی نے سنتے ہی چلوؤں میں پانی بھر کر پھینکا اور بولی: "یہ میں نے اللہ کے واسطے دیا۔" یہ صاحب شرمندہ ہو کر چلے آئے۔ اُسی رات انھوں نے دوبارہ اُس کے باپ کو خواب میں دیکھا اور اُسے بتایا کہ تمھاری لڑکی تو آوارہ ہو کر طوائفوں میں شامل ہو گئی اور اُس نے تمھارا پیغام پاکر تمسخر سے دونوں چلوؤں میں پانی بھر کر کنارے پر پھینکا اور کہا کہ یہ میں نے اللہ کے واسطے دیا۔ یہ سن کر مرنے والا کہنے لگا: "اے شخص! جو پانی اُس نے چلوؤں میں بھر کر پھینکا تھا، اُس کا ایک قطرہ ایک کیڑے کے منہ میں بھی پہنچا جو دریا کے کنارے کئی دن کا پیاسا تھا۔ محض اُس ایک قطرے کے عوض مجھ پر اللہ تعالیٰ نے بڑے انعام کیے۔ میں تمھارا بہت شکر گزار ہوں۔"

"ایک آدمی دلی کا رہنے والا شاہی ملازموں میں تھا، وہ نہایت افسردہ اور تباہ حال شاہ صاحب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میرے باپ کی تنخواہ ایک سو تیس روپے تھی۔ انھوں نے وفات پائی۔ اب مجھے قلعۂ شاہی سے صرف تیس روپے ملتے ہیں۔ عیال دار ہوں، اس تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ دل چاہتا ہے کچھ کھا کر مر جاؤں مگر سنتا ہوں کہ خودکشی حرام ہے اس لیے آپ [illegible] ہوں کہ جیسا ارشادِ عالی ہو ویسا عمل میں لاؤں۔ شاہ صاحب [illegible] اُس کی داستان سن کر فرمایا: میاں! تم کلام مجید میں فال [illegible] نے فال دیکھی اور شاہ صاحب کو مطلع کیا۔ حضرت نے [illegible] جنوب کی جانب روانہ ہو جاؤ۔ چودہ منزلیں طے کرنے [illegible] کا ایک شہر آئے گا، وہاں رک جانا۔ اگر دو تین وقت کا [illegible] جائے تو گھبرانا نہیں۔ پھر ان شاء اللہ تم بہت خوش ہو کر واپس [illegible] اُس شخص نے آپ کے ارشاد پر عمل کیا۔ دو آدمی اپنے ساتھ [illegible] گھوڑے پر سوار ہو کر جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ چودہ منزلیں [illegible] کے بعد ریاست ٹونک آئی جہاں نواب امیر خاں کی حکومت [illegible] اتفاق سے ان تینوں مسافروں نے جس مسجد میں قیام کیا، وہیں [illegible] صاحب نماز کے لیے آیا کرتے تھے۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ نماز [illegible] ہمیشہ مسافروں اور محتاجوں سے پوچھتے کہ کسی چیز کی ضرورت [illegible] تو نہیں ہے۔ ان تینوں سے بھی وہ نہایت تپاک سے پیش [illegible] لیکن کھانے کو نہیں پوچھا۔ انھوں نے بھی عرض نہ کیا۔ یہاں [illegible] کئی فاقے گزر گئے۔ اُن دنوں نواب کی انگریزوں سے ٹھنی ہوئی [illegible] اور روز امرا و وزرا سے اس سلسلے میں مشورے ہوتے تھے۔ سب [illegible] یہ صلاح دی کہ صلح کے بجائے انگریزوں سے لڑائی ضروری ہے۔ [illegible] صاحب نے سب کی باتیں سن کر معاً کہا، اُس شخص کو بلانا چاہیے [illegible] مسجد میں ہے۔ اُسی وقت ملازم دوڑے ہوئے گئے اور اُسے [illegible] ساتھ لے کر نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔ نواب نے تعظیم [illegible] دی اور مشورہ طلب کیا۔ اُس نے دلائل سے ثابت کیا کہ جنگ کے بجائے اس موقع پر صلح و صفائی بہتر ہے۔ اب سوال یہ اٹھا کہ صلح کس کی سفارت کے ذریعے بھیجی جائے۔ آخر قرعۂ فال اسی دلی والے کے نام نکلا۔ نواب صاحب نے پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی اور سواری کے لیے ہاتھی عنایت کیا۔ پھر سفارت کی سربراہی پر مقرر فرما کر جنرل آکٹرلونی کے پاس دہلی روانہ کیا۔ وہ شخص دہلی پہنچ کر پہلے شاہ صاحب کی قدم بوسی کے لیے آیا اور کئی اشرفیاں نذر کیں اور عرض کیا کہ حضور نے جس طرح ارشاد کیا تھا، ویسا ہی ظہور میں آیا۔ جب وہ سلام کر کے رخصت ہوا تو شاہ صاحب سے پوچھا کیا آپ نے اس شخص کے بارے میں کشفِ باطن سے فرمایا تھا؟ جواب دیا: نہیں، جب اُس نے کلام مجید سے فال نکال کر مجھے اطلاع کی تو میں نے آیات کا سیاق و سباق دیکھ کر اسے مشورہ دیا تھا۔"

ایک روز شاہ صاحب نے اپنے مدرسے کے ایک طالبِ علم سے کہا: "میاں! آج تم خواجہ نظام الدین کے مزار پر جاؤ۔ وہاں وضو تازہ کر کے پہلے مغرب ادا کرنا۔ اس کے بعد دو رکعت نماز اور پڑھنا۔

ایک بلی آئے گی لیکن تم اپنی نماز پوری کرنا اور اُس کی طرف مطلق توجہ نہ کرنا۔ سلام پھیرنے کے بعد بلی کو پکڑ کر ذبح کرنا اور کپڑے میں لپیٹ کر ہمارے پاس لے آنا۔" طالب علم نے اِس ہدایت پر عمل کیا اور بلی ذبح کر کے لے آیا مگر جب بلی اُس نے شاہ صاحب کے سامنے کپڑے سے نکال تو وہ تمام سونا تھی۔ دوسرے روز طالبِ علم نے پھر یہی کیا لیکن آج کچھ نہ ہوا۔

شاہ صاحب ایک دن حدیث کا درس دے رہے تھے دفعتہً ایک بزرگ آئے۔ شاہ صاحب نے انگلی سے اپنی پشت کی طرف اشارہ کیا کہ "اِدھر سے آئیے۔" بزرگ نے متعجب ہو کر تعمیل کی۔ جب درس تمام ہوا اور طلبہ چلے گئے تو شاہ عزیز بزرگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بزرگ نے کہا کہ "رات خواب میں مجھے سرورِ کائنات کی زیارت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ آپ سرورِ کائنات کے سامنے بیٹھے حدیث کی قرات کر رہے ہیں۔ میں حاضر ہوا تو آپ نے اِسی طرح انگلی سے اشارہ کر کے پسِ پشت بیٹھنے کا حکم دیا۔ اب جو میں آیا تو بھی ایسا ہی ہوا۔ اس میں کیا بھید ہے؟" شاہ صاحب نے مسکرا کر کہا: "آپ حقہ بہت پیتے ہیں اور آپ کے منہ سے تمباکو کی بو آتی ہے۔ یہ بو رسول اللہ کو سخت ناپسند ہے اِس لیے فقیر نے آپ کو پشت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔" اُس دن سے بزرگ نے حقہ ترک کر دیا۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی شاہ عزیز کے شاگردِ رشید تھے۔ ایک دن انھیں خیال آیا کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی کا آخری دفتر ناتمام چھوڑ دیا تھا کہ میرے بعد ایک شخص پیدا ہوگا۔ وہ اسے پورا کرے گا۔ کئی سو برس گزر گئے، کسی کو مثنوی کی تکمیل کرنے کی توفیق نہ ہوئی، کیا ہی اچھا ہو جو اسے تکمیل تک پہنچانے کی سعادت میرے حصے میں آئے۔ انھوں نے شاہ عزیز کو ایک عریضہ لکھا کہ "اگر آپ کی اجازت ہو تو مثنوی شروع کر دوں؟" شاہ عزیز نے جواب میں قرآن کی دو آیتیں لکھ کر مفتی صاحب کو بھیجیں کہ "عشا کی نماز کے بعد یہ آیتیں پڑھ کر سو رہو۔ خواب میں مولانا روم کی زیارت ہوگی، انھی کے سامنے اپنی درخواست پیش کرنا۔" مفتی صاحب نے اِس پر عمل کیا۔ رات کو خواب میں انھوں نے مولانا روم کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے "ہاں وہ شخص تمھی ہو جو مثنوی تمام کرے گا۔ عصر اور مغرب کے درمیان قلم دوات لے کر اپنے حجرے میں بیٹھا کرو۔ باقی ماندہ قصہ خود بخود قلم سے لکھا جائے گا۔" چنانچہ مفتی صاحب نے مثنوی کا ساتواں دفتر لکھا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس میں اور مولانا روم کی مثنوی کے چھ دفتروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مولوی خدا بخش دہلوی کو نبی کریم کی جسمی معراج میں شبہ تھا۔ شاہ صاحب نے ایک دن اُن سے کہا: "میاں خدا بخش! آج رات سوتے وقت ایک مرتبہ آیت الکرسی پڑھ لینا۔" مولوی خدا بخش پڑھ کر سوئے۔ خواب میں انھوں نے آسمانوں اور کی۔ صبح اُٹھتے ہی وہ شاہ صاحب کے پاس آئے اور خواب کا ارادہ کیا مگر شاہ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے رہو۔ یہ طریقہ میں نے اس لیے بتایا تھا کہ تم شنیدہ کے بود

ایک دن شاہ صاحب نے لوگوں سے کہا کہ ہمیں عالمِ رویا میں حضرت علی کی زیارت ہوئی۔ ہم نے کی درخواست کی۔ انھوں نے ہمیں بیعت سے مشرف بعد ارشاد ہوا کہ عبدالعزیز! فلاں شخص نے پشتو زبان میں ایک ہے۔ اُس میں ہماری مذمت کی گئی ہے۔ ہم نے عرض کیا حضور جانتا۔ امیر المومنین نے فرمایا، کچھ مضائقہ نہیں۔ ہم خواب ہوئے۔ خاصی تلاش کے بعد وہ کتاب ہمیں دست یاب ہوئی پشتو میں اس کا جواب لکھ کر شائع کیا۔"

مشہور ہے کہ ایک انگریز پادری دلّی آیا۔ وہ بڑا اور لسان تھا۔ اُس نے مٹکاف صاحب ایجنٹ گورنر جنرل کہ مجھے شاہ عبدالعزیز سے مباحثے کی خواہش ہے۔ صرف ایک کا جواب اُن سے چاہتا ہوں۔" مٹکاف اُسے لے کر شاہ صاحب کے پاس آیا۔ پادری نے شاہ صاحب سے کہا: "میں ایک سوال کرتا ہوں اور اُس کا جواب عقلی علوم سے چاہتا ہوں، نقلی سے نہیں۔" صاحب نے کہا: "پوچھیے کیا پوچھنا ہے؟" پادری بولا: "کیا آپ کے پیغمبر خدا کے حبیب ہیں؟" شاہ عزیز نے جواب دیا: "ہاں" پادری نے کہا: "کربلا میں جب دشمنوں نے امام حسین کو شہید کیا تو آپ کے پیغمبر نے خدا سے فریاد کی تھی مگر کچھ نہیں ہوا حالانکہ حبیب محبوب تو حبیب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے؟" شاہ صاحب نے کہا: "جناب! ہمارے پیغمبر کو خدا نے فریاد کا یہ جواب دیا تھا کہ تم نواسے کا رونا روتے ہو، یہاں لوگوں نے ہمارے پیارے بیٹے سولی پر لٹکا دیا اور ہم کچھ نہ کر سکے۔"

اُس زمانے میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے انگلستان سے بے شمار پادری ہندوستان آ رہے تھے۔ وہ شہر کے گلی کوچوں اور چوراہوں پر تبلیغ کی محفلیں سجاتے۔ یہ پادری نہ صرف اُردو بلکہ عربی فارسی میں بھی کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ شاہ صاحب ایک روز جامع مسجد میں وعظ کر رہے تھے۔ ایک انگریز پادری نے وہاں آ کے کہا: "شاہ صاحب! میرے ایک سوال کا جواب عنایت فرمائیے۔" شاہ صاحب وعظ روک کر بولے: "کہو کیا سوال ہے؟" پادری نے یہ شعر پڑھا ؎

کسے بگفت کہ عیسیٰ ز مصطفیٰ اعلاست
کہ ایں بزیرِ زمیں است و آں باوجِ سماست

[illegible] اس شعر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام
[illegible] ہیں اور آپ کے نبی زیر ہیں۔"
[illegible] اس کا جواب دیا ہے

[illegible] تری باشد
[illegible] تہہ دریاست

[illegible] شاہ عزیز بولے: "یوں سمجھنا [illegible] ایک بلبلے کے مانند ہیں اور ہمارے [illegible] گوہر کی شکل میں جو دریا کی تہہ میں رہتا ہے۔"

[illegible] شاہ صاحب سے سوال کیا: "آپ کہتے [illegible] قرآن میں نہ ہو، کیا یہ صحیح ہے؟"
[illegible] اصل صحیح ہے۔" اس نے پوچھا: "اچھا [illegible] ہے؟" شاہ صاحب نے تانبے کا ایک ٹکڑا [illegible] پڑھ کے اس پر دم کیا۔ اسی لمحے تانبے کی [illegible] کی طرح دمکنے لگا۔ اسے کسوٹی پر کسا گیا تو وہ [illegible]

[illegible] نے سوال کیا: "کوئی دوسرا شخص یہی آیت پڑھ [illegible] یا نہیں؟" شاہ صاحب نے جواب دیا: "ضرور بنا [illegible] زبان میں تاثیر کی ہے اور یہ تاثیر ہر شخص [illegible] نہیں ہوتی۔"

[illegible] ایک شہدے نے ایک روز شاہ عزیز سے کہا: "جنابِ [illegible] سوال کا جواب دیتے ہیں، میرے سوال کا جواب [illegible]" شاہ صاحب نے کہا: "کہو کیا سوال ہے؟" وہ کہنے [illegible] جاڑے میں گڑیاں کھیلتے ہیں اور اس موسم کے سوا دوسرے [illegible] میں خواہش نہیں ہوتی۔ اس کا کیا سبب ہے؟" شاہ صاحب [illegible] میاں! اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک سبب تو تمھیں معلوم [illegible] گڑیوں کا کھیل دوسرے کھیلوں جیسا نہیں کہ مکان میں [illegible] کھیل لیا جائے جس طرح گنجفہ یا شطرنج کھیلتے ہیں۔ اس کے لیے [illegible] میدان کی ضرورت ہے لیکن میدان میں دھوپ اور بارش کے موسم [illegible] میں کھیلنا دشوار ہے۔ دوسرا سبب تمھیں نہیں معلوم، ہمیں معلوم ہے [illegible] گڑیاں کھیلنے سے مقصود نشان اڑانا ہے جو شست جمنے پر موقوف [illegible] اور شست جمنا انجمادِ خون سے تعلق رکھتا ہے اور انجمادِ خون جاڑوں [illegible] میں ہوتا ہے۔" حاضرین نہایت محظوظ ہوئے۔

مجلس میں ایک رندِ پاک باز بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے۔ "حضرت! ہم بھی ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں؟ کئی مولویوں سے پوچھ چکے ہیں، کوئی جواب نہیں دیتا، سب بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔" شاہ صاحب نے کہا: "بھلا ایسا کون سا مسئلہ ہے جس کا جواب دینے سے مولوی عاجز ہیں؟" انھوں نے کہا: "صاحب! یہ جو طوائفیں مرتی ہیں، اُن کے جنازے کی نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟" شاہ صاحب ہنس پڑے۔ انھوں نے اپنی طرف سے سوال کیا: "یہ بتاؤ کہ جو مرد اُن طوائفوں کے آشنا ہیں، تم اُن کے جنازے کی نماز پڑھتے ہو یا نہیں؟" انھوں نے اقرار کیا کہ "جی ہاں، پڑھتے ہیں۔" شاہ صاحب بولے: "تو پھر طوائفوں کا جنازہ پڑھنے میں کیا حرج ہے؟"

ہفتے میں دو مرتبہ منگل اور جمعے کے دن کوچہ چیلان میں شاہ صاحب کا وعظ ہوتا تھا۔ ہر مذہب و ملت کا آدمی خوش ہو کر اٹھتا۔ اُن کی کوئی بات کسی کو گراں نہ گزرتی نیز جس قدر آواز قریب بیٹھے ہوئے لوگوں تک پہنچتی، اسی قدر دور بیٹھے ہوئے لوگ سنتے۔ جتنا وعظ کوئی عالم و فاضل سمجھتا، اتنا ہی جاہل کی سمجھ میں بھی آتا۔ شاہ صاحب مرتے دم تک وعظ کہتے رہے۔ مرض الموت میں بھی یہ وضع نباہی۔ انتقال سے چند روز پہلے مرض کی شدت تھی۔ وعظ کا دن آیا، شاہ صاحب نے کہا: "مجھے پکڑے رہو، جب میں بیان کرنے لگوں تب چھوڑ دینا۔" لوگوں نے یہی کیا۔ شاہ صاحب کامل دو گھنٹے پوری قوت سے وعظ کرتے رہے۔ انھوں نے لوگوں کے سوالات کے جواب بھی فی البدیہہ دیے۔ ایک شخص نے پوچھا: "کربلا میں جب امام حسین اور یزید کا مقابلہ تھا تو خدا کس طرف تھا؟" شاہ صاحب نے جواب دیا: "میزانِ عدل پر، اسی لیے تو امام حسین کا صبر آخر یزید کے ظلم پر غالب آیا۔"

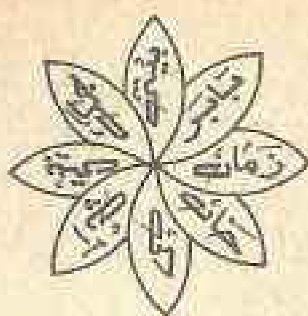
آخری وعظ کے آخر میں انھوں نے چند اشعار عربی کے پڑھے، چند فارسی کے پھر گھر چلے گئے۔ گھر میں عزیز و اقارب کو جمع کر کے انھوں نے کہا کہ "میری ملکیت میں جس قدر نقد اور اسباب ہے، سب ایک جگہ جمع کر دو۔" سب کچھ یک جا کر دیا گیا۔ انھوں نے سارا سامان اپنے ہاتھ سے لوگوں میں تقسیم کر دیا پھر وصیت کی کہ "میرا کفن اسی کپڑے کا ہو جو میں پہنتا ہوں۔" وہ ہمیشہ دھوتر کا کرتا اور گاڑھے کا پاجامہ پہنتے تھے۔ انھوں نے یہ ہدایت بھی کی کہ تجہیز و تکفین کے بعد جب جنازہ تیار ہو تو نہایت وقار کے ساتھ لے جایا جائے اور شہر کے باہر صحرا میں جنازے کی نماز ادا کی جائے۔ "بادشاہ میرے جنازے پر نہ آنے پائے۔"

یہ باتیں کر کے وہ ذکر میں مشغول ہو گئے۔ اسی حالت میں اُن کی روح پرواز کر گئی۔ اُن کی تکفین و تدفین وصیت کے مطابق عمل میں آئی۔ پچپن مرتبہ جنازے کی نماز پڑھی گئی۔ ہر شخص کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ حکیم مومن خاں مومن نے اُن کی یہ تاریخ وفات کہی تھی ؂

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

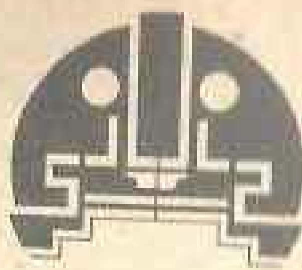
۱۲۳۹ھ





امنگوں حوصلوں آنسوؤں اور آہوں کی داستان

گوتم بدھ کا سالانہ جشن جاری تھا۔ بدھ گیا کے علاقے میں دنیا بھر کے زائرین جمع تھے۔ اچین نامی ایک بوڑھا تبت سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ بارہ تیرہ سال کی ایک [illegible]
اچین اور کورا جشن میں شامل ہونے کے باوجود زائرین سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ صرف بابر ہی ایک سعادت مند لڑکا ان کے قریب ہو سکا تھا۔ بابر کا پورا نام بابر زمل خان تھا۔ اس کے والدین [illegible]
بابر ایک بیٹھے ہوئے مزاج کا کتابوں میں گم رہنے والا لڑکا تھا مگر کورا کی کشش اسے بار بار اپنے گھر سے وہاں تک کھینچ لاتی تھی۔ کورا کے کتابی چہرے نے دوسری کتابوں کے نقوش دھندلا دیے تھے۔ [illegible]
تھا اس مشغلے میں اسے کسی کی دخل اندازی گوارا نہیں تھی لیکن ایک رات خود کورا نے اچانک پہنچ کے اس کی محویت توڑ دی۔ کورا کا لباس پھٹا ہوا تھا اور بال حواس کی طرح منتشر تھے۔ [illegible]
اچین قتل کر دیا گیا ہے اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کے وہاں تک پہنچی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک پوٹلی دبی ہوئی تھی۔ پوٹلی میں بوڑھے اچین کے کاغذات کا پلندہ اور چند زیورات تھے۔ بابر [illegible]
اور کورا کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اچین کے بعد کورا کو بھی شدید خطرہ درپیش تھا کیونکہ وہ تبت کے جانگ قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی۔ اپنے باپ کی موت کے بعد قبیلے کی سرداری اس کا حق تھا [illegible]
یہ حق استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ اس صورت سے فائدہ اٹھا کے اس کا چچا سردار بن بیٹھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کورا کو ہلاک کروا کے اس کا حق ہمیشہ کے لیے غصب کر لے۔ مقتول اچین کورا کا اتالیق تھا [illegible]
یہ وہ اسے کسی طرح وہاں سے نکال لایا تھا۔ کورا کے علاوہ اسے قبیلے کے مدفون خزانوں کے نقشے وغیرہ لانے میں بھی کامیابی ہو گئی تھی۔ یہ نقشے اور کاغذات قبیلے میں متبرک سمجھے جاتے تھے چنانچہ موجودہ سردار [illegible]
کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے تھے۔ ان حالات میں بابر کا گھر کورا کے لیے ایک محفوظ جگہ نہیں تھی چنانچہ بابر نے اس کی خاطر اپنا گھر چھوڑ دیا۔ وہ دونوں چھپتے چھپاتے اسٹیشن پہنچے اور کلکتے کے ٹکٹ لے کے ریل میں [illegible]
مولوی محمد شفیق سے انہیں بہت سہارا ملا۔ مولوی صاحب نے انہیں کلکتے میں در بدر بھٹکنے سے بچا لیا لیکن بابر ان پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا لہٰذا ایک روز ان کی غیر موجودگی میں کورا کو ساتھ لے کے [illegible]
ان کی ملاقات ایک عورت نسترن اور اس کے ساتھی چاند میاں سے ہوئی۔ چاند میاں اور نسترن دوسری دنیا کے لوگ تھے۔ انہوں نے کورا اور بابر کے گرد جال پھیلانا شروع کر دیا چنانچہ بابر اور کورا کو پھر [illegible]



[illegible] ایک نوجوان کا فسانۂ عبرت

[illegible] کا منتظر تھا۔ بدایک ان پر غنڈوں نے حملہ کر دیا۔ غنڈے کرن کی تاک میں تھے اسے بچانے کے لیے بابر کو ایک غنڈے کے خون میں ہاتھ رنگنے پڑے۔
[illegible] بابر پھنس گیا۔ اسے کانسٹیبلوں نے گھیر لیا۔ دفعتاً اس نے شور سے کرن کی چیخ سنی۔ بدحواسی میں وہ ایک کانسٹیبل کو بھی قتل کر بیٹھا۔ اسے سات سال کی
[illegible] جیل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے حوصلہ دیا۔ بابر کو کرن کی یاد ستانے لگی۔ [illegible] اس دوران ایک طرف اس نے [illegible]
[illegible] شروع کر دی اور ایم اے کر لیا۔ سات سال آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئے۔ سزا پوری کر کے وہ کھلی فضا میں آیا تو سب کچھ بدل چکا تھا مگر بابر کا دل نہیں بدلا
[illegible] کو سات سال پہلے نہیں بلکہ ابھی ابھی آنکھوں سے اوجھل ہوئی ہو۔ وہ جیل کے پاس جانے کے بجائے کرن کی تلاش میں نکل گیا۔ [illegible] صاحب
[illegible] وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ بابر کو اپنی رہائی کا افسوس ہونے لگا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ دیوانہ وار شہر در شہر اسے ڈھونڈتا ہوا ایک
[illegible] باپ اور بہن بھائی کسی نامعلوم جگہ جا بسے تھے۔ بابر وہاں نہ ٹھہر سکا۔ واپسی کے دوران ریل میں اس کی نظر ایک ادھیڑ عورت پر پڑی۔ بابر کی آنکھوں میں
[illegible] لڑکی کو دیکھ کے بابر کی نگاہ میں کرن کی صورت گھوم گئی لیکن بابر کو نہیں پہچانا تھی۔ لہٰذا بابر کو اس کے سامنے ایک گھریلو ملازم کا روپ دھارنے ہی دیر
[illegible] ساتھ آئی ہوئی لڑکی کے پیچھے ہو لیے۔ اس کا نام زرین تھا۔ وہ فیض آباد کے ایک متمول خاندان کی تیم [illegible] لڑکی تھی۔ اس کا [illegible] اور زرین
[illegible] زرین کو بلا جھجک اپنے ساتھ لے آئی۔ یہاں وہ اس کا سودا کرنے کی فکر میں تھی۔ بابر نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ ایک رات زرین کو وہاں سے نکال
[illegible] کو بیٹی کی طرح عزت سے بٹھا لیا۔ بابر کی آمد سے وہ بے چین ہونے لگے۔ بابر کو زرین کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں جیل بہت کام آیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے

ساتھ بابر اور زرینہ کو فیض آباد روانہ کر دیا۔ یہاں جگل کے رشتہ دار موجود تھے۔ انھوں نے بڑی عمر بار زرینہ کی غصب شدہ حویلی اور جائداد اُسے واپس دلوادی۔ بچہ بابر کو اس خوشی میں ایک زخم بھی سہنا پڑا۔ عظیم جان کی محفل میں سے جاتا بابر نے عظیم جان کو دیکھا تو اس کی آنکھیں اندھیری ہو گئیں۔ دوسری طرف عظیم جان کا حال بھی اسے دیکھ کر دگرگوں ہو گیا۔ وہ بھری محفل سے اچانک اٹھی اور دیکھتے دیکھتے کھڑکی سے نیچے کود گئی۔ بابر دیوانگی سے سیڑھیاں پھلانگتا سڑک پر پہنچا مگر وہ مر چکی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن فہمیدہ نے اس کی گود میں دم توڑ دیا۔ اگر جگل کو بار بار ہوش کر کے فوراً نہ بلا لیا جاتا تو بابر کے لیے اس صدمے کی تاب لانا مشکل تھا۔ جگل نے آگے اُسے جیسے تیسے زندہ رکھا۔ بابر بھی بابر کی طرح تھی، اس کی کوئی کوتاہی نہیں کی یہاں تک کہ ایک روز اس نے اپنی ہر چیز بابر کے نام لکھ دی لیکن اس کا یہ ایثار بابر کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکا۔ وہ ایک رات حویلی سے نکل گیا۔ اس نے فہمیدہ کو عظیم جان بنانے والے چمپا بائی کا پتہ لگایا اور اُسے آگرے جا کے پکڑا۔ چمپا بائی نے فہمیدہ کو بمبئی سے خریدا تھا۔ بابر نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور بمبئی کے لیے ریل میں سوار ہو گیا۔ ایک پولیس افسر کرشنا اُن کا ہم سفر تھا۔ سفر میں اُس کا کرشنا سے تعارف ہوا۔ کرشنا اپنے تالاب محلہ بولارات کا وقت تھا۔ کرشنا سو رہا تھا لیکن اُس کی قسمت بابر کے ڈبے میں جاگ رہی تھی۔ بابر نے حملہ آور کو بے بس کر کے قتل کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ کرشنا اس کا بے حد احسان مند ہوا۔ بمبئی پہنچ کے اس نے بابر اور چمپا کو اپنے ساتھ قیام کی پیشکش کی مگر بابر نے ہوٹل میں ٹھہرنے کو ترجیح دی کیونکہ اپنے گھر والوں کی تلاش کے لیے اُسے آزادی چاہیے تھی۔ چمپا کی نشاندہی اور بابر کی دوڑ دھوپ کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ گھر والے تو نہیں ملے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بمبئی میں مقیم ضرور تھے لیکن ایک روز اچانک وہاں سے کہیں کوچ کر گئے۔ بابر نے اپنے والد کے بارے میں سنا کہ ان کے سامنے دن رات کسی نامعلوم کی تلاش کے کاغذات اور نقشے وغیرہ کھلے رہتے تھے۔ بابر سمجھ گیا کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو گرو کا مقتول آیا لیکن تبت سے لایا تھا اور جن میں جانگ قبیلے کے مدفون خزانوں کا راز مستور تھا۔ گھر والوں کے دفعتاً لاپتہ ہو جانے نے خود بابر کو گم کر دیا۔ اپنی خبر نہ رہی۔ بھوک لگتی تو کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لیتا۔ نیند آتی تو کہیں بھی پڑ رہتا۔ اس ہیئت کذائی میں ایک روز کرشنا نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ بابر کو بہ اصرار اپنے بنگلے لے گیا۔

ایک مدت کی آبلہ پائی کے بعد بابر کو گھر کا چین نصیب ہوا۔ کرشنا نے چھوٹے بھائی کی طرح بابر کا خیال رکھا مگر اپنا خیال نہیں رکھا۔ وہ ایک پولیس افسر تھا۔ منصبی فرائض کی ادائی میں اس نے غضب کی دیانت اور جاں فشانی کا ثبوت دیا۔ بمبئی بھر کے جرائم پیشہ اس کی جان کے لاگو ہو گئے۔ نتیجتاً بابر کا یہ محسن ایک روز اپنے جسم پر زخموں کے تمغے سجا کر دنیا سے منہ موڑ گیا۔ مرتے مرتے وہ بابر کے سر پر ایک دھر گیا تھا۔ اس نے اپنی تمام جائداد اور خطیر نقدی بابر کے نام کر دی تھی مگر بابر کی سب سے بڑی دولت تو کرشنا کی ذات اور اس کی محبت تھی۔ دولت کے ڈھیلے اور کاغذ کے پرزے اس کی کیا اشک شوئی کرتے۔ اس نے کرشنا کے قاتلوں سے انتقام لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے لیے اُسے اڈوں اور بازاروں کی دنیا میں گھس کے ایک بڑا پاپڑ حاصل کرنا پڑا۔ اس اثنا میں جگل بھی بمبئی پہنچ گیا۔ بابر کی مشکل آسان کر دی۔ جگل نے معاملے کی اونچ نیچ پر غور کر کے بمبئی کے مشہور استاد پیرو دادا کو اپنے ساتھ ملایا اور کرشنا کے سب سے بڑے دشمن اور شہر کے سب سے بڑے بدمعاش تیوراری کے اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ تیوراری اپنی ناک کٹوا کے کہیں منہ کالا کر گیا۔ کرشنا نے اپنی زندگی میں جولین نامی ایک لڑکی کو بابر کی تیمار داری پر مقرر کر دیا تھا۔ جولین اب بابر ہی کے ساتھ کرشنا کے گھر میں رہتی تھی، نیز چمپا بائی بھی ماضی سے پیچھا چھڑا کر بابر کے پاس چلی آئی تھی۔ جولین اور چمپا کی محبت و خدمت کی ٹھنڈی چھاؤں بابر کو اور تڑپا دیتی۔ اُسے رہ رہ کر کورا کا خیال آتا۔ کورا زندگی کی کڑی دھوپ میں نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ بابر کی یہ خلش جگل کو معلوم تھی۔ اس بار وہ بھی بابر کے ساتھ کورا کی تلاش میں نکلا۔ اُس نے اپنے ذہن میں نقشہ ترتیب دے لیا تھا۔ نقشے کے مطابق دونوں آگے بڑھتے رہے۔ وہ شہر شہر گئے۔ کورا کہیں نہ ملی البتہ حیدرآباد دکن میں بابر کو اپنا چھوٹا بھائی جہانگیر مل گیا۔ جہانگیر کوئی تین سال قبل گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا اور اب حیدرآباد کی ایک ممتاز مغنیہ شریفن خانم اُس کی پرورش کر رہی تھی۔ شریفن کے ہاں ایک نوعمر لڑکی نیساں زیر تربیت تھی۔ بابر نیساں کو دیکھتا تو اسے اپنی بہن تبی یاد آ جاتی۔ نیساں بھی اس محبت سے مانوس ہو گئی تھی چنانچہ اُس نے نیساں کو اس کی ماں سے خرید لیا پھر علاج میں جہانگیر، فانم اور نیساں کو زرینہ کے پاس فیض آباد منتقل کر کے بابر ایک بار پھر اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔ جگل ساتھ تھا۔ دونوں چار مہینے تک پورے وسطی ہند کی خاک چھانتے ہوئے جیسلمیر پہنچ گئے۔ جیسلمیر کی مٹی میں کورا کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ایک بزرگ شخص منیر علی سے معلوم ہوا کہ مولوی محمد شفیق اپنی جوان لڑکی زہرہ کے ساتھ اُن کے پڑوس میں مقیم تھے لیکن ایک رات وہ دونوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اچانک غائب ہو گئے۔ جگل نے منیر علی کو کریدا تو پتہ چلا کہ مولوی صاحب اور اُن کی لڑکی اچانک گرفتاری کا شکار ہوئے۔ دار ایک بااثر رئیس رانا مہتاب ہے۔ رانا نے کورا کے لیے پیام بھیجا تھا لیکن مولوی صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ انتقاماً رانا نے اپنے آدمیوں کے ذریعے انھیں اٹھوا لیا۔ جگل نے یہ اطلاع پاتے ہی بمبئی سے پیرو کو بلوا کے رانا کی حویلی کھنگالنے کے لیے بھیج دیا۔ پیرو مولوی صاحب اور کورا کو تو نہ لا سکا۔ رانا کی آنکھیں ضرور نکال لایا۔ رانا کے آدمی انتقاماً منیر علی کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ اُن کی لڑکی زہرہ کو اغوا کر لینا چاہتے تھے لیکن جگل اور بابر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ انھوں نے منیر علی کو اس صدمے سے بچا لیا اور اُن کے خاندان سمیت فیض آباد لے آئے۔ زرینہ کی حویلی اور بارونق ہو گئی۔ جگل اور بابر سانس درست کرنے کے لیے چند روز فیض آباد میں ٹھہرے پھر نکلنے آگے۔ یہاں مقامی آدمیوں کے علاوہ بمبئی کے پیرو دادا اور دوسرے آدمیوں کو دیکھ کر بابر حیران رہ گیا۔ انھیں جگل نے بلوایا تھا کیونکہ اُسے بابر کے والد کی ایک خبر ملی تھی۔ وہ تبت سے قریب کے ہندوستانی علاقے میں دیکھے گئے تھے۔ جگل چیدہ آدمیوں کے ساتھ پوری طرح لیس ہو کے اُن کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ سفر کی تیاری ہونے لگی۔ اس اثنا میں ایک دن بمبئی کے آدمیوں کے ساتھ بابر کو بازار حسن جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک نوخیز مغنیہ شبپارہ اُس کے گلے کا ہار بن گئی۔ کلکتے کا ایک سیٹھ اُس کا سودا کر چکا تھا۔ بابر نے منہ مانگی قیمت پر اُسے سیٹھ کے چنگل سے نکال لیا۔ ادھر جگل رات دن سفر کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر کے اس نے منتخب آدمی دو ٹکڑیوں میں بانٹ دیے اور پہلی ٹکڑی پیرو کے ساتھ روانہ کر دی۔ دوسرا قافلہ لے کے وہ خود روانہ ہوا۔ بابر اسی قافلے میں شامل تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک کٹھن اور طویل سفر طے کیا۔ شدید سردی، الہڑ ہوائیں، چٹانیں، ڈھلوان پہاڑ، جنگل، ندی نالے، الغرض راستے کی ہر رکاوٹ دور کرتے ہوئے وہ سوداگروں کے بھیس میں جانگ قبیلے کی بستی درونگ پہنچ گئے۔ قبیلے کے سردار نے شوق سے اُن کے تحائف قبول کیے اور جین ورسا نامی ایک شخص کے ہاں اُن کے قیام و طعام کا بندوبست کر دیا۔ اپنی آمد کے چوتھے دن وہ لوگ بستی سے تین چار میل اوپر مندروں کے علاقے میں جا نکلے۔ یہاں بابر نے گوتم بدھ کی عظیم مورتی کے سامنے ایک بدھ بھکشو کو دیکھا۔ اُس کی سانس رک گئی۔ اُس نے بھکشو کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ یہ اُس کے باپ صفدر زماں خاں تھے۔ اُس نے اضطراب سے جگل کو اشارہ کیا۔ جگل نے سرگوشی میں اُسے سنبھلے رہنے کی ہدایت کی اور اُس کا ہاتھ تھام کے ایک طرف چل دیا۔ وہ جھاڑیوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوئے علاقے میں چھوٹے بڑے مندروں کی سیر کرتے رہے۔ بستی میں اُن کے سامان تجارت کی خوب پذیرائی ہوئی تھی لیکن جگل نے مال باقاعدہ روک کے رکھا۔ ایک شام اپنے میزبان جین ورسا کی زبانی انھوں نے سنا کہ جانگ قبیلہ خوشیوں میں گھرا ہوا ہے کیونکہ وہ اپنے مقدس اور متبرک کاغذات کی حفاظت نہ کر سکا۔ جین ورسا نے انھیں ان کورا کے کاغذات سمیت فرار ہونے کی داستان دہرائی اور بتایا کہ کاغذات کی بحالی سرداری کی شرط اوّل ہو کے رہ گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہر نئے سردار کو گیارہ ماہ کی مہلت ملتی ہے۔ اس کے بعد وہ خودکشی کر لیتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔ کئی نوجوان کاغذات کی کھوج میں ہندوستان پہنچے اور وہیں مر کھپ گئے۔ جین ورسا نے مزید کہا کہ قبیلہ کاغذات دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی بازی لگا سکتا ہے۔ جگل نے یہ بات گرہ میں باندھ لی اور قبیلے کے سردار واشی کا کے سامنے کاغذات کی تلاش کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس کے صلے میں اُس نے سردار سے یہ وعدہ لیا کہ کامیابی کی صورت میں جانگ قبیلہ صرف اُن کے بھیجے ہوئے قافلے کو راہ داری دینے کا پابند ہوگا۔ سردار نے کچھ پس و پیش سے اُس کی یہ شرط قبول تو کر لی لیکن ایک روز جگل اور اس کے آدمیوں کو اچانک طلب کر کے انھیں مسلح آدمیوں کے نرغے میں لے لیا۔ اُسے خدشہ تھا کہ ان لوگوں کو کاغذات کے متعلق ضرور کچھ معلوم ہے۔ وہ ہتھیاروں کے بل پر اُن کی زبان کھلوانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اُسے ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جگل اور اس کے ساتھیوں کو اُن پر قابو پانے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی مگر اس واقعے نے جگل کو اور محتاط کر دیا۔ وہ اور بابر خیر جو صنم پرستی اور قرب و جوار کا چپا چپا آنکھوں میں محفوظ کرتے رہے۔ ایک رات جگل نے نہایت خاموشی سے بابر کے والد کو جا لیا۔ انھوں نے جگل کی زبان سے اپنا نام سن کر پیچھا چھڑانا چاہا لیکن جب جگل نے اُن کے بچھڑے ہوئے جوان بیٹے کو اُن کے سامنے کیا تو اُن کے بند ٹوٹ گئے۔ جگل نے انھیں واپسی کی ترغیب دی لیکن وہ بابر کے باپ تھے۔ انھوں نے گزشتہ نو برس بابر کی طرح ضائع نہیں کیے تھے۔ اب منزل مقصود اُن کے بہت نزدیک تھی۔ وہ لوٹ کیسے جاتے۔ جگل نے اُن کا بوجھ بانٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس اثنا میں پیرو کا قافلہ بھی درونگ پہنچ چکا تھا مگر اس کے قافلے میں ایک آدمی کی کمی ہو گئی تھی۔ متین خاں کی وہ راستے میں چل بسا تھا۔ اُسے درونگ میں دفن کر دیا گیا۔ عزم کی کٹھائی جگل اور ساز گار وقت آ گیا تو جگل، پیرو، بابر اور دوسرے لوگ بابر کے والد کی معیت میں نہ جانے کہاں کہاں اور کن کن راستوں سے ہوتے ہوئے خزانے کے منہ تک پہنچ گئے۔ بابر کے والد نے تلاش و تحقیق میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ جگل اور اس کے ساتھی اُن سے خزانے کی تاریخ سن کے حیرت زدہ رہ گئے۔ اُن کا جوش بڑھ گیا۔ ہتھوڑیاں، چھینیاں اور سبھی ضرورت کی ہر چیز اُن کے پاس تھی۔ وہ تن دہی سے کھدائی میں جٹ گئے۔ پہلے دستے جو کچھ برآمد ہوا اُسے دیکھ کے سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ جگل نے خزانے کے جلد ملنے تک چڑھ اٹھانے تو اُن کی ہتھیلی پر ستارے سے آگ آئے۔ پانچ راتوں تک وہ برابر کھدائی میں مشغول رہے اور چار دن تک انھوں نے آسمان نہیں دیکھا۔ یہ محنت ضائع نہیں ہوئی۔ وہ چھ دروں کا خزانہ کل پر اندازہ جو اہر کا انبار برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہ منتظر وقت سے پہلے تہ خانے سے باہر نہیں نکلے۔ چوتھے دن اندھیری رات میں سب کچھ سمیٹ کے قبیلے والوں کی بے خبری میں وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ راستے کا تعین انھوں نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد جانگ قبیلے کی ایک لڑکی بھی اُن میں آ شامل ہوئی۔ یہ جین ورسا کی بیٹی نشاتم تھی۔ اسے جگل کے من چلے ساتھی سلطان نے درونگ کے قیام میں اپنا بنا لیا تھا۔ نشاتم بابر کے والد کے ساتھ چل رہی تھی۔ قافلہ پھونک پھونک کے قدم اٹھا رہا مگر جلد ہی اُسے اپنا سفر روکنا پڑا۔ وہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک سرسبز وادی سے گزر رہے تھے۔ ایک تنگ گھاٹی میں یکایک ایک تیر اُن کی طرف آیا۔ سب چوکنے ہو گئے۔ اوپر پہاڑوں پر ہر طرف آدمی موجود تھے۔ وادی اُن کی صداؤں سے گونج رہی تھی۔

باکوں کی آڑ میں ہوتے ہی ہم نے تمنچے نکال لیے تھے
اور ان کے کاندھوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ انھوں نے چشم زدن
میں انھیں اُتار کے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا لیا تھا مگر وہ کسی ایک جانب
نہیں تھے۔ وادی کے اوپر پہاڑوں کی اونچی نیچی دیواروں پر تقریباً
ہر جگہ وہ موجود تھے۔ اُن کی تعداد سو سوا سو کے قریب ہوگی۔ تجمل کے
کھڑے ہو جانے کے باوجود کوئی تیر نہیں چلا۔ چند لمحوں تک ہم نے
انتظار کیا پھر پاکوں کی غیر محفوظ اوٹ سے نکل کے اُن کے سامنے ہو
گئے۔ اُن کی آوازیں ایک دم بند ہوگئی تھیں لیکن اُن کی کمانیں کھنچی
ہوئی تھیں۔ اُن میں سے کئی کے ہاتھ میں نیزے تھے۔ فاصلہ زیادہ
تھا اور ہم اُن کی شکلیں واضح طور پر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تجمل نے فوراً
ہاتھ اُٹھا کے ہمیں بندوق نہ چلانے کا اشارہ کیا اور تیزی سے بولا۔
"جانے پہلے دیکھتے ہیں۔"

سب کی نظریں سلطان اور تشانم پر آ کے رُک گئیں۔ "یہ تو
اُن استاد! اپنے سلطان نے شاہ کو بدھائی دینے آئے ہیں۔" جامو نے
ایک لمبی سانس لے کے کہا۔ "سمدھیانے کو نہیں پہچانتے۔"

"نہیں نہیں۔" سلطان نے تشانم کو کھینچ کے اپنے بازو سے
چپکا لیا۔ "اس نے انھیں نہیں بتایا۔ یہ نہیں بتا سکتی۔" وہ ہذیانی انداز
میں بولا۔ "اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ماں قسم یہ ....." تجمل کو گھورتے دیکھ
کر اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"سُن رہے ہو اُستاد!"

"جامو!" تجمل نے درشتی سے کہا۔ "بھینچ کے رکھو۔"

"وہ نیچے اُتر رہے ہیں۔" اچانک بلا کو چیخی ہوئی آواز میں بولا۔

تجمل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ نیزے اور کمانیں تانے ہوئے
وہ چند قدم اور آگے آگئے تھے۔ ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں
تھا۔ ایک کوشش کی جا سکتی تھی کہ ادھر اُدھر جھپٹ کے ہم اردگرد
کی چٹانوں جھاڑیوں یا درختوں کی آڑ لے لیں۔ اس طرح نشانہ لینے
میں کچھ آسانی ہو جاتی مگر اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہی ایسا
کرنا ممکن تھا۔ شاید سب نے جان لیا تھا کہ اب کوئی اور کوشش
بے سود ہے۔ سو ہم پوری طرح تیار تھے۔ اتنے فاصلے پر تمنچوں اور
بندوقوں کے صحیح نشانوں کا کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ انھیں آگے
آنا چاہیے تھا اور ہمیں اُس وقت تک کوئی گولی ضائع نہیں کرنی
چاہیے تھی جب تک وہ خود پہل نہ کریں۔ پہل کرنے کی صورت
میں ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم فاصلے اور نشانے کی پروا
کیے بغیر فیر کرنا شروع کر دیں اور جس کو قریب جو جگہ ملے وہ وہیں
چھپ جائے۔ اُن کی تعداد دس گُنی کے لگ بھگ ہوگی۔ یقیناً وہ
قبائلی قزاق نہیں تھے جو پہاڑوں پر قافلوں کی تاک میں بیٹھتے ہیں۔
وہ ہوتے تو اتنا انتظار نہ کرتے۔ نہ ایک تیر چلا کے دوسرا چلانے
میں دیر کرتے۔ سبھی کو یہ تعین کرنے کی جستجو تھی کہ وہ کون لوگ ہیں
اور کیوں اس طرح چاروں سمت سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔

دروتنگ بستی کے نزدیک جہاں سُولم، مارٹی، جینی پلیٹو اور
زورا نے ہم سے پہلے پہنچ کے پڑاؤ کیا تھا، وہاں سے ہمیں چلے
ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ انھی کے روکے ہوئے قلی ہمارے ساتھ
تھے۔ جہاں تک بن پڑا، شام کو اندھیرا گہرا ہونے کے بعد بھی ہم نے اپنا
سفر جاری رکھا۔ رات کو چلنا مشکل تھا ورنہ ہم کسی جگہ نہ ٹھیرتے۔ سب
کا مقصد یہی تھا کہ جلد سے جلد دروتنگ بستی سے دُور ہو جائیں۔ راستے
میں کسی قافلے سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی اور نہ ہم نے اپنے
تعاقب کی کوئی آہٹ محسوس کی تھی۔ قلی بھی پرانے نہیں تھے۔
دروتنگ بستی سے نکل کے سُولم نے آگے دو منزلوں پر انھیں تبدیل
کیا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق کسی جگہ انھیں مشکوک نگاہوں
سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ سولم، مارٹی، جینی پلیٹو کو سفر کے لیے ضروری
اسباب سمیت ہم نے دس دن پہلے رخصت کیا تھا۔ اُن کے جانے
کے تین دن بعد باقی ہم سب بستی سے اچانک غائب ہو گئے
تھے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے ہمارے پیچھے اِدھر اُدھر اپنے آدمی
دوڑائے ہوں لیکن ہم بستی سے کہیں اور گئے ہی نہیں تھے جو انھیں
مل جاتے۔ ہم بستی میں چند میل اُوپر ہی مندروں کے علاقے میں
واقع قدیم مندر کے تہ خانے میں مسلسل چار دن تک چھپے رہے
تھے۔ تہ خانے سے دوبارہ برآمد ہوتے وقت ہر سُو گہرا اندھیرا
مسلط تھا۔ مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ہماری سُن گُن
مل گئی تھی مگر وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دوسرے
روز انھیں اُن کے اکڑے ہوئے جسم ہی ملے ہوں گے۔

گویا بستی کے لوگوں کی نظر میں ہمیں وہاں سے چلے ہوئے
سات دن ہو گئے تھے۔ یہ عرصہ ہمارے دُور نکل جانے کے لیے
کافی تھا۔ اب انھیں ہماری اُمید ترک کر دینی چاہیے تھی لیکن وہ
پھر ہمارے سامنے موجود تھے۔ وہ نہیں تھے تو پھر اور کون لوگ تھے۔
اگر تشانم نے اپنے باپ چن وسا کو بتا دیا تھا کہ سلطان نے چار
دن بعد اس سے بستی کی سرحدوں پر مقدس پگوڈا کے علاقے میں
ملنے کو کہا ہے تو انھوں نے مزید دو دن کیوں توقف کیا۔ جہاں
تشانم ہمیں ملی تھی، وہیں وہ ہمارے راستے کی دیوار کیوں نہ بن گئے۔
اور انھوں نے تشانم کو ہمارے ہاتھوں میں کیوں جانے دیا۔ سولم،
مارٹی وغیرہ کے دوبارہ ہمارے ساتھ شامل ہو جانے کے بعد

اُنھیں پھر کس کا انتظار تھا۔ بستی کے قریب ہی انھوں نے ہمارے اطراف اس طرح اپنے آدمی کیوں نہیں کھڑے کر دیے۔ جاموکی طرح سبھی کو انھیں دیکھ کے فوراً ہی گمان ہوا تھا کہ تشانم نے اُنھیں ہماری خبر دی ہوگی لیکن جلد ہی سب کو احساس ہو گیا کہ یہ محض بدگمانی ہے، ایک بے جواز شبہ ہے۔ تشانم دو دن سے ہمارے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ سب اُس کی باتیں، اُس کا چہرہ جیسے بھول گئے تھے۔ اُس کے چہرے پر پھولوں کی سی معصومیت اور اُس کی باتوں میں بچّوں کی سی سادگی تھی۔ جب کوئی اُس کے سامنے سلطان کا نام لے کے چھیڑتا تو وہ بُری طرح شرما جاتی۔ دو دن سے بھی اُسے چھیڑتے رہے تھے۔ جب اُس نے پہلی بار ہمارے سامنے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بات کی تو سب کو حیرت ہوئی حالانکہ سبھی کو معلوم تھا کہ وہ سلطان سے اسی زبان میں بات کرتی ہوگی۔ کورا کو بھی ایسی ہی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی آتی تھی۔ کورا کے مانند سوچ سوچ کے کوشش کر کر کے بولنا، پلکیں پٹ پٹانا، کوئی لفظ سمجھ میں نہ آنے پر گھبرانا، بے چارگی سے مسکرانا اور شرمانا۔ ابّا جان کو بھی اُسے دیکھ کے کورا کی یاد آتی ہوگی۔ سلطان نے اُسے اشارہ کیا ہوگا تبھی وہ زیادہ تر ابّا جان کے ساتھ رہتی تھی، اُن کے پہلو بہ پہلو۔ دو دن سے وہی ہمارے لیے شکار کیے ہوئے گوشت کا کھانا پکا رہی تھی۔ تشانم اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے وداع ہو کے آئی تھی جیسے کورا ایک رات ہمارے گھر آئی تھی۔ ابّا جان نے نہیں سمجھا کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی، وہ تو اُن کی بیٹی بننے کے لیے آئی ہے۔ وہ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیتے تو وہ اُن کی اپنی بیٹیوں سے زیادہ اُن کی خدمت کرتی۔

کمانوں اور نیزوں سے مسلّح اِن لوگوں کو کسی اور ذریعے سے خبر ہوئی تھی۔ سولم کے ساتھ آنے والے قلیوں کو ہماری منزل کا پتہ نہیں تھا کیونکہ تجمّل کی ہدایت کے مطابق دوسری منزل پر انھیں بدلتے ہوئے سولم نے اُن سے ہندوستان کی طرف جانے کے لیے طے کیا تھا لیکن کچھ دُور آ کے اُس نے اُنھیں جاتمگ قبیلے کی طرف چلنے کا حکم دے دیا۔ سفر کی اس اچانک تبدیلی سے یہی مراد تھی کہ قلی چلتے وقت اپنی بستی کے لوگوں کو سولم کی منزل کی غلط نشان دہی کر کے آئیں۔ بس ایک ہی بات ممکن تھی کہ بڑے مندلے کے تہہ خانے سے ہمارے نکلنے کے دوسرے دن جب اُنھیں وہاں موجود پہرے دار نظر نہیں آئے ہوں گے تو اُنھوں نے اُن کی تلاش کی ہو گی اور بڑے مندر کے نشیب میں اُن کی لاشیں پڑی ہوئی مل گئی ہوں گی۔ لاشیں بول نہیں سکتی تھیں لیکن اُن کی ناگفتنی صاف

غمازی کرتی ہوگی کہ ہم گزشتہ رات یہاں موجود تھے۔ ہما... اُن کی موت کا کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا چنانچہ اُنھوں نے ... پیچھا کرنے کے بجائے سیدھے ہندوستان کے راستے کی سمت ... کیا۔ وہ پہاڑوں کے درمیان راستے ہم سے بہتر جانتے تھے او... کے ہم سے پہلے ہماری منزل پر پہنچ سکتے تھے۔

تجمّل نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی تھی لیکن ہم سب خود ہی اپنی اپنی جگہیں متعین کر لی تھیں۔ اگر وہ وادی کے ا... پہاڑوں پر ایک دائرے کی صورت میں بڑھتے ہوئے ہمارے گھیرا تنگ کر رہے تھے تو ہمارے تمنچوں اور بندوقوں کا رُخ بھی ... کی جانب تھا۔ پہرو کا رُخ کسی اور سمت تھا تو زورا کا کسی او... سمت۔ ہر ایک کی نگاہ اوپر اُٹھی ہوئی تھی اور سب نے غیرا... طور پر سمتیں اپنی اپنی نگاہوں کے حصّے میں تقسیم کر لی تھیں۔ ابّا... تشانم اور قلی درمیان میں تھے اور اُن میں سے کسی کے پاس ... ہتھیار نہیں تھا۔ تجمّل نے بھی اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی بندوق ا... تک نہیں اُتاری تھی اور نہ اپنا تمنچہ جیب سے باہر نکالا تھا۔ وا... کے نشیب کی زمین مسطح نہیں تھی۔ درمیان میں ایک تیز ند... گزرتی تھی جس کے کناروں کی زمین کہیں کہیں اتنی اوپر اُٹھی ہو... تھی کہ ایک گھاٹی سی بن جاتی تھی۔ ہم نے فاصلہ کم کرنے کی غر... سے ندی کے کنارے کنارے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ منظر بھی بہت دل کش تھا۔ دھوپ نکل رہی تھی اور ندی کا چاندی جیسا پانی مچا رہا تھا۔ اِسی شور کے سبب ہمیں اپنے پیچھے اُن کی نقل و ح... کا پتہ نہیں چلا۔ ہمارے وادی میں اُترنے سے پہلے وہ اوپر کسی ... سمت چھپے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم نے وادی میں اُترنا شروع ... کیا، وہ اطراف کے پہاڑوں پر پھیلتے گئے اور اُنھوں نے اُس وقت ... پہلا تیر پھینکا اور صدائیں بلند کر کے ہمیں اپنی جانب متوجّہ کیا ... جب ہم وادی کے عین بیچوں بیچ پہنچ گئے، خصوصاً اُس مقام ... جہاں نشیب گہرا تھا اور ہمارے فرار کا امکان اور مقاموں کی نسبت کم ہو جاتا تھا۔ وہ ایک گھاٹی کی شکل کا راستہ تھا مگر ندی کے دونوں طرف اُٹھی ہوئی زمین ڈھلوان تھی۔ اِسی ڈھلوان کی وجہ سے ہم اوپر پہاڑوں کی طرف دیکھنے پر قادر تھے اور وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔ وادی میں کسی جگہ ندی کے دونوں کناروں پر اُٹھی ہوئی زمین عمودی ہوتی تو یہاں کے بجائے وہ اُسی جگہ کا انتخاب کرتے مگر ایسا کوئی مقام وادی میں شاید کہیں نہیں تھا۔ نشیب کا یہ گھاٹی نما حصّہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اُنھیں ذرا سی دیر ہو جاتی تو ہم آگے نکل چکے ہوتے۔ سب کو چند لمحوں اور چند قدموں کے اِسی ایک موقع کی تلاش تھی۔

[illegible] کے مانند گنگ کھڑے۔ تجمل کی طرف سے کسی اشارے [illegible] تجمل تبھی کوئی اشارہ کرتا جب اُسے کسی لمحے کوئی [illegible] نظر آتی۔ ہمارے کسی بھی غلط فیصلے کی تلافی ممکن [illegible] تجمل سر اٹھائے گھوم گھوم کے انھیں دیکھتا رہا۔

[illegible] ماسٹر ہاری کی گھٹتی ہوئی چیخ پر سب اُس کی طرف [illegible] ہاری ابا جان کو روک رہا تھا جو ہم سے کچھ کہے بغیر [illegible] درمیان سے نکل کے قریب کے ایک ٹیلے کی طرف بڑھ [illegible] ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ابا جان کا یہ اقدام اتنا [illegible] اور ناقابلِ فہم تھا کہ سب ایک لمحے کے لیے جیسے اپنے [illegible] بیٹھے۔ جامو، سلطان اور میں نے انھیں روکنے کے لیے [illegible] وقت بھاگنے کا ارادہ کیا مگر تجمل کی آواز نے ہمارے قدم [illegible] ابا جان کی رفتار میں تیزی نہیں تھی۔ ہم سے کچھ دور [illegible] پہنچ کے وہ ٹھیر گئے۔ میرا دم آنکھوں میں اٹکا ہوا تھا۔ [illegible] انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لیے اور پہاڑوں [illegible] ہوئے لوگوں سے اشاروں اشاروں میں کچھ کہنا چاہا اور [illegible] جان کے حیرت ہوئی کہ اُن کے اشاروں کے جواب میں [illegible] رک گئے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے سر جھکا کے ابا [illegible] تعظیم دی تو ہم سب کی سمجھ میں آیا کہ ابا [illegible] نے یوں آگے بڑھ جانے کی جرأت کس اعتبار میں کی ہے۔ [illegible] کے لباس میں تھے۔ اپنے مخصوص حلیے کے سبب دور [illegible] سے وہ ہم میں سب سے الگ نظر آتے تھے۔ کھڑے کھڑے [illegible] ہانپنے لگا تھا۔ جامو نے میرا بازو پکڑ لیا۔ "لاڈلے! ذرا آہستگی [illegible] نظر کو کسی ہی رکھنا۔"

"جامو بھائی!" میری آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔

"لاڈلے جانی!" اُس نے میرے بازو میں اپنی انگلیاں گڑو [illegible] "کبھی تو نے یہ نہیں پوچھا کہ تیرے جامو بھائی نے کیسی کاٹی ہے؟"

میں نے پلٹ کے اُسے دیکھا۔ جامو اپنی آنکھیں چھپانے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر لرزتی ہوئی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ میرا جی چاہا کہ اُس کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ جامو نے کوہنی مار کے مجھے چونکایا اور سامنے دیکھتے رہنے کی تلقین کی۔

ابا جان کے ہاتھ ابھی تک اٹھے ہوئے تھے۔ نیچے کے کھٹکے پر میری انگلی جمی ہوئی تھی اور میری نگاہوں نے اُن کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ اِدھر وہ لوگ ٹھیرے اُدھر سلطان نے لپکتے ہوئے لہجے میں تجمل کو مخاطب کیا۔ "استاد! یہ تشام بولتی ہے۔ اُدھر آگ لگانے کا مطلب سفید جھنڈی ہے۔"

"ہتھیار بڑھا لو۔" تجمل نے بوجھل آواز میں کہا۔ "سلطانے! تو آگ لگا دے۔" یہ کہہ کے وہ نپے تلے قدموں سے ابا جان کے پاس اوپر ٹیلے پر چڑھ گیا۔ باقی سب لوگ نیچے ہی رہے۔ سلطان نے قلیوں اور تشام کی مدد سے ایک مشعل میں آگ لگا دی۔ دھوپ میں اُس کے شعلے مرجھائے ہوئے تھے تاہم اوپر والوں نے اُسے دیکھ لیا ہوگا۔ صرف مشعل جلانے پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ آڑے وقت کے لیے یاکوں پر خشک لکڑیوں کا جو ڈھیر بندھا رہتا تھا، اُسے اُتار کے اُس میں بھی آگ بھڑکا دی گئی۔ اس طرح اوپر سے گھیرے آنے والوں کو ہماری طرف سے یہ پیغام منتقل کر دیا گیا کہ ہم مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ سب نے تجمل کی ہدایت پر ہتھیار نیچے کر لیے تھے۔ جاتے جاتے وہ اشارہ کر گیا تھا کہ سامان نیچے چھوڑ کے ہم سب اوپر آنے کی کوشش کریں۔ جس موقع کے ہم دیر سے منتظر تھے، اُس کی آمد بندھ چلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ ابا جان کی اپیل پر نظرِ ثانی کرتے یا رائے بدل دیتے، ہم نے ایک دوسرے کو نگاہوں سے ٹھوکے مارے۔ آگ جلانے کے بعد ہم نے چند ثانیوں کی تاخیر کی ہوگی کہ ایک ساتھ سب اِدھر اُدھر منتشر ہوتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہم نے رفتار میں کسی عجلت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہاں ہم زیادہ بہتر طریقے سے انھیں دیکھ سکتے اور زیادہ محفوظ انداز میں اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ یہاں جگہ خاصی کشادہ تھی۔ پتھریلی چٹانوں میں آڑ لینے کے لیے کئی گوشے موجود تھے۔ ہم نے دوبارہ اپنے ہتھیار اوپر نہیں کیے۔ "ابھی ان کو اوپر نیچے آ جانا تھا بڑے صاحب!" تجمل شکایتی لہجے میں ابا جان سے بولا۔

"اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔" ابا جان نے مایوسی سے کہا۔

"پر اُن کا ابھی اوپر نیچے آنا ٹھیک تھا۔"

"میرا خیال ہے ہمیں اُن سے بات کر کے دیکھنی چاہیے۔"

"وہ جو بولیں گے، وہ آپ بھی جانتے ہو بڑے صاحب!"

"لیکن ہمارے پاس اُن کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ہاں بڑے صاحب!" تجمل نے گہری سانس لے کے کہا۔ "شاید اپنے کو بھی بعد میں یہی کرنا پڑتا، پر ذرا پہلے اُن کو نزدیک سے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

"اُن کے پاس کثیر تعداد میں ہتھیار ہیں اور ہماری نسبت وہ زیادہ بہتر جگہ پر ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ صورتِ حال سمجھ لینی چاہیے۔" ابا جان نے تذبذب سے کہا۔

"آپ اِدھر آرام سے بیٹھے رہو۔ ابھی ہم لوگ اُدھر جا کے اُن سے بات کرتے ہیں۔" تجمل نے سولم، پیرو اور مجھ سے آگے بڑھنے

کے لیے کہا۔
"نہیں!" ابا جان تندی سے بولے۔ "اگر میری رائے آپ لوگوں کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو میں آپ کو اُن کے پاس جانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میں خود جا کے بات کرتا ہوں۔ آپ سے زیادہ یہ سب کچھ دیکھنے کا صدمہ مجھے ہوگا لیکن اِس کا امکان ہر وقت موجود تھا۔ ہماری ذرا سی بے احتیاطی ہمارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ دونوں میں سے ایک بات کا فیصلہ ہمیں ابھی کر لینا چاہیے کہ ہم زیادہ قیمتی ہیں یا ہمارا مال و اسباب۔"
"آپ کیا بول رہے ہو بڑے صاحب!" انجل نے بےچینی سے کہا۔
"میں درست ہی کہہ رہا ہوں۔ میری رائے میں کسی قسم کی الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سامنے ہمارے لیے اندیشے زیادہ تحفظات کم ہیں۔ سب کچھ اُن کے حوالے کرنے کے لیے ذہن آمادہ کر لیجیے۔ اس آمادگی کے سوا کوئی اور تدبیر ہو تو مجھے بتائیے۔"
"آپ جو سوچ رہے ہو، صرف اتنا نہیں ہے۔"
"پھر کیا ہے؟"
"وہ نہیں جانتے کہ اپنے پاس کیسا سامان ہے۔ اُن کو اُس کا ابھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ وہ تو ہم کو لینے آئے ہیں۔"
"لیکن ہمارے پاس اور کیا ہے۔ یہ سب اُن کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔" ابا جان نے بھاری لہجے میں کہا۔
"بہت تھوڑا ہے بڑے صاحب! اتنے سے اُن کا بھلا نہیں ہوگا۔ ہم نے اُدھر جا کے اُن سے بولا تھا کہ ہم اُن کے کھوئے ہوئے کاغذ واپس لانے کا جتن کریں گے۔ اُن کو یہ بولے بغیر ہم روز اُدھر اور یہ نیچے آ جا نہیں سکتے تھے۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے میں نے پہلی بار آپ کو سب بول دیا تھا۔ اِن پتھروں کی نہیں، اُن کو کاغذ کی ضرورت ہے۔"
"لیکن کاغذات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا مگر آپ نے بقول آپ کے کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بہتر ہے انھیں ہمارے سامان کی تلاشی لینے دیجیے۔"
"وہ ہم کو واپس لینے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے اُن سے پورا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پر نو سال تک کسی نے اِدھر آ کے اُن سے ایسا بولا تھا، نو سال سے وہ سالے ہندوستان میں سر مار رہے ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کرو بڑے صاحب!"
"میں سمجھ رہا ہوں لیکن کاغذ یہاں نہیں ہیں۔"
"یہ بات آپ مجھ سے بول رہے ہو، اُن کو کیسے بولا جائے۔"
"آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ ہمارا وعدہ ابھی تک قائم ہے۔ ہم کاغذات انھیں واپس کر دیں گے۔ اگر انھیں حاصل کرنا مقصود ہے تو ہماری بات کا یقین کرنا ہوگا۔"
"آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟"
"جی!" ابا جان ہچکچا کے بولے۔
"میں بولتا ہوں، وعدہ پورا کرنے کے لیے آپ اُن کو اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ ایسا بولیں تو آپ کیا جواب دو گے؟"
"نہیں۔ میں ایسا نہیں چاہوں گا۔"
"بڑے صاحب!" انجل نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ نے اُن کو روک دیا ہے۔ ابھی آپ اِدھر ٹھیرو۔ ہم جا کے اُن کو دیکھتے ہیں۔ آپ سے وہ کچھ بولیں تو ہم سے آپ اپنے کو الگ بولنا۔"
"آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کے لیے سود مند ہے تو بہتر ہے میں اُن سے یہی اظہار کروں گا لیکن آپ خود اُوپر جا کے اُن سے کیا بات کریں گے؟"
"ابھی اُدھر جا کے دیکھتے ہیں بڑے صاحب!"
"میں سمجھتا ہوں، میری بات شاید وہ مان جائیں۔"
"پر آپ ایسی بات ہی کیوں بولو جس کے نہ ماننے سے آپ کا بھرم بھی جاتا رہے۔"
"ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ ہم سخت خطرے میں ہیں۔"
"اِن لوگ سب خطرے کی گھڑی میں جنم لیے تھے۔" بیرو آگے آ کے تیزی سے بولا۔ "یہ اِن کے راجا کے بارے آپ ٹھیک جانتے ہو گے بابا!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ "ہم اِن کو ایک دم یقین ہے راجا بھی ایسی گھڑی میں اِدھر آیا ہوگا۔ آپ بالکل ٹھکانے سے بیٹھو۔ اِن نے آپ سے بولا تھا، بولا تھا کہ اُدھر سے سارا اسباب چکتا کر کے آیا ہے۔"
"مگر، مگر۔۔۔" ابا جان نے آنکھیں بند کر لیں۔
"بڑے صاحب! آپ اِدھر ہمارے ساتھ ہی رہو۔" جانو نے لجاجت سے کہا۔
"درست ہے، درست ہے۔" ابا جان اُکھڑی ہوئی سانسوں سے بولے۔
دیر ہو رہی تھی۔ وہ دور کھڑے ہم لوگوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے لیکن ہماری آواز اُن تک نہیں پہنچ رہی ہوگی۔ ہماری جانب سے وہ جلد از جلد کسی اقدام کے منتظر ہوں گے۔ انجل نے ابا جان کی طرح چاروں طرف گھومتے ہوئے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ سولم، بیرو اور میں نے اُس کی تقلید کی۔ کچھ توقف



...طرف سے جواب میں ہاتھ بلند کیے گئے۔ تجمل نے ...کی۔ باقی لوگوں کو وہیں ٹھیرے رہنے کی تاکید کر کے ...بلندی پر چلنے لگا جس جانب سے جواب آیا تھا، ...چند آدمی بھی ہماری طرف بڑھنے لگے۔ راستے میں تجمل ...کوئی بات نہیں کی۔ ہم تیز تیز قدموں سے درمیان کا ...فاصلہ کم کرنے لگے۔ کبھی سامنے درختوں اور چٹانوں کی وجہ سے ...وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ ہم نے ...آنکھوں میں نہیں اٹھائے تھے۔ آدھ گھنٹے کے وقفے میں ...پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے آگے آنے والے آدمی ...وہ جانے والوں سے اتنی دُور نہیں آئے تھے جتنے ...لوگوں سے دُور ہو گئے تھے۔ جو لوگ سامنے آئے تھے ...قبیلے ہی کے آدمی تھے۔ گنتی میں چھ، عمروں میں مختلف، ...یکساں انھوں نے کسا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور اُن کے ...سفر کی تھکن کے آثار نہیں تھے بلکہ تازگی کھلی ہوئی تھی، ...طرح چاق و چوبند اور مستعد۔ ایک تبتی سپاہی کے پاس ...جنگ میں جتنے ہتھیار ہو سکتے ہیں، اُن کے جسم اُن سب ...سے مزین تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص بلند اور تن درست و توانا ...اُن میں سب سے نمایاں تھا اور ہمارا صورت آشنا تھا۔ اُس کی کمر سے ایک تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ ہم نے اُسے قبیلے کے سردار کے خاص کمرے میں کئی بار دیکھا تھا۔ دوسرے آدمیوں کے ...اور دیکھنے کا اتفاق ہمیں شاید نہیں ہوا تھا۔ صورت شکل ...میں تمام تبتی ایک جیسے لگتے ہیں۔ ممکن ہے انھیں بھی ہم نے سردار کے مکان یا بستی میں کہیں دیکھا ہو۔ سب کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہم ہی پر مرکوز تھیں۔ اُن کے چہرے انگارا ہو رہے تھے۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر تجمل نے کسی تمہید کے بغیر تبتی لہجے میں پوچھا: "سردار نے بھیجا ہے؟"

شولم نے فوراً اُسی کے لہجے میں ترجمانی کر دی۔

"ہاں!" ادھیڑ عمر شخص نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"سردار کدھر ہے؟"

"بستی میں ہے۔"

"ہم کو ساتھ لے جانے کو آئے ہو؟"

"ہاں!"... اُس نے مختصر جواب دیا۔

"اتنے بہت سے آدمی بلانے بھیجے ہیں؟"

"پیچھے اور بھی ہیں۔"

"اچھا!" تجمل نے سکون سے کہا: "پر کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے۔" وہ نخوت سے بولا۔

"سردار سے بولو کہ ہم اُدھر واپس آئیں گے۔ ابھی ہمارا بہت سا سامان اِدھر پڑا ہے، ہم نے اپنی طرف سے سردار کو جو بات بولی تھی، وہ ہم کو یاد ہے۔ اُس کو پورا کرنے کی ہم کوشش کریں گے۔" تجمل نے متانت سے کہا۔

"سردار نے ہمیں ایک ہی حکم دیا ہے کہ تمھیں واپس لایا جائے۔"

تجمل سر ہلانے لگا: "تم کو پتہ ہے ہم نے سردار سے کیا بولا تھا؟"

"تھوڑا بہت۔" اُس نے سر جھٹک کے کہا۔

"ابھی ہم کو کچھ نہیں ملا ہے۔"

"یہ سردار کو ہی جا کے بتانا۔"

"سردار سے تو ہم نے ساری بات صاف کر لی تھی۔ ہم نے بول دیا تھا کہ چار مہینے تک کدھر بھی آئیں کدھر بھی جائیں۔ وہ بیچ میں روڑا نہیں ڈالے گا۔ چار مہینے بعد اگر ہم کو کچھ ہاتھ نہیں لگا تو اپنا کالا منہ لے کے اُس کے پاس تبھی لوٹیں گے۔ ہم لوگوں نے تو بس چپڑی چلائی ہے، ابھی تین ایک مہینے کے لیے کیوں اُلٹا سیدھا کر رہے ہو؟"

"ہم سے کوئی صفائی مت کرو، جو کچھ کہنا ہے جا سردار سے جا کے اُس کی وضاحت کر دو۔"

"اُدھر جانے سے نہ سردار کا بھلا ہے نہ اپنا، تمھارے پاس اچھا بدن ہے، بھیجا بھی اچھا ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو جا کے سردار کو کیا ٹھینگا دیں گے۔ ہمارا راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو؟"

"ہم نے سردار کا حکم تمھیں بتا دیا ہے۔"

"اور ہم تم سے یہ نہیں بولیں گے کہ یہ سردار کا حکم نہیں ہے۔"

"تم یہ نہ کہو کہ اچھا ہی کرو گے اور ہماری بات مان کے اور اچھا سردار سے جا کے خود بات کر لو۔ ابھی بستی زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"چار آدمی بھیج کے سردار ہی کو اِدھر بلا لو، ہم اُس کا انتظار کر لیں گے۔" یہ کہنے سے نہ جانے تجمل کا کیا مقصد تھا۔

اُس نے منہ بنایا۔ "ہمارے لیے سردار کا ایک ہی فرمان ہے۔"

"کوئی دوسرا نہیں؟" تجمل نے سرد لہجے میں کہا۔

"دوسرا بھی ہے۔"

"اُس کو بھی بولو۔"

"اُس کے بتانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔" اُس نے ناگواری سے کہا۔

"تم اِدھر کب سے ہو؟" غالباً تجمل کو یہ جاننے کی جستجو تھی کہ وہ بڑے مندر کے علاقے میں اپنے چار آدمیوں کی موت کی اطلاع سُن کے آئے ہیں یا پہلے سے موجود ہیں۔ اُن کے تیور کو تراز و کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا۔

"تمھیں اِس سے کوئی غرض نہیں۔"

"غرض کیوں نہیں ہے سُور ماسیاں؟" معلوم نہیں سُولم نے تیلی کا کیا ترجمہ کیا ہوگا۔ اُس شخص کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"تمھاری طرف سے کیا جواب ہے؟" اُس کی آواز بگڑنے لگی۔

"کیا جواب دیں پیرو دادا؟" تجمل نے پیرو کی طرف دیکھ کے کہا۔

"ابھی کیا بولیں اُستاد!" پیرو کڑواہٹ سے بولا۔ "سالا ڈیل ہے منہ کو لگام مانگتا ہے۔ اپن اتنی بات نہیں سُنتا۔"

تجمل چند لمحے چپ کھڑا رہا۔ ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے آدمیوں کے ہاتھوں میں کمانیں تنی تھیں۔ ہماری ایک ایک جنبش اُن کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وادی میں ندی کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ "اپنے لیے واپس جانے میں تمھارا ہی گھاٹا ہے۔" تجمل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہم اپنا گھاٹا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ ہم تو ایک زمانے سے گھاٹے میں ہیں۔" سردار کے پیغام بر کی آواز تپی ہوئی سی تھی۔

"بولو پیرو دادا!"

پیرو نے تجمل کو جواب دینے کے بجائے سولم سے کہا۔ "اِس سے بولو سُولم، سالا سردار کو اپن کچھ جاستی پسند آگیا ہے کیا۔ اُودر اپن کے لیے اپنی ماں بہن کو سامنے کریں گا یا خود لیٹے گا؟... اِس سے بولو کہ ابھی اپنا کچھ آدمی اپن کے ساتھ باندھ دے۔ پھر اپن دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان کا سیر ماریں گا اور گھوڑے گھوڑے ردّی کا غذ کھوجیں گا۔"

میں نے پیرو کا ہاتھ دبا کے اُسے روکا۔ پیرو کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔

سُولم نے اپنی طرف سے قطع و برید کر کے پیرو کی پیش کش دُہرا دی۔

"اِس کا فیصلہ بھی سردار کرے گا۔"

"یہ چڑی مار تو اپن کو ایک دم حکم کا غلام لگتا ہے۔"

"بالکل ہے دادا!"

"اپن اصیل بولنے کو تھا۔" پیرو چمک کے بولا۔

"تمھارے سردار کو کاغذات چاہئیں [illegible]

آواز میں بولا۔

وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچانے لگا۔ "کاغذ [illegible]

"تو ابھی اپن اُودر جا کے سردار سے منع [illegible]

پیرو نے تجمل کے کچھ کہنے سے پہلے درمیان [illegible]

قبیلے کا آدمی ہے۔ ایدر تمھارے ساتھ اور سب لوگ [illegible]

سردار کے آگے پیچھے کی سکوٹ کر لو اور سمجھو کہ ابھی [illegible]

ہے۔ کاغذ ایدر نئیں ہے۔ اپنا سامان تلاشی کر لو۔ [illegible]

میں اُودر جا رہا ہے بابا! اپن کو بھی مال بنانے کی جلدی [illegible]

بیزاری سے کہنے لگا۔ "اپن سے گھٹالا مت کرو۔ نو سال [illegible]

سال لگ جائیں گا۔ سب ایک ایک کر کے سو جائیں گا۔ [illegible]

نئیں ہونے گا۔ سُولم! اِس کو بولو کہ ایدر بھی تمھارا لوگ [illegible]

جو اپن ایدر بول رہا ہے اُودر بھی جا کے اتنا بولے گا۔" [illegible]

میں لکنت آ گئی تھی۔ "سُولم! اِس کو بولو، کھوپڑی سیدھی [illegible]

آدمیوں سے سوچ بچار کر لو۔ اپن ایدر ہی ہیں۔ بولو کہ اپن کا [illegible]

مجھے حیرت تھی کہ تجمل اور پیرو ایسی اور اتنی باتیں کیوں [illegible]

رہے ہیں، بالکل فضول۔ انھیں ابتدا ہی میں اندازہ لگا لینا [illegible]

تھا کہ وہ کوئی اور بات سُننا نہیں چاہتے۔ گو سُولم نے احتیاط [illegible]

ترجمانی کرتے ہوئے پیرو کا لہجہ منتقل نہیں کیا تھا، وہ دلال اور [illegible]

انداز میں انھیں اُس کی کہی ہوئی باتیں منتقل کرتا رہا تھا لیکن [illegible]

سب اگر ہندوستانی نہیں جانتے تھے تو پیرو کا لہجہ اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھا اور اُن میں سے ایک معمّر شخص سر اُٹھا کے بولا۔ "ہم سمجھیں تم انکار کرتے ہو؟"

"اپن سمجھیں تم انکار کر رہے ہو؟" پیرو بھڑک کے بولا۔

"دونوں کا انکار بُرا ہے دادا!" یکا یک تجمل نے دھیرے سے کہا۔

"پھر کیا... کیا ہے تجمل بھائی؟" پیرو چونک پڑا۔

"سردار کی عزت تم سے بڑی ہے۔"

"مطلب تم... تم واپس جانے کو بولتے ہو کیا؟" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں دادا!" تجمل نے کسمسا کے کہا۔

پیرو کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، وہ تجمل کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا جیسے اُس نے جو سُنا ہے وہ تجمل نے نہیں کہا ہے مگر وہ تجمل ہی نے کہا تھا۔ پیرو کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

جب جھل نے سولم سے کہا: "بولو کہ چلیو۔ یہ اب کاغذ کا دھیان چھوڑ دو۔ اب تمھارا باپ ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ بولو کہ سردار نے کاغذ بیچ میں ڈال کے اپنا وعدہ توڑ دیا ہے۔ ہم بھی اب اُس کے پابند نہیں ہیں۔ کاغذ کو بھول جاؤ، اُدھر سردار نے اُس ٹائم تم میں سے بہت سے جوں گے جب اُس نے ہم کو توڑنے کے لیے اپنے آدمیوں کو ٹھیک ٹھاک بیٹھک کرائی تھی اور ہم نے اُس کو بولا تھا کہ اپنے کو اکیلے جانا ٹھیک نہیں لگتا۔ گنتی تمھاری زیادہ رہے گی۔ ہم تو اُدھر اپنے ٹھکانے سے سر کو اُدھار جان کے چلے تھے۔"

سردار کا پیغام بر فوراً کوئی جواب نہیں دے سکا۔ وہ نہ اُس کا کوئی ساتھی۔ انھیں بھی پیرو کی طرح جیسے جھل کی بات پر اعتبار نہیں تھا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ وہ چپ چاپ کھڑے اضطراری نگاہوں سے ہمیں تکتے رہے۔ پھر سردار کے پیغام بر نے سٹ پٹاتے ہوئے کہا: "تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔"

"جو بھی کیا ہے تم سے اُس پہ ٹھپا نہیں لگوانا ہے۔"

"اپنے ہتھیار اُتار دو۔"

"تھوڑی دیر میں بولنا اپنے کپڑے اُتار دو۔"

"سردست ہتھیار ہی اُتار دو۔"

"ہاں، ہاں۔" جھل کے نتھنے پھولنے لگے۔ "ہتھیار بھی اتار دیں گے بلّا! اپنے لیے پھر کیا چوڑیاں لائے ہو۔ بولو گے تو اُن کو بھی پہن لیں گے پر تمھارے پہننے کے بعد۔"

"ہم کہتے ہیں اپنے سارے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔"

"تم بھی ایسا کرو گے تو اپنے کو کیا انھیں چاٹنا ہے۔"

"ہم..... ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"ادھر تمھارے ساتھ یہ سب حرام کے جنے ہیں کیا! ایک بار پھر گنتی کر لو۔ بھوسا بھر کے نہیں لائے ہو گے۔ واوا! سنا؟ ہتھیار اُتارنے کو بولتے ہیں۔"

"اپنے کو سالے اُلّو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔" پیرو پھنکارتے ہوئے بولا۔

"تمھارے ہتھیار ہمارے پاس محفوظ رہیں گے۔ سردار کے پاس جا کے یہ تمھیں واپس مل جائیں گے۔" ان میں سے ایک نوجوان تیزی سے بولا۔

"اور تمھارے اپنے پاس۔"

"اس کا مطلب ہے تم انکار کر رہے ہو تم چلنا نہیں چاہتے۔"

"ہم نے جو بول دیا ہے، اُتنا ہی ٹھیک ہے۔"

"چھوڑو جھل بھائی! یہ سالا کتے کی دم ہے۔" پیرو نے تلملا کے کہا: "سولم! ابھی اِس کو بولو کہ فیصلہ کرے۔ اپنے کو لے جانا مانگتا ہے تو ہتھیار کے سنگ۔ اپن سالا قبیلے سے سردار کی ماں بھگا کے نہیں لایا ہے۔ ادھر ایک چھوکری اُودر کی اپنی مرضی سے آئی ہے۔ مرضی بدلے تو لوٹ جائے۔ اپن نہ ادھر کا آدمی ہے، نہ سردار کا کھاتا ہے۔ سالا ایک کے برابر ڈزن ڈزن بھرے ہے۔ پھر بولنا ہے جیب نکال دو۔ پھر بولیں گا، آنکھ الگ کر دو، کان الگ کر دو۔" پیرو منہ چڑا کے بولا: "مسخری مارتا ہے۔ قسم سے ابھی اُستاد بادشاہ کا خیال ہے۔ اپن کا خون بہت گندا ہے۔"

وہ تنتام کے ذکر پر ایک لمحے کے لیے چونکے تھے۔ شاید اُن کے لیے یہ اطلاع نئی تھی مگر انھوں نے پلٹ کے نہیں پوچھا کہ قبیلے کی کون سی لڑکی ہمارے ساتھ آئی تھی، تاہم اُن کے چونکنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مندر کے تہہ خانے سے ہمارے نکلنے اور تنتام کے ساتھ ہونے سے پہلے انھوں نے یہاں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ انھیں یقین ہو گا کہ اگر ہمیں ہندوستان کی طرف جانا ہے تو ہم اس جگہ سے ضرور گزریں گے۔ پیرو نے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو ہمارے سامان کی تلاشی لے لیں۔ انھوں نے اِس پر توجہ نہیں دی۔ وہ طے کر کے آئے تھے کہ ہمیں بستی واپس لے کے جائیں گے تو ہمارا سامان چھیڑنا لاحاصل تھا۔ یہ کام وہ بستی میں جا کے بھی کر سکتے تھے۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو ہتھیار اُتار کے چلیں، انھوں نے بحث نہیں کی۔ حالانکہ وہ کہہ سکتے تھے کہ پھر بستی سے کوئی اطلاع دیے، کسی سے کچھ کہے سنے بغیر ہمیں یوں غائب ہو جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اطلاع دینے میں کیا عذر تھا۔ یہ کوئی منظم پروگرام ہی ہو گا، دوسرا قافلہ بھی ہمارے ساتھ تھا جسے ہم نے اپنے جانے سے تین دن پہلے بستی سے روانہ کیا تھا۔ پیرو اور جھل نے سردار کے سامنے خود کو دو قافلوں کے طور پر پیش کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے آئے تھے۔ اب وہ دونوں ساتھ تھے۔ ہزار قسم کے وسوسے اُن کے ذہن میں گردش کرتے ہوں گے۔ کاغذ کی متبرک حیثیت کے علاوہ اُن کے بارے میں اور بھی بے شمار روایتیں مشہور تھیں۔ ہر چند کوئی بات واضح نہیں تھی۔ اس سلسلے میں اُن کا علم سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں تھا۔ کسی مخفی خزانے کی روایت بھی اُن میں سے ایک ہو گی۔ اشاروں کنایوں میں انھوں نے اُس کا تذکرہ بھی کیا تھا مگر وہ یقیناً بڑے مندر کے تہہ خانے میں چھپے ہوئے عظیم الشان خزانے کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ کبھی انھوں نے ان کاغذات کی تحقیق کی باقاعدہ کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ایک تو وہ انھیں چھوتے ہوئے ڈرتے تھے یا پھر وہ اُن کے رموز جاننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ ممکن ہے کبھی کسی نے ان کی تحقیق کی جرأت کی ہو اور قبیلے میں فساد کے خوف سے خاموش

ہو۔ اگر کبھی ایسی کوئی کوشش کی گئی تھی تو اُس کا علم چند لوگوں تک محدود رہا ہوگا۔ جس زمانے میں قبیلے کا سردار، کورا کا باپ مارا گیا تھا، اُس زمانے میں اُس کے اتالیق اقبین نے، ہو سکتا ہے، کوئی رمز دریافت کرلی ہو جس کا علم کورا کے چچا کو بھی ہو گیا ہو اور اُس نے محض اسی سبب سے اپنے بڑے بھائی کو راستے سے ہٹا دیا ہو مگر اقبین کی ذات اور کورا کو لے کے اُس کی دست برد سے دُور ہو گیا۔ بہر حال اقبین کی ذات سے متعلق اَن گنت روایتیں قبیلے میں ہماری اچانک آمد اور ہمارے متضاد طرزِ عمل کے پیشِ نظر وہ ہمارے بارے میں اَن گنت قیاس آرائیاں کرنے میں حق بجانب تھے مگر انھوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بجائے بس اپنا مقصد سامنے رکھا تھا کہ وہ کسی طور ہمیں سردار کے سامنے زندہ پیش کر دیں۔

پیرو اور بجبل کی زبانی ہتھیار اتارنے سے حتمی انکار سُن کے وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ادھیڑ عمر شخص جو اُن میں سب سے بڑا عہدے دار تھا، ہمارے ہتھیار ہمارے ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں تھا مگر اس کے دوسرے ساتھی اُس کے ہم نوا نظر نہیں آتے تھے۔ اِس دوران پیرو بڑبڑاتا رہا۔ بجبل نے اُس کی کمر تھپک کے اُسے کسی طرح چپ کیا اور ہم سب اُن کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ اب کوئی اور اُمید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ہتھیار چھن جانے سے ہماری تعداد و نہ ہونے کی برابر رہ جاتی۔ بجبل، پیرو، سولم اور میں، چاروں اُن کی نا آمادگی کی صورت میں اپنے تمنچے اور چاقو نکالنے کے لیے مستعد تھے اور ہمیں اندازہ تھا کہ ہماری کسی بھی حرکت پر ایک لمحے میں چاروں طرف سے تیر برسنا شروع ہو جائیں گے۔ تیر چلنے کی نوبت آتی تو ہم میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ ایک ہاتھ میں تمنچا، دوسرے میں چاقو لے کے جھٹ اُن کے غول میں گھس جاؤں گا۔ وہ اپنے آدمیوں کو اشارہ کرنے سے پہلے ہمارے جواب کا انتظار ضرور کریں گے۔ اسی مہلت میں ہم اُن پر جھپٹ سکتے تھے۔ بجبل، پیرو، سولم نے بھی یہی سوچ رکھا ہوگا۔ اس موقع پر تمنچے سے کارگر کوئی اور ہتھیار نہیں ہوگا۔ مجھے ابا جان کے ساتھ کھڑے ہوئے ہمارے سارے آدمیوں کی نظر ہم پر ہوگی۔ وہ اب ایک ٹیلے پر تھے اور اُن کی بندوقیں اوپر کھڑے ہوئے لوگوں کا نشانہ لے سکتی تھیں۔ وہ آخر دم تک نشانے لگاتے رہیں گے اور کسی کو بھی کسی حیران کن نتیجے کی توقع نہیں ہوگی۔ ہم کتنی گولیاں چلائیں گے۔ ہمارے پاس کارتوس یقیناً اُن کی تعداد سے بہت زیادہ تھے مگر انھیں استعمال کرنے کا موقع ملتا تب نا۔ یوں بھی اُن کے ساتھ جانا تھا لیکن ہتھیاروں کے بغیر زندہ جانا بھی مُردوں کے مانند جانا تھا۔

نکتے دانے

- اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ مکھن توس کے کس رُخ پر لگا ہوا ہے۔ آپ کو توس کے دونوں رُخ کھانے پڑتے ہیں۔
- اُسے سانپ نے ڈس لیا۔ میں نے اُسے شراب دی، اُس کا زہر تو نہیں اُترا مگر وہ اِس دُنیا سے خوشی خوشی رخصت ہو گیا۔
- تم اگر لوگوں کے جنازوں میں نہیں جاؤ گے تو وہ بھی تمھارے جنازے میں نہیں آئیں گے۔
- وہ بہت امیر ہے۔ خیرات مانگنے کے لیے دو کشکول لے جاتا ہے۔
- جی ہاں، دولت صرف مصائب لاتی ہے مگر آپ دولت سے انھیں دور بھی کر سکتے ہیں۔
- کھیل تو بہت اچھا تھا مگر تھیٹر میں ایک بات غلط تھی، کرسیوں کا رُخ اسٹیج کی جانب تھا۔



ہتھیار اُن کے حوالے کرنے تھے تو بھرے ہوئے ہی کیوں۔ بندوقیں اور کارتوس خالی کر کے اور خنجروں، چاقوؤں کی دھار کُند کر کے ہی کیوں نہیں۔ ایک پل، دو پل کی دیر تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کے پیچھے کھڑے ہوئے ابا جان کی طرف دیکھا۔ اُن کا سر جھکا ہوا تھا۔ میرے لیے دعا کر رہے ہوں گے۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھر اُن کا چہرہ دیکھنے کا وقت ملے گا یا نہیں۔ آنے والی گھڑی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر مجھے ابا جان سے دو باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تو میں اُن سے زرّیں، نیساں، شہ پارہ کے لیے کچھ کہتا اور اپنی بنڈی میں رکھی ہوئی چیک بک اُن کے حوالے کر دیتا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ ابا جان پر ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے لیکن اُن کی موجودگی میں ابا جان میری لاش کو بھی اپنے سینے سے نہیں لگا سکیں گے۔ اُن چند لمحوں میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے کہ میرا سارا وجود لرز لرز گیا۔ کچھ دیر پہلے پیرو نے ابا جان سے کہا تھا کہ میں خطرے کی کسی گھڑی میں پیدا ہوا ہوں گا۔ خطرے کی نہیں تو وہ نحوست کی گھڑی ضرور تھی۔ میرا وجود ہی نحس تھا۔ سب ایک آدمی کے سبب سے تھا۔ وہ نہ ہوتا تو اتنے لوگ اس دور افتادہ، اجنبی جگہ پر یوں زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا نہ ہوتے۔ کاش عدالت میں تین آدمیوں کے قتل پر اُسے ابتدا ہی میں موت کی سزا مل جاتی۔ اکٹھے چار تو اُس کے جسم کے لیے کھلے تھے۔ کوئی ایک اُن میں سے لگ جاتا تو یہ وقت نہ آتا۔ معلوم نہیں، وہ چند آدمی دنیا سے کیوں نہیں اُٹھ جاتے جو خود بھی زندہ نہیں رہتے، دوسروں کو بھی چین سے نہیں رہنے دیتے۔ میرے قریب بجبل پُرسکون انداز میں کھڑا تھا۔ پیرو بھی بظاہر مطمئن نظر آتا تھا۔ اندر ایک طوفان مچا ہوگا۔ اُس کی بیٹی گیتا اور بیوی کی

پر چھائیاں آنکھوں میں لرز رہی ہوں گی۔ کاش وہ سب مل کے پہلے مجھے مار دیتے۔

ادھیڑ عمر شخص اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے جیسے ہی ہماری طرف متوجہ ہوا میرے ہاتھ تیزی سے اپنی جیبوں کی طرف لپکے لیکن ہتھیار باہر نکالنے کی ضرورت نہیں پڑی، ایک لمحہ جاتا تھا کہ میرے تمنچے کی گولی اس کے سینے میں پیوست تھی۔ اس نے سر کی جنبش سے اپنے اقرار کا اظہار کر دیا تھا۔ "یہ کسی تاخیر کے بغیر چلو۔" اس نے اونچی آواز میں ہمیں حکم دیا۔

* تجمل اور بیرو پھر ایک پل کے لیے بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہرے۔ چپ چاپ پیچھے ٹیلے پر آگئے جہاں سب ہمارے منتظر تھے اور یہ جاننے کے لیے مضطرب کہ ہم کیا طے کر کے آئے ہیں۔ شاید وہ کسی عجوبے کی توقع کر رہے تھے۔ تجمل نے ان سے سامان اٹھانے اور چلنے کے لیے کہا تو ان کی گردنیں ڈھلکنے سی لگیں مگر انھوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یاکوں کا رخ فوراً موڑ دیا گیا۔ جانگ قبیلے کے سارے آدمی اوپر ہی لیے اور اطراف سے ایک جانب سمٹتے گئے۔ وادی سے نکلتے ہی وہ ہمارے اردگرد ہو گئے۔ انھوں نے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کچھ لوگ ہمارے آگے تھے، کچھ پیچھے، کچھ دائیں بائیں۔ کچھ ہم سے قریب تھے تو کچھ دور۔ جو قریب تھے ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔ دور چلنے والوں کے ہاتھوں میں کمانیں تھیں۔ ابا جان اور نشانم ہمارے ساتھ ہی تھے۔ ایک بزرگ شخص نے ابا جان کے پاس آ کے انھیں الگ ہو جانے کی پیش کش کی تھی۔ ابا جان نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ ایسے حالات میں وہ ان لوگوں سے جدا ہونا مناسب نہیں سمجھتے جن کی رفاقت میں انھوں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہمارے ہمراہ ان کی واپسی کا جواز موجود تھا۔ ان دشوار گزار راستوں میں تنہا سفر کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ہمارے لوٹنے کے بعد ابا جان اکیلے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں راستے میں کسی دوسرے قافلے کی ہم رکابی کے عذر تک ہمارے ساتھ واپس چلنا تھا۔ بھکشوؤں اور تاجروں کے قافلوں کی سفری رفاقت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سفر کی دشواریاں کم کرنے کے لیے کبھی تاجر بھکشوؤں کے قافلے کے ساتھ ہو جاتے تھے، کبھی بھکشو تاجروں کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہمارے ہمراہ ابا جان کی موجودی پر کسی شبہے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ قریب آ کے انھوں نے نشانم کا چہرہ بھی دیکھ لیا تھا مگر نہ تو اسے برا بھلا کہا، نہ ابا جان کی طرح اسے ہم سے جدا ہونے کی پیش کش کی۔ جب سب بستی ہی کی طرف جا رہے تھے تو نشانم ادھر لے جاتے یا ادھر، بات ایک ہی تھی۔

اتنے بہت سے مردوں کے درمیان نشانم صرف ایک تھی۔ واپسی کا سن کے اس کے سرخ و سفید چہرے پر زرد[illegible] گئی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ جیسے اس کا خون سوکھ رہا ہو۔ تجمل نے ا[illegible] ایک یاک پر بٹھا دیا تھا مگر اس کے بدن کی لرزش کم نہ ہوئی[illegible] اس کے قریب ہی تھا اور سرگوشیوں میں اسے بار بار نہ جانے کیا تسلیاں دلا رہا تھا۔ پھر تجمل بھی اس کے پاس پہنچ گیا[illegible] نے نشانم کا ہاتھ تھام کے اس کے بدن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے[illegible] وہ مسکراتے ہوئے بولا "یہ رنگ کیوں بدلتی ہے۔ وہ لال رنگ[illegible] تیرے کو اچھا لگتا ہے۔"

نشانم کے ہونٹ سسکنے لگے۔

"نا، نا" تجمل اس کی انگلیاں چومتے ہوئے بولا "میری[illegible] ری۔ گڈا تو ادھر ہی ہے۔ سنگ سنگ جانا۔"

نشانم نے اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ دو دن سے وہ ہمارے ساتھ تھی۔ تجمل نے اسے پہلی بار مخاطب کیا تھا۔ "یہ بیچ میں[illegible] دن پڑے تھے اور گھر سے پگڈنڈی کا رستہ بھی چھوٹا نہیں تھا۔ جب دھیان نہیں دیا تو اب کاہے کا دھواں ہے۔ سجنی اب رت[illegible] ٹھیک نہیں لگتی۔" وہ ہنس کے بولا "یہ لوٹ پھیر تو ساری زندگی کا ہے۔ سینے کو اجلا ہی رکھ، جیسا لے کے آئی تھی دیا۔ سمجھتی[illegible]

پتہ نہیں نشانم کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں مگر دیکھتے دیکھتے اس کا کھویا ہوا رنگ واپس آنے لگا۔ اس کا مرجھایا ہوا بدن جیسے پھر سے نمو پانے لگا۔ سہ پہر ہو گئی تھی۔ ابھی ہم نے وادی سے چند میل آگے کا سفر طے کیا ہوگا، اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے اچانک سفر ملتوی کر دیا۔ وہ ایک کشادہ اور ہموار جگہ تھی۔ قریب ہی پڑاؤ کے لیے ایسی کوئی جگہ ملنی مشکل ہوگی اسی لیے انھوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیے۔ ان کے ساتھ بار برداری کے لیے بیس کے لگ بھگ یاک تھے۔ باقی سامان بڑے بڑے تھیلوں میں ان کی پیٹھ سے بندھا ہوا تھا۔ وہ فاصلے فاصلے سے ہمارے اردگرد مختلف مقامات پر جم گئے تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی انھوں نے مشعلیں روشن کر دیں اور الاؤ جلا دیے۔ ان میں سے چند لوگ ہماری پہرے داری چھوڑ کر کھانا تیار کرنے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ جامو اور پیرو نے صبح صبح کئی پرندوں کا شکار کیا تھا لیکن انھیں ہم نے محفوظ رہنے دیا۔ سولم نے ان سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ہمارے لیے بھی کھانا تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ وہ منع نہیں کر سکے۔ سو ہم نے خیمے نصب کر کے اور بستر لگا کے لیٹے رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ انھوں نے





ہیں کئی چھوٹی بڑی چھول داریاں کھڑی کر لی تھیں اور ہمارے
باہر متعدد آدمی پھیلا دیے تھے۔ جب تک انھوں نے
کے لیے آواز نہیں دی، ہم باہر نہیں نکلے۔ سارا جسم ٹوٹ
رہا تھا اور بخار سا محسوس ہو رہا تھا۔ انھوں نے وافر کھانا بھیجا تھا۔
کر جھجک ہی نہیں تھی۔ سب نے ایک دوسرے کے خیال سے
بہت جلد حلق سے اُتار لیا۔ ابھی رات کا ابتدائی پہر تھا۔ کھانا
کے بعد ہم کچھ دیر ہی باہر ٹھہرے ہوں گے کہ پھر خیموں میں آ کے
لیٹ گئے۔ جھبل نے سب کو تاکید کی تھی کہ پوری رات آرام سے سوئیں
مگر سب آنکھیں کھولے کروٹیں بدلتے رہے۔ کسی کے پاس دوسرے
سے کہنے کے لیے شاید کچھ نہیں تھا۔ باہر الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے
لوگوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھبل، ابّا جان، تشام، وزیر
اور سولم الگ خیمے میں تھے۔ بین، جامو، مارٹی، زورا اور جینی دوسرے
میں، تیسرے میں پیرو، سلطان، پلٹو، ہلاکو اور دو قلی تھے۔ تیسرا قلی
جھبل کے خیمے میں تھا۔ سب قریب ہی قریب تھے۔ کوئی زور سے
بات کرتا تو دوسرے خیمے کے لوگ سن سکتے تھے۔ رات گزرنے
پر ہم سب نے باری باری خیمے کی جھریوں سے جھانک کے دیکھا۔
اتنی سخت سردی میں وہ باہر ہی موجود تھے۔ نہ جانے انھوں نے
چھول داریاں کیوں نصب کی تھیں۔ کھانے کے دوران ایک شخص
نے آ کے ہمیں متنبہ کرنا ضروری سمجھا تھا کہ فرار کی کوشش ہمارے
لیے انتہائی عبرت ناک ہوگی۔ آگے کی منزلوں پر بھی اُن کے بقول جانگ
قبیلے کے گروہ موجود تھے۔ سب سُن کے خاموش رہے۔

جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، سردی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرا
خیال تھا کہ سردی سے گھبرا کے وہ آخر کار چھول داریوں میں پناہ
لیں گے۔ ممکن ہے جھبل کے ذہن میں ہو کہ اس لمحے باہر نکلنے کی
ہم کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور بارش ہوگئی تو لازماً انھیں اندر
گھسنا پڑے گا۔ الاؤ بھی بجھ جائیں گے، مشعلیں بھی گل ہو جائیں
گی۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں ستاروں اور
چاند پر چھا جاتی تھیں۔ بارش کا امکان نہیں تھا مگر کسی وقت بھی
بارش ہو سکتی تھی۔ یہاں ایسا ہی ہوتا تھا۔ اچانک بادل گھر کے آ
جاتے اور موسلا دھار پانی برسنے لگتا لیکن جس طرح وہ بارش میں باہر
نہیں رہ سکتے تھے، ہم بھی اپنے خیموں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ نکل کے
کتنی دور جاتے! بارش کا سلسلہ نہ رکتا تو کہاں سر چھپاتے۔ آسمان سے
اولے نہیں پڑتے تھے تو برف کا پانی گرتا تھا جیسے اوپر سلیں رکھی
ہوں اور پگھل رہی ہوں۔ منّن میاں کا جسم برف کے اسی پانی نے
ٹھٹھرا دیا تھا۔ پھر سامان ساتھ تھا۔ قلیوں اور باکوں کو اٹھا کے
اندھیری رات اور بارش میں پگ ڈنڈیوں پر چلنا ممکن ہی نہیں تھا۔

رات بھر وہ جاگتے ہی رہے تھے اس لیے اوّل صبح کھڑے
ہو گئے اور ناشتہ کرتے ہی آگے بڑھنے لگے۔ اتنے آدمیوں میں رفتار
تیز نہیں ہو سکتی تھی پھر ہم نے خود اپنی رفتار دھیمی رکھی تھی۔ دو
دن میں جتنا طویل سفر ہم نے کیا تھا، انھیں اس کے لیے تین دن
لگتے۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ کسی اور راستے سے بستی میں داخل
ہوں لیکن انھوں نے راستہ نہیں بدلا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی
تھی کہ وہ کوئی مختصر راستہ ہمیں دکھانا ہی نہ چاہتے ہوں۔ دوپہر کے
کھانے کے وقت انھوں نے مکھن، خشک اناج اور رات کے
بچے ہوئے گوشت اور چائے پر گزارہ کیا اور چلتے رہے۔ کل دوپہر سے اب
تک اُن کے کسی آدمی نے ہمارے کسی آدمی سے غیر ضروری بات
کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، تشام سے بھی نہیں اور اُن قلیوں
سے بھی نہیں جو ہمارے ساتھ تھے۔ کئی مرتبہ مجھے ایسا لگا کہ اُن کی
متجسس نظریں ہمارے سامان پر بھٹک رہی ہیں لیکن یہ ایک احساس
ہی تھا، وہ چونک چونک کے بار بار ہماری نقل و حرکت دیکھتے رہتے
تھے۔ کسی جگہ انھوں نے ہمارا سامان چھونے اور کریدنے کی زحمت
نہیں کی۔ تمام ہیرے جواہر یہاں تک کہ تہ خانے سے برآمد کیا ہوا
منقش بکس بھی ہم نے ٹرنکوں میں محفوظ کر دیا تھا اور ٹرنکوں کا
سامان تھیلوں میں۔ انھیں شاید کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان صندوقوں
میں کیا چھپا ہوا ہے۔ کچّی آنکھوں کا کوئی شخص دیکھے تو آنکھیں پھٹ
جائیں۔ اگر انھیں معلوم تھا تو وہ سب انھی کے علاقے میں انھی
کے پاس واپس جا رہا تھا سو انھیں تشویش کرنے کی کیا ضرورت
تھی مگر انھیں کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔

تمام راستے اباجان سر جھکائے کسی متحرک بُت کی طرح قدم بڑھاتے رہے۔ ہمارے ہمراہ ہونے کے باوجود بھی وہ سب سے الگ الگ تھے۔ انھوں نے اپنی جانب سے کسی سے کچھ کہنے، کچھ پوچھنے کی پہل نہیں کی البتہ وہ لوگ اُن سے وقفے وقفے سے پوچھتے رہتے تھے کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اباجان ہر مرتبہ کبھی سر ہلا کے کبھی تبتی کے دو ایک لفظوں میں منع کر دیتے تھے۔ نو سال میں انھوں نے تبتی زبان سے بڑی حد تک واقفیت حاصل کر لی تھی، پڑھنے میں تو انھیں ملکہ حاصل ہو گیا ہوگا تبھی کاغذات میں لکھی ہوئی ہزاروں سال پہلے کی زبان اُن کی سمجھ میں آئی ہوگی تاہم تبتی بولنے میں پڑھنے جیسی روانی نہیں ہوگی۔ تبت کے مقدس مقاموں، خانقاہوں کی زیارت کرنے والے کسی راہب کے لیے لازم بھی نہیں تھا کہ اُسے تبتی سے خوب آشنائی ہو۔ دنیا بھر سے راہب یہاں آتے تھے۔ اباجان نے تبتی محض کاغذات کا علم اخذ کرنے کے لیے سیکھی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے ہی اس میں کچھ شُد بُد رکھتے ہوں۔ وہ گیا میں پیدا ہوئے تھے، انھیں ہزاروں تبتی راہبوں سے واسطہ پڑا ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ کاغذات کسی اور زبان میں ہوں۔ تبتی اور چینی ملی ہوئی زبان۔ بہرحال وہ کسی بہت مشکل زبان ہی میں ہوں گے جو اباجان کو نو سال لگ گئے۔ یہ اُن کے نو سال کی ریاضت تھی جو صندوقوں میں پتھر اور دھاتوں کی شکل میں چھپی ہوئی تھی۔ صندوقوں میں قنی اور اقی کی روحیں بند تھیں۔ اباجان ہی ٹھیک جانتے تھے کہ اُن میں کیا کیا بند ہے۔

دوسرے دن سہ پہر ہونے تک ہم اس طرف کے پہاڑوں کے آخری سرے پر پہنچ گئے تھے۔ اِس طرف کے لیں کہنا چاہیے کہ ایک گہرا نشیب درمیان میں راستہ کاٹ دیتا تھا۔ دوسری طرف بھی بلند و بالا پہاڑ تھے مگر اُن تک جانے اور آگے سفر جاری رکھنے کے لیے آمنے سامنے دونوں پہاڑی سلسلوں کے بیچ رسّیوں اور لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا پُل عبور کرنا پڑتا تھا۔ نیچے ہزاروں فٹ گہرائی میں دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ کے سبب پُل بھی بڑا تھا۔ یہاں سے ہم دو دن پہلے گزر چکے تھے۔ پُل آنے پر سب نے بے اختیار جھل کی طرف دیکھا لیکن جھل کے ماتھے پر کوئی شکن اور آنکھ میں ہلکی سی چمک بھی نہیں اُبھری۔ یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سب کو سمٹ کے پُل پار کرنا تھا۔ جھل کی ہدایت پر وادی سے لوٹنے کے بعد اب تک ہم نے ہتھیار یوں ہی چھوڑ رکھے تھے۔ بندوقیں گلے میں جھولتی رہی تھیں اور تمنچے، چاقو جیبوں میں پڑے رہے تھے۔ انھیں بھی اِس مقام پر احتیاط کا احساس تھا۔ اوّل تو وہ قطار کے انداز میں سمٹے ہی نہیں پُل کے اس سرے پر دائیں بائیں پھیل گئے۔ دو... انھوں نے پہلے اپنے آدھے آدمی عبور کرا دیے تب ہم سے بڑھنے کو کہا۔ باقی آدھوں نے دوسری جانب ہمارے پہنچ جانے پر پُل پار کرنا شروع کیا۔ دونوں اطراف اُدھر پہنچ جانے والے اور اِدھر رہ جانے والے لوگ ہمارے پُل سے گزرنے کے دوران ہتھیار اٹھائے کھڑے رہے۔ انھوں نے بس ہمارے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں ڈالی تھیں۔ جھل اور پیرو نے ہتھیار ساتھ رکھنے پر اُن سے بے کار اصرار کیا تھا۔ یہ صرف ذہن کا دلاسا تھا۔ کسی ... اُن کی نظریں ہم سے اوجھل نہیں رہی تھیں۔ ہر طرف اُن کی سلاخیں کھڑی تھیں۔ ہماری حالت اُس قیدی سے مختلف نہیں تھی جسے سلاخوں کے پیچھے ہتھیار دے دیا جائے۔ قیدی زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا، قریبی پہرے دار پر جھپٹے گا یا پھر خود کو مار لے گا۔ سارے جیل خانے کو تو وہ تمنچے اور چاقو سے نہیں کاٹ سکے گا۔

پُل طے کرنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ ہم ایک آدھ ہی میل اور چلے ہوں گے کہ ہلکی بوندا باندی ہونے لگی ویسے بھی اندھیرا آنکھیں دھندلی کرنے لگا تھا۔ وہ ایک مناسب جگہ ٹھہر گئے۔ بوندا باندی زیادہ دیر جاری نہیں رہی۔ شام کو آسمان خشک ہو گیا تھا۔ دن بھر اونچے نیچے راستوں پر چلتے چلتے پیر دُکھنے لگے تھے۔ میری پنڈلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ میری طرح سب کا یہی حال ہوگا۔ اونچائی پر ایک کوس کا سفر میدانی علاقوں کے کئی کوس کی تھکن کے برابر ہوتا ہے۔ بستی تک تاخیر سے پہنچنے کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ آگے بیشتر تر اونچائی تھی۔ پڑاؤ کے بعد کل کے معمول کے مطابق وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ چھولداریاں نصب کرنے، کھانے پکانے، الاؤ جلانے اور مشعلیں روشن کرنے کے لیے چند آدمی الگ ہو گئے تھے۔ باقی سب کا کام ہماری نگہداشت کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہمارے آس پاس انھوں نے ایک طرح کے مورچے قائم کر لیے تھے۔ جھل نے اباجان، نشانم اور قلیوں کو خیموں میں بھیج دیا اور خود ہم سب کے ساتھ باہر رہا اور ہم کسی ایک جگہ ٹک کے بیٹھنے کے بجائے ستارے جگمگانے تک ایک محدود فاصلے میں خواہ مخواہ اِدھر سے اُدھر چکر لگاتے رہے۔ کھانا کھاتے ہی جھل نے الاؤ جلوا دیا تھا۔ سب موٹے کپڑوں اور کمبلوں میں لپٹے ہوئے اس کے گرد بیٹھے ہاتھ تاپتے رہے اور وہ ہمارے اِرد گرد منڈلاتے رہے۔ ہم سب پر سکوت طاری تھا۔ سکوت توڑنے کے لیے پیرو بمبئی کے واقعات سنانے لگا۔ پھر تو قصوں کہانیوں کا ایک تانا بانا سا بندھ گیا۔ پیرو کی زبان اُس کے سنانے اور

...کے لیے ہاتھ کے اشاروں کا انداز اتنا تجسس انگیز تھا کہ ... گئے تھے اور کچھ دیر کے لیے انھیں بالکل یاد نہیں رہا کہ ... کہاں اور کن لوگوں کے درمیان ہیں۔ پیرو کہیں اٹک جاتا یا بھول ... زورا اور مارتی اُسے اُکساتے اور یاد دلا دیتے: "دادا! وہ اُودر ... جامنی بائی کا سالا کیا لفڑا تھا؟" پیرو کے چپ ہوتے ہی ... نے کسمساتی آواز میں پوچھا۔

پیرو آہ بھر کے بولا: "کس کا نام لے دیا ماسٹر!"

"بولو نا دادا!" مارتی نے اصرار کیا۔

"جانے دے ماسٹر! کیوں سوئی مارتا ہے۔"

"اپن اُس ٹیم چھنگا اُستاد کے بارے میں تھا۔" زورا اشتیاق سے ... اپن کے کان بند نہیں تھے۔ سُنا تھا کہ سالی نے اُودر تمھارے ... لمبا چندا ڈالا تھا۔"

"ابھی اپن کیا بولے۔" پیرو کی آواز کہیں کھو گئی۔ "ایک ٹیم تو اُس نے اپن کو نچا دیا تھا زورا دادا!"

"اپنے کو ایسا بول کے کیوں خوار کرتے ہو دادا!" زورا کان ... ہوئے بولا۔ "اپن ابھی تمھارے پیروں کا مٹی بھی نہیں۔ دادا کدر ... ہو گیا۔"

پیرو اُسے کوئی جواب دینے کو تھا کہ وزیر نے جھجکتے ہوئے لہجے میں اسے ٹوکا: "یہ وہ جامنی بائی والا قصہ بول رہے تھے تم...."

"جامنی بائی! جانی! کس منہ سے بولے۔" پیرو ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگا۔ "ایک نمبر فنٹوش تھا وزیرے! ایک ٹیم پورا دادر اُس کا غلام تھا۔ کلر سالی کا بالکل جامن جیسا اور بدن! بدن کسی سندر کا مورت ... تھا۔ روز اُس کو ہتھوڑی سے ٹھوکتا تھا یا چاقو سے کاٹ چھانٹ کرتا تھا۔ ایسا سنبھال کے رکھا تھا جیسا اُودر بمبئی میں ڈولی رام اپنی دکان کے کانچ کے پیچھے گوری میم کی مورتی سنبھال کے رکھتا ہے۔ ایک دم نیچے سے اوپر تک کھنچا ہوا قطب کی لاٹ کی طرح، آنکھ بڑا بڑا، ہرنی ماتک، بال سالا بس پیروں تک آنے سے بچ گیا تھا۔ اگر جامنی نہیں ہوتا تو کسی محل کا رانی بنتا۔ رانی تو وہ اُس ٹیم بھی تھا۔ لوگ باگ اُس کو دادر کا رانی بولتا تھا۔ جب باڑے سے نکلتا، لگتا شیرنی بن سے نکلتا ہے۔ ایدر سے اُودر تک دادر کے جنگل میں سب کی بولتی بند ہو جاتا۔ پتہ نہیں سالی کدر سے آیا تھا۔ کچھ بولتا بنگال سے آیا ہے، کچھ اُودر لنکا سے بولتا۔ جب آیا تو دادر کے باڑے میں طوفان دادا بیٹھتا تھا۔ بولتے ہیں جامنی بائی سے پہلے اُس کا بھائی ستارہ بمبئی آیا تھا اور آ کے دادر میں ہی اونچا نیچا کام کرنے لگا تھا۔ طوفان دادا کے آدمی نے بھتا مانگا۔ ستارہ بھی آدمی سونا تھا۔ بھتے کے بجائے طوفان کے آدمی کو ٹھینگا مارا، ہاتھ پاؤں الگ سُجا دیا۔ بجلے میں طوفان نے سالا حرامی پن کیا۔ اپن سب کہتے ہیں، پر وہ بہت نیچی جات کا تھا۔ لونڈی کا بچہ، ایک رات مالے پر جا کے طوفان کے آدمی نے ستارہ کو بجھا دیا۔ پھر کچھ دن بعد جامنی بائی کا دادر میں ایک دن بجلی چمکا۔ اِس سے پہلے اُودر کسی نے اُس کو نہیں دیکھا تھا۔ جامنی سیدھا طوفان کے باڑے پہنچا اور جا کے بولا کہ اپنے بھائی کا بدلہ لینا مانگتا ہے۔ طوفان دادا سمجھا چھوکری مسخری کرتا ہے۔ جامنی بائی تیار ہو کے آیا تھا اور پتہ نہیں سالی لوہا پی کے آیا تھا یا جادو کر کے۔ اُسی ٹیم طوفان کو نرکھ کا ٹکٹ کٹا دیا۔ اپن کا دو ایک آدمی بھی اُودر تھا۔ بولتا تھا کہ جامنی کا ہاتھ اُٹھا خالی تھا۔ طوفان جیسا دیر آدمی کا



* عورت سب سے زیادہ کس چیز سے خوف کھاتی ہے؟
حسین تر عورت سے۔

* خواتین کو کم عقل کیوں سمجھا جاتا ہے؟
اس لیے کہ وہ مردوں کی تمام حماقتوں سے واقف ہوتی ہیں۔

* عورت، مرد کے مقابلے میں بار بار اپنا خیال بدلتی ہے۔
مرد خیال کیے بغیر عورت بدل دیتا ہے۔

* ایک خوب صورت خاتون کسی ماہرِ نفسیات کے زیرِ علاج تھیں۔ وہ روزانہ ماہرِ نفسیات سے اپنے خوابوں کا تجزیہ کراتیں۔ ایک دن نہایت پریشانی میں وہ معالج کے پاس پہنچیں اور گھبرا کے بولیں "ڈاکٹر صاحب! کل رات مجھے کوئی خواب دکھائی نہیں دیا۔"
"محترمہ!" ڈاکٹر نے مسکرا کے جواب دیا۔ "اگر آپ اپنا ہوم ورک کرنا بھول جائیں تو میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔"

* "تمھاری عمر کتنی ہے؟" جج نے پوچھا۔ "یاد رکھو تم حلفی بیان دے رہی ہو۔"
"اکتیس سال، چند مہینے۔" خاتون نے جواب دیا۔
"چند مہینے سے کیا مراد ہے؟ مہینوں کی تعداد بتاؤ؟"
"جی۔" خاتون نے سوچ کر جواب دیا۔ "ایک سو آٹھ مہینے۔"

* تین سہیلیاں ایک مہنگے ہوٹل میں پہنچیں۔ بیرا مینو لایا۔ تینوں نے اپنے اپنے پرس سے عینکیں نکالیں۔ پہلی نے شرما کے کہا: "میں صرف پڑھتے وقت عینک لگاتی ہوں۔"
"میں کار چلاتے وقت عینک لگاتی ہوں۔" دوسری بولی۔
"اور میں۔" تیسری نے انکشاف کیا۔ "صرف اُس وقت عینک لگاتی ہوں جب مجھے کچھ دیکھنا ہوتا ہے۔"

اُس نے دیکھتے دیکھتے چٹنی پیس دیا۔ کیس چلا، کچھ تو عورت ہونے کا سالی کو بخشش ملا، کچھ وکیل کے زور مارنے سے جامنی بائی کو صرف ۵ برس کا سزا پڑا۔ پانچ برس میں ابھی چار برس کاٹا تھا کہ جیل سے چھوٹ کے پھر وادر آگیا اور طوفان دادا کے پاڑے پر آکے ہی جم گیا۔ سالی کی عمر بھی کم تھا۔ چار برس بندی کے بعد بھی چھوکری لگتا تھا جیسے اُودر سالا ابھی شیشے کے سامنے بیٹھا رہا ہو۔ جیل سے بدن کر لیا تیر کمان بنائے ہوئے نکلا تھا۔" پیرو کی آواز بہکنے لگی اور وہ بولتے بولتے گم سا ہو گیا۔ سب انتظار کرتے رہے۔ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد پیرو خود ہی بولا: "کید رکید رسے بولے۔ پورا ناگن تھا سالا۔ پھن اُٹھاتا تو پاڑے کے سارے آدمی کو تھرتھری لگ جاتا۔ کسی نے اونچا بوم مارا، اُس کو سدا کے لیے نیچا بٹھا دیا۔ گیرے اور نیلے رنگ کے سوا دوسرا کلر کا ساڑی نہیں پہنتا تھا۔ ادھر وادر کے آزو بازو پاڑوں کے دادا لوگوں کو موت مانگتا تھا تو وہ اُودر جامنی بائی کے پاڑے کو اُن کا منہ پھیر دیتا تھا جس نے جامنی بائی سے مخول کیا، اپنے آپ سے مخول کیا۔ جامنی بائی کبھی خود سے کسی پاڑے میں نہیں گیا۔ وہ اُودر اپنے کو بند رکھتا تھا۔ پر دادا لوگ ایک عورت کا اُس کے اپنی خواری سمجھتا تھا۔ اُس ٹیم وادر کے بازو میں جانگڑی دادا کا بہت مشہوری تھا، اُس کو لوگ بلڈ آگ بھی بولتے تھے۔ جامنی بائی نے کچھ نہیں بولا تھا کہ جانگڑی نے آدمی بھیج کے بولا، اپن سے شادی بناؤ۔ تم رانی، اپن راجا، دونوں کا پاڑا مل جائیں گا۔ جامنی بائی جانگڑی کے آدمی کی بات سنتا رہا پھر اپنے ہاتھ کی چوڑی اُتار کے بھیج دیا۔ جانگڑی سمجھ گیا کہ ابھی جامنی بائی کا کیا مطلب ہے۔ چاقو اُس کے ہاتھ میں پیرتا تھا۔ آنکھ کا گرم اور دل کا جوان تھا، بولا، اپن آتا ہے، تیار رہو۔ ابھی لال کلر کا ساڑی پہننا۔ جامنی نے جواب بولا، کبھی آؤ، اپن ادھر ہی ہے۔ دوسرے دن جانگڑی ہار پھول لے کے گیا تھا۔ جامنی نے لال کلر کا ساڑی پہن رکھا تھا، ہار پھول لے کے ایک طرف رکھا، جانگڑی کے آگے چاقو پھینکا اور سامنے آگیا۔ جانگڑی نے چاقو اُٹھالیا، چوما اور دس بارہ ہاتھ سے جاستی نہیں چلایا تھا کہ بازو پر نشان ڈلوا کے گر گیا۔ جامنی بائی کھڑا رہا۔ اُودر جانگڑی کا سارا آدمی بھی یہ تماشا دیکھتا تھا۔ جانگڑی نے پھر سے چاقو اُٹھالیا۔ سب سمجھے کہ جامنی بائی پر پھینکے گا۔ پر جانگڑی نے اُس کو اپنی چھاتی میں اُتار لیا۔"

پیرو کہہ رہا تھا کہ جامنی بائی نے جانگڑی کی آخری خواہش کے طور پر لال رنگ کی ساڑھی پہنی تھی۔ سب کی آنکھیں پیرو کی طرف مرکوز تھیں۔ پیرو چپ ہو جاتا تو وہ مچلنے لگتے۔ پیرو کو اُس کی بہت سی باتیں یاد تھیں، ناقابلِ یقین باتیں، وہ اُس کے چاقو چلانے اور داؤ پیچ کے انداز بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ بظاہر وہ سیدھی سادی سی عورت لگتی تھی مگر جب چاقو اُٹھاتی یا سامنے آتا تو بالکل بدل جاتی۔ آنکھوں میں انگارے سے دہکنے لگتے۔ جامنی رنگ سرخ ہو جاتا اور بدن پھڑکنے لگتا۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس کے داؤ تو اُس کی آنکھوں کے تھے جسے نظر بھر کے دیکھ لیتی، اپنا بھول جاتا۔ ہاتھ اُٹھاتی کہیں تھی، مارتی کہیں تھی، کوئی اُس کے پہلے سے تعین نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے آتے ہی ہرن کی طرح بھرتی۔ اُسے پینترے بدلنے اور جھپٹ کے وار کرنے کا تجربہ تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ وہ کوئی جادو کرتی ہے لیکن اُسے تقریباً تمام داؤ آتے تھے۔ نیزا، بلم، چاقو وغیرہ اور خالی ہاتھ کے داؤ۔ اتنی کم عمر میں اُس نے نہ جانے یہ سب کچھ کہاں اور کیسے سیکھا تھا۔ عموماً وہ اپنے پاڑے تک محدود رہتی تھی، نہ اُسے اپنا پاڑا بڑھانے کی خواہش تھی۔ چھوٹے موٹے اڈے اُس کی تحویل میں آئے، اُن سب کے اُستادوں نے خود اُس سے چھیڑ خانی کر کے اُس کی گود میں ڈال دیے تھے۔ جن میں کئی کو اُس نے یوں ہی چھوڑ دیا، کئی پر اپنے آدمی بٹھا دیے۔ خود اُس نے اپنے پاڑے میں تمام الا بلا آدمی نکال کے منتخب آدمی رکھے تھے۔ اپنی دو نوکرانیوں کے سوا وہ سارے پاڑے میں تنہا رہتی تھی۔ پولیس سے بھی اُس کے تعلقات ٹھیک رہتے تھے۔ علاقے سے اُس کے کسی آدمی کی شکایت آتی تو وہ اُسے سدھرنے کا صرف ایک موقع دیتی تھی، دوسری شکایت پر اُسے پاڑے سے نکال دیتی۔ قسم قسم کی کہانیاں اُس کے بارے میں مشہور ہو گئی تھیں مگر وہ اُن سب سے جیسے بے خبر تھی۔ اُس کے پاڑے کے آدمیوں کا کہنا تھا کہ اُس نے کبھی کسی مرد کو قریب نہیں پھٹکنے دیا، پاڑے کے کسی آدمی سے زیادہ بات نہیں کی۔ علاقے کے لوگ اُسے جامنی دیوی کہنے لگے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ کالی دیوی کا کوئی روپ ہے۔ پاڑے میں کوئی ضرورت مند جاتا تو خالی ہاتھ واپس نہیں آتا تھا مگر اُس کے ساتھ کسی نے زیادتی کی ہوتی تو وہ اُس کے ساتھ خود باہر آجاتی اور زیادتی کرنے والے سے باز پرس کرتی۔ وادر کے لوگ اپنے بعض فیصلے بھی اس سے کرانے لگے تھے۔ جانگڑی کی موت کے بعد ممبئی کے کسی دادا نے پھر جامنی بائی کے علاقے کا رُخ نہیں کیا۔ سب نے جان لیا تھا کہ جامنی کو کریدنا اپنی موت کے مترادف ہے۔ جامنی بائی کو ایک ہی شوق تھا۔ گانا گانے اور ناچ دیکھنے کا شوق۔ اُسے کسی نے گاتے ہوئے دیکھا نہیں تھا، جاتی رات کو کبھی پاڑے کی اوپری منزل سے جہاں وہ رہتی تھی، کبھی کبھی اُس کے گانے کی آواز

آنے لگتی اور وہ صرف رات کو گاتی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس کی آواز سُننے کے لیے اُس کے پاڑے کے آدمی کان لگائے رہتے تھے لیکن روز رات کو گانا اُس کا معمول نہیں تھا۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا اور جب اُسے ناچ دیکھنا ہوتا تو کسی طوائف کو بلا کے کمرہ بند کر لیتی اور تنہا اُس کا ناچ دیکھتی رہتی۔ مہینے میں دو ایک بار وہ ضرور کسی طوائف کو بلاتی تھی اور رات کا کھانا اُس کے ساتھ کھاتی تھی، اُسے ایک جوڑا پہناتی اور روپیے پیسے کے بجائے سونے کا کنگن یا چوڑیاں دیا کرتی تھی۔

"ابھی تم نے کبھی کالا گلاب دیکھا ہے؟" پیرو نے اچانک ہم سے پوچھا۔

"دیکھا ہے دادا!" جامو نے جواب دیا۔

"بس سمجھو جامنی بائی بھی ایک کالا گلاب تھا۔" پیرو خوابیدہ آواز میں بولا۔ "گلاب کی پتی جیسا، پر شبنی پر کانٹا بہت تھا۔"

بھَل سر جھکائے پیرو کی باتیں سُن رہا تھا اور بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ "آواز کیوں ڈنک رہی ہے دادا؟" وہ سر اُٹھا کے پہلی مرتبہ درمیان میں بولا۔ "ابھی آگے زبان کھولو۔"

"آگے، آگے کیا زبان کھولے۔" پیرو سٹ پٹا سا گیا۔ "ابھی ایدر رات بھی جانے کو ہے۔ جامنی بائی ایک رات سے بہت بڑا تھا۔ اپن کتنا پچھان کے بولے۔"

"اُدھر جامنی بائی نے تم کو کب دیکھا؟"

"تم کچھ جانتا ہے استاد!" پیرو چونک پڑا۔

"آگے بولو، دادا!"

"قسم سے بھَل بھائی! اپنے کو بولو، تم جامنی بائی کو جانتا ہے؟"

"کبھی نام سُنا تھا۔"

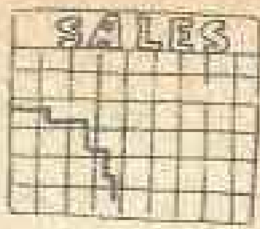
"صرف نام! دیکھنے کی چیز تھا۔ اُدر بمبئی میں اپن نے تم کو پہلی بار دیکھا تو جامنی بائی بہت یاد آیا۔ تم اُس جیم ہوتا۔"

"اب وہ کہاں ہے دادا؟" بِلّا کو نے بے چینی سے پوچھا۔

پہرے دار ہمارے قریب آتے اور کن انکھیوں سے جھانکتے ہوئے گزر جاتے۔ کل کی طرح اپنے خیموں میں سونے کے بجائے ہمارا الاؤ کے گرد بیٹھے رہنا اُن کے لیے حیرانی کا باعث ہوگا۔ رات آہستہ آہستہ بیت رہی تھی۔ الاؤ کے شعلوں نے کم از کم ہمارے اطراف کی سردی دُور کر دی تھی۔ تاہم ہوا کا کوئی تیز جھونکا چل جاتا تو آگ بھی ٹھٹھرنے سی لگتی۔ سولم نے دیر ہوئی چائے کی کیتلی انگاروں پر رکھ دی تھی۔ پانی کھولتے کھولتے سوکھ گیا۔ کسی کو چائے پینے کا خیال نہیں آیا۔ جامو، بلشو اور مارٹی پیرو کو تکے جھولے تھے ابھی رات باقی تھی۔ پیرو کہنے لگا کہ اُس وقت جب جامنی بائی داور

کے علاقے میں اڈا جمائے ہوئے تھی اور بے تاج کی رانی ... بھی ماہم کے علاقے میں ایک اڈا تھا، زیادہ بڑا تو نہیں ... کے اعتبار سے بڑے اڈوں سے کم نہیں تھا۔ چھ جوئے ... شراب کی کئی بھٹیاں علاقے میں چلتی تھیں۔ اِدھر اُدھر ... کے آدمی آ کے پیرو کو جامنی بائی کے قصے سناتے تھے۔ ... کا سچا تھا۔ ماہم کا اڈا اُس نے اپنے ہاتھ ہی کے بل پر ... تھا۔ بمبئی کے اور داداؤں کی طرح پیرو کے دل میں کبھی ... آتا تھا کہ وہ جامنی بائی کے ہاتھ سے چاقو چھین لے لیکن ... کے بہت سے واقعات سُن چکا تھا اور جب جامنی نے کبھی ... علاقے کو نہیں چھیڑا تھا تو اُسے خواہ مخواہ اُس سے بیر کرنے کی ... ضرورت تھی۔ دوسرے دادا جامنی بائی کو داور کے علاقے سے ... کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ شاید اسی لیے انھوں نے مشہور کر ... تھا کہ وہ کالا جادو کرتی ہے۔ پیرو کو ان روایتوں پر یقین نہیں ... لیکن اگر اس میں ایک فی صد بھی سچائی تھی تو اُسے محتاط رہنا چاہیے ... تھا۔ پیرو کسی کے اکسانے میں نہیں آیا۔

اِدھر چند دنوں سے پیرو کے آدمی اُس کے پاس شکایت لے کے آ رہے تھے کہ جامنی بائی کے آدمی اُس کے علاقے میں گھُس کے پیسہ بنا رہے ہیں اور بھی پاڑوں کے داداؤں کو یہی شکایت تھی۔ جامنی بائی کی شہرت کی وجہ سے اُس کے آدمی بے مہار ہوتے جا رہے تھے۔ داور کے علاقے میں جامنی بائی کے ڈر سے وہ کچھ نہیں کر پاتے تو دوسرے علاقوں میں جا کے لوگوں کو تنگ کرتے۔ انھیں معلوم تھا کہ اب کوئی بھی جامنی بائی کے اڈے آنے کی کوشش نہیں کرے گا، سب اُس سے دُور دُور الگ رہنا ہی مناسب سمجھتے ہیں، سو کسی کو اُن کی شکایت کی جرأت بھی نہیں ہوگی۔ ہوتا بھی یہی تھا کہ جامنی بائی کی وجہ سے لوگ انھیں درگزر کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُن کا کٹ کھنا پن بڑھتا گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ جامنی بائی خود اپنے آدمیوں کو دوسرے پاڑوں سے چھیڑ چھاڑ کے لیے بھیجتی ہے۔ پیرو کے لیے یہ بات خاصی تشویش کی تھی کہ وہ اُس کے علاقے تک پہنچ گئے ہیں مگر پیرو نے جلدی نہیں کی۔ خود علاقے میں گیا، انھیں سمجھایا کہ مان جاؤ۔ وہ پیرو کے منہ لگنے لگے۔ پیرو نے پھر تحمل کیا اور اسی دن شام کو داور کے علاقے میں پہنچا اور جامنی بائی کو کہلوایا کہ ماہم کا پیرو دادا ملنا چاہتا ہے۔ جامنی نے فوراً بلوایا۔ پیرو اکیلا پاڑے میں داخل ہوا تو وہ ایک تخت پر بیٹھی تھی۔ پیرو نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ پیرو کہہ رہا تھا کہ تخت پر وہ کوئی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ کچھ





[illegible] گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اُسے دیکھتا
[illegible] ہوا تھا، سانچے میں ڈھلا ہوا، گردن لانبی
[illegible] ال کھلے ہوئے۔ گیروے رنگ کی ساڑی سے
[illegible] ڈھانپ رکھا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں
[illegible] لونگ اور کلائیوں میں چوڑیاں چوڑیوں کے
[illegible] نہیں تھا۔ چمکتا ہوا جامنی رنگ، پیرو کے کہنے
[illegible] ہوئی جامن تناخ سے توڑی جائے۔ زمین
[illegible] عمر میں وہ بالکل لڑکی نظر آتی تھی۔ اُس لڑکی
[illegible] شوہر شادی کے فوراً بعد چھِن گیا ہو۔ سب سے
[illegible] آنکھیں تھیں، نیلاہٹ لیے ہوئے سیاہ آنکھیں جو
[illegible] ڈوبی اور بڑی بڑی تھیں۔ اُن میں چنگاریاں
[illegible] ہوتی تھیں۔ وہ بھی پیرو کو دیکھ کے چپ رہی پھر
[illegible] کس آیا۔ سنبھل کے بولا: "جامنی بائی! اپن تم
[illegible] مانگتا ہے۔"
[illegible] مجسمے کے مانند ساکت بیٹھی رہی۔ پیرو نے تلخی سے
[illegible] وہ اپنے آدمیوں کو روک لے۔ جامنی بائی کی آنکھیں کھلی
[illegible] اس نے جواب نہیں دیا۔ پیرو کو عجیب سا لگا: "اپن پھر
[illegible] آدمی اِدھر بھیجے کیا؟ ان کو روک لو جامنی بائی! اپن بھی
[illegible] اور نمٹ سکتا تھا، پر سوچا پہلے تم کو بول دے۔" پیرو
[illegible] استعمال میں کہا۔

جامنی بائی پیرو کی آواز پر جیسے خواب سے جاگی اور اپنی
لانبی پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے آہستگی سے بولی: "دادا!
[illegible] آرام سے بیٹھو۔" پیرو کہتا تھا کہ اُس کی آواز کھن کھنا رہی تھی۔
پیرو جھجکتے ہوئے ایک طرف بیٹھ گیا۔ جامنی بائی نے ایک
آدمی کو اشارہ کیا۔ پیرو کے سامنے اُسی وقت صراحی اور گلاس رکھ
دیئے گئے۔ پہلی مرتبہ جامنی بائی نے کسی کو اس طرح شراب پیش
کرنے کا حکم دیا تھا۔ پیرو نے ایک گلاس پی لیا اور بولا: "ابھی تمھارا
کیا جواب ہے جامنی؟"

جامنی نے اپنے پاڑے کے سارے آدمیوں کو اندر بلا لیا
اور پیرو سے پوچھا: "ان میں سے کون تھا دادا!"

پیرو نے تین آدمیوں کی طرف انگلی اُٹھائی: "ابھی اپن ان
کو پہچانتا ہے اور لوگوں کا اپن کو پتہ نہیں۔"

پیرو نے جن آدمیوں کی نشان دہی کی تھی اُن کے سوا کسی
نے واویلا نہیں کیا۔ وہ پیرو کے آدمیوں کو اُلٹا الزام دینے لگے: "چپ
رہو۔" جامنی نے ہاتھ اُٹھا کے کہا: "اور وہ تم کو کھینچ لے گئے تھے
کیا؟ تم اِن سے کیوں نہ بولے؟"

انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن جامنی بائی کی آنکھوں میں آگ
اور ہاتھ میں خنجر دیکھ کے کپکپانے لگے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ
جامنی کا خنجر اُٹھے اور اُن میں سے کسی ایک کے سینے میں پیوست
ہو۔ خنجر اُس نے اُٹھا بھی لیا تھا مگر کچھ سوچ کے رُک گئی۔ بولی: "ابھی
تم اپنا فیصلہ خود کرو۔" تینوں آدمی چند لمحے گم اُس کا چہرہ تکا کیے پھر
ایک دم تیزی سے آگے بڑھے اور کتوں کی طرح پیرو کے قدموں سے
لپٹ گئے۔

پیرو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے: "ٹھیک ہے جامنی بائی!"
وہ اُٹھتے ہوئے بولا: "اپن اب جاتا ہے۔" پیرو نے کہنے کو تو کہہ دیا
مگر اُس کا جی وہاں سے جانے کو نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹھو دادا! کوئی اور کام ہو تو بولو؟"

"اپن کو اتنا ہی کام تھا۔" پیرو نے مدھم لہجے میں کہا۔

"ابھی اپن اِن کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اپن کا فیصلہ
رہ گیا ہے۔" جامنی بائی سرد آواز میں بولی۔

"ابھی اتنا ٹھیک ہے جامنی بائی!"

پیرو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اپنے سب آدمیوں کو باہر جانے
کا حکم دیا۔ صرف وہ اور پیرو اُس بڑے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔
پیرو اُس کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کے جانے
کے بعد وہ تادیر کچھ نہیں بولی۔ پیرو بھی خاموش رہا مگر اُسے اس
خاموشی سے جلد ہی اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ
جامنی بائی سے اُس کے بارے میں کچھ پوچھے۔ بے شمار سوال اُس
کے دماغ میں اُٹھ رہے تھے لیکن پیرو زبان بند کیے رہا۔ جامنی بائی
نے پہل کی اور اُس سے باہم کے علاقے کے متعلق پوچھنے لگی۔ پیرو کو خبر
ہوا کہ کہیں جامنی کی نظر اُس کے علاقے پر تو نہیں ہے مگر اُس نے

کسی الجھن کے بغیر جواب دیا: "علاقہ چھوٹا ہو پر چلتا ہے۔" پھر اس کے
منہ سے بے اختیار نکل گیا: "کبھی ادھر اپنی طرف آؤ جامنی بائی!"
"تم بلاتے ہو تو ضرور آئیں گے دادا!" وہ شگفتگی سے بولی۔
پیرو اس سے کچھ اور نہیں کہہ سکا۔ وہ یہاں پہلی بار آیا تھا۔ نہ جانے جامنی بائی کیا سمجھتی اور خود اُسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ ایک علاقے کا دادا ہو کے اُس پر اپنا تجسس ظاہر کرے چنانچہ اُس نے اختصار برتا اور رسمی طور پہ جامنی بائی کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔
پیرو بتا رہا تھا کہ وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اپنے پاڑے آنے کے بعد اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی کی آنکھیں اُس کے ساتھ آگئی ہیں اور اُسے گھور رہی ہیں۔ ابھی ایک رات نہیں گزری تھی کہ صبح اُسے اطلاع ملی۔ جامنی بائی کے پاڑے کے قریب کوڑے کے ڈھیر پہ تین آدمیوں کی لاشیں پڑی ملی ہیں، پولیس نے جامنی بائی اور اُس کے پاڑے کے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ پیرو کو اس خبر سے دُکھ ہوا۔ یقیناً یہ وہی تین آدمی ہوں گے جن کے بارے میں کل شام جامنی بائی نے کہا تھا کہ ابھی اُس کا فیصلہ باقی ہے۔ پیرو دن بھر بے چین رہا۔ وہ تیار تھا کہ پولیس اُسے بھی بلائے گی۔ پولیس کا کوئی آدمی اُسے بلانے نہیں آیا اور دوسرے دن دوپہر اُسے خبر ملی کہ جامنی بائی اپنے ساتھیوں سمیت تھانے سے پاڑے واپس آگئی ہے۔ اس کے تین دن بعد سرِ شام وہ پاڑے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی نے آ کے اطلاع دی: "دادر کا جامنی بائی ایدر پاڑے کی طرف آرہا ہے۔"
پیرو بہت حیران ہوا، خود دوڑا ہوا پاڑے کے باہر گیا۔ جامنی بائی تنہا دروازے پہ موجود تھی: "دادا! اپن آگئے۔" اُس نے ہولے سے کہا۔
"تم، تم جامنی بائی!" پیرو وحشت سے بولا: "آؤ، آؤ، اندر آؤ۔ ابھی اپن کوئی سپنا دیکھتا ہے کہ ایدر کھوپڑی کا کوئی کل اُلٹ ہو گیا ہے۔"
جامنی بائی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ سی کھلی۔ وہ پیرو کے پیچھے پیچھے اندر آنے لگی۔ پاڑے کے تمام لوگ اُسے دیکھ کے حیرت زدہ تھے اور اُس کی آمد کا مقصد جاننے کے لیے بے تاب۔ اس سے پہلے جامنی بائی کے بارے میں کبھی نہیں سُنا گیا تھا کہ وہ کسی پاڑے میں خود آئی ہو۔ وہ کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ پیرو اُسے ایک کشادہ اور صاف کمرے میں لے آیا اور پوچھا کہ وہ اُس کی کیا خاطر کرے۔ جامنی بائی نے کہا کہ اُسے بھیڑ بھڑکا پسند نہیں ہے۔ پیرو نے اپنے تمام آدمیوں کو باہر نکال دیا: "تم نے بلایا تھا، اپن ادھر آگئے۔"
وہ دھیمے دھیمے بولی۔
"تم نے ایدر آ کے اپن کو بہت، بہت خوش کیا۔" پیرو کو منا لفظ نہیں مل رہے تھے: "ابھی بولو، اپن کیا.... کیا کرے؟"
"بیٹھے رہو دادا!"
"بیٹھا تو اپن ایدر ہی ہے، پر اپنے کو...."
جامنی نے نظریں اُٹھا کے دیکھا تو پیرو بوکھلا گیا: "اپن صرف تم سے ملنے، تم کو دیکھنے آیا ہے۔" وہ ڈوبتی آواز میں بولی۔
"ہوں، ہوں۔" پیرو پہلو بدلنے لگا: "اپن تمہارے سامنے ہے۔"
"تم ایدر دادا کیسے ہو گئے؟"
"کیوں، کیوں؟" پیرو کا خون بھڑکنے لگا: "تمہارا مطلب؟ اپن کو یہ سب باپ مرتے ٹیم نہیں لکھ گیا تھا جامنی بائی!"
"جانتے ہیں دادا!"
"پھر تم، تم کیا بولنا چاہتا ہے؟"
"کچھ نہیں دادا!" وہ کسی قدر اداسی سے بولی۔
"نہیں، تم کچھ بولنا چاہتا ہے؟" پیرو نے تندی سے کہا۔
اُس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور بیٹھی جیسے کچھ سوچتی رہی۔ پیرو نے بھی بات وہیں چھوڑ دی لیکن اُس کا اضطراب سوا ہو گیا تھا۔ اُسے کچھ بولنے میں اس لیے دشواری پیش آرہی تھی کہ ابھی تک وہ جامنی بائی کی اچانک آمد کا سبب طے نہیں کر سکا تھا۔ دادر سے چلتے وقت اُس نے رسماً جامنی بائی سے آنے کو کہا اور اُس کا خیال تھا کہ رسماً ہی جامنی بائی نے حامی بھری تھی مگر اب وہ سامنے بیٹھی تھی اور اُس کے بدن سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی اُبٹن جیسی خوشبو کمرے میں چھا گئی تھی۔ پیرو کا تذبذب بے جا نہیں تھا۔ اُسے اُس کے آنے سے ایک خوشی تھی تو کئی اندیشے بھی لاحق تھے۔ ممکن ہے اُس کا کوئی اور ارادہ ہو اور پیرو کو اپنی مروت کے اظہار پہ بعد میں پشیمانی ہو۔ وہ خواہ مخواہ جامنی بائی سے کوئی کد نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس چھیڑ کا کوئی جواز ہوتا تو ٹھیک تھا۔ بمبئی میں بہت سے علاقے تھے جہاں جامنی بائی کی طرح دادا پاڑا چلاتے تھے اور بے دلیل ایک دوسرے کے معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتے تھے لیکن کوئی دلیل پیدا ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ بدنیتی بھی ایک دلیل ہے اور وہ کسی وقت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ چاقو اور زور بھی ایک دلیل ہے۔ پاڑوں میں یہی ایک دلیل چلتی ہے۔ پیرو کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ جامنی بائی کو ایک مہمان سے مختلف درجہ دے اور اُس کی خوشنودی کے لیے اپنی طبیعت کے خلاف کوئی بات کرے اور جامنی بائی پہ کوئی ایسا

تاثر قائم ہو جیسے وہ کسی دفاعی حالت میں ہے۔ اپنے بارے میں وہ جامنی بائی کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ جامنی بائی کے بجائے کوئی اور دادا آتا تو پیرو کو اتنی اُلجھن پیش نہ آتی مگر وہ جامنی بائی تھی۔ پیرو کو خود اپنی جانب سے خدشہ تھا۔ اپنے خون کی گرمی سے اور اُسے یہ گرمی عزیز بھی بہت تھی۔ وہ جامنی بائی کا ارادہ سونگھنے کی جستجو میں تھا اور جامنی بائی تھی کہ ڈَر کے گم صم سی بیٹھ گئی تھی۔

پیرو موضوع بدل کے اُس سے پوچھے بنا اپنے علاقے کے بارے میں بتانے لگا۔ اُسے کچھ جاننا تھا تو اِس کی یہی ایک صورت سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ اُس کا علاقہ کتنا زرخیز ہے، یہاں کے لوگ، مکانات، کاروبار، گلیاں، یہاں کتنی بھٹیاں، کارخانے اور چھپے ہوئے گودام ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ کوئی دادا کسی دوسرے دادا کو اپنے علاقے سے متعلق ایسی باتیں نہیں بتایا کرتا جو پیرو نے اُس سے کہی تھیں۔ پیرو نے اُس سے کچھ نہیں چھپایا، نہ مبالغہ کیا۔ وہ اپنی کش مکش سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس دوران وہ پوری طرح کسی بھی بدلی ہوئی صورتِ حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے۔ کوئی ایسی بغاوت نہیں جس میں سبکی کا کوئی پہلو نکلتا، پیرو کو اپنے اس عزم سے طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ پیرو تھا، پیرو کی جگہ کوئی دوسرا دادا ہوتا تو شاید یہ فیصلہ نہ کر پاتا۔ جامنی بائی اُس کے علاقے کا حال سنتی رہی، نہ اُس نے اشتیاق کا اظہار کیا، نہ سرد مہری کا، سو پیرو کا تجسس کم نہیں ہوا۔ پھر اُس نے اُن تین آدمیوں کا ذکر چھیڑ دیا جو دو دن پہلے ختم کر دیے گئے تھے۔ پیرو نے کہا کہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔

”اُن کو جانے دو دادا!“ جامنی بائی بے دلی سے بولی۔

”پر اپن نے اُن کو معاف کر دیا تھا۔“

”اپن نے نہیں۔“ جامنی نے زیرِ لب کہا۔ ”ابھی اُن کی بات چھوڑو۔ وہ چلے گئے ہیں۔“

”چھوڑ دو۔“ پیرو نے جھٹک کے بولا۔

”ابھی اِدھر کی زندوں کی بات کرو۔“

”جو بولے کرے۔“ پیرو نے تیزی سے کہا۔

”ابھی تم سدا کے لیے اِدھر پاڑے میں رہنا چاہتے ہو؟“

”ابھی اپن کے ہاتھ پاؤں ایک دم ٹھیک ہیں۔“

اُس نے نظر بھر کے پیرو کو دیکھا اور کہنے لگی۔ ”اِدھر تمھارا بہت من لگتا ہے کیا؟“

”لگا کیا ہے، بس بیٹھا ہے۔“

”تم اس کو بڑھانا چاہتے ہو کیا؟“

”ابھی اپن نے ایسا سوچا نہیں ہے۔“ پیرو نے تذبذب سے کہا۔ ”پر جامنی بائی! اپن کو بولو، ایسا بولنے سے تم کیا، کیا...“

”سوچتے ہیں تم کو دادا نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

پیرو نے برجستگی سے کہا۔ ”تم کو بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”ہاں!“ جامنی بائی سر جھکا کے بولی۔ ”پر اپن دادا ہے۔“

”اور اپن بھی۔“ پیرو نے اونچی آواز میں کہا۔

جامنی بائی نے منع کیا تھا لیکن پیرو کے آدمی مٹھائیاں، نمکین چیزیں اور چائے وغیرہ لے کے آ گئے تھے، پیرو کے کہنے پر اُس نے چند کاجو منہ میں ڈال لیے اور چائے پی لی۔ ”ابھی تم کو اور پیسے تو لائے؟“ پیرو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”نہیں دادا!“ جامنی بائی مخمور لہجے میں بولی۔

”اپن سوچا، پہلے تم سے پوچھ لے۔“

چائے پینے کے بعد وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ آنکھیں نیم وا کیے۔ پیرو کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بھی سوچتا رہا اور جامنی بائی کے چہرے پر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آج بھی وہ گیروا ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ گھنے بال اُس نے ایک ربن سے باندھ رکھے تھے۔ کانوں میں جھول کھلے ہوئے تھے۔ ناک میں سنہری لونگ چمک رہی تھی۔ جامنی رنگ، پر اُس کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ پیرو کہتا تھا کہ جب وہ بات کرنے کے لیے اپنے لبوں کو جنبش دیتی تو اُس کے سفید دانت موتیوں کے مانند لگتے۔ موتی جو پیازی رنگ کی مخمل میں ٹکے ہوئے ہوں۔ اندر سے اُس کے ہونٹ، اُس کا منہ پیازی رنگ کا تھا، باہر سے سارا جامنی۔ یکایک جامنی بائی کچھ بے چین سی ہو گئی اور اٹھنے لگی۔

”چلتے ہیں دادا!“

”یہ کیا۔ کیا؟“ پیرو تعجب سے بولا۔ ”اپن اس کو کیا سمجھے؟“

”تم نے بولا تھا تو اپن...“

”پر اتنے ٹیم کے لیے نئیں۔ تم کو آئے دیر کتنا ہوا ہے ابھی چلنے کو بولتا ہے۔“ پیرو اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”پھر کبھی آئیں گے۔“

”وہ ٹھیک ہے، سو بار آؤ، ہزار بار آؤ، پر ابھی کیوں جاتا ہے۔ یوں چلا جائے گا تو اپن سمجھے گا، اپنے سے مہمان کا خیال نئیں ہوا۔ اپن جنگلی ہے۔“

”نہیں پیرو دادا!“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

”پھر کیا ہے، بیٹھو۔ ابھی اپن بیٹھنے کو بولتا ہے جیسا اِدھر آنے

گم ہو گیا تھا۔" پیرو نے کہا کہ وہ تو کچھ بولی ہی نہیں، وہی سُر بے سُر ہو رہا ہے۔

جامنی کچھ دیر کے لیے اور بیٹھ گئی اور اس اثنا میں اُس نے پیرو سے آس پاس کے علاقوں کے بارے میں چند باتیں پوچھیں کون سا علاقہ کس دادا کے پاس ہے کیسا ہے۔ پیرو کو ان سوالوں پر حیرت ہوئی جیسے جامنی کو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ اسے بتاتا رہا اور اس نے ان باڑوں سے اپنے تعلقات پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

وہ جانے لگی تو پیرو اُسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ پیرو نے ایک آدمی سے کہہ کے اُس کے لیے وکٹوریا منگوائی تھی۔ وکٹوریا میں سوار ہوتے ہوئے جامنی کے ہونٹوں پر لرزش تھی۔ اُس نے پیرو سے پھر کسی دن اپنے باڑے آنے کو کہا۔ پیرو نے وعدہ کیا۔ جامنی بائی کے جاتے ہی پیرو کے آدمیوں نے اُسے گھیر لیا اور جامنی بائی کے آنے کا سبب پوچھنے لگے۔ پیرو کو خود کچھ پتہ ہوتا تو وہ انھیں بتاتا۔ "سب ٹھیک ہے بابا!" ظاہر ہے، پیرو کے اتنا کہنے سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔

چار دن بعد کی بات ہے کہ پیرو کے باڑے میں ایک اجنبی شخص مٹھائی اور پھلوں کی دو ٹوکریاں لے کے آیا اور اُس نے تخلیے میں انھیں صرف پیرو کے حوالے کیا۔ شکل و صورت سے وہ کسی باڑے سے متعلق آدمی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ٹوکریاں جامنی بائی نے بھیجی تھیں۔ پیرو نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور تیسرے روز اپنی طرف سے پھلوں اور مٹھائیوں پر مشتمل چار ٹوکریاں جامنی بائی کو بھیجیں۔ اُس نے بھی اپنے باڑے کے بجائے باہر کا ایک آدمی منتخب کیا۔ باڑے میں کسی کو علم نہیں ہو سکا کہ جامنی بائی کی طرف سے کوئی سوغات آئی ہے اور پیرو نے بھی جواباً اسے ٹوکریاں بھیجی ہیں۔ جامنی بائی نے انھیں شکریے کے ساتھ قبول کیا اور کہلوایا کہ ہفتے کی شام اپنے باڑے میں وہ پیرو کی منتظر رہے گی۔ بیچ کے دو دن پیرو کے لیے نہایت اضطراب کے تھے۔ جامنی بائی کے پاس دوبارہ جانے کے خیال سے اُس کے دل و دماغ میں عجب عجب احساس جنم لے رہے تھے۔ اس دوران وہ خفا کے بناتا، بگاڑتا رہا اور جب ہفتہ آیا، سورج ڈوبنے لگا تو اُس نے داور کے علاقے کا رُخ کیا۔ وہ اپنے ساتھ کسی آدمی کو نہیں لے گیا تھا۔ جس وقت وہ جامنی بائی کے باڑے میں داخل ہوا، وہ نیلی ساڑی پہنے، ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ لیے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اُس کی چمکتی نظروں نے پیرو کا طواف کیا اور وہ اسے فوراً اندر لے گئی۔ یہاں

میں کوئی اور شخص نہیں تھا۔ البتہ اُوپری منزل پہ جامنی بائی کی دو خادمائیں موجود تھیں۔ پیرو ایک صاف ستھرے سجے سجائے کمرے میں آ کے بیٹھ گیا۔ کمرے کی دیواریں رنگین تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی چاندنی کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک مختصر قالین نما دری بچھی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی میز پہ صراحی اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جامنی بائی نے خود اُسے جام بنا کے دیا۔ اُسی وقت گندمی رنگ اور لمبے قد کی ایک خوب صورت لڑکی زرق برق کپڑے پہنے، گھنگرو چھنکاتی اندر آئی اور اُس کے آتے ہی ہارمونیم اور ستار کی آواز گونجنے لگی۔ سازندے کمرے ہی میں کہیں تھے، نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جلد ہی پیرو کو پتہ چل گیا کہ وہ سامنے لٹکے ہوئے دبیز نیلے پردے کے پیچھے موجود ہیں۔ لڑکی نے دونوں کو جھک کے سلام کیا اور رقص کرنے لگی۔ پیرو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہا ہے اور کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ جامنی بائی ایک دوسرے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُسے اس طرح بیٹھا دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی باڑے سے متعلق ہے اور چاقو اٹھانا جانتی ہے۔ وہ بس ایک عورت تھی، ایک لڑکی۔ پیرو نے چاہا کہ وہ اُس کے اور قریب ہو جائے، بہت قریب ہو جائے لیکن وہ خود اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکا، نہ جامنی کی طرف ہاتھ بڑھا سکا، نہ اُس سے اپنی خواہش کا اظہار کر سکا۔ جامنی بائی کی طرف نظریں اٹھاتے ہی اُس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: وہ ایک دم رانی لگتا تھا۔ اپنی سالارانی سے کیسے

بول سکتا تھا۔"

جامو نے درمیان میں دخل دے کے پوچھا۔ "دادا! اور تم؟ تم بھی بولو، تم اُس وقت کیسے لگ رہے تھے؟"

پیرو نے آہ بھر کے کہا۔ "اپن کیا جانے، پر ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔"

پیرو نے اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ خود کیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اب بھی اُس کا سرخ و سفید رنگ اُس کے گالوں پر دمکتا تھا۔ اُس کے گھنگریالے بالوں پر ابھی تک سیاہی غالب تھی۔ لگ بھگ بیس سال پہلے کی بات تھی، اُس وقت پیرو کا کیا حال ہوگا۔ قد کا بڑا، کاٹھی کا مضبوط، خد و خال کا تیکھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، کھلی پیشانی، چوڑے شانے اور اُبھرا ہوا سینہ۔ وہ بھی کوئی شہزادہ معلوم ہو رہا تھا، کسی راج کمار سے کیا کم۔ جامنی بائی اپنی جگہ بیٹھی رہی اور پیرو کن انکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے حواس میں ایک دھیما دھیما سرور رچ رہا تھا اور وہ یہ سرور توڑنے کے لیے اپنے آپ سے مزاحمت کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جامنی بائی کے سامنے مدہوش ہو جائے۔ لڑکی ناچتی رہی۔ جامنی بائی نے ناچ کے دوران اُسے دوسرا جام بنا کے دیا۔ پیرو نے منع نہیں کیا، وہ چسکیاں لیتا رقص دیکھتا رہا مگر اُس کا دھیان رقص میں نہیں تھا۔ وہ مسلسل جامنی بائی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ لڑکی نے ناچ کے دو تین بھاؤ بتائے ہوں گے کہ جامنی نے انگلی کے اشارے سے اُسے روک دیا اور پیرو سے پوچھا کہ کیا رقص جاری رکھا جائے؟ پیرو نے یوں ہی سر ہلا کے انکار کر دیا۔ اِس میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ پھر خادماؤں نے کھانا لگا دیا۔ کھانوں کی اقسام کم تھیں مگر وہ سب نفاست سے چنے ہوئے تھے اور نہایت لذیذ تھے۔ جامنی بائی اِس قدر تکلف سے کھا رہی تھی کہ پیرو کو کہنا پڑا۔ "ابھی تم تو کچھ کھا ہی نہیں رہیں۔ ایدر بھی تم سے اپن ہی بولے کیا؟"

"کھا رہے ہیں دادا!" وہ متبسم لہجے میں بولی۔

کھانے کے بعد جامنی بائی نے پھر اُس سے پوچھا کہ کب دوبارہ ناچ کا اہتمام کیا جائے۔ پیرو اس سے بات کرنا چاہتا تھا سو اُس نے کہا۔ "ابھی تمہارا مرضی ہو تو چلے گا۔"

جامنی بائی نے لڑکی کو نہیں بلایا اور اپنے لب جیسے سی کے بیٹھ گئی۔ پھر وہی خاموشی۔ پیرو کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا کرے، کیا یوں ہی بیٹھا کبھی دلوار میں، کبھی جامنی بائی کو گھورتا رہے۔ سکوت کے ایک طویل وقفے کے بعد جامنی کے لبوں میں جنبش ہوئی، اُس کی پلکیں تھرتھرائیں اور اُس کے ہونٹ سکڑنے اور پھیلنے لگے جیسے وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو۔ "دادا!" وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔ "اپن تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔"

"اپن کو حکم دو۔" پیرو نے مچل کے کہا۔

"حکم نہیں ہے۔"

"جو بھی بولو، اپن سننے کے لیے بے کل ہے۔"

"ابھی اپن تم سے سب بولے دیتے ہیں۔" اُس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

"ہاں، ہاں۔"

"پتہ نہیں، تم کیا بولو گے، پر اپن کو اس کی چنتا نہیں ہے۔"

"اپن کے من میں تمہارے لیے بہت جگہ ہے۔"

"اپن نے سوچا تم سے سب کہہ دیں، کچھ نہ چھپائیں، جو کچھ اپنے پاس ہے، ابھی بول دیں، نہ تم روز ادھر آ سکتے ہو، نہ اپن اُدھر جا سکتے ہیں۔"

"تم بولو گی تو اپن روز ایدر آئے گا۔"

"اپن کو بھی اُدھر آنے کے لیے کسی سے بولنے کی ضرورت نہیں ہے پر ایسا ٹھیک نہیں ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بولی۔

"پھر جو ٹھیک ہے وہ بولو۔" پیرو نے بے تابی سے کہا۔

وہ چند لمحے چپ رہی پھر رکی رکی آواز میں بولی۔ "اپن سدا کے لیے تم کو اپنا اور اپنے کو تمہارا بنانا چاہتے ہیں۔"

پیرو کے کان سن ہو گئے۔ "جامنی بائی!"

جامنی بائی نے سر جھکا لیا۔ "اپن کو لاگ لپیٹ نہیں آتی، صاف بول دیے ہیں۔ پر اس کو کچھ اور مت سمجھنا۔ اپن کی ایسی مرضی ہے۔"

"جامنی بائی!" پیرو کی سسکی نکل گئی۔

"تم کو بہت حیرت ہے کیا؟" وہ بولی۔

"نہیں، نہیں۔"

"کیا اپن کے لیے ایسا بولنا ٹھیک نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" پیرو نے بدحواسی سے کہا۔

پیرو کا سارا جسم گنگ ہو گیا تھا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا، اُس کی بازگشت اُس کے رگ و پے میں سن سنا رہی تھی۔ اِس کے باوجود اُسے اپنا سنا ہوا ایک سراب معلوم ہو رہا تھا۔ جامنی بائی کے اظہار میں کوئی بات صراحت طلب نہیں تھی۔ اُس نے جو کہا تھا اُس میں کوئی ستر نہاں، کوئی رمز، کوئی آمیزش نہیں تھی۔ اُسے صاف سنا، صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ دن کی طرح اُجلا، رات کی طرح سیاہ تھا۔ پیرو کو ایسا محسوس ہوا جیسے جامنی بائی نے اُسے اٹھا کے آگ میں پھینک دیا ہے۔ اُس کے مساموں سے پسینہ رس رہا تھا۔ جامنی بائی نے ایک اضطراری نظر سے اُسے دیکھا اور کہنے لگی کہ اُسے احساس ہے ایسا کہنا کتنا بڑا ہے، جو کہہ دیا اُس کا لوٹانا کتنا مشکل ہے

...اُس نے سوچنے سمجھنے کے چند لمحوں کا عذاب بھگتا ہے یا زبان کے چند لمحوں کا گناہ بھی کیا ہے۔ اُسے معلوم ہے یہ اُس کا کیا ہوا ہے، اُس کا سُنا ہوا نہیں چنانچہ اُس کا فیصلہ پیرو کے اقرار سے مشروط نہیں ہے۔ پیرو کو اختیار ہے کہ وہ اُسے قبول کرے یا رد کرے۔ اُس کا نہ کوئی دعوا ہے نہ حکم۔ اُسے بے شک اقرار سے خوشی ہوگی تو انکار میں دُکھ مگر جو کچھ اُسے ملے گا، وہ اُسے اپنی قسمت کا لکھا تصوّر کرے گی۔ اُس نے پیرو کو اپنا دیوتا تسلیم کیا ہے اور دیوتا کی مرضی اُس کی داسی کے لیے ہر حال میں مقدم ہوتی ہے۔ جامنی بائی کہنے لگی کہ زندگی میں پہلی بار اُس نے کسی سے کچھ کہا ہے۔ اور اُس کی التجا ہے کہ پیرو اُسے پاڑے کے ایک داسی کی فرمائش سمجھ کے قبول نہ کرے۔ اُس نے اپنا سب کچھ اپنے دیوتا کے حوالے کر دیا ہے اور یہ کوئی بھینٹ نہیں جس کے عوض دیوتا سے اُس کی خوشنودی کا سودا کیا جائے۔ پیرو چاہے گا تو وہ یہ پاڑا چھوڑ دے گی۔ پیرو کہے گا تو وہ یہیں رہے گی۔ پیرو اُسے جھونپڑی میں لے جائے یا کسی محل میں، سینے سے لگائے یا ٹھوکر مار کے پامال کر دے لیکن اگر اُسے اپنی آرزو کے اظہار کی اجازت دی گئی تو وہ اپنے دیوتا کے ساتھ کہیں دُور جانا پسند کرے گی۔

پیرو سکتے کی سی حالت میں سُنتا رہا۔ اُس کے لیے یہ سب بہت خواب ناک، بہت عجیب تھا۔ اُس دن جامنی بائی کے اپنے پاڑے میں آنے کے بعد سے اُس نے بہت سے خاکے بنائے تھے، اُن میں ایسا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ پیرو کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ اس مختصر زندگی میں اُس پر بہت سے وقت گزرے تھے مگر وہ کسی ایسے وقت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اُس نے زندگی میں بہت سے سوالوں کے جواب دیے تھے، یہ سب سے مختلف سوال تھا۔

"جامنی بائی!" اُس نے بہ مشکل اپنے حواس بجا کیے اور ڈگمگاتی آواز میں بولا۔ "بس کرو، ابھی اپن تم کو کیا بولے۔"

"اپن نے کسی جواب کے لیے تم کو نہیں بولا ہے۔"

"جامنی بائی!" پیرو نے جھپٹ کے اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ پیرو کہتا تھا کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے نا آشنا تھیں لیکن وہ سب کہیں رُکے ہوئے تھے جن کا علم پیرو کو نہیں تھا۔ اُس رات اُس کی آنکھیں پھٹ پڑیں، اُس کا سارا چہرہ بھیگ گیا۔ جامنی بائی بھی سسک رہی تھی۔ وہ اُسے کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا، کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ جامنی بائی نے بہت دیر کر دی تھی۔ پیرو کا دماغ ایک اور شخص کے خیال سے لبریز تھا، وہ بھی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی۔ اُس کے سینے میں بھی دل کی جگہ پھول دھڑکتے تھے۔ پیرو لمحے گن رہا تھا کہ وہ کب آتی ہے۔ پیرو نے اُس سے کہا تھا کہ وہ آخری سانسوں تک اُس کی راہ تکتا رہے گا۔ اُس لڑکی کے گھر والے عزت نشان کے لوگ تھے اور وہ اپنی نازک بدن بیٹی کے لیے کسی ریاست سے آنے والے ایک راج کمار کے خواب دیکھ رہے تھے۔ درمیان میں پیرو نے اُس راج کمار کی جگہ لے لی مگر پیرو کے پاس کوئی ریاست نہیں تھی، نہ اُس کا کوئی شجرہ تھا، نہ امتیاز، نہ پس منظر، نہ پیش منظر۔ بمبئی کے تھانوں میں اُس کا نام سرِفہرست تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا، اُس کا ہنر صرف چاقو تھا۔ لڑکی والوں نے اُسے مسترد کر دیا لیکن لڑکی نے نہیں۔ وہ اپنے گھر والوں کو آمادہ کر رہی تھی اور اُس نے پیرو سے کہا تھا کہ اگر وہ انھیں منانے میں ناکام ہو گئی تو ایک دن سب کو چھوڑ کے اُس کے پاس چلی آئے گی اور وہ ایسی ہی تھی۔ پیرو کو یقین تھا کہ دنیا بدل جائے گی، وہ نہیں بدلے گی، اُسے ایک دن آنا ہے کسی بھی لمحے وہ ساری زنجیریں، سارے بندھن توڑ کے اپنی منزل، اپنے مرکز پر آ جائے گی، پیرو کی ذات میں جذب ہونے اور پیرو کو اپنی ذات میں جذب کرنے۔ پیرو اُس دن کا بے قراری سے منتظر تھا۔ اُس نے جامنی بائی سے کچھ نہیں چھپایا، سب کچھ کہہ دیا۔ جامنی بائی کی آنکھوں کے سمندر میں ایک ثانیے کے لیے تلاطم سا برپا ہوا مگر دوسرے ہی لمحے اُس میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ پیرو کو اُس تلاطم سے اتنی وحشت نہیں ہوئی جتنی اُس کے سکون سے۔ جامنی بائی سر جھکائے خاموش رہی۔

رات گئے پیرو داور کے پاڑے سے واپس آ رہا تھا تو اُس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ اُس کا سارا جسم جل رہا تھا اور سر خالی خالی تھا۔ اسی عالم میں کئی دن گزر گئے۔ پیرو جامنی بائی کے پاس نہیں گیا مگر جامنی بائی ہر لمحے اُس کے سامنے ہی رہی۔ پھر ایک دن شام کو بے ارادہ اُس کے قدم داور کے پاڑے کی طرف اُٹھ گئے۔ جامنی بائی کے کان جیسے اُس کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ پیرو کو دیکھتے ہی اُس کا سراپا لہرا گیا اور اُس نے والہانہ نظروں سے اُس کا استقبال کیا لیکن اُس کے ہونٹوں پر سکوت کی مہر لگی رہی۔ پیرو اُس کے بعد بھی کئی بار اُس کے پاڑے میں گیا۔ جامنی بائی کی ڈبڈبائی نظریں اُس کا سینہ کاٹتی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھا رہتا تھا۔ چُپ چاپ، گم صم اور چلا آتا تھا۔ جامنی بائی کبھی اُس کے سامنے بیٹھی، کبھی اُس کے پہلو میں سمٹی جام بنا کے دیتی رہتی اور وہ انھیں حلق میں اُنڈیلتا رہتا۔ جب جام زیادہ ہو جاتے تو جامنی بائی ہاتھ روک لیتی۔ گو پیرو اپنے پاڑے میں کسی کو اطلاع دے کے نہیں جاتا تھا مگر جامنی بائی کے ہاں اُس کے آنے جانے کی خبر روپوش نہیں رہی۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ اُن سے بے نیاز جامنی

بائی کے ہاں جاتا رہا۔ اُس کے پاس اُس سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا تب بھی وہ جاتا رہا۔ اُس کے پاڑے کے ساتھی اُسے متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ پیرو اب اُن سے نہ علاقے کا حال پوچھتا تھا، نہ آمدنی کا حساب لیتا تھا۔ دن بھر یا تو وہ پاڑے کے کسی کمرے میں پڑا رہتا یا پھر کہیں نکل جاتا۔ اُس نے پاڑے میں چاقو وغیرہ کی تشقیں کرانا اور زور کرنا چھوڑ دیا تھا اور سویرے ورزش کرنے کا معمول بھی بھول گیا تھا۔

پیرو کے جسم میں اُس کے بقول دھواں سا بھرتا گیا۔ اتنا دھواں کہ اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ آخر ایک روز اُس نے اُس لڑکی کو جامنی بائی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جامنی نے اُس سے کیا کہا ہے، اُس نے اُس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ لڑکی کیا کہے گی کیونکہ اُس کا دل پھول کی طرح نرم، شبنم کی طرح شفاف تھا۔ وہ پیرو کی مسیحا تھی، اُس کا مداوا تھی۔ پیرو جب اپنا احوال کہہ کے اُس کے پاس سے اُٹھا تو اپنے آپ کو بے وزن محسوس کر رہا تھا لیکن وہ تقریباً ایک ہفتے تک جامنی بائی کے پاس نہیں گیا۔ ایک ہفتے بعد جب اُس نے دادر کے پاڑے جانے کا فیصلہ کیا تو اُس کا خون تیزی سے گردش کر رہا تھا مگر وہ اُس کے عزم کی گردش تھی۔ سات دن بعد جامنی بائی نے پیرو کو دروازے پر دیکھا تو اپنے قابو میں نہ رہ سکی۔ اُس کے بازوؤں میں چھپ کے بکھر سی گئی۔ وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ "ابھی اپن آگیا ہے۔" پیرو ہانپتے ہوئے بولا۔

"اتنے دن تم کدھر تھے دادا؟"

"اپن اپنے آپ کو بنا رہا تھا۔" جامنی بائی کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اُس کی سمجھ میں پیرو کی بات نہیں آئی تھی۔ پیرو نے اُس کے کان میں چپکے سے کہا۔ "ابھی اپن تم کو ادھر سے لے جانا مانگتا ہے جامنی بائی!"

"دادا!" وہ تڑپ کے بولی۔ "تم کیا بولتے ہو؟"

"ہاں جامنی بائی! اپن نے بات کر لیا ہے۔"

"کس سے؟"

"اپنے آپ سے اور ابھی اُس سے جس کا اپن نے بولا تھا۔ اُس نے اپن سے بولا۔ پیرو! جاؤ، جامنی بائی کو لے آؤ۔ اُس کو اپن نے ایک دم سب بول دیا تھا۔ سنتا رہا اور سُن کے بولا، ودر جاؤ، جامنی سے بولو، اپن دونوں ساتھ ساتھ رہے گا۔ نہ مانے تو بولو، ہم اُس کی نوکرانی بن کے رہے گا یا اُس سے الگ رہے گا۔ پھر بھی نہ مانے تو بولو، اپن بالکل الگ ہو جائے گا۔ اپن نے بولا۔ تم نئیں ہوگا تو ادھر اپنا کیا ہوگا۔ بولا، ابھی تم ادھر سے جاؤ، جامنی بائی ایسا نئیں کرے گا۔ اپن کو یقین ہے۔"

جامنی بائی کی مبہوت آنکھیں اُس پر مرکوز رہیں۔

"تم نے سُنا جامنی بائی، اپن کیا بولتا ہے؟"

"سُن لیا دادا!" وہ نڈھال ہو کے بولی۔

"بس ابھی تم تیار ہو جاؤ، چاقو اُٹھاؤ۔"

"چاقو!" وہ اچنبھے سے بولی۔

"ہاں جامنی بائی! چاقو۔"

"چاقو کیوں دادا؟"

"ابھی اپن جانتا ہے کہ ادھر ویدر پاڑے کے دادا لوگوں نے تم کو لے جانے کا کوشش کیا تھا اور تم نے بولا تھا، اپن کے ہاتھ سے کوئی چاقو گرا دے تو اپن پھر ایک پل نئیں ٹھیرے گا، اُسی کے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسا بولا تھا نا؟"

"ہاں، پر تم سے نہیں بولے تھے۔"

"اپنے سے نئیں بولا، ٹھیک ہے پر اپن کو پتہ ہے اور اپن بھی ایک دادا ہے۔ اپن ابھی تمھاری بات پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم کو چاقو کے بل پر لے جائے گا اور اپن کے چاقو میں بل نہیں تو سالا تم سے دُور ہو جائے گا، اپنا منہ سدا کو نہیں دکھائے گا۔"

"نہیں دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتا۔"

"کیوں نہیں لڑ سکتا۔" پیرو تلخی سے بولا۔ "اپنے کو بھیک نہیں چاہتا۔" اُس نے تیز و تند لہجے میں جامنی سے کہا کہ اگر وہ چاقو نہیں اُٹھائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس نے پیرو کے ساتھ رعایت کی ہے، بخشش کی ہے۔ پیرو ہمیشہ اس میں اپنی ہتک محسوس کرتا رہے گا۔ زندگی بھر اُسے خلش رہے گی کہ جامنی بائی نے اُسے کسی سبب سے درگزر کیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نگاہ ملا کے رہنا چاہتا ہے، نگاہ چرا کے نہیں۔ اس کانٹے کے ساتھ نہیں کہ جیتی کے ایک پاڑے کے دادا کی حیثیت سے وہ جامنی بائی کا اہل نہیں تھا۔ کوئی شک نہیں کہ جامنی نے پیرو کو ایک دادا کی صورت میں نہیں دیکھا تھا اور اُس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ پیرو اُسے بھی ایک پاڑے کی دادا نہ سمجھے لیکن اپنی ذات کے سکون، آئندہ دنوں میں جامنی بائی کی نظروں میں اپنی سرخوشی کے لیے پیرو اُس سے چاقو اُٹھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

جامنی بائی ششدر کھڑی تھی۔ اُس نے شدت سے انکار کر دیا اور بولی کہ یہ پیرو کا ہذیان ہے۔ کیا اُس نے اُس لڑکی سے بھی، جس کی اجازت لے کے وہ جامنی بائی کے پاس آیا ہے، اِسی طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے۔ اگر پیرو نے اُس لڑکی سے کچھ نہیں کہا اور اُسے جوں کا توں قبول کیا ہے تو جامنی بائی کے سلسلے

اس کی یہ خواہش کیوں ہے۔
"وہ جامنی بائی نہیں ہے، پاڑے میں نہیں ہے۔" پیرو نے
کہا: "اس نے پہلے کسی کو ایسا نہیں بولا۔ جیسا جامنی بائی
بولا تھا۔"

"دادا! اپن تم سے نہیں لڑ سکتے۔" جامنی بائی ناتوانی سے بولی۔
پیرو نہیں مانا، کہنے لگا کہ جامنی بائی کے انکار کے معنی اس
کے سوا نہیں کہ وہ پیرو کی شکست سے ہراساں ہے۔ اُسے یقین
ہے کہ وہ اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ پیرو کے لیے یہ صورتِ حال کسی
توہین سے کم نہ تھی کہ اس کے بارے میں ایسا سمجھا جائے۔

"پھر تم سمجھو اپن جو بولے تھے، اس کو واپس لیتے ہیں۔ تم
اپنی گھر والی کے پاس چلے جاؤ۔ اپن کا دھیان چھوڑ دو۔ اپن بھی
تم کو بھول جائیں گے۔" جامنی بائی شکست خوردہ لہجے میں بولی۔
پیرو نے کہا کہ اس طرح وہ اس کے شبہے کی تصدیق کر رہی
ہے۔ "وہ پیرو کو رسوا کرنا نہیں چاہتی مگر پیرو کے لیے اس سے
بڑی رسوائی کوئی نہیں کہ جامنی اس کے خیال سے چاقو اٹھانے
سے ڈرتی ہے۔" اپن جانتا ہے تم ایسا کیوں بولتا ہے۔ پھر تم بھی اپنے
کو پیرو مت جانو، ماہم کے پاڑے کا دادا جانو جو پچھلے دادا کی
طرح تمہارے پاڑے میں چاقو چھنوانے آیا ہے۔" اس نے
جوشِ حال میں کہا۔

"ایسا مت بولو۔" جامنی بائی ترشی سے بولی۔
پیرو ضد کرنے لگا۔ وہ ہم سے پوچھ رہا تھا، بتاؤ میں اُسے
کیسے لے جاتا۔ پیرو کے احساسات سمجھنا ہمارے لیے دشوار
نہیں تھا۔ پیرو نے اپنی زبان سے نہیں کہا لیکن اُسے بہت سے
اندیشے ہوں گے۔ دوسرے پاڑوں کے داداؤں کا اور سب سے
بڑھ کر اپنے آزار کا۔ وہ اس عورت کو کیسے گھر لے جا سکتا تھا جس
کے اعتبار کا اُسے اعتماد نہ ہو۔ اگر جامنی بائی پیرو کے بیان کے
مطابق اسی کے خیال سے پہلو تہی کر رہی تھی تو پیرو کے لیے یہ
غیرت کا تازیانہ تھا۔

جامنی اُس سے التجا کرتی رہی لیکن جتنا وہ التجا کرتی پیرو
کا اصرار اتنا ہی بڑھتا جاتا اور جب جامنی بائی نے یہ جان لیا
کہ اس کا اکراہ پیرو کے لیے آتشِ مہمیز کا کام دے رہا ہے تو اس نے
خاموشی اختیار کر لی۔ پیرو کہتا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر
اداسی چھائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ کچھ
دیر اس پر سناٹا طاری رہا۔ "ٹھیک ہے دادا!" وہ شکستہ آواز میں
بولی۔ "جیسا تم بولتے ہو، ٹھیک ہے۔"

پیرو نے آگے بڑھ کے اُسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔
"جامنی بائی!" اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا: "ابھی تم سمجھو
اپن ایسا کیوں مانگتا ہے۔"

جامنی بائی کا سراپا اس کی آغوش میں سسکتا رہا۔ پیرو نے
دیر نہیں کی۔ اُسے خدشہ تھا، جامنی بائی اپنا ارادہ نہ بدل دے۔
"ابھی پاڑے کے سارے آدمی کو بلالو۔" اس نے جامنی بائی سے کہا۔

"اُن کو کیوں دادا؟" جامنی بائی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"اپن چاہتا ہے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپن
تم کو اپنی، تمہاری ماں کی، تمہارے بھگوان کی سوگند دیتا ہے اگر
تم نے چاقو میں کوئی چوری کیا، اپن کا دھیان کیا، پھر اپن چھاتی
میں اس کو اتار لے گا، سمجھا!"

صبح قریب ہی تھی۔ ہمارے اردگرد چکر لگاتے ہوئے پہرے دار
ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بیٹھے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ اُن سے
دُور کے لوگ بھی۔ اُن میں سے شاید کوئی نہیں سویا تھا۔ فاصلے فاصلے
پر کئی الاؤ جل رہے تھے اور اُن کے اطراف بیٹھے ہوئے مشٹنڈوں
نے ہتھیار اپنے ہاتھوں میں تیار رکھے تھے۔ پیرو سانس لینے کے لیے
رُک گیا تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اُسی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ بنجل
کا منہ بھی اُسی کی جانب تھا۔ ہر شخص دم بخود سا تھا۔ جامنی بائی
کی جو شکل و صورت پیرو نے بیان کی تھی، اُسے سن کے سبھی کے
دل میں اُسے ایک بار دیکھنے کی خواہش جاگی ہو گی، ضرور بنجل
کے دل میں بھی۔ دیر ہو گئی تو جامو نے پیرو کو ٹوکا۔

پیرو نے اپنا بھاری سر ہلایا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کا منہ جیسے سوکھ
گیا تھا۔ بہکی بہکی آواز میں کہنے لگا کہ تھوڑی دیر میں جامنی بائی کے حکم پر
اُس کے پاڑے کے سارے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ اس دوران وہ
تخت پر اپنے آپ میں گم بیٹھی رہی۔ پیرو اُس کے پاس تخت
کے دوسرے سرے پر تھا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو وہ تخت
سے اُتر آئی۔ پیرو بھی اُس کے پیچھے پیچھے بیچ میں کھلی ہوئی جگہ پہنچ
گیا۔ جامنی بائی نے ساڑھی کا پلو کمر سے باندھ لیا اور اپنے بکھرے
ہوئے بالوں کی لٹوں میں گرہیں لگا دیں، سر کو کئی جھٹکے دیے اور اُٹھا

ہاتھ بائیں جانب بڑھا دیا۔ پاڑے کے ایک آدمی نے فوراً چاقو
اُس کی طرف اچھالا جامنی بائی نے پھرتی سے اُسے اُچک لیا۔ چاقو
ہاتھ میں آتے ہی اُس کے سراپا میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی
اور اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بھینچ لیں۔ اُس
کے سینے میں جوار بھاٹا سا اُٹھ رہا تھا۔ آنکھیں کھول کے اُس نے
پیرو کو ایک نظر دیکھا۔ پیرو کو ایسا لگا جیسے اُس کی آنکھوں میں
آگ بھڑک رہی ہے۔ "دادا!" اُس نے لرزیدہ آواز میں اُسے
مخاطب کیا۔

"جامنی بائی!" پیرو نے وارفتگی سے کہا۔

مگر جامنی اُسے مخاطب کر کے رہ گئی۔ وہ چند قدم پیچھے
ہٹی اور یکایک اُس کے بدن میں ایک بجلی سی چمکی یا کوئی شعلہ سا
لپکا۔ اُس کے پیچھے ہٹتے ہی پیرو نے بھی اپنا چاقو تان لیا۔ چشم زدن
میں وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔ پیرو کی نظر اُس کے چاقو سے بندھی تھی۔
اُس نے سن رکھا تھا کہ جامنی بائی کی آنکھیں اُس کے مقابل کو
متزلزل کر دیتی ہیں۔ یہ آنکھیں پیرو کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔
وہ ان میں جھانکتا رہا تھا لیکن آنکھیں ہی نہیں، جامنی بائی کے
سارے بدن سے چنگاریاں اُٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ پیرو کو اپنی توجہ
مرکوز کرنے میں کسی قدر مشکل پیش آئی۔ اُسے اس بات کی خوشی
تھی کہ جامنی کے ہاں اُس کے لیے رعایت کی کوئی گنجائش موجود
نہیں ہے گویا اُس نے اُس کی دی ہوئی قسم کا پاس کیا ہے۔ یہ دیکھ
کے پیرو کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اُبلنے لگا اور اُسے جامنی بائی
کے دو تین ہی پینتروں سے اُس کے متعلق سُنی ہوئی روایتیں جھوٹ
نظر آئیں۔ وہ نہ کسی جادو کا کرشمہ تھا، نہ اُس کی شرربار آنکھوں کا شعبدہ۔
وہ سب جامنی بائی کے چاقو کا تماشا تھا کہ اُسے چاقو چلانا آتا
تھا۔ پیرو نے بہت سے لوگوں کو چاقو اُٹھاتے، چاقو تولتے دیکھا
تھا مگر جامنی بائی کا انداز سب سے جُدا تھا۔ وہ اپنے مخالف کو
اپنے ممکنہ داؤ کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتی تھی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر
ایک پل میں اِس بازو، دوسرے پل میں اُس بازو۔ اس کا بدن ہوا
کے مانند تھا، سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہر، پھرکی کی طرح۔ پیرو کو ابتدا
ہی میں اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں سوچنے کا کوئی لمحہ ملنا دشوار ہے
سو جامنی بائی کا چاقو منتشر کرنے کی ایک ہی صورت اُس کے
ذہن میں آتی تھی کہ وہ خود اُسی کا تیور اختیار کرے۔ اُسے اپنے داؤ
کی آہٹ کا احساس نہ ہونے دے جیسا کہ جامنی بائی کا طریقہ تھا۔
جامنی بائی کا یہ طریقہ کوئی حربہ یا ہتھکنڈا نہیں تھا۔ چاقو پر بیرے
ہوئے ہاتھ اور جسم کی قابو یافتگی کے اعتماد کے بغیر ایسا ممکن نہیں تھا۔

پیرو کی خواہش تھی کہ جو کچھ ہونا ہے، جلد سے جلد ہو جا…
تک آمنے سامنے رہنے کی نوبت نہ آئے۔ وہ شروع ہی…
بائی کی کلائی پکڑنے کی فکر میں تھا۔ جامنی بائی نے اپنا…
کے قریب نہیں پھٹکنے دیا اور پیرو پہلے ہی مرحلے میں…
سے بڑھ بڑھ کے جھپٹ جھپٹ کے اُسے دفاعی حال…
لانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ ظاہر ہے، پیرو نے اپنے…
اور چاقو کی تمام صلاحیتیں آزما کے دیکھی ہوں گی۔ وہ بتا…
جامنی بائی ہر مرتبہ اُس کے نرغے سے پھدک کے نکل جاتی…
کانا پینترا بدل کے اُس پر جھپٹتی۔ پیرو کسی نہ کسی طرح…
کے، کبھی تیورا کے، کسی طرف لپک کے اور اپنے آپ کو…
سمیٹ کے اُس کا وار اکارت کر دیتا اور پھر اُسی کی تدبیر…
کہ پلک جھپکتے میں چاقو تلنے اُس پہ اُٹھتا، بڑھتا اور وا…
چلانے کی کوشش کرتا۔

جامنی بائی کے لیے پیرو جیسے کسی شخص کا تجربہ نیا…
ہم نے بمبئی اور کلکتے کے پاڑوں میں اُسے اپنے آدمیوں…
زور آزمائی کرتے دیکھا تھا۔ اب بھی اُس میں ایسی پھرتی…
کے وقت کیسی ہو گی۔ اب کی نسبت جب ایک ہی فرق…
پیرو کے ہاتھ میں گرمی کے ساتھ دماغ میں گرمی زیادہ ہو گی…
کے نزدیک ایک نامناسب بات تھی۔ اُس نے کئی بار…
کی تھی، لاڈلے، چاقو اُٹھاتے ہوئے سر الگ رکھنے کی کوشش…
خون کی گرمی کے اثر سے سر دور ہی رکھنا۔ یہ کوئی آسان…
کہ آدمی اپنے جسم کی کھولتی ہوئی گرمی گردن سے اوپر نہ بڑھ…
تحمل کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سر برف کے مانند منجمد ہونا چاہ…
کی مُراد یہ تھی کہ سر میں حبس نہ ہو، کھلا ہی رہے تو بہتر ہے…
کو بھی یہ بات معلوم ہو گی۔ اُس نے ماہم کا پاڑا یوں ہی حا…
نہیں کر لیا تھا۔ بہت سے آدمیوں میں وہی آدمی اڈے کا…
بنتا ہے جس کے جسم اور سر میں توازن ہو اور اس لحاظ سے…
بائی بمبئی کے ایک پاڑے کی داوا تھی اور اُس نے کئی پاڑے…
ہی لوگوں کے سپرد کر دیے تھے۔ وہ بھی اس توازن سے ناآشنا…
انھیں دس منٹ سے زیادہ گزر گئے تھے۔ مشہور تھا…
بائی کو چند ہی لمحے لگتے ہیں۔ اُس کے آدمی چاروں طرف دم…
کھڑے تھے۔ بیچ میں پیرو کو ایک بار شبہ ہوا تھا کہ جامنی بائی
کے ساتھ رعایت تو نہیں برت رہی ہے مگر پھر خود ہی اُسے
وہم کی تردید کرنی پڑی۔ کوئی پل ایسا نہیں گزرا تھا جب جامنی
نے اُس کے وار سے بچنے یا اُس پر وار کرنے کا موقع کھویا ہو…

ہو گئے تھے۔ پیرو اُسے اور تھکا دینا چاہتا تھا کہ
میں شاید کوئی وار کارگر ہو جائے۔ دونوں ایک دوسرے
نشان ڈالنے سے بچ رہے تھے اور ایک دوسرے کو
کے خیال سے چاقو کی جھپکیاں دے رہے تھے۔ دونوں
اپنی اس تگ و دو میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ گڑبڑا
نہیں چھوڑ دیتا۔ چاقو ہر حالت میں ہاتھ سے چپکا
کوئی چارہ نہ رہے تو دوسری بات ہے۔ جو گڑبڑا
چھوڑ بیٹھتا ہے۔ بجّھل کے کہنے کے مطابق اُسے دوبارہ
تھامنا چاہیے پھر اُسے چاقو تھامنا نہیں آتا چنانچہ ایک
متذبذب کرنے یا بوکھلا دینے سے اُن کا مقصد محض
کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ ٹانگ اڑا کے نیچے گرانے
بھی ڈالنے۔ توازن بگاڑنے اور کسی خاص جگہ سے پنجہ
میں کامیابی حاصل کرنا جو ابھی تک ممکن نہیں ہو رہا تھا۔
وزن میں بہت کم ہو گی۔ کلائی بھی اُس کی پیرو
نہیں ہو گی۔ پنجے کی پکڑ بھی پیرو کے مقابلے میں
چاہیے لیکن کمزوری اور مضبوطی کا تعلق داؤ نہ جاننے
ہوتا ہے۔ صحیح رگ انگلی کی زد پر آ جائے تو دیو ہیکل آدمی
لگتا ہے۔ جامنی بائی کو اپنی گرفت کا کوئی جوہر سا ہی
اُس پاس کے پاڑوں کے داؤں سے زور آزمائی کرنے
جھجکتی تھی۔ ہر طرف دائرے کی شکل میں کھڑے ہوئے آدمیوں
کھلی جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ پیرو متعدد مرتبہ دائیں بائیں
[illegible] بڑھا تاکہ کسی ایک گوشے میں جامنی بائی کھیلے
ہو جائے اور اُس پر ہاتھ ڈالنا آسان ہو جائے مگر وہ
گوشے میں آنے سے پہلے ہی اُس کے پہلو سے لڑک
جاتی تھی۔ اُس کے بدن میں بے حد لچک تھی۔ اُسے دُہرا
اپنے آپ کو تہہ کرنے میں اتنی دشواری نہیں ہوتی تھی
پیرو کو ہوتی تھی۔ دونوں کے بیچ دیر تک چوہے بلی کا کھیل
پھر معاً پیرو کے ذہن نے کروٹ سی بدلی یا جیسے اندھیرے
کی کرن پھوٹی۔ اُس نے کسی تاخیر کے بغیر اُسی پر عمل کرنے
ارادہ کر لیا۔

اُس نے طے کیا تھا کہ اب کے جب جامنی بائی چاقو تانے
اُس پر لپکے تو وہ اِدھر اُدھر بچنے کے بجائے ایک دم بیٹھ جائے۔
بائی کے قریب آنے پر ہی اُس کا بیٹھنا سود مند ہوتا۔ فاصلہ
ہوتا تو وہ اُس کی طرف بڑھتے بڑھتے پلٹ جاتی۔ فاصلہ کم رہ
اُس کے لیے پلٹنا بہت وقت طلب تھا۔ وہ اپنی جھونک

میں پیرو پر ٹوٹ جاتی۔ اس گڑبڑاہٹ کے دوران اُس کا چاقو
پیرو کے جسم کے کسی حصے پر لگ سکتا تھا اور اُس کا پنجہ بھی پیرو
کے قبضے میں آ سکتا تھا۔ خود جامنی بائی کے لیے اتنے کم فاصلے پر
سنبھلنا اور سنبھل کے پیرو کا پنجہ پکڑنا ناممکن نہیں تھا۔ لاکھ پھرتی
ہونے کے باوجود اتنی جلد ارادہ بدلنے کا امکان سو میں ایک فی صد
ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک وہ ایک دوسرے کے وار
ٹالتے رہے تھے۔ اس بار بھی پیرو پر جھپٹتے وقت جامنی بائی کو توقع
ہو گی کہ پیرو کسی جانب اُچک نکلے گا۔ پیرو کا یہ اقدام جامنی بائی کے
ذہن میں دُور دُور تک نہیں ہو گا کہ وہ یوں اپنے آپ کو خطرے
میں ڈال دے گا۔ یہ ایک طرح کی وحشت تھی مگر جسے دیکھ کے
جامنی خود سٹ پٹا سکتی تھی۔ بہرحال پیرو اس موقع کی تاک میں
تھا۔ جوں ہی جامنی بائی اُس کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی آئی،
پیرو نے چند قدم پیچھے ہٹ کے پہلے تو اُسے یہ تاثر دیا کہ وہ اس
کے ممکنہ وار سے بچنے کے لیے تیار ہے لیکن... جیسے ہی جامنی
کا اور اُس کا فاصلہ ایک گز سے قریب رہ گیا تو دفعتاً وہ بیٹھ گیا۔
اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے رکھے تھے اور اُس کا خیال تھا کہ
ضرورت پڑی تو وہ اپنا چاقو بھی چھوڑ دے گا۔ جامنی بائی بیچ میں
حائل پیرو کے جسم سے تیزی سے ٹکرائی مگر ابھی پیرو [illegible] تھا کہ
اُس کا بازو یا کلائی پکڑ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے بدن کی پوری
طاقت سے اوپر اچھلی اور پیچھے پیرو کے دوسری جانب لوٹ گئی،
فرش پر دو ایک قلابازیاں کھاتی ہوئی وہ کچھ دُور جا کے کھڑی ہو گئی۔
پیرو کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے دُھند سی چھا گئی
لیکن وہ جلد ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کے کچھ پیچھے آ گیا اور اِس سے
پہلے کہ اب جامنی بائی اُس پر لپکتی، وہ ترچھا ہو کے ایک ہاتھ بڑھا،
چاقو کو ناک کی سیدھ میں لیے چند قدم جست لگا کر پھر جامنی کے قریب
آ گیا۔ کوئی اور بات اِس کے سوا اُس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی کہ
وہ جامنی بائی کا اور اپنا فاصلہ کم سے کم رکھے۔ اُس نے کچھ ایسا محسوس
کیا تھا کہ جامنی بائی فاصلہ کم رہنے سے کترا رہی ہے۔ اگر یہ اُس کا
گمان ہی تھا، تو بھی اب زیادہ دیر تک پیرو یہ آنکھ مچولی جاری رکھنے
پر تیار نہیں تھا۔ فاصلہ کم ہونے پر جلد سے جلد کوئی نتیجہ برآمد ہونے
کی توقع تھی۔ اِدھر یا اُدھر، جو کچھ بھی ہو۔ پیرو کا چاقو والا ہاتھ اپنے
سامنے دراز رہنے کی وجہ سے جامنی بائی دائیں بائیں ہو کے اُس
کا ہاتھ اچکنے کی کوشش کرتی یا پہلو سے بچ نکل کے پیرو کو پھر
پلٹنے پر مجبور کر دیتی۔ پیرو کی خواہش تھی کہ جامنی بائی اس موقع سے
فائدہ اٹھائے اور اُس کے پنجے پر جھپٹا مارے۔ بس یہیں سب

طے ہو جاتا تھا کہ وہ جامنی بائی سے پنجہ چھڑا لیتا ہے اور خود اُس کا پنجہ قبضے میں کر لیتا ہے یا نہیں۔

پیرو کی نگاہیں چاقو پر جمی ہوئی نہیں تھیں کیونکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جامنی سامنے سے اُس کے اُٹھے ہوئے ہاتھ کے چاقو کی نوک پر آنے سے تو رہی اسی لیے پیرو اس طرف سے بے فکر تھا اور سامنے دیکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر جامنی بائی کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے مستعد تھا۔ جامنی بائی اُسے بڑھتا ہوا دیکھ کے فوراً ہی بائیں جانب ہوئی، پھر دائیں جانب۔ ایک آن میں اُس نے کئی پینترے بدلے۔ پیرو نے اپنا ہاتھ سیدھا ہی رکھا اور اس طرح جامنی بائی کو کوئی رائے قائم کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ جامنی کے لیے اس میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کسی طرف بھی ہو سکتی تھی مگر پیرو کا اس انداز میں چاقو اُٹھائے، ہاتھ پھیلائے رکھنا اُسے شک میں ڈال سکتا تھا۔ وہ پیرو کے انتہائی بائیں جانب ہو گئی۔ نتیجتہً پیرو کو بھی رُخ بدلنا پڑا لیکن اُس نے اپنا ہاتھ ویسے ہی پھیلائے رکھا۔ جامنی بائی اِس اثنا میں بڑھ چکی تھی۔ پیرو نے رُخ بدلنے میں دانستہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ اُدھر سے بڑھی، اِدھر سے پیرو پلٹ کے جامنی کے سامنے ہو گیا۔ جامنی بائی اتنی تیزی میں تھی کہ پیرو کو اپنا ہاتھ کھینچنے کی مہلت نہیں ملی، وہ عین اُس کے مقابل آ چکی تھی اور چاقو ٹھیک اُس کے سینے میں پیوست ہوا، دوسرے ہی پل وہ پیرو کے بازو پر جھول رہی تھی اور پیرو کا سارا جسم چکرا رہا تھا۔

وزیرا اور ماری کی سسکیاں نکل گئیں۔ سبھی پتھرائی ہوئی نظروں سے پیرو کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ پیرو کا سر جھکا ہوا تھا اور اُس کا جسم ایک ڈھیر لگ رہا تھا۔ کسی کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ جھل بھی گم صم بیٹھا تنکوں سے آگ کرید رہا تھا۔ خاصی دیر بعد جامو نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔ "دادا! پر یہ ایسا کیسے ہو گیا؟" اُس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

"ہو گیا جانی! سب ایسا ہی ہوا۔" پیرو بھاری لہجے میں بولا۔ "جامنی بائی اپن سے مسخری کر رہا تھا۔ وہ سب مخول تھا جامو! اپن سالا سمجھا تھا، اپن جامنی بائی کو نچاتا ہے، وہ اُودر اپنے کو نچاتا تھا۔ اتنے آدمیوں کے بیچ اپنے پیرو کو ذلیل کرنا نہیں مانگتا تھا۔ انتا جھٹکا اُس نے اپن کے لیے لیا تھا۔"

"نہیں دادا!" جامو منتشر لہجے میں بولا۔

"اپن نے آخری ٹیم اُس کا مسکان دیکھا تھا۔ وہ لونڈا اپن کے بازو پر ہی پڑا تھا۔ ہنستا ہوا بولا، اپن ہار گئے دادا! اپن ... نہیں بولا گیا۔ بولا تو وہ کان بند کر چکا تھا۔ تم سمجھتا ہے جامو؟ اپن نے پلٹنے میں دیر کی کہ اُودر سے وہ چل پڑا تھا۔ وہ ... چل پڑا تھا جامو! وہ چاہتا تو کسی اور طرف کو جا پڑتا۔"

پیرو ٹھیک ہی کہتا تھا، جب اُس نے جامنی بائی ... کیا تھا تبھی جامنی بائی نے یہ طے کر لیا ہوگا۔ جامو نے اُس ... کچھ اور نہیں کہا۔ پیرو کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُس نے ... میں جس لڑکی کا ذکر کیا تھا، اُس کا نام نہیں بتایا، نہ کسی نے ... مگر میں اور جھل اُسے دیکھ چکے تھے۔ وہ گیتا کی ماں کے ... نہیں ہو سکتی تھی۔

الاؤ میں آگ دہک رہی تھی۔ آگ دھیمی ہو جاتی تو لکڑ... اور جھونک دی جاتیں، رات بھر آسمان صاف رہا اور ستار... ٹمٹماتے رہے اور پیرے دار ہمارے اطراف چکر لگاتے رہے۔ ... دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ... بیٹھے نہ جانے کتنا وقت اور بیت گیا کہ سورج کی پہلی کرن ... ہوئی۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں نے فوراً جھول داریاں لپیٹ... کر دیں اور اُن کے کچھ آدمی ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ... باقی سب ہمارے قریب ہی منڈلاتے رہے۔

اندھیرا پوری طرح چھٹ چکا تھا کہ اُنھوں نے ہمیں آگے ... کا اشارہ کیا۔ ابتدا میں اُن کی رفتار تیز تھی، رفتہ رفتہ سست ... گئی۔ گزشتہ دو دن میں وہ مسلسل چلتے رہے تھے یا جاگتے رہے ... تھے۔ جس رفتار سے وہ فاصلے طے کر رہے تھے، دو ... پہنچنے میں مزید ایک دن اور لگ سکتا تھا۔ تاہم اباجان کے ... تھی۔ دونوں کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ رات بھر خیمے میں ... بدلتے رہے ہیں۔ ہم نے اپنے تھیلے بھی بانکوں پر ڈال دیے ... دھوپ نکلنے سے سردی کچھ کم ہو گئی تھی۔ آگے اونچائی ہی ... تھی۔ اونچائی پر مسلسل نہیں چلا جا سکتا۔ چنانچہ وقفے وقفے ... سب دم ضرور لیتے تھے۔ اب یہ وقفے پہلے سے طویل ہو گئے ... آگے جا کے اُن کی رفتار کچھ اور سست پڑ گئی اور ہم ایک ... پہاڑی راستہ طے کر کے پھر نیچے اترنے لگے اور ایک خندق ... میں آ گئے۔

ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی کہ کھانا کھانے کے لیے وہ ... ٹھہر جاتے حالانکہ وادی نہایت خوب صورت تھی، چاروں طر... پہاڑ کے بیچ میں کسی بڑے کٹورے کی پیندی کے مانند۔ برف... سب...

…پہاڑوں سے ٹوٹ کر کبھی نیچے آ گئے ہوں گے۔ جگہ
…بکھرے ہوئے تھے۔ پانی کی افراط تھی۔ اوپر سے گرتے
…نے نشیب میں ایک جھیل سی بنا دی تھی۔ پتھروں
…درخت زیادہ نہیں تھے۔ کہیں کہیں اُن کے ساتھ بیل
…زمین سے پھوٹ آئی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے
…پیچھے تھے، ابا جان اور انشا نم سب سے پیچھے۔ ہمارے
…یاکوں کے ساتھ تھے، تقریباً سارا سامان یاکوں پر لدا ہوا
…اور پلٹو ہم سب سے آگے تھے۔ زیادہ دور نہیں جانگ قبیلے
…کی نگہداشت کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہمارے
…تھیلوں میں پڑے ہوئے تھے اور بندوقیں شانوں پر
…تھیں۔ وادی کے درمیانی حصے میں آتے ہی یکایک جینی
…زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ سب
…طرف دیکھنے لگے۔ ابھی ہم کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے
…پلٹو نے جینی کو کمر سے اٹھا کے زمین پر پٹخ دیا اور چاقو
…اور اس پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ ہم سب اُسی کی طرف بھاگے۔
…طرح چیخ رہا تھا۔ جھل نے پلٹو کا چاقو والا ہاتھ پکڑ لیا اور
…کے جینی کو دیکھنے لگے، وہ زمین پر ٹانگیں پٹخ پٹخ کے چیخیں
…تھا۔ دیکھتے دیکھتے جانگ قبیلے کے سارے آدمی ہماری طرف دوڑ
…اور ہمارے گرد اُن کا ایک گھیرا سا بن گیا۔ ہر شخص اچک اچک
…جینی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وادی میں شور مچ گیا تھا۔ جا سو نے جینی
…کے اٹھایا۔ جھل نے پلٹو کو الگ پکڑ رکھا تھا اور پلٹو کے منہ
…گالیاں اُبل رہی تھیں۔ جھل نے چیخ کے اُسے چپ رہنے کی
…کی اور ٹھیک اُسی لمحے ہم جیسے ہی جینی کو اٹھا کے پلٹے
…ہمارے چہرے اُن کی متجسس آنکھوں کے مقابل ہوئے تو ہمارے
…اٹھے ہوئے تھے اور خالی نہیں تھے۔ ہم نے بے دریغ گولیاں
…برسانی شروع کر دیں۔

وہ ہمارے بہت قریب تھے دوسری طرف پلٹو اور جینی بھی
…تانے اُن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ اُن کے گھیرے میں سامنے
…جتنے آدمی تھے، وہ دھڑا دھڑ گرنے لگے اور جیسے ہی پیچھے
…آدمی آگے والوں کے ہٹنے پر سامنے آئے اُن کا بھی یہی حشر
ہوا۔ ابھی وہ اس ناگہانی کو ٹھیک طرح سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ بیس
…تیس آدمی وہیں ڈھیر ہو گئے، باقی اندھا دھند بھاگنے لگے۔ بھاگ
…کے وہ کچھ فاصلے پر رُک گئے اور ہم پر نیزے تانتے یا کمانیں چڑھاتے۔
…سب کو احساس تھا کہ آگے جا کے انھیں ایک لمحہ بھی ملا تو وہ ہم پر
نیزے پھینک سکتے ہیں یا تیر چلا سکتے ہیں۔ انھیں کوئی وقت

نہیں دینا تھا۔ ہماری گولیوں نے اُن کا دور تک پیچھا کیا
اور شیرز کو راستے میں ہی جا لیا۔ ہر سو اُن کی چیخیں گونج رہی تھیں
اور ہم میں سے کسی کو ایک دوسرے کی جانب دیکھنے کا ہوش نہیں
تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں پیچھے بھاگ رہے تھے پھر جسے جس
قریبی پتھر کی آڑ ملی، وہ وہیں چھپ گیا۔

اُس وقت ہمارے کانوں میں جھل اور چیرو کی آواز آئی۔ وہ
چلا چلا کے ہمیں اور آگے بڑھنے کو کہہ رہے تھے تاکہ تمنچے کی ہر
گولی کا فاصلہ اپنی حد ہی میں رہے، کوئی نشانہ خطا نہ ہو۔ سامنے
اُن کے مرے ہوئے اور تڑپتے ہوئے آدمیوں کو سرسری نظر سے دیکھنے
کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اُن کی ایک بڑی تعداد ختم
ہو گئی ہے۔ سارے تمنچے بھرے ہوئے تھے اور ہر ایک کے ہاتھ
میں تمنچا تھا، بعض کے پاس دو بھی تھے۔ پتھروں کی آڑ میں کمان یا
نیزے سے ہم پر نشانہ لگانے کے لیے انھیں بہر صورت آڑ سے
نکلنا پڑتا کیونکہ اُن کے پاس ہماری طرح بندوقیں اور تمنچے نہیں تھے
کچھ آگے بڑھ کے ہم بھی احتیاطاً ٹوٹی ہوئی چٹانوں کے ان تودوں
کے پیچھے ہو گئے جو وادی میں جا بجا پڑے تھے۔ ہم نے کچھ دیر انتظار
کیا اور اسی اثنا میں اپنے خالی تمنچے بھر لیے۔ اُن میں سے کوئی باہر
نہیں نکلا۔ انھیں وہاں سے نکالنے اور اپنی سمتوں کا اندازہ کرانے
کے لیے ہم نے آپس میں صدائیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ اُن میں سے
چند ہی نے نشانہ لینے کی جرأت کی اور تیروں کے بجائے نیزے پھینکے،
اُن کے آگے ہم نے فیر کر دیے تھے پھر بھی اُن کے کئی نیزے ہمیں
لگتے لگتے بچے۔ ہم اپنی تعداد کے مطابق پتھروں کو نشانہ بنا سکتے
تھے، پتھروں کی تعداد جہاں وہ چھپنے میں کامیاب ہو گئے تھے، ہم
سے زیادہ تھی اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سامنے جن پتھروں
کو ہم نشانہ بنائے ہوئے ہیں، اُس کے پار وہ موجود بھی ہیں یا نہیں۔
ایک مرتبہ ہماری آوازوں پر اپنی اپنی آڑ سے نیزے پھینکنے کے بعد
وہ خاموش ہو گئے۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کچھ توقف کریں۔ وہ جاتے
کہاں، وادی کے ہر طرف اونچے پہاڑ تھے۔ اُن کی کوشش یہی ہونی
چاہیے تھی کہ وہ کسی طرح اُن تک پہنچ کے وہاں پھیلے ہوئے درختوں
کے جھنڈ میں جا چھپیں اور رینگ رینگ کے آگے بڑھتے رہیں یا
وہاں سے ہم پر تیر اور نیزے پھینکیں۔ پہاڑوں پر پگ ڈنڈیوں کے
بغیر چلنا مشکل تھا۔

دن کے بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ دھوپ ساری وادی میں کھلی
ہوئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دھوپ مرجھانے کے وقت کا انتظار کریں۔
اندھیرے میں اُن کا پہاڑوں کی دیواروں کی جانب رینگنا آسان تھا

اس لیے ہمیں انھیں زیادہ وقت نہیں دینا چاہیے تھا۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے، باقی رہ جانے والے اُن تمام آدمیوں کو نشانہ بنا دینے میں ہمارے لیے بہتری تھی۔ آگے بڑھنے کی وجہ سے ہمارا دائرہ وسیع ہو چکا تھا اور ہم ایک دوسرے سے خاصی دُور ہو چکے تھے۔ آوازیں بلند کر کے ہی دوسرے کو مخاطب کیا جا سکتا تھا اور آوازیں بلند کرنا اب مناسب نہیں تھا۔ مجھے ابا جان کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ انھیں دیکھنے کے لیے میں ایک تودے پر چڑھ گیا مگر اُن کا اور تشانم کا دور و نزدیک کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ بجھل اور جامو بھی میری طرح اُوپر تودوں پر آ گئے تھے۔ جامو کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے اُترنے اور آگے جانے کا اشارہ کیا۔ میرے قریب صرف سارٹے تھا۔ میں دوڑ کے اُس کے پاس پہنچا اور اُسے ساتھ لے کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ جامو کے کہنے سے پہلے ہی میرا خیال تھا کہ انتظار کرنے کے بجائے ہم قریب قریب کی تمام جگہوں پر، جہاں اُن کے چھپنے کا امکان ہے، خود ہی اُن کے سامنے پہنچ جائیں، دو آدمی ایک ساتھ چلیں۔ ہم پنجوں کے بل اپنی چاپیں انتہائی مدھم رکھتے ہوئے سامنے کے تودوں کے نزدیک ہوتے رہے۔ دونوں کھلے ہوئے تھے کسی جانب سے بھی نیزہ یا تیر آ سکتا تھا۔ بہت سے تودوں کے ساتھ جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں اور وہ جھاڑیوں میں تودوں کی نسبت وہ زیادہ محفوظ تھے کیونکہ وہاں سے وہ نشانہ لے سکتے تھے۔ ہماری نگاہیں وہیں منڈلا رہی تھیں جہاں جھاڑیاں تھیں۔

میرے ایک ہاتھ میں چاقو، دوسرے میں تمنچا تھا۔ سارٹے کے دونوں ہاتھوں میں تمنچے تھے۔ ایک بڑے تودے کی دیوار سامنے آتے ہی ہم دونوں مخالف سمتوں میں تیزی سے بھاگے۔ سارٹے اُدھر سے، میں اِدھر سے۔ جیسے ہم اچانک زمین سے پھٹے ہوں، ہم دونوں دونوں اطراف سے اُن پر جھپٹے۔ وہاں پانچ چھ آدمی دبکے ہوئے تھے۔ انھوں نے حواس باختگی سے نیزے پھینکنے چاہے مگر تمنچے کی گولیوں نے انھیں وہیں ختم کر دیا۔ میں نے کھٹکا دبانے کے ساتھ ساتھ چاقو بھی اُن پر پھینکا تھا اور میں چاقو ایک آدمی کے سینے سے نکال ہی رہا تھا کہ وادی میں گولیاں چلنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے ایک دم گولیوں کا شور اٹھتا۔ میں اور سارٹے آگے ہی بڑھتے گئے۔ ہم دونوں نے اچانک اُن کے سروں پر پہنچ پہنچ کے کوئی دس گیارہ آدمی ٹھکانے لگا دیے تھے۔ دوسری جانب گولیاں چلنے کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری طرح اور بھی لوگ انھیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے تک وقفے وقفے سے پہاڑوں میں گولیوں کے دھماکے ہوتے رہے پھر خاموشی چھا گئی۔ ہم ایک ہی سمت میں دُور تک [illegible] تھے مگر ہمارا دُور آنا بے کار ثابت ہوا۔ آگے کسی جگہ وہ ہمیں [illegible] سارٹے کو نظر نہیں آئے۔

ابھی ہم لَوٹنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وادی میں کسی [illegible] زور سے بولنے کی آواز گھومنے لگی۔ ہم نے سمجھنے کی کوشش [illegible] کوئی تنتی میں بول رہا تھا اور یہ سولم ہی کی آواز ہو سکتی تھی [illegible] پیچھے مُڑ کے دیکھا۔ سولم پیرو کے ساتھ ایک اُونچے ٹیلے پر کھڑا [illegible] ہاتھ منہ سے لگائے مخاطب تھا۔ سولم کے مخاطب جانگ [illegible] بچے کھچے لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ یقیناً وہ اُن سے کہہ رہا ہو گا [illegible] آ جائیں اور اپنے ہتھیار پھینک دیں مگر سولم کی آواز سننے [illegible] رہے ہوں گے گنتی کے چند آدمی۔ آدھے سے زیادہ وہ گولیوں [illegible] پہلی دوسری باڑھ ہی میں تمام ہو چکے تھے۔ ابتدا میں آنا فانا [illegible] کچھ نہ ہوتا تو شاید اُن کے ہتھیار اُن کے کسی کام آ جاتے۔

بجھل نے پہلی رات سو کے اور دوسری جاگ کے [illegible] گنوائی تھی۔ پہلی رات ہمارے سو جانے کے بعد حفظِ ماتقدم [illegible] پر انھیں جاگنا ہی تھا۔ دوسری رات ہم انھیں جگائے رکھنے [illegible] دانستہ جاگتے رہے۔ دو دن نیند کے بغیر پہاڑوں پر مسلسل سفر اُن [illegible] جسم بوجھل کر دینے کے لیے بہت تھا اور ابھی آدھا سفر بھی [illegible] نہیں ہوا تھا۔ بقیہ آدھے کے خیال سے اُن پر ایک بوجھ سا طاری [illegible] اور ہماری جانب سے کسی وقت بھی کسی اقدام کا کھٹکا اُن کے [illegible] الگ ایک وحشت کا سبب ہو گا۔ صبح آگے بڑھتے ہوئے اُن [illegible] قدموں میں پہلے جیسی مستعدی نہیں رہی تھی۔ بجھل پرسوں یا کل کسی [illegible] بھی جینی اور ملیٹو کو اسی طرح آگے بھیج کے اور اُن کے درمیان [illegible] کرا کے انھیں اپنے قریب کر سکتا تھا۔ ہم سب کا جینی اور ملیٹو کو [illegible] بھی جھگڑے سے باز رکھنے کے لیے اُن کے پاس بھاگنا ایک فطری [illegible] عمل تھا۔ ہم سب جب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے تو اُن کا بھی ہر طرف [illegible] سے ہماری جانب بڑھنا لازم تھا لیکن اُن کے وہم گمان میں بھی نہ [illegible] کہ ہم بھی اپنے قریب اُن کے گھیرے کا انتظار کر رہے ہیں۔ پہلے [illegible] اُن پر گولیاں چلا دیں گے اور انھیں ہتھیار تولنے کے لیے بھی ایک [illegible] نہیں ملے گا۔ پرسوں نہیں تو کل ہم انھیں یوں اپنے نزدیک بلا سکتے تھے مگر اچھا یہی تھا کہ دو راتوں اور دو دنوں کی تھکن اُن پر غالب [illegible] جائے اور اس دوران انھیں کسی قدر یہ اطمینان بھی ہو جائے کہ کسی قسم کی مزاحمت کا امکان نہیں ہے۔ بجھل نے اپنے اس ارادے کے بارے میں پہلے سے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ جینی اور ملیٹو کو آگے بھیجنے کے بعد ہی اس نے ہم سب کو بتایا تھا کہ تیار رہیں۔ سب اپنی جگہ [illegible]

چمک رہے تھے۔ سبھی کے ذہن میں ایک شبہ تھا کہ جمل واپسی کے لیے
ایسے ہی آمادہ نہیں ہو گیا ہو گا اسی لیے سب اُس کے اشارے کے
منتظر تھے۔ جینی اور بلٹو نے آپس میں اُلجھنے میں نہ دیر کی تھی نہ جلدی۔
اُن کے کسی طور سے یہ ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو فضول
میں مار رہے ہیں۔ ایک لمحے کو جمل کے کہنے کے باوجود مجھے کچھ ایسا
لگا تھا کہ وہ حقیقتاً آپس میں بھڑ گئے ہیں۔ بلٹو نے جینی کو کمر سے پکڑ
کے زور سے زمین پر پٹخ دیا تھا اور چاقو تان کے اُسے مارنا ہی چاہتا
تھا کہ جمل نے لپک کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وادی میں سطح زمین زیادہ
لمبی چوڑی نہیں تھی۔ آگے ایک اونچا پہاڑی سلسلہ تھا جانگ قبیلے
کے آدمیوں کے لیے فرار کے راستے مسدود تھے۔ اندھیرا ہونے میں
خاصا وقت پڑا تھا۔ آگے ایسا کوئی موقع ملتا یا نہ ملتا۔

آمنے سامنے ہر جانب لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے اس
سے پہلے کبھی ایک ساتھ اتنے آدمی مرے ہوئے نہیں دیکھے تھے زمین
بہت سی جگہوں پر لال ہو گئی تھی۔ جابجا خون کے لوتھڑے اور چکتے
پڑے ہوئے تھے۔ ہم انھیں پھلانگتے ہوئے اُس مقام تک جا پہنچے
جہاں سے چلے تھے۔ میری سانس اکھڑ رہی تھی اور دل دھڑ دھڑا رہا
تھا۔ پتہ نہیں سارٹے کا کیا حال تھا لیکن اُس کی آنکھیں بھی پھٹی
ہوئی تھیں۔ سُولم اور پیرو کو ہم نے تودے پر کھڑے ہوئے دیکھ لیا
تھا۔ آگے بڑھنے پر جب جامو، بلٹو، ہلاکو، مارتی اور جمل کے چہرے
نظر آئے تو ہمارے حواس کسی قدر بجا ہوئے۔ ابا جان اُن میں نہیں تھے،
نہ تشام تھی۔ مغرور جمل نے جینی اور بلٹو کو اشارہ کرتے ہوئے انھیں
بھی کچھ اور پیچھے ہو جانے اور اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی تلقین کی ہو
گی اور وہ یہیں کہیں کسی آڑ میں چھپے ہوں گے۔ ایک طرف جامو
بندوق تانے جانگ قبیلے کے پانچ آدمیوں کو روکے کھڑا تھا۔ مارتی
پشت سے اُن کے ہاتھ رسیوں سے باندھ رہا تھا۔ جامو کے ماتھے
پر خون بہہ رہا تھا۔ تیر اُس کی آنکھ اور گال سے گزرتا ہوا گردن تک چلا
گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کے اُس کے ہونٹ بڑبڑانے لگے اور وہ چیخ کے
بولا۔ "لاڈلے! سلطانے کو دیکھو۔"

سلطان کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جامو سے کچھ دُور جمل،
جینی، زورا، ہلاکو اور بلٹو کسی پر جھکے ہوئے تھے۔ یقیناً کوئی بہت
زیادہ زخمی ہو گیا تھا۔ میں اُن کی طرف نہیں گیا اور اِدھر اُدھر پڑی ہوئی
لاشوں میں سلطان کو تلاش کرتا رہا۔ سارٹے دوسری جانب نکل گیا
تھا۔ سُولم اور پیرو بھی تودے سے اُتر کے میرے آس پاس منڈلا رہے
تھے۔ جانگ قبیلے کے آدمی اپنے مخصوص لباس کی وجہ سے علیحدہ
پہچانے جا سکتے تھے، سو اُن کے اوندھے جسم سیدھے کرنے کی ضرورت
نہیں تھی۔ سلطان اپنے چوڑے چکلے جسم اور کپڑوں کے سبب
سے نظر آ جاتا۔ میں اُسی کو ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک بڑے پتھر
کسی کی کراہ میرے کانوں میں پڑی۔ وہ سلطان ہی تھا اور
اُٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی پنڈلی میں تیر لگا
گوشت پھاڑتا ہوا گزر گیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول
سلطان بے حال تھا۔ آواز بھی حلق سے نہیں نکل رہی تھی
میں نہیں آیا کہ کیا کروں مگر اسی اثنا میں اُسے ڈھونڈتا
اس طرف آ نکلا اور سلطان کا زخم ایک نظر دیکھتے ہی اُسے
کندھے پر ڈال کے جمل کی سمت بھاگنے لگا۔ اُس نے مجھ
کی کہ میں مرہم پٹی اور دواؤں کا صندوقچہ لے کے اُس کے
پہنچوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ سامان میں یہ صندوقچہ کدھر رکھا
اتنا مجھے یاد تھا کہ جمل کلکتے ہی سے اُسے اپنے ساتھ لے کے
اور جانگ قبیلے سے چلتے وقت بھی سامان میں رکھنا نہیں بھولا
لیکن سارا سامان راستے میں اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ سارٹے
پیرو کو سلطان کا جسم کندھے پر لادے جمل کی طرف بھاگتے ہوئے
لیا تھا۔ وہ بھی اُدھر جا رہا تھا مگر میں نے اُسے روک لیا اور
کے بارے میں پوچھا۔ مجھے کچھ بتانے کے بجائے وہ خود سامان
چلا گیا۔ جتنی دیر میں سارٹے واپس آتا میں اُس طرف لپکا جہاں
ہلاکو، جینی اور بلٹو تھے۔ وہاں وزیر بے سدھ پڑا تھا اور وہ سب
ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وزیر کا ایک شانہ خون
نہایا ہوا تھا اور اُس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جس وقت
میں اُن کے پاس پہنچا، جمل وزیر کو آہستہ آہستہ پکار رہا تھا۔ وزیر
آنکھیں نہیں کھولیں۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے سانس بھی بند کر لی اور
کے ہاتھ میں دبا ہوا تمنچہ چھوٹ پڑا۔ سب ایک دوسرے کو ویران
آنکھوں سے دیکھا کیے۔ جمل نے جلد ہی وزیر کے منہ پر کپڑا ڈال دیا
سب اُس کے پاس سے اُٹھ گئے تھے۔ سارٹے کو سامان میں صندوقچہ
نہیں ملا تھا۔ وہ تو اِدھر پڑا تھا جیسے ہی اُس نے لوٹ کے سلطان
بارے میں جمل کو بتایا، سب جمل کی طرف دوڑ پڑے۔ مجھ سے چلا
نہیں گیا۔ میں وزیر کا سر اپنی گود میں بھینچے وہیں بیٹھا رہا۔

وزیر کی قبر ایک اونچی جگہ کھودی گئی۔ بڑے مندر کے
تہہ خانے میں پتھریلی دیواریں کھودنے کی ہمیں مہارت ہو ہی گئی تھی
مٹی کی قبر کھودنے میں کیا دیر لگتی۔ چاروں طرف سناٹا ہو جانے
کے بعد ابا جان اور تشام بھی کسی چھپی ہوئی جگہ سے باہر نکل آئے
تھے۔ ابا جان اور پیرو نے مل کے وزیر کو جھیل پر نہلایا اور ابا جان
ہی نے بھکشوؤں کے لباس میں اُس کی نماز ادا کی۔ پس سب مثر

ے گھوڑے رہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر مٹی میاں
وزیر کو بھی منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا اور ہم اسے ویرانے
میں تنہا چھوڑ کے آگے بڑھ گئے۔

سلطان کی پنڈلی کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی مگر اس کی حالت
اچھی نہیں تھی۔ زودرا، جاموا اور جھل بھی زخمی ہوئے تھے۔ ہلاکو
کو کسی نے پتھر کھینچ مارا تھا۔ جھل کا پیر بھاگتے ہوئے
مڑ گیا تھا اور اسے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ زودرا
کی پسلیوں سے نیزہ اچھلتا ہوا گزر گیا تھا۔ قسمت تھی جو بچ گیا۔
سلطان کے مقابلے میں سب کے زخم معمولی تھے۔ ہمارے تینوں
قیدیوں میں سے ایک ہی زندہ بچا تھا۔ باقی دو نے موقع دیکھ کے قبیلے
کے لوگوں کے ساتھ بھاگنے کی غلطی کی اور نشانے پر آ گئے۔ قبیلے کے
زندہ رہ جانے والے پانچوں آدمیوں کے ہاتھ جھل نے کھلوا دیے
تھے اور انہیں اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ بہت سے یاک مر گئے تھے
ہمارے اور ان کے یاکوں کو ملا کے کل گیارہ یاک تھے۔ اتنوں کی ضرورت
نہیں تھی لیکن زندہ یاکوں کو بے آسرا چھوڑ دینے سے بہتر تھا کہ انھیں
ساتھ لے کے ہی چلیں۔ چھول داریاں، کھانے پینے کا سامان،
کدالیں اور سفر کے لیے دیگر ضروری اشیا کا ایک بڑا ذخیرہ ہمیں
قبیلے کے لوگوں کے اسباب میں ملا تھا۔ ہم نے وہ سب کا سب
اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ ضرورت کے مطابق ہی اس میں سے کچھ
رکھ کے باقی وہیں چھوڑ دیا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی دیر تھی کہ ہم
وادی سے چل پڑے اور اندھیرا تیز ہونے کے بعد بھی چلتے رہے۔
مشعلوں کی اب ہمارے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ آگے بشیر نجانی
تھی۔ مارٹی اور زودرا بیٹریاں اور مشعلیں روشن کر کے راستہ دکھاتے
رہے۔ جب سردی بہت بڑھ گئی اور بادل چھانے کی وجہ سے اندھیرا
گہرا ہو گیا تو ہمیں ٹھہر جانا پڑا۔ لکڑیاں رسی سے باندھ کے سلطان
کے لیے ایک چارپائی نما جھلنگا سا اسٹریچر بنا دیا گیا تھا جس کے آگے
پیچھے نکلے ہوئے کنارے قبیلے کے آدمی اٹھائے ہوئے تھے۔
کبھی ہم بھی اسے کندھا دیتے تھے۔ تشام اسی کے سرہانے
کے ساتھ بندھی ہوئی چل رہی تھی۔ سہ پہر سے اب تک سلطان
کو ہوش نہیں آیا تھا۔ تشام کے منہ کو چپ لگ گئی تھی۔ ابا جان
کا بھی یہی حال تھا۔ وادی سے چلنے کے بعد وہ بھی سلطان کے
اسٹریچر کے ساتھ ساتھ ہی تھے۔

پڑاؤ کی جگہ رکتے ہی ہم نے سلطان کے لیے ایک علیحدہ خیمہ
لگا دیا۔ تشام اور ابا جان کو اس کی دیکھ بھال کے لیے وہیں بیٹھنے
دیا۔ کسی کو نیند نہیں آ رہی تھی اور کوئی کسی سے نہیں بول رہا تھا۔
رات کو کئی بار ہم لوگ سلطان کو دیکھنے گئے۔ تشام رات بھر اس کے
بالیں بیٹھی رہی تھی۔ قبیلے کے آدمیوں کو بھی ہم نے ایک الگ خیمے
میں بند کر دیا تھا۔ باری باری ایک ایک گھنٹے کے لیے سب پہرا
دیتے رہے مگر کسی نے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ صبح ہوتے
ہی ہم نے خیمے اکھاڑ لیے اور سامان سمیٹ کے یاکوں پر لاد دیا۔ دوپہر
کو سلطان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں
مگر چند لمحے ادھر ادھر دیکھ کے وہ پھر غافل ہو گیا۔ اسے تیز
بخار چڑھ گیا تھا۔ قبیلے کے لوگوں نے اس کے لیے کئی بوٹیاں تجویز
کیں۔ جاموا نے انہیں سلطان کو کھلانے سے پہلے خود قبیلے کے
آدمیوں پر ان کا تجربہ کیا کہ کہیں وہ کوئی دھوکا نہ کر رہے ہوں۔ درمیان
میں پڑنے والا رسیوں کا پل ہم نے سویرے ہی عبور کر لیا تھا۔ دوسرے
دن رات تک ہم نے ایک بڑا فاصلہ طے کر لیا تھا اور ایسی سرسبز و
شاداب وسیع و عریض وادی میں آ گئے تھے جہاں سے ہمیں
گزرنا پڑا تھا۔ چلتے چلتے جھل کا پیر بھی سوجنے لگا تھا۔ رات کو زودرا
اور مارٹی نے یاک کے مکھن میں نمک ملا کے مالش بھی کی مگر صبح
اس کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ تاہم وہ چلتا رہا۔ دوپہر کے کھانے

بیوٹی پارلر

دُردانہ پرویز شمسی کی تلاش

روم جلتا رہا اور نیرو بانسری بجاتا رہا۔ روم کے اس ظالم بادشاہ کی بیوی کا نام پوپیا تھا۔ پوپیا روم کی ملکہ بننے سے پہلے تین شادیاں کر چکی تھی اور عمر میں بھی نیرو سے بڑی تھی لیکن اُس کے حسن و شباب میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ملکہ پوپیا ہر روز پانچ سو گدھیوں کے دودھ سے غسل کرتی تھی۔ اس کے حسن و شباب کا یہی راز تھا۔

کے لیے ہم ایک جگہ آدھ پون گھنٹے کے لیے ٹھیرے تھے۔ تیسرے دن اندھیرا ہونے تک ہم نے اپنے راستے میں پڑنے والے پہاڑوں کی اور کئی دیواریں عبور کر لی تھیں لیکن چوتھے دن صبح رات بھر کے پڑاؤ کے بعد صرف ایک میل کے قریب آگے آئے ہوں گے کہ آسمان پر یکایک کالے بادل گھر آئے اور ہم خیمے نصب کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سلطان بھی بھیگ گیا۔ ہر چند ہم نے اُس کے اسٹریچر پر فوراً جھول واری ڈال دی تھی۔ خیموں کی میخیں ٹھونکتے ٹھونکتے ہم بھی شرابور ہو گئے تھے۔ بارش جس تیزی سے آئی تھی، اُسی تیزی سے گزر گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہو گیا اور تازہ دھوپ چمکنے لگی لیکن تجمل نے پھر آگے بڑھنے سے سب کو روک دیا تھا۔ سلطان کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ اسٹریچر کے جھٹکوں اور بارش نے اُس کے رہے سہے اوسان بھی چھین لیے تھے۔ سب اُسے مختلف قسم کی دوائیاں دیتے رہے اور اُس کے گرد ہی بیٹھے رہے۔ سلطان کسی طرح قابو میں نہیں آیا۔ جتنا اُس کا دھیان کرتے، وہ اتنا ہی اور بکھر جاتا۔ پھر اُسی دن شام کو اُس نے نہ جانے کیسے آنکھیں کھول دیں، وحشت ناک پلکوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تشانم اُس کی نظروں کے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس پر نظر پڑی تو مسکرایا۔ پھیکی پھیکی مسکراہٹ۔

”کیا ہے سلطانے؟“ تجمل نے بے چینی سے پوچھا۔

”اُستاد!“ بمشکل وہ ڈوبتی اور لرزتی آواز میں بولا۔ ”اِس کا دھیان رکھنا۔ اب تمھی اس کا.... “

”کیا بولتا ہے رے؟“ تجمل مضطربانہ اُس کا گال تھپتھپانے لگا۔

”اپنے پاس وقت نہیں ہے۔“ سلطان کی آواز پر غشی طاری تھا۔

”نہیں رے!“ تجمل نے تندی سے کہا۔

معلوم نہیں، تجمل کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچی بھی یا نہیں۔ وہ تشانم کو دیکھ رہا تھا اور اُس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں نمودار ہوئیں اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ تشانم پر آنکھیں جمائے لیٹا رہا۔ دیر تک اُس کی آنکھیں نہیں جھپکیں۔ تجمل نے پھر ہاتھ بڑھا کے انھیں خود ہی بند کر دیا۔

تشانم کے سینے سے نہ کوئی آہ بلند ہوئی نہ اُس کے آنسو نکلے۔ وہ بُت کی طرح ٹھٹکی بیٹھی رہی۔ سلطان کو جب قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو بھی وہ کچھ نہیں بولی۔ اس دوران تجمل، پیرو، جامو اور آبا جانی اُسے تھامے رہے، بازوؤں سے پکڑے، گردن میں ہاتھ ڈالے۔ اُس کی آنکھوں میں جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ سبھی اپنے اپنے طور پر اُس سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ مارتی، پلاکو، زودا، پلٹو، سولم، جینی سارے اور میں نے بھی اُس سے بہت کچھ کہا لیکن اُس نے جیسے کسی کی بات ہی نہیں سُنی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا لیکن ہم نے اُس کے خیال سے جلدی کی کہ وہ سلطان سے جتنی جلد اور جتنی دور ہو جائے اچھا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کون رہتا ہے۔ مرنے کا مطلب ایک مستقل دوری ہے۔ سارے رشتے زندگی کے ہیں۔ رات کو ہم نے خاصا آگے جا کے پاکوں سے سامان اُتارا۔ اُس رات کسی نے کھایا پیا نہیں۔ جانگ قبیلے کے آدمیوں کو گوشت کے پارچے، مکھن اور بُھنا ہوا اناج دے دیا گیا، وہی اُنھوں نے کھا لیا۔

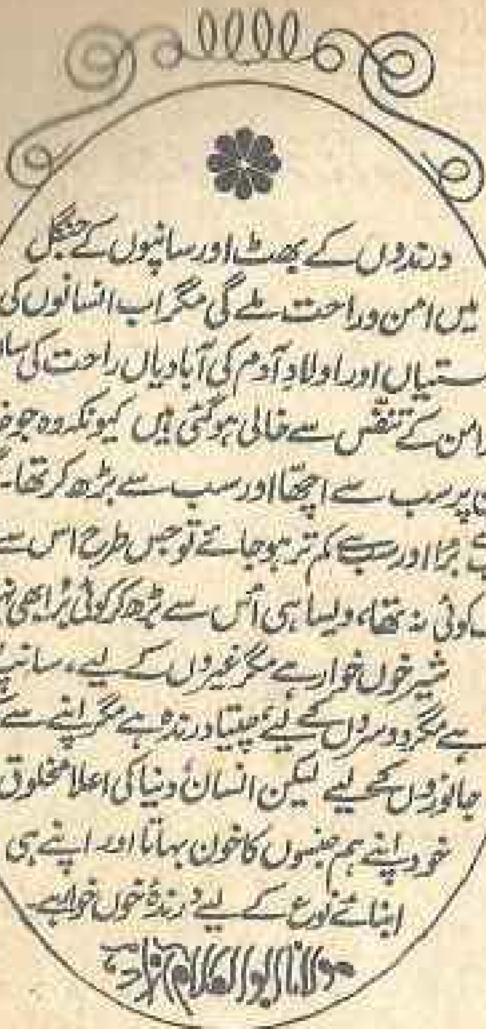
ہم سب ایک ہی خیمے میں تھے۔ تشانم رات بھر ایک کونے میں ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ تجمل اُس کے ماتھے، ہاتھوں اور گالوں کو پیار کرتا تھا، اُسے جھنجھوڑتا تھا مگر تشانم کا بدن سُن پڑا تھا۔ رنگ بالکل سفید ہو گیا تھا۔ جیسے رفتہ رفتہ کوئی اُس کا خون چوس رہا ہو۔ ساری رات کوئی بھی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ نہ تجمل، نہ آبا جانی، نہ پیرو۔ پیرو نے اُس کی دل جوئی کی سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ عمر میں تشانم اُس کی بیٹی گیتا کے برابر ہی ہو گی اور پیرو ہی کی کوشش سے تشانم کی آنکھیں بھیگیں۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے پیرو نے اُسے اُٹھا کے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا اور اُس کا بدن گدگدانے لگا تھا۔ تشانم کی آنکھوں سے آبشار سا بہہ نکلا۔ ایسے بلک بلک کے روئی کہ میں نے کبھی کسی کو ایسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ جیسے ہم سبھی کو رونا یاد آ گیا تھا۔

ہم شہر زاپول سے بھی آگے بڑھ آئے۔ زاپول کی بستی میں داخل ہونے کے بجائے ہم دور ہی دور سے راستہ کاٹ کے نکل گئے۔ راستے میں اور بھی کئی بستیاں پڑیں مگر جیسے ہی دور سے اُن کے نشانات نظر آتے، ہم راستہ بدل دیتے تھے۔ چاہے کتنا ہی چکر کاٹنا پڑتا۔ ندی، نالے، دریا، پُل، ستواں پگ ڈنڈیاں، گھاٹیاں۔ سلطان کو دفن کرنے کے چار دن بعد تک ہم روز رات کو چند گھنٹوں کے لیے ٹھیرے، مسلسل چلتے رہے۔ جامو کا زخم سوکھ گیا تھا لیکن تجمل کے پیر کی سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم اصرار کر کے اُسے یاک پر بٹھا دیتے اور دن میں دو بار اُس کے پیر پر لیپ کرتے۔ اسی

سے سفر میں کچھ رکاوٹ نہیں پڑی۔ سردی کی شدت بھی کم ہو گئی تھی اور آگے راستے اتنے پیچیدہ نہیں تھے۔ ساری پیچیدگی ہمارے عام راستوں سے ہٹ جانے کے سبب سے تھی۔ کئی دن تک تشانم ہمارے ساتھ رہی۔ کھوئی کھوئی سی ساتھ چلتی رہی۔ جب کہتے' اٹھ جاتی، جب کہتے' بیٹھ جاتی۔ جب نظر پڑتی' اس کی آنکھیں چھلکتی ہوئی دکھائی دیتیں سو ہر کوئی اس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنے سے پہلو تہی کرتا تھا۔ سولم تبتی سے خوب واقف تھا اور تشانم کو چونکہ ہندوستانی ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی اس لیے شبیر اس کے قریب رہتا تھا، سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا۔ ابا جان بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور یوں بھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اسے کچھ قرار آ گیا ہے۔ قرار اسے ضرور آ گیا تھا لیکن پانچویں دن سہ پہر کے وقت ہم نے دو بلند پہاڑوں کے درمیان رسیوں کا پل عبور کیا ہی تھا اور پل سے چند قدم آگے آئے تھے کہ تشانم کو اچانک نہ جانے کیا ہوا، وہ واپس دیوانہ وار پل کی طرف بھاگی۔ مارٹی نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر پل تک چند ہی قدم کا فاصلہ تھا۔ تشانم ہزاروں فٹ نیچے گھاٹی میں بہتے ہوئے دریا میں کود گئی۔ مارٹی بھی گرتے گرتے بچا۔ جب تک ہم سب وہاں پہنچے، دریا کی تیز لہریں اسے بہا کے لے گئیں۔ سب نیچے جھانکتے رہ گئے۔ پیرو نے اپنا منہ کھسوٹ لیا اور ابا جان سینے میں سر چھپا کے بیٹھ گئے۔

کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ تشانم چلی گئی ہے۔ سب کی نظریں اس طرح بھٹک رہی تھیں کہ شاید ابھی وہ کسی جانب سے واپس آ جائے گی۔ ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ نیچے گھاٹی میں اترنا مشکل تھا ورنہ ہم اسے نیچے جا کے دیکھتے۔ نیچے جانے کا صرف ایک راستہ تھا کہ دریا میں چھلانگ لگا دی جائے۔ ہم اور آگے بڑھ گئے مگر سب کے پیروں کو جیسے زنگ سا لگ گیا تھا۔ گرتے پڑتے اندھیرا ہوتے ہم پھر ایک جگہ آ کے ٹھہر گئے۔

تشانم بھی اسی مٹی کی بنی ہوئی تھی جس کی کورا تھی۔ اس کی بہت سی باتیں کورا سے ملتی جلتی تھیں۔ اس کے لانبے بال، آنکھیں، پیشانی، اس کے مسکرانے اور شرمانے کا انداز۔ تشانم کو اگر کورا کی طرح کوئی آسرا ہوتا کہ سلطان واپس آ جائے گا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتی۔ ساری زندگی اس کا انتظار کرتی رہتی لیکن اس نے اپنی آنکھوں سے سلطان کو ہمیشہ کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے کورا جیسا کوئی آسرا نہیں رہا تھا۔ کورا کی طرح جھوٹ موٹ کا سہی۔ ہم نے تشانم سے کون سی بات کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جتنی بھی تسلیاں ممکن تھیں' دیتے رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ



انھوں نے روٹھی ہوئی تشانم کو منا لیا ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ تشانم ایسے کیسے بہل جائے گی۔ جاموں نے اسے اپنی بہن بنا لیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے اسے کسی بات کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ ابا جان اور پیرو اسے بیٹی بیٹی پکارتے تھے۔ اگر وہ سلطان کے بدلے سب سے کچھ نہ کچھ مانگتی تو جس کے پاس جو کچھ تھا' وہ اس کے حوالے کر دیتا مگر کیا اس طرح سلطان کی قیمت ادا ہو جاتی۔ قیمتیں تو انھی چیزوں کی ہوتی ہیں جنھیں لوگ بیچنے اور خریدنے کے لیے آمادہ ہوں۔ یہاں تو صرف خریدار تھے۔ دکھ کے بدلے سکھ کا سودا کرنے کے خریدار سب اپنی اپنی بولیاں لگا رہے تھے۔ بے شک تشانم کو سلطان کی قیمت مقرر کرنے کا اختیار تھا مگر وہ اس کی کیا قیمت لگاتی۔ ہر چیز کی قیمت نہیں ہوا کرتی۔

کورا سے بھی لوگ ایسا ہی کہتے تھے۔ زہرو نے مجھے بھی کچھ بتایا تھا۔ جیسلمیر میں رانا صاحب کی پیش کش' ارشد کا پیام اور نہ جانے اتنے عرصے میں کس کس نے کورا کے لیے مولوی صاحب کے آگے خزانے بچھائے ہوں گے اور صرف مولوی صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ کورا کو کھلونوں سے قائل کرنا کتنا مشکل ہے۔ لوگ کہتے ہیں' وقت کے ساتھ بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں' عادتیں چھوٹ جاتی ہیں' آدمی زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ کپڑا نہ ہو تو پتوں سے ستر پوشی کر لیتا ہے' کھانا نہ ہو تو گھاس پھوس کھا لیتا ہے۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی بدل مل جاتا ہے۔ آدمی کا بدل بھی مل جاتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو

دُنیا کب کی ختم ہو جاتی مگر سب کو نہیں ملتا۔ جن کا نصیب کالا ہو، انھیں نہیں ملتا۔ مولوی صاحب نے کورا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ اُسے پڑھایا لکھایا، اُس کے لیے اپنا گھر بار، اپنا وطن چھوڑ دیا۔ دربدر مارے مارے پھرتے رہے۔ انھوں نے کورا کو اپنی دانست میں ہزار تسلیاں دی ہوں گی مگر یہ اُن کی تسلیاں نہیں تھیں جو کورا کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ اُس کی اپنی تسلی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بھی تو کچھ کہتی ہوگی، اُس کا دل بھی اُس سے کچھ کہتا ہوگا۔ اُس کا دل کہتا ہوگا کہ میں اُسے کہاں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں۔ میری نظریں اسے اپنے بدن پر چبھتی محسوس ہوتی ہوں گی کیونکہ اُس کی نظریں بھی مجھے اپنے اردگرد محسوس ہوتی تھیں۔

مولوی صاحب نے اُسے جو کچھ بتایا ہو، امکان اِسی بات کا زیادہ ہے کہ انھوں نے اُسے میرے مر کھپ جانے کا یقین دلانا چاہا ہوگا۔ وہ میرا آسرا چھوڑ دے، اُن کے خیال میں کورا کو اِسی صورت میں صبر آسکتا ہے۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ کورا نے اُن کی بات کا بالکل یقین نہیں کیا ہے۔ وہ چپ ہے تو اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے دل میں اُمید کی ساری کونپلیں جل گئی ہیں۔ اُس نے مولوی صاحب سے حجت نہیں کی ہوگی کہ وہ نہیں مانتی۔ بس وہ چپ ہو گئی ہوگی۔ اتنے عرصے کورا کے ساتھ رہنے کے باوجود مولوی صاحب کو پتہ نہیں چلا تو اور کتنے عرصے نہیں چلے گا۔ آخر وہ تھک جائیں گے اور ایک دن انھیں احساس ہوگا کہ انھوں نے میری طرف سے بے خبری برت کے کتنا بُرا کیا ہے۔ میرے ذہن میں بار بار یہی بات آتی تھی ورنہ پھر کیا وجہ تھی کہ مولوی صاحب نے کبھی پلٹ کے میری خبر نہیں لی۔ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ میں مر تو نہیں گیا تھا اور مر گیا تھا تو انھیں کم از کم اس کی تصدیق ضرور کرنی چاہیے تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل ناطمئن ہوں گے۔ بجّل نے ایک بار اشارتہً مجھ سے کہا تھا، لاڈلے! کیا پتہ، مولوی صاحب ابھی تک اُن بھکشوؤں سے خوف زدہ ہوں جو کورا کی تلاش میں سارے ہندوستان میں منڈلاتے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کبھی اُن بھکشوؤں سے اُن کا کوئی واسطہ پڑا ہو اور انھیں شبہ ہو کہ مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے بعد کورا اتنی محفوظ نہیں رہے گی جتنی اُن کے پاس ہے۔ میں بجّل کی بات سُن کے خاموش ہو گیا تھا۔ بحث کرنے سے کیا حاصل تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کہنے سے بجّل کی مُراد مجھے سمجھانا ہی تھا۔ ایسا تھا تو بھی مولوی صاحب اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے میری تلاش ضرور کرتے۔ وہ مجھے تلاش کرنا ہی نہ چاہتے تھے۔ وہ کورا کو اپنے پاس سے جُدا کرنا ہی نہ چاہتے ہوں گے۔ انھیں خدشہ ہوگا کہ کورا پھر اُن سے چھن جائے گی اور یہ سب تو اُن کے اپنے اندر کی باتیں تھیں، کورا سے انھوں نے کیا کہا ہوگا۔ میرے نہ آنے کی کیا تاویل دی ہوگی۔ جو کچھ بھی دی ہوگی۔ یہ مولوی صاحب کی بھول تھی کہ انھوں نے جو کہا ہے، کورا نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ کورا اپنی "تاویل" قائم تھی۔ اپنے دل کی "تاویل" سے ۔۔۔ اور تشانم! وہ کس "تاویل" پر بھروسا کرتی۔ اُس کے سامنے کوئی پردہ نہیں پڑا تھا۔ وہ خود کو کیا باور کراتی!۔

❀ ابھی راستوں سے ہمیں ہندوستان میں داخل ہونا تھا جن سے ہم یہاں آئے تھے۔ سرحدی چوکیوں اور بستیوں سے گزر کے نہیں اور اب کے ہمیں زیادہ احتیاط کرنی تھی کہ ہمارے پاس دنیا کا بیش قیمت سامان تھا۔ زر و جواہر، لعل و یاقوت، ہزاروں سال پہلے کے برتنوں اور زیوروں سے بھرے ہوئے صندوق۔ آدھے سے زیادہ راستہ ہم نے کسی نہ کسی طرح طے کر لیا تھا۔ ہر دن ہمیں ہندوستان کی سرحد سے اور قریب کر دیتا تھا۔ کوئی بیسویں اکیسویں دن پہلی بار ایک بڑا قافلہ ہمیں ہندوستان کی سمت سے آتا نظر آیا۔ ہم آگے بڑھنے کے بجائے ٹھیر گئے اور قافلے کے کچھ قریب ہونے کا انتظار کرنے لگے مگر وہ سب بھکشو تھے جو اپنے مخصوص لباس کے باعث دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ ویسے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن ہمارے ہمراہ جانگ قبیلے کے چار آدمی اور ایک تبتی قلی تھا۔ ایک آدمی کو عم عدلی پر جاسو نے گولی مار دی تھی۔ قافلے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ شور مچا سکتے تھے۔ زورا، بلاکر اور سُولم نے انھیں اُس کے سامنے ہی نہیں ہونے دیا۔ وہ تینوں فوراً انھیں دُور لے گئے۔ ابا جان کی وجہ سے قافلے کے بھکشو کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ ابا جان اور اُن کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا۔ انھوں نے ہماری خیریت بھی پوچھی اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے سکون کی سانس لی۔ ہو سکتا تھا کہ آگے جا کے اُن سے کوئی ہمارے بارے میں استفسار کرتا لیکن ہماری گنتی کم تھی۔ ابا جان ہمارے ہمراہ تھے اور اس دوران ہمارے حلیے یکسر بدل گئے تھے۔ چہرے پر داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کے ہم نے بندوقیں پہلے ہی چھپا دی تھیں۔

اس سے پہلے بھی راستے میں اکا دکا چھوٹے موٹے قافلے ٹکرائے تھے مگر اُن کے سامنے وہ ایک لفظ نہیں بولے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ہماری بندوقیں اور تمنچے اُن کی کسی بھی آواز پر چلنے لگیں گے اور صرف وہی نہیں جائیں گے، قافلے کے لوگ بھی ختم

...گے۔ انھیں یہ بات پہلے بتا بھی دی گئی تھی۔ بھکشوؤں کا
...بڑا تھا اور ویسے بھی اُن پر صندوق اُٹھاتے ہوئے
...لازم تھا اسی لیے ہمیں اُنھیں ایک دوسرے کی نظروں
...کرنا پڑا کہ وہ اس موقع سے کوئی فائدہ اُٹھانے کی
...کریں۔

...مہینے کی مسلسل مسافت کے بعد ہم ہندوستانی سرحد
...نزدیک ہو گئے۔ قبیلے کے آدمی اور قلی ہمارے ساتھ تھے
...ہمیں مزید آگے لے جانا مناسب نہیں تھا مگر ہمیں اُن کی
ضرورت تھی۔ وہ وقت آ پہنچا تھا جب ہمیں اُن کے
...میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا تھا۔ جامو کی رائے تھی کہ اُنھیں
...جائے۔ ہلاکو، جینی، مارٹی اور سارٹے بھی اُس کے ہم نوا تھے۔
...میں نہیں بولا۔ پیرو نے منع کر دیا اور اُنھیں اپنے ساتھ
...مگر دوسرے دن جیسے ہی ایک گہری گھاٹی پر نظر پڑی
...ہمیں ٹھہر جانے کا حکم دیا۔ قبیلے کے آدمیوں اور قلیوں کو [illegible]
...کے یکے بعد دیگرے نیچے گھاٹی میں اُتار دیا گیا۔ کدالیں
...ایک خیمہ، مشکیزے اور سفر کا ضروری سامان بھی اُن کے ساتھ
...نیچے چھوڑ دیا گیا۔ ہزاروں فٹ گہری گھاٹی کی تہہ سے اُنھیں اوپر
...اور کسی قریبی بستی پہنچنے میں کئی دن لگتے اور اس دوران
...کے تبت کی سرحد پار کر چکے ہوتے۔ اُنھیں ایسے چھوڑ دینے
...کوئی بھی تیار نہ ہوتا، اگر ہمیں یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ ہمارے سامان
...بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ وہ صندوق میں بھری ہوئی چیزوں
...متعلق قطعاً لاعلم تھے۔ جس وقت بڑے مندر کے تہہ خانے
...کل کے راتوں رات ہم اس مقام پر پہنچے تھے جہاں سُولم ہمارا
انتظار کر رہا تھا تو ہم نے اپنی جیبوں اور تھیلیوں میں بھرا ہوا سامان
اُس کے ساتھ لائے ہوئے صندوقوں میں منتقل کرتے وقت اس
بات کی خاص احتیاط کی تھی کہ تینوں قلی اسے نہ دیکھ پائیں۔ اُنھیں
اس دوران دُور رکھا گیا تھا۔

اُونچے پہاڑوں کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا مگر سردی بہ
تدریج کمی ہو رہی تھی۔ دن میں ہم اپنے اوورکوٹ اُتار دیتے
تھے۔ سردی کا موسم بھی بدل گیا تھا۔ راستے میں باری باری سبھی
بیمار پڑے تھے۔ سب کے بدن کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی
تھی۔ منہ کھولتے ہوئے ہونٹ دکھتے تھے، رات کو لیٹتے تو رگیں تڑختی
لگتیں۔ ابا جان بہت کم کسی سے بولتے تھے، مجھ سے بھی نہیں۔
تقریباً سبھی کے منہ سلے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ اب کوئی رہبر
نہیں تھا۔ صرف ایک اندازہ تھا کہ ہم سرحد کے قریب ہو رہے
ہیں، سرحد اب آیا ہی چاہتی ہے۔ ایک [illegible]
بستیوں کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس وقت ہمیں [illegible]
کا شبہ ہوا۔ اب تک ہم بستیاں کاٹ کاٹ کے گزر رہے تھے
اب ہمیں خود اُن کی تلاش تھی۔ اُونچائی سے ہم چاروں طرف نظریں
دوڑاتے رہتے کہ کہیں انسانی زندگی کے نشانات دکھائی دے جائیں۔
کئی دن تک ہم اسی تگ و دو میں رہے۔ اس عرصے میں کسی بھی قافلے
سے ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا۔ یقیناً ہم کسی ویران جگہ آ گئے تھے
یہاں سبزہ بھی برائے نام تھا اور آگے دُور تک عموماً چٹیل پہاڑوں
کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن پر کہیں کہیں برف پڑی ہوئی تھی۔ اگر
سرحد اتنی ہی دُور تھی تو ہمیں قبیلے کے آدمیوں اور قلی کو گھاٹی
میں نہیں اُتارنا چاہیے تھا۔ شاید اُنھوں نے ہی ہمارا رُخ کسی دوسرے
راستے کی طرف موڑ دیا تھا لیکن سمت کی پہچان مشکل نہیں تھی۔ ابا
جان کے پاس قطب نما کی ایک چھوٹی ڈبیا تھی۔ سورج سے بھی
سمت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے اندازے کے
مطابق جنوب کی سمت سفر جاری رکھا اور زمین جیسے ہمارے
پیروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ ہر سُو پہاڑ ہی پہاڑ، میدانوں
کو دیکھے ہوئے مہینے گزر گئے تھے۔ سب کی رفتار تیز تھی۔ ہندوستان
کی سرحد نزدیک آنے کے خیال سے سبھی کے قدم اُٹھ رہے تھے
لیکن ایسا لگتا تھا یہ پہاڑ کبھی ختم نہیں ہوں گے، ساری زندگی ہم
اُنھی کے گرد گھومتے رہیں گے۔ سامنے جب کوئی اونچا پہاڑ دیوار
بنا کھڑا نظر آتا تو جی چاہتا، برمے سے اس میں سوراخ کر دیں۔ ایک
مختصر فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک پہاڑ کے کئی چکر کاٹنے پڑتے
تھے۔ تب کہیں وہ سامنے سے ہٹتا تھا مگر اس کے ہٹتے ہی دوسرا
سامنے آ جاتا تھا۔ تبت کی پہلی سرحدی چوکی کا نام ساما تھا اور
اُس کے پاس بہت سی چھوٹی بڑی بستیاں آباد تھیں۔ ساما یا
کسی دوسری بستی کی دُور دُور تک کوئی علامت موجود نہیں تھی۔
قبیلے کے لوگوں کو جدا ہوئے دس روز سے زیادہ ہو چکے
تھے۔ ہم چلتے رہے۔ چلتے ہی کی صورت میں کوئی بستی ملنے کا
امکان تھا اور آخر گیارھویں روز بلندی سے مشرقی نشیب میں
واقع ایک چھوٹی بستی ہم نے ڈھونڈ ہی لی۔ کسی سیاح کو دنیا کا
کوئی نیا خطہ دریافت کرنے کی اتنی خوشی اور حیرت نہیں ہوئی
ہوگی جتنی ہمیں گنتی کے چند مکانوں پر مشتمل وہ بستی دیکھ کر ہوئی۔
سب لوگ آگے جا کے رُک گئے اور سُولم اور پیرو تقریباً بھاگتے
ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ جب تک وہ نہیں لوٹے، ہم اُن
کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے اور جب وہ لوٹے تو اکیلے نہیں

تھے اُن کے ہمراہ یاکوں کے ساتھ چار آدمی بھی تھے۔ یقیناً وہ قلی ہی ہوسکتے تھے اور وہ قلی ہی تھے۔ انھی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم آسام کی طرف جانے کے بجائے جنوب مغرب میں بھوٹان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بھوٹان کا سارا علاقہ عبور کرکے ہی ہندوستان میں داخل ہوا جاسکتا تھا۔ وہ جگہیں اور وہاں کے لوگ ہمارے دیکھے بھالے نہیں تھے۔ بھوٹان زیادہ دُور نہیں رہ گیا تھا لیکن ہم نے قلیوں کو آسام کی سرحد کی جانب چلنے کو کہا۔ انھیں ایک بڑے معاوضے کی پیش کش کی گئی تھی اور کچھ رقم پیشگی بھی دے دی گئی تھی۔ ساتھ ہی اُن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ ساما کی سرحدی چوکی تک ہمارے ساتھ چلیں گے تو ہم اپنا بچا ہوا تجارتی سامان اور چند یاک بھی اُن کے حوالے کردیں گے۔ وہ آنا کانی کررہے تھے لیکن ابا جان کا اصرار کارگر ثابت ہوا۔ وہ مان گئے۔ آیندہ ایک ہفتے کی مسافت سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم کتنے مختلف راستے پر اپنی منزل سے کتنی دور چلے گئے تھے۔

ایک ہفتے بعد جب قلیوں نے ہمیں بتایا کہ ساما کی سرحدی چوکی اب ایک دن کے فاصلے پر رہ گئی ہے تو سب ایک دوسرے کو ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھنے لگے۔ گویا چند میل کے فاصلے پر ہندوستان تھا۔ دو یا تین دن کا سفر۔ سبھی کی بجھی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہم نے قلیوں سے کہہ دیا تھا کہ ساما آنے سے کچھ دُور پہلے ہی وہ ہمیں مطلع کردیں۔ اب تک ہم نے انھیں نہیں بتایا تھا کہ ہندوستان میں واپس ہونے کے لیے ہمارے پاس راہ داری کا باقاعدہ پروانہ نہیں ہے ورنہ وہ شروع ہی میں آئیں بائیں شائیں کرتے۔ ابا جان کا کچھ نہیں تھا۔ بھکشو پروانۂ راہ داری کی قید سے آزاد تھے۔ جیسا کہ ہمیں توقع تھی، بیرمن کے قلی منہ بنانے لگے اور اُنھوں نے پروانے کے بغیر ہمیں آگے لے جانے سے صاف انکار کردیا۔ یہاں تک آکے ہم اُن سے کوئی ضد بھی نہیں کرسکتے تھے۔ بستیاں قریب تھیں اور ہمارا کوئی بھی ناروا عمل ہمیں اُن کی نظروں میں مشکوک کرسکتا تھا۔ جاتے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پروانے کے بغیر قلی بڑی مشکل سے ہمیں تبت میں داخل کرانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ ہم نے انھیں ایک بڑی رقم کی پیش کش کی اور اپنے تمام کے تمام یاک اور ایک بندوق بھی اُن کے حوالے کردینے کا وعدہ کیا۔ پچھلے تجربے کے مطابق ہمیں اندازہ تھا کہ اُن کا انکار ہماری طرف سے محض رقم میں مزید اضافے کے لیے ہے۔ وہ انکار کرتے رہے اور جب اُنھیں یہ یقین ہوگیا کہ اب ہم اس

سے زیادہ نہیں بڑھیں گے تو وہ چپ ہوگئے۔

ہم ساما نہیں گئے بلکہ کچھ پیچھے لوٹ کے ایک [illegible] پہاڑوں پر چڑھنے لگے۔ ایک دن، دو دن، تین دن، پو[illegible] دن بعد ہمارے ڈگمگاتے قدم ہندوستان کی زمین چھو [illegible] ہم ہندوستان کی پہلی سرحدی چوکی وانگ کے اطراف [illegible] ہوئے اُس سے کچھ آگے ساتی نامی ایک قصبے کے گردو[illegible] میں آگئے تھے۔ ساتی سے ہم پہلے بھی گزر چکے تھے۔ یہاں شہرِ تبت کے لوگ رہتے تھے۔ بُجز وقتی تبتی، بُجز وقتی ہند[illegible] ہم ساتی کی بستی میں بھی نہیں گئے۔ قلیوں نے ہمیں وہاں [illegible] کے واپس جانا چاہا تھا۔ ہم نے انھیں کسی نہ کسی طرح اور [illegible] چلنے پر آمادہ کرلیا اور دو دن کی مزید مسافت کے بعد وہ ہمیں [illegible] من زانگ کے علاقے میں لے آئے۔ ہمیں یاد تھا کہ من زا[illegible] دوسری منزل قصبہ بوجی ما کا فاصلہ تقریباً آٹھ میل کے برابر ہے [illegible] ان آٹھ میلوں میں بڑے پاٹ کے دریا، گھاٹیاں، اونچی چو[illegible] کیڑے مکوڑے، جنگلات اور درندوں کی کثرت ہے۔ چین وتی [illegible] ہمیں جیپیں مل سکتی تھیں۔ قلی من زانگ سے آگے بڑھنے پر [illegible] تیار نہیں تھے لیکن اُن کے بعد بار برداری کے لیے خچروں او[illegible] قلیوں کی تلاش میں ہمیں مجبوراً قصبہ من زانگ میں داخل [illegible] پڑتا۔ خچروں اور یاکوں کے بغیر آٹھ میل کا یہ دشوار گزار راستہ [illegible] کرنا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ قلی ہماری کمزوری سے خوب واقف تھے۔ سامان تو ہم کسی طرح اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے [illegible] جھل کے لیے بیرکی سوجن کی وجہ سے زیادہ دور چلنا نقصان [illegible] ثابت ہوتا۔ وعدے کے مطابق ہمیں اپنے تمام یاک اُن کے رخصت ہونے پر اُن کے حوالے کردینے تھے۔ جامو کو اُن پر غص[illegible] آرہا تھا۔ بیرمن نے اُسے تھامے رکھا اور چھول داریاں کدالیں، خیمے [illegible] باقی بندوقیں، گرم کپڑے اور مزید نقدی کے معاوضے پر انھیں ہموار کرلیا۔ قلیوں کو بھی واپس جانے کی جلدی تھی۔ انھوں نے ہمیں ایک ہی دن میں من زانگ سے چین وتی پہنچا دیا۔ جس وقت ہم چین وتی کی سرزمین میں داخل ہوئے سورج چمک رہا تھا۔ کُنکُنی سی ہوا چل رہی تھی۔ اجنبی اجنبی سی ہوا۔ جسم چھپائے جاتے تھے۔ ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی اور بانس کے مکانات کے جھنڈ تھے مگر ہم اُن سے دُور ہی رہے۔

سب کے پیر جیسے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ مارٹی نے قلیوں کو اپنی گھڑی بھی دے دی۔ سرخی بے خد گم ہوگئی تھی۔ ہم نے جتنی چیزوں کا اُن سے وعدہ کیا تھا، اُس سے بڑھ کر جو کچھ ہمارے

پاس زائد تھا، سب اُن کے سپرد کر دیا۔ یوں بھی ہمیں اپنا سامان
کم کرنا تھا۔ قلیوں کے جانے کے بعد اور جپسیوں کی تلاش میں
نکلنے سے پہلے ہم نے اپنے حلیے ٹھیک کیے۔ سب نے شیو کیا،
ایک دوسرے کے بالوں کی لٹیں قینچی سے تراشیں اور نئے کپڑے
بدل لیے۔ ابا جان نے بھی اپنا بھکشوؤں کا لباس اتار دیا۔ اُن کے
پاس کوئی اور لباس نہیں تھا مگر کُرتا، پاجامہ اور صدری پہن کے
انھوں نے اُوپر سے بنڈی پہن لی۔ زرّیں نے یہ سارے کپڑے
اپنے ہاتھوں سے سیے تھے۔ سورج ڈوبتے وقت جپسیں ملنا ممکن
نہیں تھا اس لیے ہم نے سُولم اور جامو کو جلد سے جلد آگے روانہ
کر دیا اور خود اپنے سروں پر صندوقوں کا بوجھ اٹھائے چن وتی کی
بستی کی طرف بڑھنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح سبھی کے دل
دھڑک رہے ہوں گے۔ ابھی ہم بستی کے کنارے پر تھے کہ سُولم اور
جامو واپس ہوتے دکھائی دیے۔ اُن کے ساتھ خچر اور قلی تھے۔ کچھ
پوچھنا بیکار تھا۔ انھیں جپسیں نہیں مل سکی ہوں گی۔ ہم نے سامان
خچروں پر لاد دیا۔ چن وتی سے اگلا قصبہ نارا سات میل کی دوری
پر تھا مگر وہاں پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا۔ قلی اندھیرے کے باوجود
ہمیں بستی تک پہنچانے کے لیے تیار تھے لیکن پیرو نے انھیں [illegible]
دیا۔ اُسے بدھوں کا ایک مندر نظر آ گیا تھا۔ بستی میں جانے سے بہتر
تھا کہ رات ہم مندر کی عمارت میں گزار دیں۔ پھر قلی بھی ہمارے ساتھ
ٹھیر گئے۔ ابھی صبح پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی کہ جامو اور سُولم
کسی سے کچھ کہے بغیر پھر جپسیوں کی تلاش میں نکل گئے۔ واپس
آئے تو اُن کے ساتھ دو جپسیں تھیں۔ نارا سے قصبہ موچی ما، پھر سارما،
تھرونال پانگ، پھر دینگ انگمہ۔ تین دن بعد کہیں خچروں، کہیں
جپسیوں کے ذریعے شب و روز سفر کرتے ہوئے قصبہ دری ای میں
آ کے ہم نے دم لیا مگر بس دم لینے کی حد تک۔ ہمیں معلوم تھا کہ
دری ای میں ہندوستان کے پولی ٹیکل ایجنٹ، انٹیلی جنس افسر
اور ٹریڈ ایجنٹ کے دفاتر موجود ہیں اور پولیس اسٹیشن بھی۔ صندوقوں
میں بھرے ہوئے سامان کی وجہ سے ہمیں خود کو چھپائے رکھنا
پڑ رہا تھا۔ زیادہ احتیاط میں بھی اندیشے تھے، کوئی بھی شک کر سکتا
تھا۔ چن وتی سے جتنے قلی اور ڈرائیور ہمیں ملے، ہم نے انھیں یہی
بتایا کہ ہم انھی قصبوں کے اطراف تجارت کی غرض سے گھوم رہے
تھے۔ اب واپس اپنے گھروں کو جا رہے ہیں اور ہم دو قافلے ہیں
جو چن وتی میں اتفاق سے ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ ہم نے
اپنے چہروں، لباس اور انداز سے طویل سفر کے نشانات مٹا دینے
کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ بہر حال انھیں ہم پر شک نہیں ہوا۔ ہم

پڑے نہ ہمارے سامان پر اور جیسے جیسے ہم پہاڑی علاقوں س
علاقوں کی طرف بڑھتے گئے، ہمارے اندیشے بھی کم ہوتے گ
کسی قدر اطمینان سب کو اُسی وقت حاصل ہوا جب ہم
ریلوے اسٹیشن پر کلکتے جانے کے لیے ریل گاڑی میں قدم ر

ساری بندوقیں قلی لے گئے تھے، تمنچے، چاقو البتہ ہمار
جیبوں میں موجود تھے۔ چیکنگ پولیس والوں اور مسافروں کی
سے بچنے کے لیے ہم نے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لیے تھے
ہمارے کپڑے فرسٹ کلاس مسافروں جیسے نہیں تھے۔ کاش ہمیں
مقام پر اپنے صندوق سوٹ کیسوں سے بدلنے اور نئے کپڑ
کا وقت مل جاتا مگر کسی جگہ زیادہ دیر تک ٹھیرنا ہمارے لیے منا
ہی نہیں تھا۔ جلد سے جلد سرحد سے دُور، انسانوں کی بھیڑ میں گم
جانا ہی قرینِ مصلحت تھا اگر صندوق میں وہ سامان ن
جواب موجود تھا تو ہمیں قدم قدم پر یہ احتیاط کرنے
ضرورت نہیں تھی۔ ایک ڈبے میں بیٹھنے کے بجائے ہم
ٹولیوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ مجھل، ابا جان، میں، ہلاکو، مارٹی اور
ایک ڈبے میں، دوسرے میں پیرو، جامو، پلٹو، سُولم، زودا اور
لگ بھگ چھ مہینے ہو رہے تھے۔ چھ مہینے بعد ریل گاڑیاں، اسٹ
بجلی، قسم قسم کی اشیا، طرح طرح کے لوگ، بھاگتے چیختے چلاتے
ہوئے آدمی پھر ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ ہر طرف شور ہی شو
قصبہ دری ای میں بہت دنوں بعد ہم نے ہندوستانی طرز کا کھ
کھایا تو مرچوں سے منہ جل گیا۔ دودھ میں کھولتی ہوئی چائے
ذائقہ بھی سٹھا سٹھا سا تھا۔ سب کچھ بدلا بدلا، نیا نیا سا تھا جیسے
کسی نئی دنیا میں آ گئے ہوں یا ہم نے دوسرا جنم لیا ہو۔ مجھے اپنے
ہر طرف پتنگے سے اڑتے محسوس ہو رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا
جیسے میں سیدھا کورا کے پاس جا رہا ہوں۔ میری انگلیاں بے اختیار
گردن میں پڑی اُس کی دی ہوئی مالا کے دانے ٹٹولتی تھیں اور
لمحے مجھے گمان ہوتا تھا کہ میری مالا کھو گئی ہے۔ اُس کی کوئی ایک
ایسی چیز تو میرے پاس موجود تھی جسے میں چھو سکتا تھا۔ جب بھی
مالا کے دانوں سے میری انگلیاں مس ہوتیں، لگتا جیسے اُس کے
ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں اور وہ میرے سینے سے لگی ہے۔ مجھے
ٹوک رہی ہے، ٹہوکے مار رہی ہے، میں سو گیا ہوں تو مجھے جگا
رہی ہے۔ وہ میرے سامنے کھڑی ہے لیکن میں اُسے دیکھ نہیں سکتا
لیکن میں اُسے چھو سکتا ہوں۔ میں اندھا یہ خواب ہی دیکھتا رہتا تھا۔
ہر لمحہ ہمیں کلکتے سے قریب کر رہا تھا، میری طرح ہر کوئی لمحے گن رہا

گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر ٹھہرتی تو کبھی وہ دوسرے ڈبے میں پہنچتے آجاتے کبھی میں، مارتی، بلاکو، سارٹے اُن کے پاس چلے جاتے۔ سارٹے کو کلکتے پہنچنے کی سب سے زیادہ بے کلی تھی۔ کہتا تھا جب ہم اچانک اڈے پہنچیں گے تو کالتے اور کپتن کیسے حیران رہ جائیں گے۔ اتنے دن ہو گئے تھے، اُدھر اڈے پر سب نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کبھی لوٹ کے آئیں گے بھی یا نہیں۔ تجمل نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اُس کا ارادہ کس طرف جانے کا ہے مگر اُس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ واپس آنا نہ آنا اتفاق ہے، ایک حادثہ۔ انھیں معلوم تھا کہ اُس نے بارہ آدمی اُن لوگوں میں سے منتخب کیے تھے جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، جن کے پیر بندھے ہوئے نہ ہوں۔ تمنچوں اور بندوق کی مشقیں، جانے سے پہلے تجمل کا دن دن بھر اڈے سے باہر رہنا، انھیں یہ سب باتیں یاد آتی ہوں گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی ہوگی۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوں گے کہ ہماری کوئی خیر خبر ملی؟ ہمیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ کالتے کے نام زرّیں کے روز نہیں تو ہفتے میں ایک دو بار ضرور خط آتے ہوں گے۔ کالتے اُلٹے سیدھے جواب دیتا ہوگا۔ بمبئی سے جولین اور چمپا کے خط بھی اُس کے نام آتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ جولین، اُس کی ماں اور چمپا بیگم کو فیض آباد ہی لے آیا ہو۔ کہتا تھا کہ استاد ناراض ہوں گے مگر ایک بار جب جولین فیض آباد آ ہی جائے گی تو استاد اُسے بمبئی واپس نہیں بھیج دیں گے۔ اگر کالتے واقعی اُسے فیض آباد لے آیا ہے تو حویلی میں ہر وقت ایک ہنگامہ رہتا ہوگا۔ منیر علی، زہرہ، سلمیٰ، مجّو میاں، ارشد، خانم، نیساں، جہاں گیر۔ روز ڈاکیے کا انتظار ہوتا ہوگا۔ نیساں پانچوں وقت مصلّے پر بیٹھی دعائیں کرتی ہوگی، الٰہی! بابر بھائی کو سلامت رکھنا، انھیں کامیاب و کامران لوٹانا۔ اِس عرصے میں نیساں اور بڑی ہو گئی ہوگی۔ جہاں گیر نے بھی میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہوگا۔ نہ جانے کیا کیا بدل گیا ہوگا۔ منیر علی فیض آباد میں رہ سکے یا نہیں، واپس جیسلمیر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اگر رانا حتاب کے آدمیوں کو اُن کا کوئی پتہ مل گیا ہو! میرے دماغ میں سب کی شکلیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ سینہ کبھی بند ہونے لگتا، کبھی جیسے اس کے سارے دروازے کھل جاتے اور روشنی سی بھر جاتی۔

گاڑی تیز رفتاری سے بنگال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر جیسے کہیں گم تھے۔ تجمل کو نچلی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ اُس کے پاؤں میں تکلیف کچھ زیادہ ہی تھی۔ چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہوتا تھا مگر اُس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اُس کے پیر اپنے زانوؤں پر رکھ لیے تھے۔ میرے مقابل ابا جان کھڑکی کی طرف منہ کیے گھومتی ہوئی زمین دیکھ رہے تھے۔ سر ڈبے کی دیوار سے ٹکی، آنکھیں خالی خالی، پیشانی پر شکنیں، معلوم نہیں کہاں کھوئے ہوئے تھے۔ چھت میں کہیں توقع نہیں ملا تھا میرا خیال تھا گاڑی میں بیٹھ مجھے اپنے پاس بلا کے ضرور پوچھیں گے کہ تو اتنے دن کہاں رہا، یہ لوگ کون ہیں۔ ان لوگوں کے بارے میں انھوں نے کوئی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔ اتنے دن ساتھ رہنے کے بعد کوئی بات اُن سے ڈھکی چھپی نہیں رہی ہوگی مگر انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ سارے سفر کے دوران انھوں نے مجھ سے بہت کم بات کی تھی۔ ہاں مجھے دیکھتے ضرور رہے تھے۔ بارہا میرے دل میں آیا، اُن سے پوچھوں، وہ فریال، فرخ، فادیہ اور اکبر کو کس کے پاس چھوڑ کے آئے ہیں لیکن ڈر لگتا تھا، نہ جانے کون سا جواب سننے کو ملے، اُن کے پاس بتانے کو کچھ ہو نہ ہو۔ شاید تجمل نے اُن سے کچھ پوچھا ہو۔ وہ دونوں آپس میں کبھی کبھی چپکے چپکے باتیں کرتے رہتے تھے۔ ممکن ہے تجمل نے انھیں بتایا ہو کہ اُن کی خواہش کے مطابق میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ میں بہت پڑھوں لکھوں اور بڑا افسر بن جاؤں۔ شاید تجمل نے اُن سے نہیں کہا کہ میں نے قتل کے جرم میں سات سال جیل کی سزا کاٹی ہے، مجھے بہت اچھا چاقو چلانا آتا ہے۔ بلّم بھی، لاٹھی بھی، تمنچا چلاتے ہوئے تو انھوں نے خود ہی دیکھ لیا ہوگا۔

مجھے احساس ہوتا تھا، ممکن ہے وہ اپنی جھجک کی وجہ سے مجھی سے توقع کرتے ہوں کہ میں اُن سے فتی، فریال، فرخ، فادیہ اور اکبر کے بارے میں پوچھوں گا۔ ممکن ہے سوچتے ہوں کیسا بھائی ہے جسے اپنی بہنوں اور بھائی کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ بھائی اُن سے کیا کہتا، اگر اُس نے فتی کو بھوکی نظروں کے درمیان بیٹھا نہ دیکھا ہوتا تو کسی اور کے بارے میں پوچھتے ہوئے اُس کی ہمت یوں جواب نہ دے جاتی۔ غالباً ہم دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں خود ہی جواب نظر آتے رہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نے تجمل سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی کہ وہ کلکتے جا کے ٹھہر جائے گا یا سیدھا فیض آباد جانے کا ارادہ ہے جہاں جہاں گیر ہے۔ ابا جان اُسے دیکھنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ ایک مدت بعد وہ اُن کے سامنے آئے گا تو اُن کا کیا حال ہوگا اور جہاں گیر بھی کلکتے میں رہ جائے گا۔ ہو سکتا ہے تجمل نے اُن سے کہا ہو کہ دو چار دن کلکتے میں ٹھہر کے پھر فیض آباد چلیں

گے۔ بہرحال ابّاجان کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور اُن کے ذہن میں آگے کے بھی خاکے ہوں گے۔ وہ فیض آباد میں رہیں گے یا کہیں اور۔ اب اُن کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ ظاہر ہے اب وہ گیا تو نہیں جائیں گے اور زرّین انھیں کیوں جانے دے گی۔ حویلی میں جا کے ابّاجان سب سے زیادہ اُسی کو پسند کریں گے۔ وہ اُن کا اسی طرح خیال رکھے گی جس طرح بھجل کا۔ شاید وہ دوسروں کا خیال رکھنے ہی کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ فہمی کی بہت سی خصوصیات اُس میں موجود تھیں۔ ابّاجان نے فہمی کو کھو دیا مگر زرّین سے مل کے بڑی حد تک فہمی کا ازالہ ہو جائے گا مگر یہ سب میرے اپنے ذہن کے خیال تھے۔ میں ابّاجان کے دل میں چھپا نہیں بیٹھا تھا۔ نو سال میں انھوں نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ اب ان کی تعبیر کا وقت آیا تھا۔ اتنی بڑی دولت سے وہ کیا کیا خریدیں گے۔ محلات، جاگیریں، کوئی ریاست۔ ان پتھروں سے وہ اپنے خوابوں کی کیسی کیسی تعبیریں تراشیں گے۔ اُن کا شمار دُنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ہونا چاہیے۔ اب خزانہ اُن کے ساتھ تھا اور وہ خزانے کے ساتھ۔

بھجل آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ ساری رات گزر گئی۔ ابّاجان تھوڑی دیر کے لیے لیٹے پھر اُٹھ کے بیٹھ گئے وہ کھڑکی سے کبھی کبھی نظر اُٹھا کے میری طرف دیکھ لیتے۔ رات کو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بھی لیٹ جاؤں مگر مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں رات بھر بیٹھا رہا۔ صبح سویرے گاڑی نیو کوچ بہار سے ایک میل تک آئی ہوگی کہ اچانک رُک گئی۔ ہم نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ گاڑی دونوں طرف سے پولیس نے گھیر لی تھی۔ ابھی گاڑی ٹھیرے چند لمحے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ایک پولیس افسر دو سپاہیوں کے ساتھ ہمارے ڈبے میں داخل ہوا۔ پہلے اُس نے انگریزی میں دخل اندازی کی معافی چاہی لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ہی اُس نے ہماری صورتیں دیکھیں، صورتیں کیا لباس دیکھے تو ناک بھوں چڑھا کے بولا "تم لوگوں کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے؟" اُس نے انگریزی میں کہا۔ اُس کی نگاہیں ہمارے چہروں اور سامان پر مچل رہی تھیں۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ ہمارے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوگا۔

"بابو کیا گٹ پٹ کرتا ہے رے؟" بھجل نے بوجھل آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"ٹکٹ کو پوچھ رہے ہیں۔" میں نے ترشی سے جواب دیا۔ مجھے پولیس افسر کے لہجے پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس کی نظروں میں حقارت تھی۔ "ہمارے پاس ٹکٹ ہیں۔" میں نے آہستگی سے انگریزی میں کہا۔

مجھے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کے وہ چونکا ہوا اور [illegible] کے بولا: "دکھاؤ۔" اُس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا تھا۔

میں نے سوچا، کیوں دکھاتے ہیں مگر پہلے بات کر[illegible] کی تمیز سیکھو۔ میں چپ رہا۔ بھجل نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال [illegible] تھے: "دکھا دے بابو صاحب کو۔"

میرے ہاتھ سے ٹکٹ لینے کے باوجود اُس کا شک [illegible] نہیں ہوا۔ اُلٹ پلٹ کے کبھی ٹکٹ کو دیکھتا، کبھی ہمیں، کبھی سا[illegible] کو۔ "ٹھوک بجا کے دیکھ لو، جعلی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ لوگ کہاں سے آ رہے ہیں؟"

"ٹکٹ میں لکھا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہُوں۔" وہ سر ہلانے لگا اور کچھ توقف کے بعد متجسس آ[illegible] میں بولا: "آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا ٹکٹ کے ساتھ یہ سب بتانا بھی ضروری ہے؟"

"نہیں۔ اتنا بھی ٹھیک ہے۔" اُس کے لہجے میں نرمی آ گئی تھی، نرمی اُسی لمحے آ گئی تھی جب میں نے اُسے انگریزی میں جواب دیا تھا۔ بھجل نے مجھے اشارہ کر دیا تھا ورنہ میں اُس سے چند باتیں ضرور پوچھتا۔ بھجل کا خیال ہوگا کہ وہ پولیس افسر ہے۔ ہمارے سامان پر بھی شک ظاہر کر سکتا ہے، کسی وقت بھی کوئی حکم چلا سکتا ہے اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ساری گاڑی پولیس والوں نے گھیر رکھی ہے۔ ڈبے میں موجود اُس کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہیوں کی نظریں صندوقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر کو کوئی اشارہ کرتے، افسر نے مجھ سے وضاحت کی اور کہنے لگا کہ گاڑیوں کی یہ چیکنگ مسافروں کے فائدے کے لیے ہے۔ میں نے اپنے لفظ منہ ہی میں دبائے رکھے۔ وہ واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد گاڑی روانہ ہو گئی۔

میں نے مڑ کے دیکھا، ابّاجان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ ابّاجان بھی ڈبے میں بیٹھے ہیں اور وہ انگریزی بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود بولنے کے بجائے مجھے اُن کے پولیس افسر سے بات کرنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ پولیس افسر کسی نہ کسی طرح واپس چلا گیا تھا اور گاڑی بھی روانہ ہو گئی تھی لیکن جاتے وقت اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹکٹ سے ضرور مطمئن ہو گیا ہے، ہم سے نہیں۔ وہ اپنا اطمینان کرنے پھر واپس آ سکتا تھا یا گاڑی کے ساتھ چلنے والی پولیس کو چوکنا کر سکتا تھا کہ وہ ہم پر نگاہ رکھیں۔ مجھے اُس سے اتنی درشتی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مبادا وہ ناراض ہو جاتا پھر سب

ہو جاتا راستے بھر مجھے پچھتاوا ہوتا رہا۔ ہر چند میں نے کوئی
بات نہیں کہی تھی لیکن مارٹی کے بقول افسر تو افسر ہی ہوتا
تمام راستے مجھے بے چینی رہی۔ جہاں گاڑی رکتی، میں سب سے
پہلے باہر جھانک کے دیکھ لیتا کہ پولیس نے گاڑی کے گرد دوبارہ
گھیرا تو نہیں ڈال دیا ہے۔ مجھے خزانے کی فکر نہیں تھی۔ اُس کا
کیا کرنا تھا مگر جہاں تک ابا جان کہتے، ہمیں بہ حفاظت اُسے
وہاں تک پہنچا دینا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ گاڑی تیزی سے کلکتے
کی طرف ایک ہوتی گئی۔ پھر کوئی نہیں آیا۔ میں سوچ رہا تھا، اگر تجمل
نے ابا جان کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے تو میری رواں انگریزی
بولنے پر انھیں ضرور حیرت ہوئی ہوگی۔

ابھی کلکتہ آنے میں درمیان کے دو ایک اسٹیشن باقی تھے
کہ تجمل نے پیرو، زورا، مارٹی اور ابا جان کو ایک ڈبے میں کر دیا
اور خود دوسرے ڈبے میں چلا آیا۔ میں بھی اُس کے ساتھ آ گیا۔
اس نے وہ سب صندوق بھی اُسی ڈبے میں منتقل کر دیے تھے جس
میں ابا جان تھے اور اپنے ساتھ صرف وہ سامان رکھا تھا جس
میں خزانہ نہیں تھا۔ یہ احتیاط سب کی سمجھ میں آتی تھی اس لیے کسی
نے اعتراض نہیں کیا۔ تجمل چھ مہینے بعد کلکتے واپس جا رہا تھا۔ سامان
مختلف ہوتا تو بات اور تھی۔ ہمارے پیچھے کلکتے میں بہت کچھ بدلا
ہوا ہو سکتا تھا۔ پیرو، زورا اور مارٹی کا تعلق بمبئی کے اڈوں سے
تھا۔ انھیں کلکتے میں اڈے کے چند آدمیوں کے سوا کوئی نہیں جانتا
تھا۔ گاڑی سے اترتے وقت ہمارا ایک دوسرے سے جدا جدا
رہنا ہی بہتر تھا۔ اب کے اسٹیشن پر کوئی ہمیں لینے کے لیے آنے
والا نہیں تھا لیکن وہاں مختلف اڈوں کے چند آدمی ہمیشہ موجود
رہتے تھے۔ اسٹیشن تقریباً ہر وقت مسافروں سے بھرا ہوتا تھا۔ کسی
بھی اڈے کا آدمی ہمیں وہاں مل سکتا تھا۔

گاڑی گونجتی ہوئی ہاوڑا کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو
میری رگوں میں خون جھنے لگا۔ ہم پہلے اترے، بعد میں پیرو اور ابا جان
وغیرہ۔ تجمل لنگڑا کے چل رہا تھا۔ پلیٹ فارم سے گزر کے ایک دوسرے کے
پیچھے جب ہم گیٹ سے باہر آ گئے تھے اور ٹیکسیوں کی طرف بڑھنا
ہی چاہتے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی بھاگتا ہوا ہماری طرف
آیا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ بدرو تھا، بھیم پورہ کے اڈے کا
آدمی۔ آتے ہی اُس نے تجمل کے پیر پکڑ لیے اور ہانپتے ہوئے بولا۔

”استاد تم!“

”کیا ہے رے بدرو؟“ تجمل اُسے بدرو ہی کہتا تھا۔

”تم... تم کدھر تھے استاد!“ وہ حواس باختگی سے بولا۔

”ذرا دور چلے گئے تھے۔“

”دور چلے گئے تھے۔“ اُس کی آواز بھر بھرا رہی تھی۔ ادھر
کب آئے؟“

”ابھی اترے ہیں رے۔“ تجمل نے تنک کے کہا۔

”ابھی!“ وہ گھبرا کے بولا۔

”ہاں رے!“

”لوگ اِدھر نہ جانے کیا کیا بولتے تھے۔“

”اُن کو بولنے دے۔ کانتے کیسا ہے؟“

”کانتے! کانتے تو جیل میں ہے استاد!“

”جیل میں! کب سے ہے؟“

”مہینے سے! تم کو کچھ نہیں پتہ؟“ وہ سٹ پٹا کے بولا۔

تجمل نے اُس کے بال پکڑ لیے۔ ”کھل کے بول۔“

”قسم سے استاد! تم کو کچھ نہیں پتہ؟“ وہ گھگھیانے لگا۔

”منہ کھلا رکھ۔“ تجمل نے گرجتے ہوئے پوچھا۔

بدرو لڑکھڑا گیا۔ ”استاد! استاد! تم کو کچھ پتہ نہیں ہے تو ابھی
اِدھر سے لوٹ جاؤ۔“ وہ بدحواسی سے بولا۔ ”پولیس تم سب کو ڈھونڈ
رہی ہے۔ اِدھر سب الٹا ہو گیا ہے۔ کبن خاں کو مار کے رتنا حرامی
تمھارے اڈے پر بیٹھا ہے۔ شولی، لالہ، فجا، سب سب ایک دم۔“

تجمل بے اختیار اس کا منہ تھپڑانے لگا۔





آپ بیتی * جگ بیتی

صابر زمانی خان

ایک آدمی کی عبرت ناک سرگزشت

باقی آئندہ شمارے میں

ڈوبتے ہوئے وقت کو منانے

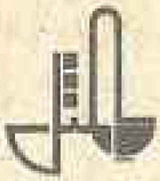
سمندر زیادہ

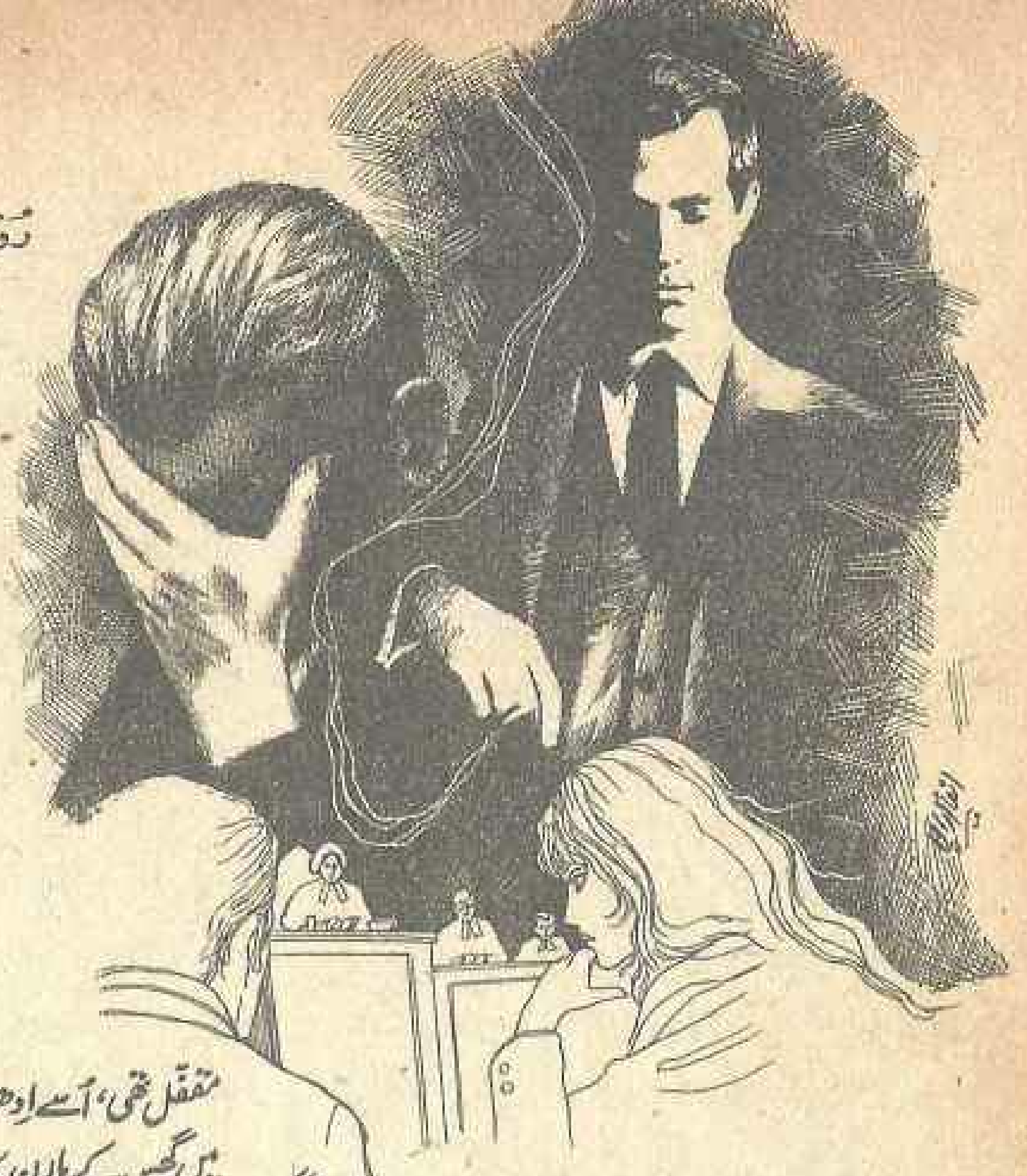
کم سُرخرو، بالانشیں

بالا امنقر

* ایلیس

* انور خواجہ





ایک سنگین مقدمے کی روداد

یہ کوئی باقاعدہ قتل نہیں تھا مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ نادانستگی میں ایک قتل کر بیٹھا تھا۔ وہ قاتل ہو گیا تھا۔ اس کی عمر ۲۹ سال تھی۔ وہ پتلے چہرے اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔ اُسے ایک معقول دفتر میں جونیئر اکاؤنٹنٹ کی جگہ ملی ہوئی تھی۔ گزشتہ چند دنوں سے اس کے افسر نے ایک مشکل جانچ پڑتال اس کے سپرد کر رکھی تھی اس لیے اُسے دفتر کے علاوہ رات کو گھر پر بھی کام کرنا پڑ رہا تھا۔

جس رات اس نے مقتول کو ہلاک کیا، وہ اپنے فلیٹ میں دفتر کا کام کر رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ رات گرم اور چپچپی تھی۔ گرمی اور چپچپاہٹ نے ہربرٹ کے حساس اعصاب تشنج میں مبتلا کر دیے تھے۔ پسینہ اس کی پیشانی سے ٹپک کر آنکھوں میں آ رہا تھا، آنکھیں دھندلائی جا رہی تھیں۔ ساڑھے نو بجے اس کی بیوی ایلین بستر پر لیٹ کر کچھ پڑھنے لگی۔ دس بجے ایک ٹی وی شو تھا۔ ایلین یہ شو بہت شوق سے دیکھتی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ ٹی وی کی آواز سے ہربرٹ پریشان ہوگا اس لیے اس نے شو نہیں دیکھا۔

مقتول کا نام جان تھا۔ اس کا تعلق ایک بیمہ کمپنی سے تھا۔ اس کی کار نیچے کھڑی تھی۔ پونے دس بجے وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے کسی اور نے ایک کار کھڑی کر دی تھی لہٰذا جان اپنی گاڑی نہیں نکال سکتا تھا۔ دوسری کار مقفل تھی، اسے ادھر اُدھر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جان نے اپنی گاڑی میں گھس کے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ ہارن بجانے کا مقصد یہ تھا کہ دوسری گاڑی والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جائے۔ رات کی خاموشی میں ہارن کا شور انتہائی ناگوار تھا۔ کانوں کے پردے پھاڑنے والا یہ ہارن تقریباً دس منٹ تک مسلسل بجتا رہا۔ ہربرٹ نے عدالت میں یہی بیان دیا تھا۔ ہربرٹ کے ایک پڑوسی مسٹر تھامسن نے کھڑکی سے سر نکال کے آواز لگائی۔ "یہ جہنمی آواز بند کرو۔"

جان نے ہارن بجانا موقوف کر دیا اور بلند آواز میں مسٹر تھامسن سے پوچھا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ میری گاڑی کے پیچھے والی کار کس کی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے، میں ساری رات یہیں گزار دوں گا؟"

جان نے پھر زور زور سے ہارن بجایا۔

ہربرٹ متفرق اخراجات کی لمبی رقمیں جمع کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ سے اس کی تمام توجہ اسی کام پر مرکوز تھی مگر ہارن نے اس کا سارا حساب گڑبڑ کر دیا۔

پڑوسی مسٹر تھامسن نے جان سے پوچھا۔ "مسٹر! کیا تم پورے محلے کو جگا دینا چاہتے ہو؟ میں صبح جلدی کام پر جاتا ہوں۔ مجھے نیند کی ضرورت ہے۔"

"یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔" جان نے نیچے سے جواب دیا۔ "میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے جلد سے جلد گھر پہنچنا ہے۔ اس سے پہلے کہ میری بیوی شور مچانے لگے۔" اس نے پھر زور سے ہارن بجانا

دیا۔ رات کے سناٹے میں ہارن کی تیز آواز کانوں کے پردے
پھاڑنے لگی۔

ہربرٹ نے کام چھوڑ کے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور زور سے
چلایا۔ "بند کرو یہ شور۔" جان نے اس بات کا جواب مسلسل ہارن سے دیا۔

کرسمس پر کمپنی نے ہربرٹ کو چینی کا ایک بڑا پیپر ویٹ
تحفے میں دیا تھا۔ اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر پیپر ویٹ اٹھا کر کار
کی طرف کھینچ مارا۔ پیپر ویٹ کار کے ادھ چڑھے شیشے پر لگا۔ شیشہ
ٹوٹ کر جان کی شہ رگ میں پیوست ہو گیا۔ شہ رگ کٹ گئی۔
ہارن کی آواز بند ہو گئی۔ ساتھ ہی جان کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔

پولیس نے اس امر سے اتفاق کیا کہ یہ محض ایک حادثہ
تھا۔ ہربرٹ کے وکیل نے اُسے اور اُس کی بیوی ایلین کو یقین دلایا
کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ صاف عارضی پاگل پن کا مقدمہ ہے۔
ملزم غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔"

لیکن استغاثے کے سرکاری وکیل نے عدالت میں اس
کے برعکس بیان دیا۔ "ملزم ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ ایک
ذمے دارانہ کام پر مامور ہے اور اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہے۔
اس نے اپنے غصے پر قابو کیوں نہیں پایا۔ اُس کے غصے کی وجہ
سے ایک انسانی جان ضائع ہو گئی۔ مانا کہ مقتول اُس وقت دوسروں
کے لیے عذاب بنا ہوا تھا لیکن وہ ہارن بجانے پر مجبور تھا اور
ہارن بجانا اتنا بڑا جرم نہیں۔ ہاں، ہارن بجانے پر قتل کر ڈالنا بہت
بڑا جرم ہے۔ میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ قاتل کو قرار
واقعی سزا دی جائے۔"

جج نے جیوری کے ارکان سے فیصلہ کرنے کے لیے کہا۔
جیوری کے ارکان دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ سہ پہر کا وقت
تھا۔ ہربرٹ کو جیل بھیج دیا گیا۔

سات بجے کے قریب ہربرٹ کے وکیل نے خوف زدہ
ایلین کو بتایا۔ "نہ جانے جیوری کے لوگ فیصلے میں اتنا وقت کیوں
لگا رہے ہیں حالانکہ ہمارا مقدمہ واضح اور صاف ہے۔ ویسے پریشانی
کی تو کوئی بات نہیں ہے مگر میں نے جیوری کے ارکان کے چہرے
دیکھے تھے۔ اُن کے چہروں کا تاثر مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا۔"

نو بجے کے قریب جیوری نے بتایا کہ وہ ابھی تک کوئی
فیصلہ نہیں کر سکے ہیں۔ اب وہ اپنے ہوٹل میں جا کر آرام کریں گے
اور آرام کے دوران مقدمے پر بحث بھی جاری رکھیں گے۔

ہربرٹ کا وکیل پریشان تھا۔ اس نے ایلین سے کہا۔ "اگر
جیوری کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو یہ بھی ہماری جیت ہو گی۔ مجھے
اُمید نہیں ہے کہ حکومت ہربرٹ پر دوبارہ مقدمہ چلائے گی۔ [illegible]
اب تم گھر جا کے تھوڑا سا آرام کر لو۔ صبح دس بجے ملاقات ہو گی۔"

دوسرے دن دس بج کر تیرہ منٹ پر عدالت کو بتایا گیا کہ
جیوری کے ارکان فیصلے پر پہنچ چکے ہیں۔ ملزم ہربرٹ کو عدالت
میں لایا گیا۔ ہربرٹ نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر وکیل سے پوچھا۔ "میری
بیوی کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں۔ وہ صبح سے نظر نہیں آئی۔"

"کہاں غائب ہو گئی؟ اُسے تو یہاں ہونا چاہیے تھا۔"

"خاموش ہو جاؤ۔ جیوری کے لوگ آ رہے ہیں۔" وکیل نے کہا۔

جیوری کے ارکان اندر آئے۔ سب کے چہرے بگڑے ہوئے
تھے۔ ہربرٹ کے افسر نے قریب آ کے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔
چند منٹ بعد جیوری کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ "ہم سب کا متفقہ فیصلہ
ہے کہ ملزم محض عارضی پاگل پن کی وجہ سے اس ہلاکت خیز اقدام
کا مرتکب ہوا ہے۔ اُسے مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

ہربرٹ کے وکیل نے مسرت سے اُس کا ہاتھ دبایا۔ ہربرٹ
کے افسر نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اُس کا کندھا تھپتھپایا۔
پڑوسی مسٹر تھامسن نے کہا کہ "انصاف ہوا ہے۔"

ہربرٹ نے کسی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ کسی کو تلاش
کر رہا۔ اُسے بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ ایلین اُس کی خوشی میں شریک
نہیں ہے۔ اُس نے سوچا کہ شاید وہ عدالت کے باہر اُس کا انتظار
کر رہی ہو۔ وہ تیزی سے باہر نکلا لیکن ایلین وہاں بھی نہیں تھی۔
ہربرٹ فوراً ٹیکسی کر کے گھر پہنچا۔ اُسے ڈر لگ رہا تھا کہ ایلین کو
کچھ ہو نہ گیا ہو۔

فلیٹ میں ایلین گہری نیند سو رہی تھی۔ ہربرٹ کا دل ٹوٹ
گیا۔ اُس نے غصے سے ایلین کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ "کیا تم بیمار ہو؟
تم عدالت میں کیوں نہیں آئیں؟ مجھے باعزت بری کر دیا گیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ایلین کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ "میں
شاید زیادہ سو گئی؟"

"کیا مطلب؟ مجھے اُمید تھی کہ تم عدالت کے باہر کار لے کر
میرا انتظار کر رہی ہو گی لیکن..."

"سنو ڈیئر! کار خراب ہے۔ اُس کی بیٹری ختم ہو چکی ہے۔ میں
ساری رات جیوری کے ہوٹل کے پیچھے ہارن بجاتی رہی ہوں۔"

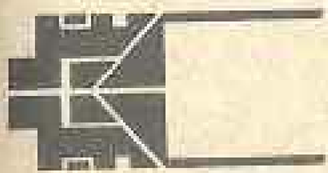


گسٹاپو کے ہیڈ کوارٹر میں طلبی کا ایک ہی مطلب ہوتا تھا
لیکن مصنف کا مقصود کچھ اور ہے

دوسری جنگ عظیم کی ایک کہانی

* ایڈورڈ اسٹیون سن

* فیاض الرحمان قادری



طویل قد کے ایک چیچک رو شخص والٹر نے ٹوڈگ کو اطلاع دی ”تم سے مسٹر ہوفنین فوراً ملنا چاہتے ہیں۔“ ٹوڈگ کا سرخ و سفید چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس کا موٹا تازہ جسم کرسی سے تقریباً آدھا اُٹھ چکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح بھاگ نکلے لیکن وہ جانتا تھا، بھاگنے سے بڑی حماقت کوئی نہیں ہو سکتی۔ گسٹاپو سے بچنا بہت مشکل تھا۔ وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اپنی کاروباری کامیابی پر اُسے پچھتاوا ہونے لگا۔ یہی کامیابی آج اُسے لے ڈوبی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا کلرک بیٹھا ہوا تھا۔ کلرک پر کپکپی طاری تھی۔ ٹوڈگ نے نرمی سے کہا ”فکر نہ کرو، مسٹر ہوفنین سے تم نہیں ملو گے، میں ملوں گا۔“

ٹوڈگ کے دماغ میں بدترین خدشات سر اُبھارنے لگے۔

کرٹ ہوفنین گسٹاپو کا ایک بہت اہم شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ہٹلر سے دوستی تھی۔ لوگ اُسے ہٹلر سے بھی زیادہ بارسوخ اور طاقت ور سمجھتے تھے۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جن کا نام سن کر لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ٹوڈگ، والٹر کے ساتھ اپنے دفتر سے نکلا۔ لوگ خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے، اس طرح جیسے وہ اُسے آخری دفعہ دیکھ رہے ہوں۔ گسٹاپو کے کسی آدمی کے پاس جا کر واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک بھوری کار ٹوڈگ اور والٹر کے انتظار میں باہر کھڑی تھی۔ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ بہار کا ایک خوب صورت دن تھا لیکن ٹوڈگ میں موسم سے لطف اندوز ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کا دماغ ماؤف تھا۔ وہ بے خیالی میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ کار ایک مضافاتی علاقے سے گزر

رہی تھی۔
کچھ دیر کی مسافت کے بعد وہ ایک بہت بڑے احاطے میں داخل ہوئے۔ درختوں کے جھنڈ سے ایک سفید پُرشکوہ عمارت جھانک رہی تھی۔ کار فرّاٹے بھرتی آگے بڑھی اور عمارت سے کچھ فاصلے پر رُک گئی۔ ایک بٹلر انھیں عمارت کے اندر لے گیا۔ والٹر نے بٹلر سے کہا: ”یہ مسٹر ٹووگ ہیں۔“
”ان کا انتظار کیا جا رہا ہے۔“ بٹلر نے بتایا۔
والٹر نچلی منزل پر رُک گیا۔ ٹووگ بٹلر کے ساتھ بالائی منزل کے ایک روشن کمرے میں پہنچا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک بڑے ڈیسک کے دوسری طرف کرٹ ہوفمین بیٹھا تھا۔ ”ٹووگ! بیٹھ جاؤ۔“ ہوفمین نے کہا۔
ٹووگ شکستہ دلی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہوفمین اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کے بال سیاہ اور بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں پہ دبیز شیشوں کا چشمہ تھا۔ چہرے سے سختی جھلک رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی خم دار مسکراہٹ ایسی تھی جیسے ہونٹ سُرخ دھاگے سے سی دیے گئے ہوں۔ ”تو تم ہو مسٹر ٹووگ۔ مشہور ایکسپورٹر؟“
”جی ہاں۔“
”تمھیں کھلونے بنانے میں مہارت حاصل ہے؟“
”جی ہاں جناب!“
”اور گڑیاں بنانے میں بھی؟“
”دوسرے کھلونوں کے علاوہ گڑیاں بنانے میں بھی۔“
”تمھارا گڑیوں کا کاروبار سب سے بہتر چل رہا ہے؟“
”بے شک جناب! میرا گڑیوں کا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے۔“ سچی بات اُس کے منہ سے نکل ہی گئی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا کہ یہ جوے کا کھیل بہت ہو چکا، اب اِس سے نکلنا چاہیے مگر اُس کی آواز حلق میں گھٹ کے رہ گئی۔
ہوفمین نے پوچھا: ”سُنا ہے، پیرس میں کوئی مسٹر روجیٹ ہیں، وہ تمھارے بہت اچھے خریدار ہیں؟“
ٹووگ نے سوچا، اِسے تو ہر بات معلوم ہے۔ وہ بہت مشکل سے بول سکا: ”میرے بہت سے گاہکوں کی طرح مسٹر روجیٹ بھی ایک گاہک ہیں۔“
”ہماری اطلاعات کے مطابق وہ تمھارا بہترین خریدار ہے۔“ ہوفمین نے ڈیسک کی دراز کھول کے ایک بڑی سی گڑیا نکالی: ”مجھے معلوم ہوا ہے، آج کل اِس ماڈل کی گڑیاں پیرس میں مقبول ہیں؟“
ٹووگ کو اپنی پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ محسوس ہوا: ”جی ہاں۔ میں نے اس ماڈل کی بہت سی گڑیاں بیچی ہیں۔“
ہوفمین نے گڑیا کا کپڑا پھاڑ ڈالا۔ اب گڑیا کے سپاٹ جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا: ”دیکھو، مسٹر ٹووگ!“ وہ گڑیا کی پشت ایک چاقو سے کاٹنے لگا۔ اس نے ٹووگ پر نظر نہیں ڈالی۔ گڑیا کاٹتا رہا: ”آج کل پیرس میں مارکس کا کیا مل جاتا ہے؟ میرا مطلب ہے کیا بھاؤ چل رہا ہے؟“
”م م... مجھے نہیں معلوم جناب!“ ٹووگ ہچکچا کے بولا۔
”کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو؟“
”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے...“
”خاموش۔ کیا تم سمجھ رہے ہو، مجھے یہ معلوم نہیں کہ اب تک تم کیا کرتے رہے ہو؟“ وہ کٹی ہوئی گڑیا کا اندرونی خالی حصّہ دکھاتے ہوئے بولا: ”کیا تم نے کبھی یہ ترکیب دیکھی ہے؟“ دوسری دراز سے اُس نے بہت سے نوٹ نکالے اور انھیں سختی سے تہہ کرکے گڑیا کے خالی حصّے میں رکھ دیا۔ ”پچاس ہزار گڑیوں میں اس طرح نوٹ رکھ کر انھیں ملک سے باہر اسمگل کیا جا سکتا ہے۔ یہی ہوتا ہے نا؟“ ٹووگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہوفمین بولتا رہا: ”گڑیا کا خالی حصّہ جواہر بھرنے کے کام میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ کیا یہ بات نہیں ہے؟ جو شخص ملک سے وفادار نہیں ہے اور جسے افراطِ زر کا خوف ہے، وہ مسٹر ٹووگ ایکسپورٹر کے پاس چلا جاتا ہے۔ مسٹر ٹووگ اُس کی دولت ملک سے باہر اسمگل کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں اُس کی دولت پونڈ اور ڈالر میں تبدیل کرا دیتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ایکسپورٹر؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر ٹووگ بھی خالی الذہنی سے مسکرا دیا۔
”اوہ، ہاں!“ ہوفمین نے بات جاری رکھی: ”مسٹر ٹووگ ایکسپورٹر کو یہ بھی معلوم ہے کہ کالی آمدنی کہاں ٹھکانے لگائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی اِس خدمت کے عوض دس فی صد وصول کرتا ہے اور معاوضہ دینے والے کو پوری طرح مطمئن کر دیتا ہے۔“ وہ دانت پیس کر یہ باتیں کر رہا تھا پھر بھی اُس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی: ”میرا خیال ہے اِس کے صلے میں تمھاری گردن بڑے سے بڑے انعام کی مستحق ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے دوست؟“

سب ٹنگ

"میں موت سے خوف زدہ نہیں ہوں۔" لووگ نے سادگی سے جواب دیا۔ عجیب بات ہے، اُس میں اچانک یہ جرأت پیدا ہو گئی تھی۔

ہوفمین تھوڑا سا آگے جھک گیا۔ "لیکن شاید تمھیں مرنا نہ پڑے۔ ہمیں اُن لوگوں کے نام جاننے سے زیادہ دلچسپی ہے، جنھوں نے تمھاری خدمات حاصل کی ہیں۔ اُن چند بدنصیبوں کے نام جو اپنے ملک کی عظمت پر یقین نہیں رکھتے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمھارے اُن سرپرستوں میں چند اہم شخصیتیں بھی شامل ہیں؟"

"میں اپنی زندگی بچانے کے لیے اپنے سرپرستوں کو دھوکا نہیں دوں گا۔" لووگ نے کہا۔ "مجھ سے اُن کے نام اگلوانے کی کوشش نہ کیجیے۔"

"گویا تم اپنے گاہکوں سے بے وفائی کرنا نہیں چاہتے؟ لیکن تمھیں ہماری طاقت معلوم ہے؟ ہم شاید تمھیں بولنے پر مجبور کر دیں۔"

"میرے ہونٹ سِلے ہوئے ہیں اور سِلے ہی رہیں گے۔"

"دیکھو لووگ! میں تمھیں ایک پیشکش کرتا ہوں۔ بعض اطلاعات کی روشنی میں مجھے یہ یقین ہے کہ کیپٹن انگر بھی تمھارا ایک گاہک ہے۔ تم صرف اُس کے بارے میں اقرار کر لو تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔"

"نہیں۔" لووگ نے عزم سے جواب دیا۔

"تمھاری ایک ہاں تمھارے لیے زندگی کی ضامن بن سکتی ہے۔ جلدی کرو۔ بتا دو؟"

"نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"سوچ لو لووگ! میں کہتا ہوں تم صرف کیپٹن انگر کا [illegible] ظاہر کر دو، تمھاری زندگی بچ جائے گی۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے [illegible]"

"میرے لبوں پر مہر لگی ہے۔" لووگ نے کہا۔

"تو پھر مجھے افسوس ہے، میں تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ملک سے بے وفائی کے جرم میں تمھیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

"میں تیار ہوں۔"

دبیز شیشوں کے پیچھے ہوفمین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "میں تمھاری بہادری کو سلام کرتا ہوں مسٹر لووگ! لیکن بات یہ ہے کیپٹن انگر نے ہمیں بتا دیا ہے کہ وہ تمھارا گاہک ہے۔"

لووگ نے اپنی حیرت اور جھنجلاہٹ چھپانے کی کوشش کی۔ اُس نے سوچا کہ اب ہوفمین اُسے دوسرے طریقے سے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ "میں کسی کیپٹن انگر کو نہیں جانتا۔"

ہوفمین نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ "مسٹر لووگ! اپنی بہادری اور اپنے گاہک کی پردہ پوشی پر مبارک باد قبول کرو۔ جیسا کیپٹن انگر نے بتایا تھا، تم ویسے ہی ثابت ہوئے۔"

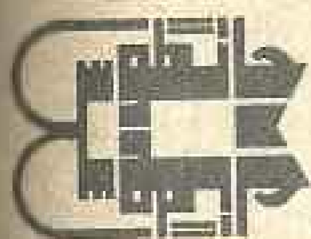
لووگ نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ ہوفمین نے کہا۔ "تمھاری یہ خوبی مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے خوشی ہو گی، اگر اس سلسلے میں تم میری بھی کچھ مدد کرو۔"

پتھر، ڈھلوان، کالے، اندھیرے، شوکت صدیقی نے اپنے لیے ایک مشکل راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ راتوں کے مصنف ہیں، سیاہ، سرد اور سخت راتوں کے، ان گلیوں اور بستیوں کے باسی ہیں جہاں صبح نہیں ہوتی۔ وہ ان آدمیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں، زندگی جن کی رقیب ہے، جو زندگی کے سوتیلے ہیں۔ شوکت صدیقی کا قلم انھی بلاکشوں کا دمساز ہے۔ جانگلوس شوکت صاحب کی ایک تازہ ترین تحریر ہے۔ شب گزیدہ گانو کی ایک سرگزشت۔ تقریباً بیس سال کے طویل وقفے کے بعد انھوں نے پھر تخلیق کی کمان اٹھائی ہے۔ دیکھیے اب کے ان کا تیر قلم کس کس کے جگر کے پار ہوتا ہے، کس کس کے سینے میں "آگ" لگاتا ہے۔

خدا کی بستی، تیسرا آدمی، راتوں کا شہر اور کئی کہانیاں لکھنے والے کی طرف سے

اس زمانے کے دو آدمیوں کا فسانہ

شوکت صدیقی کے قلم کا شاخسانہ

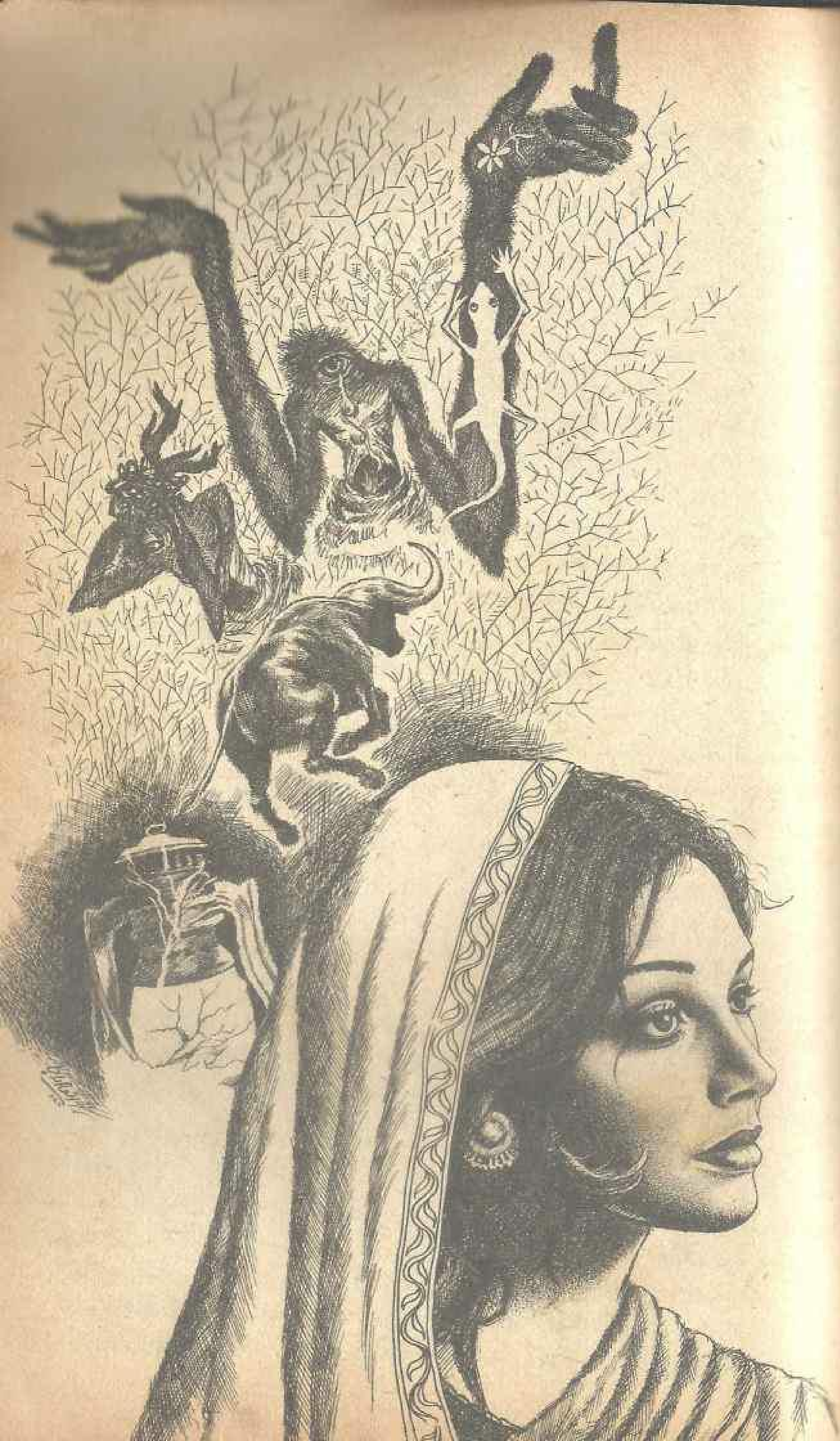


دونوں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ ایک کا نام لالی تھا، دوسرے کا رحیم داد۔ وہ جیل کی اونچی فصیل پھاند کر کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے تھے مگر اب کھلی فضا میں ان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ انھیں صبح ہونے سے پہلے پہلے بہت دور نکل جانا تھا۔ وہ چھپتے چھپاتے آگے بڑھنے لگے۔ ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں ہوا تھا کہ انھیں ایک نیم درختوں کی آڑ میں ہونا پڑا۔ سڑک پر ایک پولیس جیپ آکے رکی تھی۔ وہ گشت کرکے رک گیا۔ جیپ سے ایک پولیس والا اترا اور درخت کے پاس آگیا۔ وہ ایک ضرورت کے تحت آیا تھا۔ اس کے چھینٹے لالی کو اپنے منہ پر برداشت کرنے پڑے۔ جیپ کے جاتے ہی انھوں نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ کھیتوں اور پگڈنڈیوں سے گزرتے ہوئے وہ ایک گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں ایک رسہ گیر بچے سے ان کی مڈبھیڑ ہوگئی جو گاؤں سے بھینس چرا کے لے جا رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے چاقو کی نوک پر رکھ لیا۔ ایک جھڑپ میں زیر کرکے اس کی چادر اتروا لی اور اسے مجبور کرنے لگا کہ وہ اپنے کپڑے بھی اتار دے۔ رسہ گیر اڑ گیا کہ جان سے مار دو کپڑے نہیں اتاروں گا۔ لالی اور رحیم داد کے لیے جیل کی وردی سے نجات پانا ضروری تھا۔ انھوں نے بچے کو بہلانے پھسلانے کی کوشش بھی کی لیکن بچہ گاؤں جاکر ان کے لیے کپڑے لانے پر آمادہ ہوگیا۔ قیدیوں نے اسے جانے دیا اور کپڑوں کا انتظار کرنے لگے مگر تھوڑی دیر بعد بچہ کپڑوں کے بجائے مسلح افراد کو ساتھ لے کے لوٹا۔ خبردار نے قیدیوں کی طرف گولی داغ دی۔ لالی اور رحیم داد بہ وقت اس افتاد سے بچ کر بھاگے۔ راستے میں بچے کی دی ہوئی چادر بھی کہیں گر گئی۔ اب اجالا ہونے والا تھا چنانچہ انھیں ایک کھیت میں پناہ لینی پڑی۔ وہ تھکن سے چور تھے بے سدھ سو گئے۔ پھر ایک زوردار دھماکے اور انسانی چیخوں سے ان کی آنکھ کھلی۔ قریب ہی ایک کار ٹرک سے ٹکرا کر تباہ ہوگئی تھی۔ اس حادثے میں کار کے مسافروں کی جانیں ضرور گئیں لیکن لالی اور رحیم داد کو کچھ چیزیں مل گئیں۔ گھڑی، انگشتری، شرٹ، پتلون، نقدی اور کھانے کا کچھ سامان۔ لالی نے کپڑے بدل لیے۔ دونوں نے کھانے کی چیزیں کئی دن تک چلانے کا فیصلہ کیا اور فرار جاری رکھا۔ رحیم داد بال بچے دار آدمی تھا، اسے گھر پہنچنے کی سخت بے تابی تھی۔ لالی کا کوئی نہیں تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ اپنے ایک دوست شادو کے پاس لائل پور پہنچ جائے لیکن وہ مفرور قیدی تھے اور رحیم داد ابھی تک اس کے ساتھ تھا۔ وہ فرار سے چار دن بعد نکلے اور چلتے چلتے ایک بستی میں پہنچ گئے۔ لالی دیوار پھاند کے ایک مکان میں گھس گیا۔ وہاں آنگن میں ایک بھینس بندھی تھی۔ کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لالی دبے قدموں ایک کوٹھری میں داخل ہوگیا۔ یہاں اسے کوٹھری کا ایک بڑا صندوق نظر آیا۔ اس نے صندوق کے قریب پہنچ کے اس کا سامان ٹٹولنے کی کوشش کی۔ اچانک پشت سے ایک پاٹ دار نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایک بلا کی عورت قد آور نقوش سے گھور رہی تھی۔ اس کے تیور عجیب سے تھے۔ لالی جیسا مرد سہم گیا۔ پھر عورت کے اس انکشاف نے اسے لرزا دیا کہ وہ ایک شخص کو قتل کرکے ابھی ابھی فارغ ہوئی ہے۔ اس واردات کی تصدیق کے لیے لاش کمرے میں موجود تھی۔ فرار کی راہ مسدود نہ ہوتی تو لالی بھاگ کھڑا ہوتا۔ عورت کا نام شادان تھا، اس کی کہانی اسی کی طرح عجیب تھی۔ اس نے اپنے آشنا بلے کی محبت میں اپنا شوہر، بچے اور گھر بار سب چھوڑا اور بلے ہی کی ہوکر رہ گئی تھی مگر بلے نے اس سے بے وفائی کرتے کہیں اور آنکھ لڑا لی۔ وہ شادان سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ آج رات وہ خاصے تقاضے کے بعد آیا تو شادان سے بولا کہ وہ اپنی بھینس بیچ دے۔ شادان پہلے ہی بلے نے بھینس بیچ کر اس کا مطالبہ کیا، شادان کا دل ٹوٹا ہوا تھا۔ بلے کے اس تقاضے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ بلے کو قتل کر بیٹھی۔ اب اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی۔ لالی نے اسے سمجھایا اور رحیم داد کی مدد سے گڑھا کھود کے بلے کی لاش دفن کردی۔ اس کام میں پورا دن لگ گیا۔ لالی نے یہ مشقت دو وجوہ سے برداشت کی تھی۔ ایک تو شادان کے حالات اور طرز عمل نے اسے متاثر کیا تھا، دوسرے اس کا گھر ایک محفوظ پناہ گاہ تھا۔ دوسری رات کا ذکر ہے۔ لالی اور رحیم داد بے خبر سو رہے تھے۔ اچانک شادان نے لالی کو جگا دیا۔ وہ بے حد سراسیمہ تھی۔ اس نے بتایا کہ مفرور قیدیوں کے لیے پولیس کی طرف سے دو ہزار کے انعام کا اعلان اور تھانے کے قریب میں اس نے گاؤں کے ملک کو یہ بتا دیا ہے کہ مفرور قیدی اس کے گھر میں روپوش ہیں۔ ملک اپنی گھوڑی پر تھانے گیا ہے۔ لالی نے یہ سنا تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر رحیم داد کے ساتھ باہر نکل کر اندھیری گلی میں گھس گیا۔ عقب سے پولیس کے بھاری بوٹوں کی آہٹیں گونجنے لگیں۔

لالی اور رحیم داد پولیس کے نرغے سے صاف بچ نکلے۔

اب وہ کانگڑ کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک سنسان پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ پگڈنڈی کے دونوں جانب جھڑی کے لپوروں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ کانگڑ ختم ہوا تو چراگاہ آگئی۔ یہ قدرتی چراگاہ وسیع میدان کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں گھاس سے زیادہ خودرو پودے تھے۔ دونوں چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے اور آگے بڑھتے گئے۔

یہ وہ راستہ نہیں تھا جس پر چل کر وہ شادان کے گاؤں پہنچے



تھے۔ یہ قطعی نامانوس جگہ تھی۔ ہر چیز اُن کے لیے اجنبی تھی۔ انھیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور ایسا ویران علاقہ آگیا تھا جو کیکر کی جھاڑیوں اور کریل کے جنگلی پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ کریل کے پودوں میں پتیاں نہیں تھیں، کانٹے ہی کانٹے تھے۔ اُن کے درمیان سے راستہ بنانے میں سخت مشکل پیش آرہی تھی۔ رحیم داد کے پیر برہنہ تھے اور کانٹوں سے لہولہان ہو رہے تھے مگر وہ رُکا نہیں لالی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ رات ڈھل کر نڈھال ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہلکا ہلکا اُجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے دونوں ایک موڑ پر مڑے تو جگہ جگہ جنڈ کے درخت نظر آئے۔ اُن کے پیچھے ریل کی پٹڑی تھی۔ وہ اسی طرف چل دیے۔

ریل کی پٹڑی صبح کی دھندلی روشنی میں سہاگن کی مانگ کی طرح دُور تک سیدھی چلی گئی تھی۔ دونوں نشیب سے نکل کر اوپر آگئے اور ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ کچھ دُور جا کر رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا: "یار! ذرا دم تو لینے دے۔ تجھے کیا پتہ کانٹے چبھنے سے میرے پیروں میں کتنی اذیت ہو رہی ہے۔"

"تیری مرضی ہے تو ٹھیر جاتا ہوں۔" لالی نے کہا۔ "ویسے یہ جگہ ٹھیک نہیں۔" یہ کہہ کر وہ رُک گیا۔

رحیم داد کہنے لگا: "میں کب کہہ رہا ہوں، یہاں ٹھیر جا۔ ذرا دم لے کر پھر چل کھڑے ہوں گے۔ تجھے بھی زیادہ چلنے سے تکلیف ہو رہی ہوگی۔" یہ کہتا ہوا وہ پٹڑی کے کنارے بیٹھ گیا اور تلووں سے کانٹے نکالنے لگا۔ لالی بھی اُس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ دونوں چند منٹ تک تھکن سے نڈھال خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور پٹڑی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

دونوں نے میل سوا میل کا راستہ طے کیا تھا کہ دُور سے ریل کے انجن کی چنگھاڑ سناٹے میں اُبھری۔ ساتھ ہی لوہے کی پٹڑیاں کھٹ کھٹ بجنے لگیں۔ دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور پلٹ کر اُدھر دیکھنے لگے جدھر سے ریل گاڑی آرہی تھی۔ اب ریل کی پٹڑی پر کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں نیچے اُتر کر قریب ہی ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ پٹڑیوں پر ریل گاڑی دوڑنے کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

ذرا ہی دیر بعد سُرمئی دھندلکے میں ریل کے انجن کی تیز روشنی اُبھری اور دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی اُن کے سامنے آگئی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے اُسے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پہلے انجن دہاڑتا ہوا گزرا پھر ایک ڈبا، دوسرا ڈبا، تیسرا ڈبا گزرا پھر فرسٹ کلاس کا ڈ سامنے آیا۔ ایک کھڑکی کھلی۔ دو ہاتھ ایک سوٹ کیس اُٹھائے باہر سوٹ کیس کھڑکی سے نیچے گرا اور پٹڑی کے نشیب میں دُور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی تیزی سے آگے نکل گئی۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا۔ دونوں حیران و پریشان جہاں تھے کھڑے رہے۔ سوٹ کیس چند گز کے فاصلے پر اُن کے سامنے پڑا وہ چند لمحوں تک اُسے حیرت سے تکتے رہے پھر آہستہ آہستہ چلتے اُس کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سیاہ چمڑے کا سوٹ کیس رحیم داد نے بے صبری سے جھک کر اُسے اُٹھانا چاہا۔ لالی نے روک دیا۔ "ٹھیر جا رحیمے!"

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا: "کیوں؟"

لالی نے مشتبہ نظروں سے سوٹ کیس دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر جھجکتے ہوئے بو "یار! اِس کے اندر کہیں کٹی پھٹی لاش نہ رکھی ہو۔"

رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر لالی کو دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے بولا: "دیکھنے میں بھی بھاری بھاری لگتا ہے۔"

لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ خاموش کھڑا سوٹ کیس کو تکتا رہا۔ چند لمحے دونوں متذبذب کھڑے رہے پھر لالی نے ہاتھ بڑھا کے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا، اُسے اُٹھایا اور آہستہ آہستہ اونچا نیچا کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اندر کیا ہے۔ سوٹ کیس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس کے وزن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کپڑے اور دوسرا سفری سامان بھرا ہے۔ لالی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مسکرا کر بولا: "لے یار! کام بن گیا۔"

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا: "کیا ہے؟"

"یہ تو کھولنے ہی پر پتہ چلے گا۔" لالی نے کہا۔ "مجھے تو کپڑے لتے معلوم ہوتے ہیں اور بھی کام کی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ فسٹ کلاس کے ڈبے سے گرا ہے۔ سامان بھی اس میں فسٹ کلاس ہی ہوگا۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا پھر چہک کر بولا: "یار کیسا ٹھاٹ سے آکر گرا جیسے اپنے ہی لیے بھیجا گیا ہو۔"

رحیم داد کہنے لگا: "کھول کے تو دیکھ۔"

"یہاں نہیں آگے چل کے۔ اب یہاں زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔"

وہ سوٹ کیس ایک ہاتھ میں لٹکا کر چلنے لگا۔ رحیم داد بھی اُس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ دونوں نشیب سے نکل کر اوپر آگئے۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ ریل کی پٹڑی دھند میں لپٹی سنسان پڑی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے مگر وہ

نہیں گئے جدھر ریل گاڑی گئی تھی بلکہ وہ اُس طرف بڑھنے لگے جدھر سے آئی تھی بمشکل سے وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئے ہوں گے۔ درختوں تلے خشک پتوں پر قدموں کی آہٹ اُبھری۔ اُنھوں نے اس طرف دیکھا۔ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر اُن کی طرف آ رہا تھا۔ دھندلی روشنی میں دونوں اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اُس نے تحکمانہ انداز میں ڈانٹ کر کہا: "اوئے چیچڑ! سوٹ کیس رکھ دے۔"

لال ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا لیکن اُس نے سوٹ کیس نہیں چھوڑا۔ وہ اور قریب آگیا۔ اس دفعہ وہ زیادہ گرج دار آواز سے بولا: "دیکھتا کیا ہے جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" وہ جھپٹنے کے انداز میں تیزی سے آگے بڑھا مگر بڑھتے بڑھتے اچانک ٹھٹک کے حیرت سے چیخا: "اوئے لال! تُو حرام کے تخم؟"

لال نے فوراً اُسے پہچان لیا۔ وہ اشرف تھا۔ کئی سال پہلے وہ اُسی کے گروہ میں شامل تھا، جیل میں بھی ایک بار ساتھ رہ چکا تھا۔ اشرف پیار سے گالیاں دیتا ہوا قریب آیا اور لال کے گلے سے لپٹ گیا اور نہایت گرم جوشی سے اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچنے لگا پھر اُس سے علیحدہ ہو کر لال کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اُس کی ملگجی بش شرٹ اور پتلون دیکھی، بڑھی ہوئی داڑھی اور گرد سے اٹے ہوئے بال دیکھے اور کبیدہ خاطر ہو کر بولا: "یار! تُو نے یہ اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

لال نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا: "تجھے نہیں معلوم؟"

"مجھے معلوم ہے تُو شاہ پور جیل سے بھاگا ہوا ہے۔" اشرف نے کہا: "میرے تو تیرے ساتھ ہی جیل میں تھا۔ پرسوں چھوٹ کر آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔" اپنی بات کہتے کہتے اُس نے مُڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ رحیم داد لال کے پیچھے کھڑا تھا۔ اشرف نے اُس کی جانب اشارہ کر کے کہا: "یہ تیرے ساتھ کا دوسرا مفرور قیدی ہے نا؟ یار! اس کی جیل کی وردی تو بدلوا دی ہوتی۔ یہ تجھے صاف پکڑوا دے گا۔"

لال نے اُس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا: "یہ بتا تُو اس وقت یہاں کیسے آ پہنچا؟"

"ڈیوٹی پر تھا۔" اشرف نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اسی کے انتظار میں تھا۔"

"کچھ اونچا چکر معلوم ہوتا ہے۔" لال نے آنکھ مار کر کہا: "معاملہ کیا ہے؟"

وہ بولا: "پھر بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتا تیرا اس وقت پروگرام کیا ہے؟"

"میرا کیا پروگرام ہے۔" لال کے ہونٹوں پر زہرخند تھا: "چھپتا پھرتا ہوں۔ نہ رہنے کا ٹھکانا ہے نہ کھانے پینے کا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔"

"ایسا کر، میرے ساتھ چل۔" اُس نے لال کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا: "راستے کی پروا نہ کر۔ کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ادھر اپنی ہی عمل داری ہے۔ لاہور تک کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔"

"تُو پھر ایسا کر، سوٹ کیس کھول۔ اپنے مطلب کے کپڑے نکال لے۔ تیرا بن گیا کام۔"

اشرف سوٹ کیس کھولنے پر آمادہ نہ ہوا: "یہ سنڈیکیٹ کا مال ہے۔ اسے صرف باس کھول سکتا ہے۔"

"باس؟" لال نے حیرت سے پوچھا: "یہ باس کیا چیز ہے؟"

"بہت اونچی چیز ہے۔ فسٹ کلاس سے نیچے نہیں چلتا۔ کراچی گیا ہے۔"

لال نے دریافت کیا: "سوٹ کیس اُسی نے پھینکا تھا؟"

"ہاں۔" اشرف نے جواب دیا: "میں بھی اسی ٹرین میں تھا۔ فسٹ کلاس کے ساتھ والے انٹر کے ڈبے میں۔ پیچھے کادر آباد سٹیشن ہے، وہیں اُتر گیا تھا۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر کہا: "سٹیشن یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ یہ رہا سامنے آؤٹر سگنل۔"

لال نے سوٹ کیس اُس کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا: "لے، سنبھال اپنی امانت۔" اُس نے قدرے توقف کیا پھر مسکرا کر پوچھا۔ "کتنا مال پانی ہوگا اس کے اندر؟"

اشرف بتانے لگا: "مخبر نے تو اسّی ہزار کی اطلاع دی تھی۔ مال زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ جڑاؤ زیورات جا رہے تھے اس میں۔" اُس نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا پھر ہینڈل پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولا: "اپنا سنڈیکیٹ چھوٹا شکار نہیں مارتا۔"

لال مرعوب ہو کر بولا: "یار! یہ تو بہت اونچا چکر معلوم ہوتا ہے پُرخطرناک بھی اتنا ہی ہے۔"

"کوئی خطرناک وطرناک نہیں۔" اشرف نے ہنس کر کہا: "مہینے سوا مہینے میں صرف ایک بار نکلتے ہیں اور تگڑا شکار مارتے ہیں۔ اکیلے نہیں کھاتے، مل بانٹ کے کھاتے ہیں۔ اُوپر سے نیچے تک سب کا حصہ بندھا ہے۔ اپنے پر کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔" اُس نے ایک آنکھ دبائی: "جی چاہے تو لگ جا لیتن ہیں۔ بول کیا کہتا ہے؟ چلتا ہے میرے ساتھ؟"

لال نے رحیم داد کی جانب دیکھا: "اگر چلیں گے تو ہم دونوں ہی چلیں گے۔ تُو سوٹ کیس کھولنے کو تیار نہیں۔ پھر اپنا یار تیرے کیسے چلے گا۔"

"تُو اپنی بات کر۔" اشرف نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا: "یار! بڑا زمان۔ یہ تو دیکھنے ہی میں یتیم مسکین لگتا ہے۔ تُو اسے خاما خا نکال لایا۔ ایک بار اسے پوری سزا کاٹ لینے دے۔ پھر فروٹ ہو کر نکلے گا، ابھی تو بہت کچا ہے۔"

لال ہنس کر بولا: "خبر نے! بہت اونچا نہ اُڑ، مارا جائے گا۔"

بتا میرے بجائے کوئی اور ہوتا تو تو کیا کرتا؟"

اشرف نے گردن اونچی کر کے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "پورا راشن لے کر چلتا ہوں۔" اُس نے پتلون کی جیب سے پستول نکالا اور لالی کے سامنے گھما پھرا کر بولا۔ "پورا لوڈ ہے۔ کیا سمجھا؟" اُس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ "جلدی فیصلہ کر۔ بول کیا کہتا ہے۔ میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔" اُس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ "یوسف والا اسٹیشن سے ٹرین آنے ہی والی ہے۔ مجھے اسی سے واپس لاہور جانا ہے۔"

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ "چلا جا لالی! میری پروا نہ کر۔" پھر وہ لمحے بھر رک کر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جو قسمت میں لکھا ہے ہو کے رہے گا۔"

لالی نے اُسے غصے سے ڈانٹا۔ "چپ کر بے! تو اس میں نہ بول۔ یہ میرا اور شرفے کا معاملہ ہے۔ تو خامخا اپنی ٹانگ بیچ میں نہ اڑا۔" اس نے رحیم داد کا بازو پکڑ کے اُسے اپنی طرف کھینچا اور اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بے تکلفی سے بولا۔ "شرفے! یہ اپنا جگر ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تو جا، میرا تیرا راستہ الگ ہے۔"

"جیسی تیری مرضی۔ جی تو چاہتا تھا کہ تو ساتھ چلتا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے جیب سے بٹوا نکال کر کچھ نوٹ نکالے اور لالی کی طرف بڑھا کر بولا۔ "یہ رکھ لے۔ کام آئیں گے۔ پیالے! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔"

لالی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ "انھیں اپنے ہی پاس رکھ۔ یاری دوستی کی بات کرتا ہے تو اتار دے قمیص پتلون۔ تجھ سے زیادہ مجھے ان کی ضرورت ہے۔" اشرف ہنستا گیا، خاموش کھڑا رہا۔ لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ "جا دیکھ لیا تجھے بھی۔ خالی پیلی بڑھکیں مارنا جانتا ہے۔ اونہہ۔" اُس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں زمین پر تھوک دیا۔

اشرف بھڑک اٹھا۔ "گالی نہ دے لالی!" وہ جلدی جلدی اپنی قمیص اتارنے لگا اور لالی سے بولا۔ "تو بھی اتار اپنے کپڑے۔ جلدی کر۔ ٹائم بہت کم ہے۔"

دونوں نے جھٹ پٹ کپڑے اتارے اور ایک دوسرے سے بدل لیے۔ لالی نے اشرف کا جوتا بھی ہتھیا لیا۔ وہ اُس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔ کپڑے البتہ ذرا ڈھیلے تھے مگر لالی کے جسم پر بدنما نہیں لگتے تھے۔ اشرف نے ضد کر کے لالی کی جیب میں پچاس روپے بھی ڈال دیے۔ لالی نے کہا۔ "یار! ذرا ٹھہر۔ ادھر کا کچھ اتا پتا تو بتا۔ اپنے کو تو کچھ بھی نہیں معلوم۔" اُس نے ذرا سا تامل کیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ تو بتا کیا کروں؟"

"ایسا کر، ریلوے لائن کے اُس پار نکل جا۔ آگے ملتان روڈ ہے اور اُس سے کچھ ہی آگے نہر لوئر باری دوآب ہے۔ اسے پار کر لے تو جنگل اور ٹیلے ہیں۔ تیرے لیے بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ دن بھر وہاں رات کو چک ۴۴ کی طرف نکل جا۔ کچے ہاتھ کو ہے۔ یہاں سے سڑک نور شاہ جاتی ہے۔ تو نور شاہ نہ جانا۔ نور شاہ سے پہلے گی تو اس کے کنارے کنارے عالم شاہ پہنچ جا۔ قریب ہی راوی پتن پر پہنچ کر بیڑی میں بیٹھ کر دریا کے دوسری طرف پہنچ جا۔ وہاں سے ضلع لائل پور شروع ہو جائے گا۔" وہ کچھ رک کے بولا۔ "میں اس راستے سے دو بار لائل پور جا چکا ہوں۔ لائل پور پہنچ کر جی چاہے تو پاس لاہور آ جانا۔ دیکھ ضرور آنا۔" لالی خاموش رہا۔ پھر اُس نے کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور رخسار چوم کر محبت سے اُسے رخصت کیا۔

اشرف سوٹ کیس اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ وہ لالی کی میلی کچیلی بش شرٹ، تنگ اور اٹنگی پتلون اور بڑے بڑے جوتوں میں بھدا اور بے ڈول لگ رہا تھا۔ لالی اُسے جاتے ہوئے دور تک دیکھتا رہا مگر اشرف نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا قادر آباد اسٹیشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دونوں پٹڑی عبور کر کے اُس پار چلے گئے۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ سڑک آ گئی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ وہ سڑک کے دوسری جانب چلے گئے۔ نہر بھی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے نہر پر پہنچے۔ کچھ دور اُس کے کنارے کنارے چلے تو نہر کا پل آ گیا۔ پل سے گزر کر وہ نہر کے اُس پار پہنچ گئے۔ اشرف نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہر کے کنارے کھجور کے چند درخت تھے اور اُن کے پیچھے جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا جھنگر تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا اور ہُو کا عالم تھا۔ دونوں جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ جھنگر ختم ہوا تو اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ ایک ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچے تو فراش کے اونچے اونچے درخت دور تک ٹیلوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ ساتھ دوسرے جنگلی درخت بھی تھے، جھاڑیاں بھی تھیں۔ ٹیلے کی بلندی سے انھوں نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں جھنگر کے اس پار نہر چاندی کے تار کی طرح چمک رہی تھی۔

وہ ڈھلوانوں سے نشیب میں اترتے، چڑھائیوں پر چڑھتے کچھ اور آگے چلے گئے۔ اب وہ بہت تھک چکے تھے۔ انھیں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ دونوں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے پر انھیں جھاڑیوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ قریب ہی دو بڑے ٹیلوں کے درمیان ایسا خلا تھا جس کے اوپر ٹیلوں کی چوٹیاں ملنے سے محراب بن گئی تھی۔ یہاں وہ روپوش ہو سکتے تھے اور دھوپ سے بچ کر دن میں سو بھی سکتے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی اور انھیں اس وقت ویرانی ہی کی ضرورت تھی۔

دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ڈھلوان سے نیچے اُترے
محراب کے سامنے جا کر ٹھیر گئے۔ محراب اُن کے قد سے خاصی اونچی
تھی۔ اس کی زمین ہموار اور گچ تھی اُس میں سخت مٹی کی تہہ اور پتھر تھے
[illegible] صاف ستھری تھی۔ محراب سے ذرا ہٹ کر خراش کا ایک درخت
کھڑا تھا۔ محراب کے دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا سا کھلا
[illegible] اس کے عین نیچے گہرا کھڈ تھا۔ کھڈ میں ریتلی مٹی کے اونچے اونچے
ٹیلے تھے۔ رحیم داد زیادہ کھڑا نہ رہ سکا۔ محراب کے نیچے چلا گیا اور نڈھال
ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ لالی بھی اُس کے برابر لیٹ گیا۔ دونوں دیر تک
خاموش پڑے رہے۔ باہر جنگلی درختوں اور ٹیلوں پر زرد زرد دھوپ پھیلتی
جا رہی تھی۔

رحیم داد زمین پر چت لیٹا تھا اس نے کروٹ بدلی۔ لمحے بھر لالی
کو تکتا رہا پھر گلہ کرنے کے انداز میں بولا "یار! میں نے پہلے ہی کہا تھا
شاداں بڑی خطرناک عورت ہے۔"

"ہے تو۔" لالی نے اُس کی جانب دیکھے بغیر کہا "پر اُس میں
ایک بات ہے جو ہر عورت میں نہیں ہوتی۔"

رحیم داد حیرت سے بولا "کیا؟"

"شاداں کھرا روپیہ ہے۔ بجاؤ تو ٹن سے بولے۔"

رحیم داد نے احتجاج کیا "کیا بات کر رہا ہے لالی! بال بال بچ
گئے ورنہ اس نے تو مروا دیا تھا دونوں کو۔"

"دو ہزار بہت بڑی رقم ہوتی ہے رحیمے! وہ اپنی بات کہتے
کہتے لمحے بھر کو رکا۔ "میری تو سگی ماسی نے صرف دو سو روپے کی خاطر
مجھے آگ میں جھونک دیا تھا۔"

"چوری کی ہوگی۔"

"نہیں۔" لالی اسی طرح چت لیٹا اُوپر دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ
بتا رہا "میں نے اُس کے دو سو کے نوٹ چراغ سے جلا کر روشنی کی
تھی۔ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ شبرات پر ماں کے ساتھ ماسی
کے گھر گیا تھا۔"

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا "بڑی ظالم عورت تھی۔"

"یہ بات بھی نہیں ہے۔" لالی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ
کر ہولے ہولے ہلانے لگا "میرا موسا درزی تھا۔ سلائی کی مشین بیچ کر
اپنی بیٹی کے بیاہ کے لیے دو سو روپے لایا تھا۔ موسی اُس کی دوسری
بیوی تھی۔ پہلی مر گئی تھی اور ماسی کی دھی کا بیاہ تھا۔ میں نے موسا کے دو سو
روپے جلا ڈالے تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ جلتا چراغ اٹھا کر موسی کے
منہ پر دے مارا۔ اس کی ایک آنکھ جل گئی۔ اُس نے اپنا غصہ مجھ پر اتارا۔
مجھے دھکا دے کر جلتے الاؤ میں پھینک دیا۔ ماں نہ ہوتی تو میں جل کر
رہ جاتا۔ اچھا ہی ہوتا۔" لالی کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔

"یار! تو نے بڑی عجیب بات سنائی۔"

"عجیب بات تو یہ ہے رحیمے! سو روپے کی چوری پر سال بھر
کی سزا ہوتی ہے عورت کی ناک کاٹنے پر صرف چھ مہینے کی اور صرف
دس روپے ہیں جوان چھوکری کی جوانی لوٹ لینے کی کوئی سزا نہیں۔"

لالی نے گردن موڑ کر رحیم داد کو دیکھا "غلط کہہ رہا ہوں میں؟"

"یہ تو ہوتا آیا ہے جی اور ہوتا رہے گا۔" رحیم داد نے بڑے
بوڑھوں کے انداز میں کہا "کہتے ہیں انصاف اندھے کی لاٹھی ہوتا ہے۔"

"اور یہ بھی تو کہتے ہیں کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ معلوم نہیں،
کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔"

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی نہ بولا۔ دونوں چپ چاپ
پڑے بادلوں کی دھوپ چھاؤں میں ڈوبتے رہے پھر اُن کی آنکھ لگ
گئی۔ وہ گہری نیند سو گئے۔ دھوپ ٹیلوں کی بلندی سے زینہ زینہ نیچے
اتر رہی تھی۔ اندھیری گھاٹیاں روشن ہوتی جا رہی تھیں۔ دن کا ایک
پہر گزر گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج کا الاؤ ٹھنڈا پڑنے لگا۔
دونوں بے خبر سوتے رہے۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے لالی کی آنکھ کھل گئی۔ محراب کے نیچے
اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد ابھی تک بے خبر سو رہا
تھا۔ لالی نے اُسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سخت بھوک لگی
تھی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو سوتا چھوڑ کر باہر نکلا اور کچھ دیر
خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر ایک طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کے وہ
آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے لگا۔ یہ وسط مارچ کی ایک
خوشگوار شام تھی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں
درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلملا رہی تھی۔ نیچے گھاٹی میں ہلکا
نیل گوں دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ لالی آگے بڑھا تو اُسے سرس کے
درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ اُن میں پیلے پیلے پھولوں کے گچھے جھول رہے
تھے۔ اُن کی ہلکی ہلکی مہک ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ فضا میں پہلی رات
کی دلھن کی سی پھبن تھی اور لالی کو شدید بھوک لگی تھی۔

وہ ٹیلوں کے دامن میں اونچے نیچے ناہموار راستوں پر چلتا
ہوا دور تک چلا گیا۔ یکایک تیز بُو کا بھبکا آیا۔ لالی ٹھٹک کر رک
گیا۔ اُس نے ایک ٹیلے کی بلندی سے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر ایک مردار
خچر پڑا تھا۔ دو بڑے بڑے گدھ اُس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے
تھے۔ اوپر ٹیلے پر پانچ چھ گدھ قطار میں بیٹھے تھے اور اڑنے کے لیے
پر تول رہے تھے۔ مردہ خچر کے جسم سے اٹھتی ہوئی تیز بُو کے باوجود لالی
وہیں کھڑا رہا اور گردن اونچی کرکے متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے

لگا۔ دُور فراش کے درختوں کے پیچھے سے دھواں اُٹھ اُٹھ کے شام کے
دُھندلکے میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ
قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ وہ اُسی طرف چل دیا۔ نزدیک جا کر اُس نے
دیکھا۔ ٹیلوں کے دامن میں پیالے کی طرح کا اونچا اور اُبھرا ہوا میدان تھا۔
میدان میں جگہ جگہ اُونٹ کے سیاہ بالوں کے بُنے ہوئے تمبلے کے خیمے لگے تھے۔
ان خیموں کو پاوندے گیری کہتے ہیں۔ خیمے پھٹے پرانے تھے اور بے ترتیبی سے
اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ اُن کے آس پاس اونٹ اور خچر بندھے
تھے۔ بھیڑوں کے ریوڑ بھی تھے۔ خیموں کے باہر آگ جل رہی تھی۔ لالی
نے دُور ہی سے بھانپ لیا کہ وہاں خانہ بدوش پاوندوں نے پڑاؤ ڈالا ہے۔
میدان کے نشیب میں خشک نہر تھی اور اُس کے آگے ٹیلے تھے۔
ٹیلوں پر ڈھاک کے درختوں کا جنگل دہکتا تھا۔

وہ میدان میں پہنچنے کے لیے ایک موڑ پر مڑا۔ اُس نے جھٹ
پٹے میں دیکھا کہ دو خانہ بدوش لڑکیاں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ وہ ایک
دوسرے کے بال نوچ رہی تھیں اور زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ اُن کے
قریب ہی زمین پر سوکھی شاخوں کے گٹھے رکھے تھے۔ سامنے مٹی کے
تودے پر ایک نوجوان پاوندا بیٹھا نہایت سکون سے لڑکیوں کو ایک
دوسرے کے جھونٹے کھسوٹتے دیکھ رہا تھا۔ لالی کی آہٹ سن کر نوجوان
نے پلٹ کر اُسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ذرا دیر ہکا بکا بیٹھا
رہا پھر ایک دم اُٹھ کر خیموں کی سمت بھاگا۔ لڑکیاں بھی دھینگا مشتی
چھوڑ کر لالی کو حیرت سے تکنے لگیں۔ اُن کے لباس بوسیدہ اور گندے
تھے۔ بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں تھیں جو جھونٹے کھسوٹنے سے
بکھر کر منہ پر آ گئی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ رخسار تازہ
سیب کی طرح گلابی تھے۔ وہ بنجر ٹیلوں پر اُگنے والے جنگلی پھولوں کے
مانند تھیں جن میں رنگ ہی رنگ ہوتا ہے، خوشبو اور مہک نہیں ہوتی۔
توڑو تو ہاتھ میں کانٹے چبھ جائیں۔

ایک خانہ بدوش لڑکی بڑھ کر لالی کے قریب آئی اور اُس
کے پہلو سے لگ کر اس طرح کھڑی ہو گئی کہ اُس کے بدن کی تیز بو لالی
کی سانس میں گھل مل گئی۔ لڑکی نے سر جھکا کر اپنے بکھرے ہوئے بال
دکھائے اور دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولی: "اُس نے مجھے مارا
ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سمٹ کر لالی کے اس قدر قریب آ گئی کہ اُس
کی بھری بھری چھاتیاں لالی کے بازو میں پیوست ہو گئیں۔ لالی
نے جھرجھری سی لی اور بے رُخی سے اُسے زور سے دھکا دے کر
بولا: "اوئے کُڑی! پرے ہٹ کر بات کر۔" لڑکی کے بھورے بھورے
بال اور بکھر گئے۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ اُس نے لالی کو غصے
سے گھور کر دیکھا۔ دوسری نے زور کا قہقہہ لگایا اور لالی کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر بولی: "ڈیرے جانا ہے جی؟"

"ہاں جی۔" لالی نے مختصر جواب دیا۔

اِس کے بعد کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خانہ بدوش لڑکیوں
نے قریب پڑے ہوئے لکڑیوں کے گٹھے اُٹھا کر سروں پر رکھے اور
ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرتی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل
ہو گئیں۔ لالی آہستہ آہستہ ڈیرے کی جانب چلا۔ وہ زیادہ دُور
نہیں گیا تھا کہ ایک بوڑھا پاوندا دو نوجوانوں کے ہمراہ خیموں کے
پیچھے سے نکلا اور لالی کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب آ کر تینوں پاوندوں
نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ بوڑھا اپنے کھردرے لہجے میں بتانے
لگا کہ پڑاؤ رات ہی کو ختم ہو جائے گا اور صبح تڑکے قافلہ کوچ کر جائے گا۔
وہ مظفر گڑھ کے راستے ڈیرہ غازی خاں جا رہے تھے۔ بوڑھا پوچھے
بغیر لالی کے سامنے صفائی پیش کر رہا تھا۔ اُسے یقین دلا رہا تھا کہ
قافلے کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے نہیں ہے۔

لالی کئی برس پہلے چند روز کے لیے پاوندوں کے ایک ڈیرے
میں قیام کر چکا تھا چنانچہ وہ اُن کے عادات و اطوار اور اُن کے طرزِ
زندگی سے کسی حد تک واقف تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ پاوندے
اُن خانہ بدوش قبائل میں سے ہیں جو موسمِ سرما شروع ہوتے ہی
افغانستان کے کوہستانی دروں سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے میدانی
علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اینٹوں کے بھٹوں پر پتھیروں کا کام
کرتے ہیں، دیہات کے کچے مکانات کے لیے مٹی کی دیواریں
کھڑی کرتے ہیں، شہروں اور قصبوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔
کمبل اور نمدے، بھیڑ اور لومڑی کی کھالیں، قراقلی ٹوپیاں، جڑی
بوٹیاں، خشک میوے، ہینگ اور مشک، گھوڑے، ایرانی بلیاں اور
گرے ہاؤنڈ شکاری کتے فروخت کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں سخت
جفاکش، محنتی اور منہ زور ہوتی ہیں۔ اِس قدر آزاد اور بے باک ہوتی
ہیں کہ غیر مردوں کے سامنے بھی ذرا حجاب محسوس نہیں کرتیں۔ پاوندے
اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ اونٹوں اور خچروں پر سوار ہو کر خیمے
اور سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔ سفر کے
دوران مرد اور عورتیں مل کر کوہستانی نغمے الاپتے ہیں۔ نغموں کے ساتھ ساتھ
اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں بجتی ہیں جو نغمے کی لے کے ساتھ
ہم آہنگ ہو کر ساز کا کام دیتی ہیں۔ قافلوں کی نگرانی کے لیے پاوندے اپنے
ہمراہ روسی نسل کے کتے رکھتے ہیں۔ درختوں میں پت جھڑ لگتے
ہی پاوندوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دریائے سندھ عبور
کر کے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچتے ہیں۔ جہاں دور دراز کے
علاقوں میں بکھرے ہوئے قافلے مختلف سمتوں سے آ کر جمع ہوتے ہیں۔

یہ اُن کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے۔ گرمی بڑھنے سے پہلے پہلے وہ درۂ گومل کے راستے جہاں سے آتے ہیں، وہیں لوٹ جاتے ہیں۔ پاوندوں میں جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں جو ڈاکا زنی اور مویشیوں کی چوری کرتے ہیں یا چرس کا ناجائز دھندا کرتے ہیں لہٰذا پولیس اُن کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتی ہے۔ وہ جہاں پہنچتے ہیں، وہاں کے تھانے میں اپنی آمد کی باقاعدہ اطلاع دیتے ہیں۔

بوڑھے کی جانب سے صفائی پیش کرنے پر لالی نے جلد ہی بھانپ لیا کہ پاوندے اس کی پتلون اور اُجلی قمیص سے سخت مرعوب ہیں اور اسے پولیس یا سی آئی ڈی کا افسر سمجھ رہے ہیں۔ لالی اُن کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر انھیں ہراساں کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اس ویرانے میں اُسے اپنی آمد کا بھی کوئی نہ کوئی عذر پیش کرنا تھا لہٰذا اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ محکمۂ جنگلات کی طرف سے سرکاری کام سے اِدھر آیا ہے لیکن اس کے عملے کے دوسرے لوگ ابھی پہنچ نہیں سکے ہیں۔ اس کے بعد اس نے سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی کہ وہ سخت بھوکا ہے اور بھوک ہی سے بے قرار ہو کر اس طرف آیا ہے۔

وہ اُن کے ہمراہ ایک خیمے کے اندر گیا، اُن کا مہمان بنا۔ کٹورا بھر بھیڑ کا دودھ پیا، شہد اور پنیر کھایا، قہوے کا ایک گرم گرم پیالہ پیا۔ ڈھیر سی روٹیاں لیں، شہد اور پنیر لیا، مشکیزے میں پانی لیا۔ ہاتھ کا بنا ہوا ایک کمبل اور ایک نمدا لیا۔ بھیڑ کی چربی سے جلنے والا چراغ لیا اور ایک تیز دھار چھری بھی لی۔ تیس روپے میں یہ سودا کسی طور گراں نہ تھا۔ پاوندوں نے اُسے چرس بھری سگریٹ بھی پلائی۔ چرس پر دم لگا کے لالی کے جسم میں سرخوشی اور جولانی آگئی۔ خانہ بدوش اس کے ہاتھ چرس بھی فروخت کرنا چاہتے تھے مگر لالی اس چکر میں نہیں پڑا۔ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھیرا بھی نہیں۔ شام گہری ہو گئی تھی، اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ راستہ ناہموار اور پیچیدہ تھا اور چڑھائی بھی چڑھنی تھی۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اُسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ رحیم داد اس کی اچانک غیر حاضری سے سخت پریشان ہو گا۔

وہ پاوندے دُور تک اس کے ہمراہ آئے۔ وہ اور بھی آگے تک اس کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے مگر لالی نے ایک موڑ پر انھیں رخصت کر دیا۔ وہ انھیں نہ تو اپنا ٹھکانا دکھانا چاہتا تھا، نہ اپنے بارے میں کسی قسم کی اطلاعات بہم پہنچانا چاہتا تھا اس لیے کہ پولیس والے برابر اُن سے پوچھ گچھ کرتے رہتے تھے۔ انھیں رخصت کر کے وہ ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑا ہو کر انھیں دُور تک واپس جاتے دیکھتا رہا۔ دونوں نظروں سے اوجھل ہوئے تو وہ آگے بڑھا۔ اس نے ناہموار چڑھائی عبور کی اور سامان سے لدا پھندا محراب کے قریب پہنچ گیا۔

رحیم داد اس کی آہٹ سن کر گھبرایا ہوا باہر آیا۔ وہ سخت [illegible] تھا مگر لالی نے اس سے کوئی بات نہیں کی، دیوار سے ٹیک لگا [illegible] گیا اور ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رحیم [illegible] میں ایک ایک چیز ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ جب اس نے کمبل کی تہ [illegible] اندر سے تازہ تازہ روٹیوں کی سوندھی مہک نکلی تو وہ بچوں کی طرح [illegible] کر بولا: "او ہو، ہو یار! تُو نے تو کمال کر دیا۔ روٹیوں کا بھبکا تو ابھی گرم ہے۔"

"شہد اور پنیر بھی ہے۔" لالی نے جیب سے ماچس نکالی [illegible] چراغ اٹھایا اور اُسے روشن کر دیا مگر ہوا تیز تھی۔ چراغ کی لَو بار بار [illegible] آخر لالی نے اِدھر اُدھر سے پتھر اکٹھے کر کے چراغ اُن کی اوٹ میں [illegible] اس طرح وہ ہوا سے بھی محفوظ ہو گیا اور روشنی باہر جانے کے بجائے [illegible] ہو کر رہ گئی۔ اتنی دیر میں رحیم داد نے زمین پر نمدا بچھا دیا۔ دونوں [illegible] بیٹھ گئے۔ لالی پاوندوں کے ڈیرے کا حال بتانے لگا۔ رحیم داد نے [illegible] روٹیاں نکال کر باہر رکھیں۔ آٹھ روٹیاں تھیں۔ موٹی موٹی اور بڑی بڑی۔ لالی کہنے لگا: "یہ آٹھ دن کا راشن ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پاوندوں سے خریدی ہوئی چھری نکالی اور ہر روٹی کے چار چار ٹکڑے کر دیے۔

رحیم داد بولا: "روٹی تو چل جائے گی، پر پانی کم ہے۔"

لالی نے کہا: "مشکیزہ تو اپنے پاس ہے اور نہر بھی زیادہ دُور نہیں [illegible] پانی نہر سے آ جائے گا۔" وہ مسکرایا۔ "پر آٹھ دن تک یہاں کون پڑا رہے گا [illegible] اس وقت تک تو ہم بہت آگے نکل جائیں گے۔"

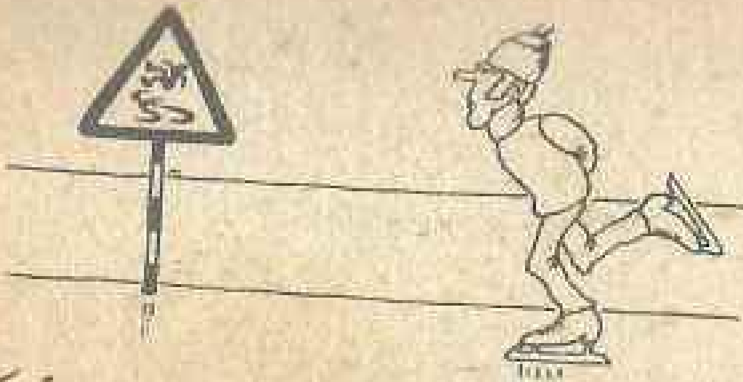
رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں جھجکتے ہوئے کہا: "یار، تیرا [illegible] مان، تیرا معاملہ تو ایک دم فسٹ کلاس بن گیا۔" اس نے اپنا میلا کچیلا لباس دیکھا۔ "یہ جیل کی وردی نہ جانے اپنے جسم سے کب اُترے گی اور جب تک یہ نہیں اُترے گی، میرے لیے تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔"

"پروا نہ کر۔ جلد ہی تیرے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے ہر وقت اسی بات کی فکر رہتی ہے۔ خطرہ صرف تیرے لیے نہیں، میرے لیے بھی تو ہے۔ یہ تو سوچ، تُو اور میں کیا الگ الگ ہیں۔" اس نے رحیم داد کو ٹہوکا دیا۔ "دیکھ کیا رہا ہے۔ شروع ہو جا۔"

رحیم داد فوراً شروع ہو گیا۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا، اس پر تھوڑا سا شہد ڈالا، پنیر کا ایک ٹکڑا رکھا پھر روٹی گول گول لپیٹ کر دانتوں سے چباتے ہوئے بولا: "تُو نہیں کھائے گا؟"

"نہیں۔" لالی نے کہا۔ "مجھے دو گھونٹ پانی پلا دے، سب مجھے جا[illegible] ہے۔ وہ مجھے بھر کو دکھا۔ چرس پر دم لگا کر بھوک لگ جاتی ہے۔"

رحیم داد نے مشکیزہ لالی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یار، تُو نے تو پاوندوں کے ڈیرے پر بڑے عیش کیے۔" لالی نے کوئی جواب



...ا۔ مشکیزہ منہ سے لگا کر پانی کے کئی گھونٹ پی گیا پھر اس نے
...ایک طرف رکھا، ہاتھ سے منہ پونچھا اور کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد
...سے پوچھا: "اکیلا ہی جائے گا؟"

لال نے آہستہ سے کہا: "ہاں"

"شاداں کے پاس تو نہیں جا رہا؟"

"جا تو وہیں رہا ہوں"

رحیم داد آنکھ مار کر بولا: "ایسا جان پڑتا ہے، شاداں پر تیرا
دل آ گیا"

"چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں"۔ لال نے بے نیازی
سے کہا: "اپنے پاس دل ہے ہی کہاں۔ دل تو دل والوں کے پاس
ہوتا ہے"

رحیم داد نے ہنس کر کہا: "تو چاہے کچھ کہے۔ تیری اپیل دیکھ کر
تو مجھے یہی لگتا ہے کہ تو......"

لال اس کی بات کاٹ کر بیزاری سے بولا: "ٹھرک بازی چھوڑ۔
کام کی بات سن"۔ یہ کہہ کر اس نے پھٹی پتلون میں اڑسی ل اور
...ا چاقو نکال کر رحیم داد کو دیا: "اسے رکھ لے۔ میں کل رات آؤں گا۔
...ہی میں دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا"

رحیم داد نے اسے روکنا چاہا: "ابھی گھپ اندھیرا ہے۔ چاند
نکل آئے تب جانا"

لال نے کوئی جواب نہیں دیا، آگے بڑھا اور قریب کے ٹیلے
پر چڑھنے لگا۔ بلندی پر جا کر اس نے دیکھا کہ ہر طرف ہول ناک
تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ دور دور تک کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے جھک
کر خراب کے نیچے نظر ڈالی۔ رحیم داد چراغ کی مدھم روشنی میں بیٹھا
روپیوں کے نوٹ گن رہا تھا۔ لال زیادہ دیر ٹیلے پر نہ ٹھہرا۔ آہستہ
آہستہ دوسری طرف اتر گیا۔ پھر وہ چڑھائیوں پر چڑھتا، ڈھلوانوں سے
اترتا، ناہموار راستوں سے گزرتا، ٹیلوں سے گزر کر نیچے جھنگر میں پہنچ
گیا۔ پھر جھنگر عبور کر کے نہر کی جانب چلنے لگا۔

لال شاداں کے پاس جانا چاہتا تھا اور اس سے وہ کپڑے
لانا چاہتا تھا جو شاداں نے گاؤں کے درزی کو سلنے دیے تھے۔ کپڑے
مل جاتے تو لال رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا دیتا اور
اس کے ہمراہ اشرف کے بتائے ہوئے راستے سے لائل پور کی طرف
نکل جاتا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ پھر چلتے چلتے اچانک اسے
خیال آیا کہ آج شاداں کے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہ ہو گا۔ کل ہی
رات پولیس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی اور اب پولیس شاداں سے
پوچھ گچھ کرتی ہو گی، اس کے گھر کی نگرانی کرتی ہو گی۔ گاؤں کے اندر اور
سب جگہ

باہر جگہ جگہ ناکوں پر پولیس تعینات ہو گی۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی
رفتار سست پڑ گئی۔ نہر اب زیادہ دور نہ تھی مگر لال نے آگے جانے
کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ واپس مڑا اور اپنے ٹھکانے کی جانب روانہ
ہوا۔ جب وہ جھنگر سے گزر کر ٹیلوں پر چڑھ رہا تھا تو رات خاصی گزر چکی
تھی۔ ہر طرف گہری ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ
روشنی پھیلنے لگی۔ دور فراش کے اونچے اونچے درختوں کے پیچھے سے
چاند ابھر رہا تھا۔ گول گول سونے کے بڑے سے تھال کی طرح چمکتا
دمکتا چاند ویرانے میں اس قدر خوب صورت نظر آ رہا تھا کہ لال ٹکٹکی
باندھے اسے تکتا رہا۔ چاند ابھر کر اوپر آیا تو اندھیرے راستے روشن ہو گئے۔

اجلی اجلی چاندنی میں چلتا ہوا لال کچھ ہی دیر بعد خراب کے
قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ پتھریلے راستوں پر لال
کی آہٹ سن کر وہ گھبرایا ہوا جھٹ نکل کر باہر آ گیا۔ لال کو اس
نے بکھری ہوئی چاندنی میں دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے
اس کی جانب بڑھا: "تو واپس کیوں آ گیا؟"

لال نے کہا: "اندر چل کر اطمینان سے بات کریں گے"۔

دونوں خراب کے نیچے پہنچ گئے۔ لال دور سے پیدل چل کر آیا
تھا۔ وہ ٹیلے پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا مگر رحیم داد سخت بے چین
تھا، خاموش نہ رہ سکا۔ کہنے لگا: "یار! یہ تو بتا، راستے میں کوئی
گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟"

"ذرا دم لے"۔ لال نے کہا: "سب کچھ بتا دوں گا۔ ویسے پریشانی
کی کوئی بات نہیں"۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا:
"بات یہ ہے رحیمے! میں نے خود ہی شاداں کے پنڈ جانے کا
ارادہ چھوڑ دیا"

رحیم داد نے دریافت کیا: "کیوں؟"

"میں نے چلتے چلتے سوچا، وہاں تو ابھی پولیس لگی ہو گی،
تفتیش کرتی ہو گی"

"یہ بات تو تجھے پہلے ہی سوچ لینی چاہیے تھی"۔ رحیم داد بولا۔
"اور میں تو کہتا ہوں جی، شاداں نے ہمارے بارے میں پولیس کو سب
کچھ بتا دیا ہو گا"

"بتانا تو نہیں چاہیے"۔ لال نے کہا: "اس نے پالے کر قتل جو

کیا ہے۔ یہ بات ہم دونوں جانتے ہیں۔ ویسے ہمارے بارے میں وہ اتنا ہی جانتی ہے، جتنا پولیس کو معلوم ہے۔"

"یہ بات ہے تو اُس نے ملک کو کیوں ہمارے بارے میں بتایا؟" رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ "بتا اُس نے ایسا کیوں کیا؟"

"وہ تو اُس نے دو ہزار انعام کے لالچ میں کیا تھا۔" لالی بولا۔ "پر اُسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس بھی تو ہو گیا تھا۔ یار! وہ اتنی بُری عورت نہیں، جتنی تُو سمجھتا ہے۔"

رحیم داد کہنے لگا۔ "سوچ لے۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا کہ تیرا اُس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔"

"یار! میں تو تیرے لیے کپڑے لینے اُس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" لالی اُسے سمجھانے لگا۔ "یہ تو تُو بھی جانتا ہے کہ جب تک تیرے بدن پر جیل کی وردی ہے، ہم کہیں جا بھی تو نہیں سکتے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں جلد سے جلد یہاں سے لائل پور کی طرف نکل جائیں۔"

رحیم داد اُس کی بات سُن کر ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "میری ایک بات مان لے گا؟"

لالی نے پوچھا۔ "کیا؟"

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ "لائل پور کی طرف جانے سے پہلے میں ایک بار اپنے پنڈ احمد کوٹ ضرور جانا چاہتا ہوں۔"

لالی نے مسکرا کر کہا۔ "ایسا لگتا ہے، تجھے اپنی گھر والی بہت یاد آ رہی ہے۔" وہ چند ثانیے خاموش رہا۔ "ایک بات تو بتا، جیسے پہلے تو تیری گھر والی تجھ سے ملنے جیل آیا کرتی تھی۔ پھر اُس نے اچانک آنا بند کیوں کر دیا؟"

"شاید بیمار پڑ گئی۔" رحیم داد نے کہا۔ "مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے۔ جب وہ آتی تھی تو مجھے دیکھ کر کتنا روتی تھی۔ بالکل دُبلی پڑ گئی تھی۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں بھی تو اُس سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں۔ تُو نے تو اُسے دیکھا ہے۔ جتنی سوہنی ہے اتنی ہی عقل اور ابری ہے۔ یوں سمجھ میرا سچا ساتھ دیتی تھی وہ۔ میرے پاس تو بس تھوڑا زمین ہے۔ اپنی زمین خود کاشت کرتا تھا۔"

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ "یار! یہ باتیں تو تُو جیل میں بھی بتایا کرتا تھا۔ کوئی اور گل کر۔"

رحیم داد کو لالی کی بات اچھی نہ لگی۔ وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر رحیم داد کو منانے کے انداز میں بولا۔ "تو میری بات کا بُرا مان گیا؟"

رحیم داد نے جھٹ کہا۔ "تو پھر یہ بات پکی رہی کہ آگے جانے سے پہلے تو مجھے نوراں اور بچوں سے ملانے احمد کوٹ لے جائے گا؟"

اُس کے انداز میں التجا تھی۔ "دیکھ انکار نہ کرنا۔ نوراں کا کوئی بھی نہیں، نہ بہن نہ بھائی۔ ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ باپ تھا وہ بھی دو سال ہوئے گزر گیا۔"

"تُو احمد کوٹ جانا چاہتا ہے تو ضرور جا۔" لالی نے کہا۔ "اتنا سمجھ لے۔ احمد کوٹ جاتے ہی پکڑ لیا جائے گا۔ تیرے گھر کی پولیس سخت نگرانی کر رہی ہوگی۔ تُو نے یہ بات نہیں سوچی؟"

اس کے بعد رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی۔ لالی بھی خاموش بیٹھا رہا۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ رات نکھرتی جا رہی تھی۔ اب خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رحیم داد جماہیاں لیتا ہوا بولا۔ "یار! مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ میں تو اب سوتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا وہ کمبل اوڑھ کر زمین پر لیٹ گیا مگر لالی نہ لیٹا۔ اس نے پھونک مار کر چراغ بجھایا، باہر نکل کر کچھ دیر چاندنی میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا پھر واپس آ کر وہ بھی لیٹ گیا۔ رحیم داد پہلے ہی سو چکا تھا۔ لالی ذرا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر اُس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح اُٹھ کر دونوں نے شہد کے ساتھ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا، پانی پیا پھر وہ محراب کے نیچے بیٹھے رہے یا اُس کے قریب ہی منڈلاتے رہے مگر دُور نہیں گئے۔ شام کو انھوں نے پھر روٹی کا ایک ایک ٹکڑا کھایا تھوڑا تھوڑا پنیر بھی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے فوراً چراغ بجھایا۔ اندھیرے میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ چاند نکلا تو دونوں باہر نکلے اور کچھ دُور جا کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بلندی سے انھوں نے گھوم پھر کر ہر طرف نظر دوڑائی۔ اُجلی اُجلی چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی مگر سناٹا بہت گہرا تھا۔ وہ بہت دیر بعد واپس آئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا مگر جو تھے دن پانی ختم ہو گیا تھا۔ البتہ روٹیاں ابھی موجود تھیں۔ شہد اور پنیر تھا مگر پھر وہ پیاسے رہے۔ شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو لالی نے مشکیزہ اُٹھایا، رحیم داد کو اپنے ساتھ لیا۔ دونوں ٹیلوں سے اُتر کر جنگل میں پہنچے، اُسے عبور کیا اور نہر پر پہنچ گئے۔ اب رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ لالی نے نہر سے مشکیزے میں پانی بھرا اور مشکیزہ رحیم داد کے حوالے کر کے بولا۔

"میں اب شاداں کے پنڈ جہاں گیرہ جاؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ سورج نکلنے سے پہلے واپس آ جاؤں۔ آج نہ آ سکا تو کل آ جاؤں گا۔ مان لے مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔ میں آؤں گا ضرور۔ تُو میرا انتظار کرنا۔ تیرے پاس ابھی چار روٹیاں ہیں۔ شہد اور پنیر بھی ہے۔ یہ آٹھ دن کا راشن ہے۔ روٹیاں سوکھ جائیں تو پانی میں بھگو کر کھا لینا پھر صبح شام روٹی کا ایک ہی ایک چپا کھانا۔ پانی ختم

ہو جائے تو رات کے اندھیرے میں نہر سے لے آنا۔ پر دن میں ہرگز اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلنا۔"

رحیم داد اُس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا پھر اُس نے بے چین ہو کر کہا "یار، تُو جلدی آ جانا اور میرے لیے کپڑے ضرور لے کر آنا۔ ویسے مجھے ساتھ لے چلتا تو اچھا تھا۔ میں ادھر کے سب رستے جانتا ہوں۔ تُو تو بچپن سے لاہور میں رہا، تجھے یہاں کا کیا پتہ؟"

"پروا نہ کر۔ مجھے رستے کا سب پتہ ہے۔ میں جلدی آؤں گا اور تیرے لیے کپڑے ضرور لاؤں گا۔" لالی محبت سے اُس کی پیٹھ تھپ تھپا کر بولا "اچھا اب تو جا۔"

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ لٹکائے جھنگی کی طرف چل دیا۔ لالی خاموش کھڑا دیکھتا رہا جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا پُل پر پہنچا اور اُسے عبور کر کے نہر کے دوسری جانب چلا گیا۔

وہ آگے بڑھا تو سڑک آ گئی۔ اُس نے دُور ہی سے دیکھا، ایک لاری تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ اُس کے جانے کے بعد گہرا سناٹا چھا گیا۔ لالی سڑک سے گزر کر ریل کی پٹڑی کی جانب بڑھا۔ ریل کی پٹڑی کے آس پاس سناٹا اور زیادہ گہرا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔

وہ ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے کچھ دُور تک چلتا رہا پھر نشیب میں اُتر کر جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ یہ وہی راستہ تھا جس سے وہ رحیم داد کے ہمراہ چند روز پہلے گزرا تھا۔ وہ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ چاند اُبھر کر اُوپر آ گیا۔ سائے پھیلنے اور سمٹنے لگے۔ ویرانے کی رات مُردے کا کفن بن گئی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ وہ گاؤں میں داخل ہوا اور سنسان گلی کوچوں سے گزرتا ہر آہٹ پر چونکتا، ایک بار پھر شاداں کے گھر کی دیوار کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا پھر دیوار پر چڑھا اور آہستہ سے آنگن میں اُتر گیا۔ اُس نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی پھر نیچی چھت والے سائبان نما دالان کی جانب دبے دبے قدموں بڑھا۔ اُس نے دیکھا کہ شاداں دالان کے ایک کونے میں فرش پر لیٹی ہے۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اُس نے اُجلی چاندنی میں لالی کا سایہ دیکھا تو گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ لالی اُس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ شاداں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے منہ پر رکھا۔ کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کیا اور لالی کا ہاتھ پکڑ کر آنگن میں آ گئی۔ پھر وہ اُسے پڑچھتی میں لے گئی۔ اور آہستہ سے پوچھا "تُو آیا کیسے؟"

"دیوار پھاند کر۔"

وہ بگڑ کر بولی "مسخری نہ کر۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔"

لالی نے کہا "پہلے یہ بتا، کمرے میں کون ہے؟"

"ہے کوئی۔ کیا کرے گا جان کر" شاداں نے گول مول [illegible] دیا۔ لالی نے آنکھ مار کر بے تکلفی سے کہا "کوئی نیا یار پھالو [illegible]

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اُٹھی۔ اُس نے [illegible] نظروں سے لالی کو دیکھا "میں کوئی چھنال ہوں؟ تو بھی [illegible] کنجر" یہ کہہ کر اُس نے غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی نے اُس کی ناراضی پر ذرا بھی بُرا نہ مانا، ڈھٹائی [illegible] رہا، کہنے لگا "ایسا نہیں ہے تو پھر چھپا کیوں رہی ہے؟ صاف [illegible] بتا کمرے میں کون ہے؟" اُس نے لمحے بھر رُک کر پوچھا "[illegible] تو نہیں آ گیا؟"

"نہیں" شاداں کے لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا تھا "وہ یہاں [illegible] سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں آ سکتا۔ تو اُس کی گھر والی جو ہے" لالی نے [illegible] سے کہا "تو چھوٹ تو نہیں گئی ہے۔ اُس نے تجھے طلاق کا کاغذ ہی [illegible] لکھ کر دیا۔"

"وہ بھی نہیں سکتا" شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا "[illegible] بالے کے ساتھ میرے اُدھلنے کا اُسے پتہ چلا تو اُس نے نہ دیٹ [illegible] نہ تھانے گیا۔ سب نے بہت کہا پھر بھی نہ گیا۔ وہ اور ہی طرح کا [illegible] ہے۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ ذرا سا شرمائی اور دوپٹے کا پلّو سر پر ڈال [illegible] "اب بھی میرے لیے مجبور نا کرتا ہے۔ جان دیتا ہے مجھ پر۔"

لالی نے نظر بھر کر شاداں کو دیکھا۔ وہ پڑچھتی کے کنارے پر اس طرح کھڑی تھی کہ ہلکی ہلکی چاندنی کی پھوار میں اُس کا چہرہ اُجلے دیے کی طرح دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔ لالی مسکرا کر بولا "تجھ پر جان دینے والے اور تیرے لیے تڑپنے والے تو اور بھی بہت سے ہیں۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔" اُس نے شاداں کی دمکتی ہوئی پیشانی اور آنکھیں بھرپور نظروں سے دیکھیں۔ "تُو تو ابھی تک تھیلی مٹیار لگتی ہے۔"

"اڑے وڈیا نا نہ کر۔" وہ شرما گئی پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولی "اب کیا رہ گیا مجھ میں جل کر راکھ ہو گئی۔" اُس نے گہری سانس بھری۔ "بالا مجھے برباد کر گیا۔"

"اُس کی گل چھوڑ۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا "ٹھیک ٹھیک بتا، کمرے میں کون ہے؟"

"ناراض تو نہیں ہو گا؟" شاداں نے جھجکتے ہوئے کہا "میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بتا۔"

"نہیں۔" لالی نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھے بغیر کہا۔

"ایسے نہیں۔" شاداں نے اصرار کر کے کہا۔ "سر پہ ہاتھ رکھ کر بتا،

اور نہیں منائے گا؟"

"نہیں مناؤں گا، نہیں مناؤں گا۔" لالی نے اُس کے سر پہ ہاتھ

رکھ دیا۔ "لے اب بتا۔"

شاداں نے ذرا سا آگے جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "تاجی

اندر منجی پر سو رہی ہے۔"

"کون تاجی؟" لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بونگی کی طرح

شاداں کا چہرہ تکنے لگا۔

شاداں ناک چڑھا کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "وہی کنجری جس نے

تجھے مجھ سے چھین لیا تھا۔"

لالی نے خطرے کے احساس سے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "وہ

یہاں کیسے آئی؟"

"آئی نہیں، میں خود جا کر لائی ہوں۔" شاداں مطلق خوف زدہ نہیں تھی۔

لالی اُس کی بات سن کر سخت پریشان ہوا۔ جھنجلا کر بولا۔ "تیرا

دماغ تو نہیں پھر گیا؟ یہ تجھے سوجھی کیا؟"

"ناراض نہ ہو۔ تو نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی

صفائی پیش کرنے لگی۔ "بخار آ رہا تھا اُسے۔ کوئی دوا دارو بھی نہیں۔

میں شام کو حکیم جی سے اُس کے لیے دوائی لائی ہوں۔" اُس نے ذرا سا

توقف کیا پھر تڑپ کر بولی۔ "ہائے سرسوں کے پھول کی طرح پیلی

پڑ گئی ہے۔"

لالی اُس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ نہایت رُکھے پن

سے بولا۔ "تجھے کس نے کہا تھا کہ اُسے اپنے گھر لا۔ اُس کا علاج کرا۔

اور کوئی نہیں اُس کا؟ کوئی تو ہوگا؟"

"ہے تو۔" شاداں نے جواب دیا۔ "ویر ہے۔ پر وہ کراچی میں کام

کرتا ہے۔ بھرجائی تھی، وہ بھی پچھلے دنوں اُس کے پاس چلی گئی۔ وہ کہے

بھر کی۔ اچھا ہی ہوا۔ ایسی چنڈال تھی۔ ہائے کیا بتاؤں۔ روز تاجی کا

ہاتھ پکڑ کر نکالتی تھی، مارتی تھی، جھونٹے کھسوٹتی تھی۔ تبھی تو تاجی بالے

کے گلے پڑ گئی۔ کہتا تھا۔۔۔"

لالی شاداں کی باتوں سے اکتا گیا۔ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔

"اماں کی کٹر کٹر بند کر۔ یہ بتا، تاجی بالے کو تو نہیں پوچھتی تھی؟"

"کیوں نہیں پوچھتی تھی۔" شاداں نے کہا۔ "میں اُس کے پاس

گئی تو اُس نے پہلی بات یہی پوچھی۔ میں نے جھٹ کہا، میرے پاس

تو وہ تین مہینے سے نہیں آیا۔ لاہور گیا ہوگا ایکٹر بننے۔ وہ تو اپنے کو بڑا

سوہنا ہیرو سمجھتا تھا۔" شاداں نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔ "غلط بات

تو نہیں کہی میں نے؟"

"بات تو ٹھیک ہی کہی تو نے۔" [illegible]

"نہ لاتی تو کیا کرتی۔ بخار ہے اُسے۔ [illegible]

نہیں۔ پیسہ کوڑی بھی اُس کے پاس نہیں۔" شاداں نے لالی کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو چاہتا کیا ہے۔ میں مر جانے دیتی اُسے؟"

وہ لالی سے اور قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ لالی اُس کے بچھڑ کے مانند

سخت جسم کی چبھن محسوس کر سکتا تھا۔ شاداں آہستہ سے بولی۔ "تاجی کے

پیٹ میں بچہ ہے، بالے ہی کا ہے۔ سچ جان اُسی کا ہے۔" شاداں نے

یہ بات ایسی لذت لے کر کہی کہ اُس کا چہرہ کھل اُٹھا، آنکھوں میں

چراغ روشن ہو گئے۔ لالی گم صم کھڑا رہا۔ اُسے شاداں پر غصہ بھی آ رہا

تھا اور اُس سے ہمدردی بھی تھی۔ شاداں اُس کی اُلجھن سے بے نیاز

کہتی رہی۔ "جیٹھا یہیں ہوگا۔ بچے کو خود پالوں گی، اپنے ہی پاس رکھوں

گی۔ تاجی بھی یہیں رہے گی۔ میرا کیا لے گی، اپنے نصیب کا کھائے گی۔"

"تو نیند کی جھوک میں تو نہیں ہے؟" لالی نے مسکرا کر کہا۔ "اب

تو جاگ جا۔"

شاداں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تو یہ سب کرے گی کیسے؟" لالی نے سنجیدگی سے کہا۔

شاداں نے شیشم کے پیڑ کے قریب پڑے ہوئے چھپر کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ ڈھارا دیکھ رہا ہے؟ ادھر آ۔" وہ لالی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ڈھارے کے پاس لے گئی اور اُس کے نیچے بیٹھی ہوئی بھینس کی تھوتھنی محبت سے سہلاتے ہوئے بولی: "میری بوری دھولی ہے۔ نیلی بار کی نج ہے۔ بھاڑو ہے۔ بچے کے بغیر صرف چارے پر صبح شام پکا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے۔"

لالی نے کہا: "پر تیرا اس سے کیا بنتا ہوگا؟"

"لے یہ کم ہے۔" شاداں نے چہک کر کہا: "ملک کی ماڑی پر سوجھی آتا ہے۔ روز کے روز دام چکا کر دودھ لے جاتا ہے۔ شام کو چاٹی میں دودھ بلو کر مکھن نکال لیتی ہوں۔ وہ بھی بک جاتا ہے۔" شاداں نے ذرا تامل کر کے کہا: "اور سُن ساڑی کی فصل پر کھیتی کی چنائی بھی کرتی ہوں۔ اچھی خاصی چوگ مل جاتی ہے۔ ملک کی حویلی میں بھی کام کاج کرتی ہوں۔ محنت کرنے کے معاملے میں اہری ہوں۔ پروا نہ کر لالی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"جب تو بہت سے کام کر لیتی ہے تو ایک کام اور کر۔" لالی مسکرا کر بولا: "مجھے پکڑوا دے۔ ایک اور نج آ جائے گی۔"

"گالی مت دے۔" وہ بگڑ کر بولی: "میں نے جتنی تیرے ہاتھ میں دے دی تھی۔ جتنی سے مار لے مجھے۔ پر ایسی بات نہ کہہ۔"

"تو مجھے پکڑوا دے گی تو مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ تجھے انعام ملے گا تو مجھے خوشی ہوگی۔" لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا: "شاداں! تو بڑی زوروں کی عورت ہے۔ منتی جائے چندن بن کر مہکتی جائے۔ بالے تجھے پہچان ہی نہ سکا۔ بالے تو ایک نمبر......"

شاداں نے اُسے بات پوری نہیں کرنے دی۔ جھٹ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی پکڑ لی مگر وہ فوراً چونک پڑا۔ شاداں کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا: "شاداں! تیرے ہاتھ کی چوڑیاں کہاں گئیں؟"

"توڑ ڈالیں۔ بالا جو مر گیا۔"

"تجھے ابھی تک اُس کا ہوکا ہے۔" لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اس طرح اُس کا سیاپا کرے گی تو ضرور جل جائے گی۔"

"اتنا ناراض کیوں ہوتا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی: "تو چاہتا ہے میں راکھواں ریشمین کپڑے پہنوں۔ سلاری باندھوں۔ دانتوں پر دنداسا ملوں۔ آنکھوں میں کاجل ڈالوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اُس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا: "بتا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بتاتا ہوں۔ ابھی بتاتا ہوں۔" لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ "ایسا کر پھانسی کے پھندے پر جا کر لٹک جا۔" شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی ذرا دیر چپ رہ کر بولا: "پیچھے سے کام لے [illegible] تیری تو مت ماری گئی ہے۔ آج نہیں تو کل چرچا ہوگا کہ بالے کو [illegible] گیا۔ ایسی بات زیادہ دنوں چھپی نہیں رہتی۔ خون سر پر چڑھ کر بولتا [illegible] تو صاف پکڑی جائے گی۔ کچھ تو سوچ۔ لگ تجھے کیا کہیں گے [illegible] ہی ہے تو ذلیل اور بدنام ہو کر کہیں مرنا چاہتی ہے۔" شاداں [illegible] کھڑی اُس کی باتیں سنتی رہی۔ لالی نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور شاداں کی طرف بڑھا کر بولا: "لے کل جا کر [illegible] بن لینا۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔" لالی نے نوٹ اُس کی ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ بند کر دیا: "سمجھ گئی نا میری بات کا مطلب؟"

"سمجھ گئی۔" شاداں نے سر ہلایا اور نوٹ لاچے کے ڈب [illegible] رکھتے ہوئے پوچھنے لگی: "یہ بتا تو اس وقت آیا کیسے؟" پھر کچھ سوچ کر بولی: "کپڑوں کے لیے آیا ہوگا۔ ہائے میں تو بھول ہی گئی [illegible] سے تو گیا ہے اُس کے بعد سے تو دو روز تک تھانے والے پوچھ پوچھ کر میرا مغز خراب کر دیا۔"

لالی نے جھٹ پوچھا: "کیا بتایا تو نے؟"

"میں نے کہہ دیا، دونوں بالے سے ملنے آئے تھے، اُس کا [illegible] بتانے تھے۔" وہ آہستہ سے ہنسی: "میں نے خوب ٹسوے بہائے [illegible] کر کہا وہ مجھے چاقو دکھا کر ڈراتے تھے۔ جان سے مار دینے کو کہتے تھے۔"

"تو تو ایک دم فرنٹ نکلی۔ دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی۔" لالی نے مسکرا کر کہا: "بالے کو پوچھتے تھے؟"

"پوچھتے تھے۔" شاداں نے نہایت مستعدی سے جواب دیا: "میں نے وہی بات کہی جو تایا جی سے کہی تھی۔" اُس نے لالی کا چہرہ [illegible] سے دیکھا: "کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟"

"ابھی تک تو ٹھیک ہی جا رہی ہے۔"

"پر تجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ زیر لب مسکرائی: "تیرا کیا بھروسا چور اُچکا جو ٹھیرا۔"

لالی اُس کی چوٹ اس طرح سہہ گیا جیسے گونگا چپ چاپ کڑوی دوا نگل جاتا ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: "آزما لے۔ لگا کر دیکھ لے۔ لے چل ملک کے پاس پکڑوا دے مجھے۔ بھاگوں گا نہیں۔ بھاگ جاؤں تو بیٹا [illegible] سے مونچھ منڈوا دینا۔" اُس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور ذرا آگے جھک کر بولا: "ایک رات تیرے پاس آؤں گا اور اُدھالا کر کے تجھے اڑا لے جاؤں گا۔"

شاداں ایک دم بھڑ گئی۔ جل کر بولی: "تو اپنے کنجر پن سے باز نہیں آئے گا۔" اُس نے غصے سے لالی کو گھور کر دیکھا: "تو کیا میرا اُدھالا

کرے گا۔ مر جاؤں گی پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

لالی ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا۔ "تو ضرور چلے گی۔ میرے سوا تجھے کوئی بھگا کر نہیں لے جا سکتا۔ تیرا اُدھالا تو میں کروں گا۔ شرط بدلے مجھ سے۔"
اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "آ، ہاتھ مار۔"

شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ کہنا چاہا۔ عین اُس وقت کمرے کے اندر آہستہ آہستہ کھانسنے کی آواز اُبھری۔ شاداں نے سہمی ہوئی نظروں سے اُس طرف دیکھا پھر سرگوشی کے انداز میں دھیرے سے بولی۔ "لگتا ہے تاجی جاگ گئی۔ تو اب جا۔"

لالی نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ چاند ڈوب گیا۔ اندھیرے میں صبح کا ہلکا ہلکا اُجالا اُبھر رہا تھا۔ اُس نے گھبرا کر کہا۔ "ہاں اب مجھے چلنا چاہیے۔ صبح ہونے والی ہے۔ کل کپڑے ورزی سے ضرور لے آنا۔ میں پھر آؤں گا۔" وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔

شاداں نے اُسے روک کر کہا۔ "ٹھہر میں بھی تیرے سنگ چلوں گی۔"

لالی آنکھ مار کر بولا۔ "رہنے دے ابھی وہ رات نہیں آئی۔"

"بکواس نہ کر۔" شاداں نے اُسے ڈانٹا۔ "تیرا ایسے جانا ٹھیک نہیں۔ چل میں تجھے گاؤں کے باہر رڑ کے نکڑ تک چھوڑ آؤں۔ بوری کو بھی ساتھ لے چلوں گی۔ کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گی بچاری کو اُسے موک لگ گیا ہے۔ سلوتری کو دکھانے پرلے گاؤں لے جا رہی ہوں۔"

لالی جاتے جاتے رُک گیا اور چوکنّا نظروں سے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ کھانسی کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔ شاداں نے بھینس کھولی۔ اُس کی گردن میں موٹی رسّی کا ڈاہا ڈالا اور اُسے ہنکاتی ہوئی لالی کے پاس پہنچی۔ دونوں گھر سے نکل کر گلی میں آ گئے۔ شاداں نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ ہر طرف دودھیا دُھند پھیلتی جا رہی تھی۔ گھروں سے رُک رُک کر مویشیوں کی اڑاٹ، بوڑھوں کے کھانسنے اور بچوں کے رونے کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔

شاداں نے گھروں سے اُبھرنے والی ملی جلی انسانی آوازوں سے پریشان ہو کر کہا۔ "جلدی کر۔ لیل بڑالا شروع ہو گیا۔"

لالی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تیز قدم اُٹھا کر چلنے لگا۔ دونوں سنسان گلی کوچوں سے گزرتے، درختوں کی آڑ لیتے آگے بڑھنے لگے۔ بھینس اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شاداں کبھی اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرتی، کبھی لاڈ سے اُس کی تھوتھنی سہلاتی اور اُسے ہنکانے کے لیے رُک رُک کر منہ سے "تت تت" کی آواز نکالتی۔ لالی صبح کا پھیلتا ہوا اُجالا دیکھ کر اور زیادہ تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کے جوتوں کی تیز رگڑ سے خاموشی میں آہٹ اُبھر رہی تھی۔ شاداں نے اُسے پھر ٹوکا۔ "اوئے لالی! دھیرے چل۔ ڈگڑ ڈگڑ نہ کر۔"

لالی نے پلٹ کر شاداں کو دیکھا۔ اپنی رفتار سست کر دی اور خاموشی سے شاداں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ چوکنّا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا۔ دونوں گاؤں سے نکل کر باہر آ گئے۔ اب رڑ شروع ہو گیا تھا۔ یہ کھلا میدان تھا۔ اس کے ایک طرف ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ صبح کی نرم نرم ہوا کے جھونکوں سے گندم اور جَو کی بالیاں جھومتیں اور خشک پتوں سے سرسراہٹیں ابھرتیں۔ رڑ اُس وقت سنسان پڑا تھا۔ اُس کی زمین سخت اور ہموار تھی۔ کہیں کہیں بارش سے زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ دن میں اُسے کھیل کود کے لیے استعمال کیا جاتا تھا مگر صبح کے سناٹے میں وہ چٹیل میدان نظر آتا تھا۔

دونوں کھیتوں کے ساتھ ساتھ رڑ سے گزرتے رہے۔ شاداں کے بال ہوا کے جھونکوں سے اُڑ اُڑ کر اُس کے صندلیں چہرے پر بکھر جاتے۔ وہ ہر بار اُنھیں سمیٹ کر پیچھے کرتی۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ اس طرح گردن اونچی کیے چل رہی تھی کہ اس وقت بھی سرکش اور طرح دار نظر آ رہی تھی۔ لالی چپ چاپ شاداں کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور اُس کے جسم کے دائرے اور پیچ و خم دیکھتا رہا۔ اب وہ نہ خوف زدہ تھا نہ بے چین۔ وہ شاداں کی پناہ میں خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا اور شاداں مٹیالے لاچے میں اپنے بھاری کولھے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلاتی آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ اپنی اوپر اُٹھی ہوئی گردن کو ہلکا سا خم دے کر اِدھر اُدھر دیکھتی جاتی۔ ایسے جیسے کُتیا اپنے پلے کی رکھوالی کرتے وقت چوکس نظر آتی ہے۔ سویرا دھیرے دھیرے بلندیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ ہر چیز خواب کے مانند دھندلی اور خاموش نظر آ رہی تھی۔ پھر اس خاموشی میں دُور سے گھوڑے کی ٹاپیں اُبھریں۔ شاداں گھبرا کر بولی۔ "ہائے مر گئی۔ یہ تو ملک جان پڑتا ہے۔"

لالی بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں ٹھٹک کر رُک گئے پھر دیکھتے دیکھتے کھڑی فصلوں کی آڑ سے ملک اللہ نواز خاں ایک پیچھے سے نکلا اور عین اُن کے سامنے آ گیا۔ وہ اپنی سفید گھوڑی پر مرغ کی طرح اکڑا بیٹھا تھا۔ اُس کے آگے بندوق رکھی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی اُس نے گھوڑی کی راس زور سے کھینچی اور شاداں سے پوچھنے لگا۔ "اتنے تڑکے سار کہاں چلی؟" یہ کہہ کر اُس نے شاداں کے پیچھے کھڑے ہوئے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔ "یہ کون ہے؟" شاداں نے کچھ کہنا چاہا مگر ملک پہلے ہی بول پڑا۔ "یہ وہی جیل سے بھاگا ہوا قیدی تو نہیں ہے؟ وہی جان پڑتا ہے۔" ملک نے غصّے سے ڈانٹ کر شاداں سے پوچھا۔ "ٹھیک ٹھیک بتا کون ہے یہ؟"

شاداں کچھ نہ بتا سکی۔ اُس کی آنکھیں خوف اور گھبراہٹ سے

ہوئی تھیں ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ بالکل ہونق نظر آ رہی تھی۔
شادان کو خاموش دیکھ کر ملک زور سے چیخا۔ "آج نکل کر نہیں جائے گا۔"
اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی بندوق اٹھائی اور لالی کو للکار کر بولا۔
"قدم اٹھایا تو گولی سے اڑا دوں گا۔"

"ملک جی!" شادان اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے لہجے میں عاجزی تھی لیکن ملک اس کی عاجزی سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ فلمی ولن کی طرح دہاڑا۔ "ہٹ جا میرے سامنے سے۔"

لالی خاموش کھڑا سوچ رہا تھا، یہ ملک کون ہوتا ہے۔ مجھ پر گولی چلانے والا۔ نہ یہ تھانے دار ہے، نہ سی آئی ڈی کا افسر وہ اس کا قیدی بھی نہیں تھا۔ نہ اس نے ملک کے گھر ڈاکا ڈالا تھا، نہ اس کی بیٹی یا بیوی کو اغوا کیا تھا مگر ملک بندوق تانے اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں غصے سے ابابیل کے پروں کی مانند پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس کی کلف دار پگ کے اونچے طرے کا بادبان ہوا سے لہرا رہا تھا۔ شادان ابھی تک لالی اور ملک کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھی۔ اچانک لالی نے پیچھے سے شادان کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گری۔ ملک کی نظر بھٹک گئی۔ لالی جھٹ قریب کھڑی ہوئی بھینس کی اوٹ میں جھک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔

ملک نشانہ باندھتے ہوئے چلا کر بولا۔ "باہر نکل نہیں تو میں گولی چلا دوں گا۔"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپکے سے چھری نکالی اور بھینس کی ٹانگوں کے بیچ سے ملک کی جانب تیزی سے پھینکی۔ چھری گھوڑی کی ایک ٹانگ چیرتی ہوئی گوشت میں پیوست ہو گئی۔ گھوڑی نے ہنہنا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں۔ ملک بے قابو ہو گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور چیختی ہوئی بھینس کے پیٹ میں اتر گئی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے ہوا۔ ملک کی گھوڑی ہنہناتی ہوئی سرپٹ بھاگی۔ ملک اس کی پیٹھ پر بیٹھا اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر گھوڑی نہ رکنا تھی نہ رکی۔ دوڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ ملک کی بندوق بھی ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

لالی نے تیزی سے دوڑ کر بندوق اٹھا لی۔ اس میں ابھی ایک کارتوس موجود تھا۔ وہ بندوق اٹھا کر پلٹا۔ شادان کی بھینس زور زور سے ڈکرائی۔ چند قدم بھاگی پھر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس کے پیٹ سے خون نکل کر دور تک زمین پر پھیل گیا۔ بھینس بے بسی سے گردن ہلا کر زمین پر منہ رگڑنے لگی۔ شادان دوڑ کر زخمی بھینس سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔ اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ دونوں آنکھیں

چکوال سے
منتخب: سلطانہ ملک
کی ڈاک

دریچے

ارسطاطالیس فلسفے ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتا تھا اور مال و متاع سے یکسر بے نیاز تھا۔ ایک مرتبہ اس کے ایک عقیدت مند رئیس نے سنگ مرمر کا عالی شان محل تیار کروایا اور ارسطاطالیس کو دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ محل میں گھومتے ہوئے معاً ارسطاطالیس نے رئیس کے منہ پر تھوک دیا۔ رئیس سخت جز بز ہوا۔ ارسطاطالیس کہنے لگا۔ "میں سنگ مرمر کے شفاف فرش اور دیواروں پر تھوکتا۔ تمہارے چہرے کے سوا کوئی مناسب جگہ دکھائی نہیں دی۔"



انسان دیکھے جا سکتے ہیں، توڑے جا سکتے ہیں، تم انہیں پکڑ سکتے ہو، ان پر ظلم کر سکتے ہو، انہیں قید کر کے ان پر مقدمہ چلا سکتے ہو اور تختۂ دار پر لٹکا سکتے ہو لیکن خیالات پر اس طرح قابو نہیں پایا جا سکتا۔ خیالات نامحسوس طور پر پھیلتے ہیں، نفوذ کرتے ہیں، چھپ جاتے ہیں اور اپنے مٹانے والوں کی نگاہوں سے مخفی ہو جاتے ہیں۔ دل کی گہرائیوں میں چھپ کر نشوونما پاتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں، جڑیں نکالتے ہیں۔ تم بے احتیاطی کے باعث ظاہر ہو جانے والی شاخیں جتنی کاٹو گے، اتنا ہی ان کی زمین دوز جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔"
(الیگزینڈر ڈوما)

اشکوں سے آبشار بن گئیں۔ لالی بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا بھینس کے قریب پہنچ گیا۔ شادان نے پلٹ کر اسے دیکھا اور سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تو گیا نہیں؟"

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا بھینس کو تڑپتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ "شادان! تیری بوری مر رہی ہے۔"

"دیکھ رہی ہوں۔" وہ چیخ کر بولی۔ "پر تو یہاں سے جا۔" لالی چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں بھینس کے پیٹ سے ابلتے ہوئے لال لال خون پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک شادان اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے بولی۔ "کھڑا کیوں ہے؟ جا یہاں سے ملک اپنے آدمیوں کو لے کر آتا ہی ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ لالی پر جھپٹی اور اسے زور سے دھکا دے کر بولی۔

"جا، جلدی سے نکل جا یہاں سے۔"

لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور مڑ مڑ کر شادان اور اس کی تڑپتی ہوئی بھینس کو دیکھتا رہا مگر جب وہ اس راستے کی جانب بڑھا جدھر سے گاؤں میں داخل ہوا تھا تو اس نے دیکھا۔ خریف کی فصل کی کٹائی کے لیے کھیتوں میں جانے والے کئی ہالی بیل پنجالی لیے سامنے کھڑے تھے اور اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لالی کی ان پر نظر پڑی تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق اٹھائی اور اس کی نال ان کی طرف کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر بیل اور پنجالی چھوڑ چھاڑ بھاگے۔ لالی نے ان کی سراسیمگی سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ کھیتوں میں داخل ہو کر ایک پگڈنڈی پر تیزی سے دوڑنے لگا۔ اب

اُسے دُور سے ملی جلی انسانی آوازوں کا بول براانسانی دے رہا تھا آوازیں رڑک کی جانب سے آرہی تھیں جہاں شاداں کی زخمی بھینس دم توڑ رہی تھی۔ وہ پگڈنڈیوں اور بیہوں سے گزرتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا رہا گیا۔ آوازیں مدھم اور مدھم ہوتی گئیں۔

کھیتوں سے نکل کر وہ ایک پڑتلی میں آگیا۔ پڑتلی میں دُور دُور تک جنگلی جھاڑیاں اور اُونچی اُونچی گھاس تھی۔ زمین خشک اور ریتلی تھی۔ اب صبح کا اُجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ چڑیوں کے غول کے غول پھرّا مار کر جھاڑیوں سے نکلتے اور چہچہاتے ہوئے فضا میں بکھر جاتے۔ لالی نے بندوق گھنی جھاڑیوں کے نیچے ایک گڑھے میں ڈال دی اور اُسے خشک پتوں اور پتھروں سے چھپا دیا۔ اب لالی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود رو پودے روندتا جھاڑیوں اور اُونچی اُونچی گھاس کے درمیان راستہ بناتا، جدھر منہ اُٹھا اُسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کدھر جا رہا تھا۔

جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے بھری ہوئی پڑتلی ختم ہوئی تو اُسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سامنے سڑک تھی۔ سڑک صبح کے اُجالے میں سانپ کی طرح بل کھاتی دُور تک چلی گئی تھی۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور غیر آباد علاقہ تھا اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں کہیں مٹی اور ریت کے تودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ اُس نے دو ڈھائی میل کا راستہ طے کیا تو دُور سے ہریالی نظر آئی۔ آگے بڑھا تو کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نہر ملی۔ اب سورج نکل آیا تھا۔ نہر کا پانی ہلکی ہلکی دھوپ میں جھلملا رہا تھا۔ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی۔ لالی نے نہر دیکھی تو بے قرار ہو کر سڑک کے نیچے اُترا اور نہر کے قریب گیا۔ اُسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس نے چلو میں پانی بھر بھر کر پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور نہر کے کنارے لیٹ گیا۔ نرم اور خنک ریت پر لیٹ کر اُسے بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آئے تو نیند سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں مگر وہ سویا نہیں۔ ذرا دیر سستا کر پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر سڑک پر آگیا۔ اُس نے پل عبور کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اب دن نکل آیا تھا اور اُسے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جہاں وہ روپوش ہو کر دن گزار سکے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دُور تک پھیلتا چلا گیا تھا اور اُن کے پیچھے گاؤں کے مکانات نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ ہی دُور آگے بڑھا تھا کہ ایک لاری شور مچاتی دھول اڑاتی سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ سڑک سے اُتر کر نشیب میں آگیا۔ لاری سڑک پر دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ لالی پھر سڑک پر آگیا۔ اس نے ڈیڑھ سوا فرلانگ کا راستہ طے کیا تو اُسے سڑک سے ایک کچا راستہ گاؤں کی طرف جاتا نظر آیا۔ یہی کچا راستہ سڑک کے دوسری طرف بھی جاتا تھا۔ دور تک طرف لاگھا تھا۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے تھے اور اُن کے درمیان جَو کے پودے لہلہا رہے تھے۔ چنے اور سرسوں کے کھیت بھی ہوا زور سے چلتی تو سرسوں کے پیلے پیلے پھول کسی الھڑ مٹیار کے دوپٹے کے آنچل کی طرح لہراتے نظر آتے۔ ایک سانڈنی سوار کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر گرد کے بگولے اڑاتا دُور جاتا نظر آ رہا تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر لالی مخمصے میں پڑ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائے اور کون سا راستہ اختیار کرے۔ وہ خاموش کھڑا سانڈنی سوار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس اثنا میں اُسے اپنی پشت پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک شخص آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھ رہا تھا، وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اُس کا لباس اُجلا تھا، آنکھوں پر عینک تھی، سر پر سفید پگڑی تھی۔ داڑھی کے بال کھچڑی تھے۔ قریب آ کر اُس نے لالی سے پوچھا۔ "کیا تم لاری سے اُترے ہو؟" لالی اس بات کا جواب فوراً نہ دے سکا۔ اُسے خاموش دیکھ کر وہ شخص مسکرایا اور کہنے لگا۔ "مجھے بھی اسی لاری سے جانا تھا۔ پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ لاری نکل گئی۔"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی ابھی گئی ہے جی۔"

"یہ لاری تو کوٹ لنگر سے آرہی تھی۔ تم بھی وہیں سے آئے ہو؟" یہ کہہ کر لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولا۔ "ایسا لگتا ہے تم غلط جگہ آ گئے۔" لالی اُس کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اُسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے نہ اُسے آگے کا پتہ تھا، نہ پیچھے کا۔ وہ پہلے کبھی اس طرف آیا ہی نہیں تھا۔ اُسے خاموش پا کر وہ شخص بولا۔ "تم آگے چلے آئے۔ تمھیں پیچھے اُترنا تھا۔ سفر میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اسی لاری سے میں چیلی پہاڑ جا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا، جھونک آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیپال پور میں تھا۔ چیلی پہاڑ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔" اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کو رکا۔ "مگر واپسی کے لیے تمھیں شام سے پہلے کوئی لاری نہیں ملے گی۔ اس سڑک پر پچھلی بارشوں کے بعد بہت کم لاریاں چلتی ہیں۔ سڑک ٹوٹ پھوٹ کر بہت خراب ہو گئی ہے۔ پہلی لاری صبح صبح نکل جاتی ہے۔"

لالی کو وہ بھلا آدمی لگا۔ اُس کے لہجے میں نرمی اور شفقت تھی مگر لالی خاموش رہا۔ وہ ابھی تک بھونچکا تھا اور خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کر سکا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرے۔ اسے

پھسلا کر لوٹ لے یا اس کے جذبۂ ہمدردی سے فائدہ اُٹھا کر کسی قسم کی درخواست کرنے کی کوشش کرے۔ جب لالی نے اُس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کہا اور گم صم کھڑا رہا، تو وہ شخص کہنے لگا: "تم کس سوچ میں پڑ گئے؟"

آخر لالی کو بولنا پڑا۔ اُس نے بات بنائی: "بات یہ ہے جی! میں یہاں دوسری بار آیا ہوں۔ کئی سال پہلے آیا تھا، رات کا وقت تھا یاد پڑتا ہے اسی جگہ اُترا تھا۔"

اُس نے پوچھا: "لاری سے آئے تھے یا تانگے سے؟"

"آیا تو لاری ہی سے تھا۔" لالی نے گاؤں کی طرف نظر ڈالی جس کے مکانات درختوں کے پیچھے سے نظر آ رہے تھے پھر اُس نے پلٹ کر سڑک کے اُس پار لاگے کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا: "کچھ سمجھ میں نہیں آتا، یہی جگہ تھی یا کوئی اور۔"

"کوئی بات نہیں۔" اُس شخص نے درختوں کی سمت ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا: "یہ رہا اپنا گاؤں۔ تم چاہو تو شام تک میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہو۔ یہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے پریشان ہو گے۔ آؤ میرے ساتھ، جہاں تمھیں جانا ہے پہنچا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

لالی انکار نہیں کر سکا، چُپ چاپ اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ دونوں کچھ دُور کچے راستے پر چلتے رہے پھر وہ ایک پہیے کی جانب مڑ گیا۔ لالی بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے اور جب پہیا طے کر کے باہر آئے تو گاؤں شروع ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ دُور نہیں گئے۔ ایک دو منزلہ پختہ مکان کے سامنے ٹھہر کر اُس شخص نے کہا: "لو جی! یہ رہی اپنی ماڑی۔ یہ گھر کا گواڑا ہے۔ ساتھ ہی میں ڈیرا ہے۔ بیٹھک بھی اُسی طرف ہے۔ اُدھر ہی چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر گپ شپ ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ مکان کے ساتھ ساتھ چلا اور سیدھے ہاتھ کو مڑ گیا۔ مکان کے آگے آم اور سرس کے پیڑ تھے۔ اُن کے نیچے ایک چارپائی بچھی تھی۔ اُس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا: "تم یہاں بیٹھو۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا وہ جس طرف سے آیا تھا، اُسی طرف واپس چلا گیا۔

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اُس کے سامنے مکان کا جو حصہ تھا، اُس کے آگے کھلا ہوا نیچی چھت کا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور اُس کے ساتھ ہی کھڑکی بھی تھی۔ برآمدہ اُس وقت خالی پڑا تھا۔ مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اُس کے گرد و نواح میں صرف چند کچے مکانات تھے۔ لالی نے گاؤں صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ اُس میں کئی اور بھی دو منزلہ مکانات تھے۔ گاؤں اپنی آبادی اور رونق کے اعتبار سے خاصا بڑا تھا اور جاں گیرہ کے مقابلے میں تو بہت بڑا تھا۔ مکان دیکھ کر لالی کو اندازہ ہو گیا کہ اُس کا میزبان گاؤں کا کھاتا پیتا

آدمی ہے مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ درختوں کے ... ہوا چل رہی تھی۔ لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اُس ... نے دل میں کہا کہ دن گزارنے کے لیے اچھا ٹھکانا مل گیا ... جاؤں گا۔ موقع ملا تو شاداں سے مل لوں گا اور پچھلی رات کے ... میں معلوم کروں گا کہ بعد میں اُس پر کیا بیتی اور اگر وہ وردی لے آئی ہو گی تو آج ہی رات رحیم داد کو جیل کی وردی ... دوں گا پھر آگے جانے کا پروگرام بنے گا مگر شاداں کے گھر ... اُسے خطرے کا بھی احساس ہوا۔ اتنے سنگین واقعے کے بعد گاؤں ... کھلبلی مچ گئی ہو گی۔ ملک اللہ نواز بہت غصے میں ہو گا۔ ہو سکتا ... اُس نے پولیس کو بھی بلایا ہو۔

لیکن شاداں کے گاؤں کی طرف جانا اُس کے لیے ... رحیم داد کے پاس پہنچنے کا راستہ اسی طرف سے جاتا تھا۔ کوئی ... لالی جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی سوچ میں گردن جھکائے خاموش ... تھا۔ ذرا دیر بعد اُس نے نظریں اُٹھائیں تو دو کانسٹیبل سامنے سے ... نظر آئے۔ لالی لرز کر رہ گیا۔ اُس نے سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا ... بھاگ کر کسی گلی میں گھس جانے کا ارادہ کیا۔ عین اُس وقت دالان کی ... طرف سے آواز آئی: "اِدھر بیٹھک میں آ جاؤ۔ کچھ کھا پی لو۔ تم نے ... سے کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا۔"

لالی نے دیکھا کہ برآمدے میں اُس کا میزبان دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ لالی تو اُس وقت چاہتا بھی یہی تھا۔ فوراً اُٹھا اور برآمدہ عبور کر کے بیٹھک کے اندر چلا گیا۔ بیٹھک صاف ستھری تھی۔ ایک طرف اونچے پایوں کا پلنگ تھا، اُس پر اُجلا بستر تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ مونڈھے تھے دو تین کرسیاں تھیں اور ایک میز بھی تھی۔ میز پر لیمپ رکھا تھا اور اُس کے قریب ہی چند پرانے اخبار پڑے تھے۔ دیوار میں پر رنگین ... لگے تھے۔ ایک بڑا سا آئینہ بھی میز کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ اُس شخص نے لالی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک مونڈھا کھینچ کر بولا: "میں تو جی اس گڑے پر بیٹھوں گا۔ مجھے تو اسی پر بیٹھنے میں آرام ملتا ہے۔"

لالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھجکا۔ میزبان نے اصرار کر کے اُسے کرسی پر بٹھا دیا۔ ذرا دیر میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت دوپٹے کے آنچل سے سر ڈھانکتی ہوئی اُس دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اُس نے حقہ مونڈھے کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اُس شخص نے حقے کی نے سنبھالتے ہوئے عورت سے کہا: "جنتے! کھانے کو کچھ روٹی شوٹی لا۔ جلدی کر۔"

"ابھی لائی جی۔" یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ وہ شخص ذرا دیر چپ چاپ حقہ گڑ
گڑاتا رہا۔ ذرا دیر بعد جننتے لوٹے میں پانی لائی۔ لالی نے باہر جا کر
منہ دھویا پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص کہنے لگا: "برخوردار! تم سوچتے
ہو گے میں کون ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا: "میرا
نام محمد ہے مگر لوگ مجھے ماسٹر جی کے نام سے جانتے ہیں۔ بات
یہ ہے برخوردار کہ میں پہلے سکول ماسٹر تھا۔ جب پاکستان بنا تو میں
ضلع حصار میں سکول ماسٹر تھا۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو لٹ پٹ
کر پاکستان آ گیا۔ کچھ دن ٹھوکریں کھاتا رہا۔ پھر پاک پٹن میں سکول ماسٹر
لگ گیا۔ حصار میں اپنی کچھ زرعی آراضی تھی۔ اس کا کلیم داخل کیا، بھاگ
دوڑ کی تو میرا کلیم منظور ہو گیا اور اس چک میں الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ میں
سکول ماسٹری چھوڑ چھاڑ یہاں آ گیا۔ اب غلہ منڈی میں آڑھت کا
کاروبار بھی کرتا ہوں۔ دو مربعے کے لگ بھگ نہری زمین ہے۔ اللہ
کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ عزت کے ساتھ گزر رہی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش
رہا پھر پوچھنے لگا: "برخوردار! تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ
نہیں بتایا؟"

لالی صاف جھوٹ بول گیا: "سرفراز... جی میرا نام محمد سرفراز ہے۔"

"اچھا، اچھا۔" وہ مسکرایا، ذرا دیر بعد پھر اس نے پوچھا: "اِدھر
کیسے آنا ہوا؟"

"ایک دوست کے پاس آیا تھا۔"

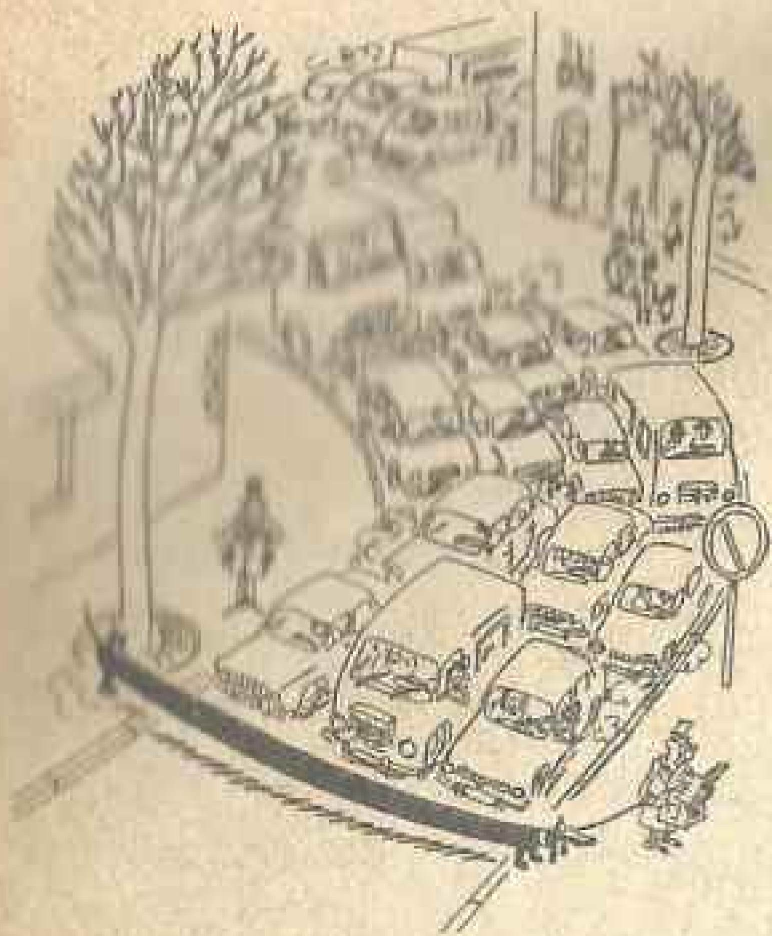
"کیا نام ہے اس کا؟"

"جی وہ۔" لالی ذرا سا اُلجھا: "اس کا نام رحمت ہے۔"

ماسٹر جی کچھ سوچتے ہوئے بولا: "وہی تو نہیں جو محمد حنیف پٹواری
کا بیٹا ہے؟"

"مجھے اس کے باپ کا نام تو معلوم نہیں جی۔"

"اگر یہ وہی رحمت ہے تو وہ اب اِس گاؤں میں نہیں رہتا۔"
ماسٹر جی نے حقے کا کش لگا کر کہا: "اس نے ریلوے میں نوکری کر لی
ہے۔ کبھی کبھار گاؤں آتا ہے۔" ماسٹر جی کچھ اور کہنا چاہتا تھا، اِسی
اثنا میں جننتے ناشتہ لے کر آ گئی۔ اس نے دری پر دسترخوان بچھایا
اور ناشتے کا سامان اس پر رکھ دیا۔ ناشتے میں پراٹھے تھے، تلے ہوئے
انڈے تھے، مکھن تھا اور چائے بھی تھی۔ ماسٹر جی نے لالی کو مخاطب
کر کے کہا: "لو برخوردار! کچھ ناشتہ پانی کر لو۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھا اور
دسترخوان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
ماسٹر جی کہنے لگا: "میں نے تو صبح ہی ناشتہ کر لیا تھا۔ تمہارا
ساتھ دینے کے لیے صرف ایک پیالی چائے پیوں گا۔ تم میرا خیال نہ
کرنا، اطمینان سے کھاؤ۔ کسی تکلف و تکلف کی مطلق ضرورت نہیں۔"



لالی خاموشی سے بیٹھا ناشتہ کرتا رہا اور ماسٹر جی اُسے اپنے
کاروبار اور زمین داری کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں سناتا رہا۔
ناشتے سے فارغ ہو کر لالی پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماسٹر جی نے اٹھ کر
میز سے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔ جننتے آ کر دسترخوان اور برتن
اٹھا کر لے گئی۔ ماسٹر جی نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور کہنے لگا۔
"لو جی! یہ تو اپنے ہی ضلع کی خبر ہے۔ دو قیدی شاہ پور جیل سے
نکل بھاگے۔ ہفتے بھر سے اوپر ہو گیا۔ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں
لگے۔ دو ہزار کا انعام بھی مقرر ہوا۔ تب بھی نہ پکڑے گئے۔" وہ مسکرایا۔
"پکڑے بھی کیسے جائیں، سب ملی بھگت ہے۔" لالی نے کوئی تبصرہ
نہیں کیا، وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ ماسٹر جی
نے اُسے خاموش دیکھ کر کہا: "سرفراز! تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔
سو جاؤ۔" مگر دوسرے ہی لمحے اس نے لالی کو سونے سے منع کر دیا۔
"بھئی! پہلے تم حجامت بنوا لو بہت بڑھ گئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔
"میں نائی کو بھیجتا ہوں۔ تم حجامت بنوا لو۔ پچھواڑے مویشیوں کا کمرا
ہے۔ وہاں کنواں بھی ہے۔ جی چاہے تو نہا لو پھر اطمینان سے سو جانا۔"
ماسٹر جی کے اٹھتے ہی لالی بھی احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر جی گھر کے
اندر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا پھر رک کر بولا: "میں
گھوڑی پر بیٹھ کر منڈی چلا جاؤں گا۔ ویسے سائیکل بھی ہے مگر
مجھے گھوڑی کی سواری پسند ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آ
جاؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کنڈی کھٹکھٹا کر جننتے کو بلا لینا۔ اُدھر
ڈیرے پر کمی اور کئی نوکر چاکر موجود ہیں۔"
ماسٹر جی گھر کے اندر چلا گیا لالی اس کے جانے کے بعد بھی

خوف زدہ رہا۔ کانسٹیبلوں کو وہ پہلے ہی گاؤں میں دیکھ چکا تھا اور ماسٹر جی نے خبر جس طرح پڑھ کر سنائی تھی، اُس نے اُسے طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کر دیا۔ باہر جانا خطرناک تھا اور کمرے میں بیٹھے رہنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ خاموش بیٹھا آنے والے خطرے کا انتظار کرتا رہا مگر خطرہ نہیں آیا۔ نائی آ گیا۔ اُس نے لالی کی بڑھی ہوئی داڑھی صاف کی، مونچھیں کاٹ چھانٹ کر درست کیں اور سر کے بال بھی تراش دیے۔ اُس نے حجامت بناتے ہوئے لالی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر لالی نے اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کی؛ خاموش بیٹھا رہا۔ نائی پھر بھی خاموش نہ رہا۔ گاؤں کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں بتاتا رہا۔

حجامت بنانے کے بعد نائی چلا گیا لیکن لالی سو نہ سکا۔ وہ نہانے کے لیے کنویں پر بھی نہیں گیا۔ بستر پر لیٹ گیا مگر بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جنتے کھانا لے کر آ گئی۔ کھانا پُرلطف اور خوش ذائقہ تھا۔ لالی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا کھایا، پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکا ہوا بھی تھا۔ لیٹتے ہی ایسی گہری نیند سویا کہ چراغ جلے آنکھ کھلی۔

اُس نے دیکھا کہ لیمپ روشن ہے اور فیض محمد عرف ماسٹر جی سامنے مونڈھے پر بیٹھا ہے۔ اُسے بیدار دیکھ کر ماسٹر جی نے کہا: "برخوردار! تمہاری لاری تو نکل گئی۔ میں دن ڈھلے ہی واپس آ گیا تھا لیکن تم اس قدر گہری نیند سو رہے تھے کہ جگانے کو جی نہ چاہا۔" اُس نے ذرا سا توقف کیا: "کوئی ضروری کام تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔" لالی نے آہستہ سے کہا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

ماسٹر جی اُس کی بات سن کر بولا: "تب تو ٹھیک ہے۔ ویسے میں نے معلوم کیا تھا۔ رحمت تین روز بعد آ رہا ہے، کیوں نہ اُس کا انتظار کر لو۔"

لالی پریشان ہو گیا۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ بات یہ تھی کہ وہ سرے سے کسی رحمت کو جانتا ہی نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت اُس کی زبان پر یہی نام آیا ورنہ وہ کوئی دوسرا نام بتا دیتا مگر اب رحمت اُس کے لیے زحمت بن گیا تھا اور اس مسئلے کا واحد حل اُس کی سمجھ میں یہ آیا کہ رحمت کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ گاؤں سے نکل جائے۔ ساتھ ہی اُسے رحیم داد کا بھی رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ رحیم داد اکیلا تھا اور لالی نے رات تک اُس کے پاس پہنچنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر ماسٹر جی نے کہا: "برخوردار! تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ اب آئے ہو تو رحمت سے مل کر ہی جانا۔ تین ہی دن کی تو بات ہے۔ تکلف چھوڑ دو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک چاہو ٹھہرو۔"

لالی بولا: "صبح نہیں تو کل شام ضرور چلا جاؤں گا۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا جی!"

"جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے میں تو یہی کہوں گا کہ تمہیں رحمت سے مل کر جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر ماسٹر جی نے ذرا سا تامل کیا اور جھجکتے ہوئے کہا: "بھئی بُرا نہ ماننا، سنا ہے رحمت کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ بازاری عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔"

لالی نے فوراً کہا: "مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو جی اُس سے کئی دنوں سے نہیں ملا۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔" ماسٹر جی نے کہا: "وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ نوکری کے بعد اُس نے پَر پُرزے نکالے ہیں۔ برخوردار! میں تو کہتا ہوں لڑکے کو جوان ہوتے ہی شادی کی زنجیر میں باندھ دینا چاہیے۔ زمانہ بہت بُرا ہے۔ محمد حنیف نے یہی غلطی کی۔ میں نے سمجھایا بھی مگر میری بات سن کر ٹال گیا۔ کہنے لگا، لڑکے کی مرضی نہیں۔ بھئی اب دیکھ لڑکے کی مرضی۔" وہ کھل کر مسکرایا۔ اُس نے لالی کو غور سے دیکھا: "تم نے تو اپنا گھر بسا لیا ہوگا؟"

"نہیں۔" لالی معصوم سی صورت بنا کر بولا: "بات یہ ہے جی، ماں باپ تو اپنے ہیں نہیں۔ بھائی بہنیں بھی نہیں۔ بالکل اکیلا ہوں۔" وہ رُکا اور آہستہ سے بولا: "نوکری چاکری بھی نہیں۔ رحمت کے پاس اسی لیے آیا تھا۔"

لالی کی بات سن کر ماسٹر جی نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ لالی نے اُس کا یہ رویّہ دیکھا تو دل ہی دل میں پچھتایا کہ اُس نے ماسٹر جی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ناحق ایسی بات کہی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے اپنی پریشان حالی بتا کر خود کو ماسٹر جی کی نظروں میں گرا لیا تھا۔ ذرا دیر بعد ماسٹر جی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے: "کھانا آ جائے گا۔ تم اکیلے ہی کھا لینا۔ میں رات کا کھانا نہیں کھاتا۔ عشا کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتا ہوں۔ یہ میرا روزمرہ کا معمول ہے۔ اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔ فجر کی اذان سے پہلے سیر کے لیے حصار سے باہر نکلنے کا حکم نہیں۔" اُس نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے چند لمحے خاموش رہ کر کہا: "کھڑکی کھول دینا۔ بہت اچھی ہوا آتی ہے۔ کمرے میں گرمی ہو تو باہر چارپائی پڑی ہے۔ ڈیرے سے رحمان کو بُلا لینا۔ بستر لگا دے گا۔"

لالی نے کہا: "نہیں جی! یہیں ٹھیک ہے۔ میں کھڑکی کھول لوں گا۔ آپ پروا نہ کریں۔"

ماسٹر جی نے کہا: "تم دن بھر سوتے رہے ہو۔ نیند جلدی نہیں

نکال کر باہر برآمدے میں ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ ذرا دل بہل
جائے گا پھر کھانا کھا کر سو جانا۔ ابھی تو سمجھو رات شروع ہوئی ہے۔"
وہ چلا گیا۔ لالی چاہتا بھی یہی تھا کہ ماسٹر جی زیادہ دیر اس
کے پاس نہ ٹھہرے۔ وہ بیٹھا رہتا تو باتیں بھی کرنی پڑتیں۔ نت نیا
جھوٹ بولنا پڑتا۔ ماسٹر جی سے بات کرتے ہوئے وہ یوں بھی کتراتا
تھا۔ کم بولتا اور بہت سنبھل سنبھل کر بولتا۔ اسے ہر لمحے دھڑکا
لگا رہتا۔ اس کا بازاری لب و لہجہ کہیں اس کا بھرم نہ کھول دے۔ ماسٹر
جی کے جانے کے بعد لالی کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔ کچھ دیر خاموش
بیٹھا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے نیچے جاکر ٹہلنے لگا۔ گاؤں
کی چہل پہل اب اجڑتی جا رہی تھی۔ سناٹا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا مگر
وہ دور نہیں گیا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں ٹہلتا رہا۔ رات کے اندھیرے
تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا پھر دالان
میں کسی عورت نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ "روٹی کھا لو بابو جی!"
لالی خاموشی سے کمرے میں چلا گیا مگر وہاں جنتے نہیں ایک
دوسری عورت کھڑی تھی۔ وہ ڈھلتی عمر کی عورت تھی۔ عمر تیس سال
سے زیادہ نہ تھی مگر سخت محنت اور خوراک کی کمی نے اس کی جوانی کا
چراغ وقت سے پہلے ہی مدھم کر دیا تھا۔ لالی چپ چاپ دسترخوان
کے قریب جاکر کھانا کھانے لگا۔ عورت دروازے کے قریب چپ
چاپ کھڑی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مڑ کر اسے دیکھا۔ "کیا
نام ہے تیرا؟"
"ربیا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں رحمان کی گھر والی ہوں۔"
"اچھا۔ ذرا پانی تو پلا۔"
ربیا نے گلاس میں پانی بھر کر دیا۔ لالی نے پانی پیا اور اٹھ کر
کھڑا ہوگیا۔ ربیا نے برتن سمیٹے، دسترخوان اٹھایا اور چلتے چلتے لالی
سے پوچھا۔ "کوئی اور کام ہو تو جی بتا دیں۔ مجھے گھر جاکر ابھی اور کام
کاج کرنا ہوگا۔"
"نہیں اب تو جا۔"
ربیا خاموشی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔
لالی ذرا دیر تک کرسی پہ بیٹھا رہا پھر اس نے اٹھ کر برآمدے میں
کھلنے والا دروازہ بند کیا، کھڑکی کھول دی، پھونک مار کر لیمپ بجھایا
اور بستر پہ دراز ہوگیا۔ وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔
پھر وہ پلنگ سے نیچے اترا اور کھڑکی پہ جاکر کھڑا ہوگیا۔ پہر رات گزر
چکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سنسان گاؤں اونگھتا ہوا نظر آرہا تھا۔
کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اس نے سوچا کہ اسے یہاں سے چلا
جانا چاہیے۔ رحیم داد اس کا انتظار کر رہا ہوگا مگر خالی ہاتھ رحیم داد کے
پاس جاکر وہ کیا کرتا۔ جب تک رحیم داد کے جسم پہ جیل کی وردی تھی،
لالی کا ہر مقصد ادھورا تھا پھر کچھ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ اس دروازے
پہ گیا جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس نے دروازہ ہولے ہولے ہلایا۔ وہ
اندر سے بند تھا۔ لالی کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ چپ چاپ بستر پہ جاکر
لیٹ گیا اور کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا۔
سویرے بہت تڑکے ماسٹر جی نے اسے بیدار کیا اور اصرار کرکے
باہر لے گیا۔ دالان سے نکل کر وہ لالی کے ہمراہ گھر کے پچھواڑے گیا جہاں
کمرے میں اس کے مویشی اور ڈھور تھے۔ وہ ایک بھینس کے پاس گیا جو
کھرلی میں منہ ڈالے چارہ کھا رہی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ماتھے
اور کھروں پہ سفید نشان تھے۔ ماسٹر جی نے بھینس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیر کر
بڑے فخر سے کہا۔ "برخوردار! یہ نیلی ہے۔ اس کے کھروں اور ماتھے پہ سفید
سفید چتیاں دیکھ رہے ہو۔ ایسی مج کو پنج کلیان بھی کہتے ہیں۔ یہ دھرلی
ہے۔ پچاس سیر دودھ دیتی ہے۔"
پھر اس نے قریب کھڑی ہوئی بھوری بھینس کی گردن جھک
کر آہستہ آہستہ سہلائی، کہنے لگا۔ "یہ بھی دھرلی ہے۔ اس کا کٹا مر گیا۔ صرف
چارے پر دودھ دیتی ہے۔ اس طرح اب یہ بچھاڑو رہ گئی ہے۔ صبح شام
اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے۔ یہ بھی اعلا نسل کی مج ہے۔" ماسٹر جی نے
فخر سے گردن اٹھائی۔ "یہ نیلی بار کی مشہور مج ہے۔ پنج کلیان کے ساتھ
میں اسے بھی میلے سے خرید کر لایا تھا۔ منہ مانگی قیمت دی تھی۔"
لالی نے بھوری بھینس کو غور سے دیکھا اور دیر تک اس کے
پاس کھڑا رہا۔ بار بار اس کی چکنی پیٹھ اور گردن پہ پیار سے ہاتھ پھیرتا
رہا۔ بھینس پہ لالی کی شفقت دیکھ کر ماسٹر جی خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ "ابھی
کی انگوٹ تو نہیں ہوئی پھر بھی اس کا دودھ گاڑھا ہوتا ہے اور اس
سے عجیب طرح کی مہک آتی ہے۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو کہ دودھ
کا گلاس منہ سے لگاؤ تو ہٹانے کو جی نہ چاہے۔"
ماسٹر جی دونوں بھینسوں کے پاس کھڑا ان کی خصوصیات بتاتا
رہا۔ پھر وہ دوسری دو بھینسوں اور گائے کے پاس گیا اور ان کے بارے
میں بتاتا رہا۔ آخر میں وہ گھوڑی کے پاس گیا اور اس کی خوبیاں
گنانے لگا۔ جب دھوپ درختوں سے نیچے اترنے لگی تو دونوں کمرے
سے واپس کمرے میں آئے۔ ناشتہ تیار تھا۔ دونوں نے ساتھ بیٹھ کر
ناشتہ کیا۔ ناشتے پہ بھی ماسٹر جی اپنی بھینسوں اور گھوڑی کے بارے
میں باتیں کرتا رہا۔ لالی اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتا رہا۔ اس
نے ناشتہ جان بوجھ کر تاخیر سے کیا۔ وہ صبح کی بس سے جانا نہیں چاہتا
تھا۔ ماسٹر جی نے بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی بلکہ بار بار یہی
کہتا رہا کہ اسے رحمت سے مل کر جانا چاہیے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ

زیادہ دیر لالی کے پاس نہیں ٹھیرا۔ ہُوا یہ کہ اُس کے کچھ ملنے والے آ گئے۔ اُس نے انھیں کمرے کے اندر نہیں بُلایا۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں گیا اور اُن کے ساتھ درختوں کے نیچے پڑی ہوئی چارپائی پر کچھ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا پھر اُن کے ساتھ ہی اُٹھ کر کہیں چلا گیا۔

دوپہر کو ماسٹر جی لالی کے پاس آیا اور اُس کے لیے سگریٹ کے پیکٹ اور ایک کنگھا بھی لایا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا مگر خلافِ معمول ماسٹر جی چپ چپ تھا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اُس نے کھانا بھی رغبت سے نہیں کھایا۔ چند لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا پھر اُس نے خود ہی اپنی پریشانی کا سبب بتایا۔ ”میرے منشی کا آج صبح انتقال ہوگیا۔ کل شام تک بالکل بھلا چنگا تھا۔ رات کو ٹھیک ٹھاک سویا، فجر کے وقت پیٹ میں ایسا شدید درد اُٹھا کہ چٹ پٹ ختم ہوگیا۔“ اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ ”اللہ اُس کی مغفرت کرے۔ بڑا نیک اور محنتی بندہ تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی پینتیس سال کا ہوگا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”انھیں میں اپنے پاس لے آؤں گا مگر اُن پر یتیمی کا جو داغ لگ چکا ہے، اُسے کون مٹا سکتا ہے۔“

لالی چپ چاپ اُس کی باتیں سُنتا رہا۔ ماسٹر جی آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”قریب ہی کے گاؤں میں وہ رہتا تھا۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ شاید شام تک واپس نہ آسکوں۔ دیر ہو جائے تو میرا انتظار نہ کرنا۔ شام کو جانا تو جھنّے یا کسی نوکر کو بتا دینا۔ ویسے میں چاہتا تھا کہ تم آج کے بجائے کل صبح کی لاری سے جاؤ۔“ اُس نے ذرا تامّل کیا۔ ”بولو، کیا ارادہ ہے؟“

لالی نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کہتے ہیں جی تو میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔“

ماسٹر جی نے اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی چپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا۔ لالی دیر تک خاموش بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا اور شام تک سوتا رہا۔

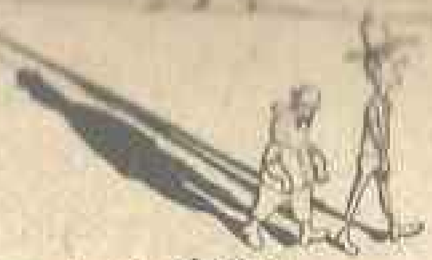
عشا کی نماز سے کچھ دیر پہلے ماسٹر جی تھکا ہارا واپس آیا۔ لالی سے اُس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ چند منٹ ٹھیر کر وہ وظیفہ پڑھنے اپنے حجرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر لالی کمرے سے باہر نہیں گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے لیمپ کی لَو مدھم کر دی اور بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ چُپ سادھے خاموش پڑا رہا۔ پہر رات گزر گئی۔ گاؤں کی چہل پہل اُجڑ گئی۔ گلیاں ویران ہوگئیں مگر لالی جاگتا رہا۔ رات آدھی ہو کر ڈھلنے لگی۔ ماسٹر جی اُس وقت بند حجرے میں اپنے گرد حصار کھینچ کر وظیفہ پڑھنے میں غرق تھا۔ اب فجر کی اذان سے پہلے اُس کے باہر نکلنے کا امکان [illegible] تھا۔ گھر پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

لالی بستر سے اُٹھا، پھونک مار کر لیمپ بجھایا اور [illegible] کے مطابق بیٹھک کا دروازہ کھول کر خاموشی سے باہر نکلا اور [illegible] قدموں چلتا ہوا گھر کے پچھواڑے گیا۔ وہ مویشیوں کے کمرے [illegible] کرا مویشیوں کے عام دھویا ڈھالے کی طرح کا نہ تھا جس [illegible] سردی سے بچاؤ کے لیے چھپر ڈال دیا جاتا ہے۔ کمرے کے [illegible] چار دیواری تھی، اُس کا پھاٹک بند تھا اور پھاٹک کے بیچ [illegible] مویشیوں کا رکھوالا چارپائی ڈالے اس طرح سو رہا تھا کہ لالی [illegible] کسی مویشی کو باہر لانا بہت دشوار تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لالی [illegible] درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ رکھوالے کو [illegible] کس طرح راستے سے صاف کیا جائے۔ وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا [illegible] اپنی پشت پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا [illegible] اُڑ گئے۔ ماسٹر جی آہستہ آہستہ اِسی طرف آرہا تھا۔ لالی جہاں تھا [illegible] دم بخود کھڑا رہا۔ ماسٹر جی قریب آکر ٹھیر گیا مگر نہ اُس نے کسی [illegible] اظہار کیا، نہ حیرت کا۔ حسبِ معمول نرم لہجے میں بولا۔ ”برخوردار [illegible] ہو۔ بیٹھک میں تمھیں نہ پایا تو طبیعت پریشان ہوئی۔ خیریت تو [illegible] تم اتنی رات گئے اِدھر کیسے آگئے؟“ وہ دم بھر کے لیے رُکا پھر [illegible] ہی بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”سمجھ گیا۔ سگریٹ کی طلب نے ستایا ہوگا [illegible] نہیں ہوگی۔ دینو کے پاس ماچس لینے آئے ہوگے۔ یہی بات ہے نا!“

لالی کو ماسٹر جی کی نیک نفسی اور سادہ دلی پر پیار آگیا۔ سعادت [illegible] مندی سے سر جھکا کر بولا۔ ”بات تو جی کچھ ایسی ہی تھی۔“

”میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔“ وہ بدستور مسکراتا رہا۔ ”مجھے اِس وقت یہاں دیکھ کر تمھیں بھی سخت حیرت ہوگی۔ مجھے تو اِس وقت حصار کے اندر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہونا چاہیے تھا۔ باہر کیسے آگیا، یہی بات بتانے تمھارے پاس آیا تھا۔“ دینو دونوں کی باتیں سُن کر بیدار ہوگیا تھا اور [illegible] پریشان آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھ رہا تھا مگر ماسٹر جی نے اُس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ لالی کو مخاطب کرکے بولا۔ ”آؤ، بیٹھک میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور لالی کے ہمراہ چپ چاپ چلتا ہوا بیٹھک میں آگیا۔ لالی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ گھر کے اندر گیا اور ماچس ہاتھ میں لیے واپس آگیا۔ اُس نے لیمپ روشن کیا اور میز کے قریب ایک کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لالی بستر پہ پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ ذرا دیر خاموشی رہی پھر ماسٹر جی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ کہنے لگا۔ ”برخوردار، آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں وظیفے کا ورد کر رہا تھا۔ خلافِ معمول نیند کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں، ایک بزرگ



فرشتہ ہیں۔ سفید براق لباس، چہرے کے گرد نور کا ہالہ۔ انھوں
...جلال کہ نظریں خود بخود جھک گئیں۔ کیا بتاؤں کیا شان تھی ان
...نے ذرا سا تامل کیا۔ چند لمحے وہ خاموش کھڑے میری جانب
...پھر حکم دیا، 'فیض محمد! اپنی بیٹی طاہرہ کو اس نوجوان کے حوالے
...جو دو روز سے تیرا مہمان ہے۔ نافرمانی کرے گا تو
...ہوگا۔' اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اب تک وہ آواز
...میں گونج رہی ہے۔"
لالی بھونچکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ کیا جواب دے۔
...نے اسے خاموش دیکھا تو نہایت شفقت سے کہا۔ "بھئی!
...اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ضرور ہے۔ میں نے بہت غور کیا تو
...آیا۔ تمھارے سر پر کسی کا سایہ نہیں۔ پریشان حال بھی ہو مگر
...اور سعادت مند ہو۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے بھی بیٹی کے فرض سے
...ہونا ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ تو اس کا پلو باندھنا ہی ہوگا۔
...خاندان میں کئی لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے اور برسرِ روزگار بھی ہیں۔
...مجھے تو تمھارے لیے حکم ملا ہے۔ تمھیں اپنی فرزندی میں لینے
...خوشی ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے، کاروبار میں ہاتھ بٹاؤ گے
...سہارا ہو گے۔ میرے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"
...اس نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "عزیزم! میری طرف
...تو ہاں ہے۔ رہ گئی تمھاری مرضی، تو جو چاہو اپنے بارے میں
...فیصلہ کرو۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ہم دونوں ہی کے لیے تائیدِ
...غیبی ہے۔" لالی پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔
...میں کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر ماسٹر جی کی آواز ابھری۔
"برخوردار! کیا یہ خاموشی ہی تمھاری مرضی سمجھوں؟"
اب لالی کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ گھبرائے ہوئے
...لہجے میں بولا۔ "میں کیا بتاؤں جی! میں تو کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔"
"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" ماسٹر جی نے اس کی دل
جوئی کرتے ہوئے کہا۔ "سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمھیں حق حاصل ہے
کہ جو چاہو اور جیسا چاہو اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔" یہ کہہ کر ماسٹر جی
نے لالی سے پوچھا۔ "تمھاری گھڑی میں کیا بجا ہے؟"
لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بتایا۔ "ساڑھے چار۔"
ماسٹر جی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب تم سو جاؤ۔ میں اب سو
نہ سکوں گا۔ کچھ ہی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ مسجد میں فجر کی نماز پڑھوں
گا اور صبح کی بس سے منڈی چلا جاؤں گا۔ تم سے شام کو واپسی پر ملاقات
ہوگی۔ تمھارے پاس خاصا وقت ہے۔ اچھی طرح غور کر لو۔ جو بھی فیصلہ
کرو مجھے بے جھجک بتا دینا۔"

ماسٹر جی نے لالی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ گھر کے
اندر جانے کے بجائے بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ لالی نے
سوچا تھا کہ ماسٹر جی کے جانے کے بعد چپکے سے نکل جائے گا مگر اب
اس کی گنجائش بھی نہ تھی۔ صبح ہونے والی تھی اور ماسٹر جی ابھی باہر
ہی تھے۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر بے چین رہا۔ ٹھیک سے
نیند نہیں آئی۔ دن میں بھی وہ بے چین رہا۔
شام کو ماسٹر جی کی واپسی ہوئی۔ وہ روز کی طرح مسکراتا لالی کے پاس
آیا اور نہایت شفقت سے پوچھا۔ "کچھ تھکے تھکے نظر آ رہے ہو۔" اس
نے ذرا توقف کیا اور لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہنے لگا۔
"بات یہ ہے کہ تم کہیں آتے جاتے بھی تو نہیں ہو۔ تمام وقت گھر
میں رہتے ہو۔ ذرا باہر نکلا کرو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کس کے پاس جاؤ،
کہاں جاؤ۔ تمھارا کوئی ملنے جلنے والا بھی یہاں نہیں ہے۔ کوئی بات
نہیں۔ یہاں رہو گے تو سبھی سے میل ملاپ پیدا ہو جائے گا۔"
لالی چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ ماسٹر جی کچھ
دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔ "برخوردار! تم بہت کم گو ہو۔ مجھے تمھاری
یہ ادا پسند بھی ہے مگر نوجوانوں کو اتنا خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ ہنسا
بولا کرو۔ کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ رہو گے تو بولنے کی بھی عادت
پڑ جائے گی۔ بھئی! میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ سخت الجھن
ہوتی ہے اور تم سے باتیں کر کے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ ایسا
محسوس ہوتا ہے تین روز نہیں تمھارے ساتھ تین برس بیت گئے۔"
ماسٹر جی بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔
مگر ماسٹر جی سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا۔ وہ حرفِ مطلب پر آ گیا۔
"برخوردار! کیا فیصلہ کیا تم نے؟" پھر خود ہی بولا۔ "فیصلہ کیا کرنا
ہے بھئی! میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میرا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ
نے تمھارے روپ میں مجھے بیٹا دے دیا۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی تو
بیاہ کر شاداں چلی گئی۔ سال دو سال میں آتی ہے۔ سمجھو وہ تو غیر ہو گئی۔"
اس نے ذرا سے توقف کیا پھر لالی سے پوچھا۔ "ہاں تو برخوردار! تم
نے کیا سوچا؟"
لالی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پچھلی رات سے جس سوال نے
اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا، وہ ہنوز جواب کا محتاج تھا۔ لالی میں
نہ صاف انکار کرنے کی جرأت تھی، نہ وہ اپنے بارے میں اصل حقیقت
سے ماسٹر جی کو آگاہ کر سکتا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں ماسٹر جی کے

دل کو زبردست ٹھیس لگتی۔ لالی اُسے کسی طور دُکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے اپنے جرائم پیشہ ہونے کا کبھی اتنی شدت سے احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ دلدل میں گر گیا تھا۔ اُسے اس دلدل سے نکلنے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا مگر وہ اس دلدل میں اتنا دھنس گیا تھا' اس قدر لت پت ہو گیا تھا کہ وہ اس موقع سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اُسے سب سے بڑا دُکھ اس بات کا تھا کہ جس زندگی کے اس نے کبھی سہانے خواب دیکھے تھے' وہ خود چل کر اس کے گھر آئی ہے مگر وہ دروازے کے پٹ کھول کر اس کا خیر مقدم نہیں کر سکتا۔

لالی کو خاموش اور گم دیکھ کر ماسٹر جی نے کہا: "برخوردار' جو کہنا ہے صاف کہہ دو۔ تم انکار کر دو گے تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھ ہی میں کوئی خامی ہو گی۔ تم کو میں اچھا سمجھتا ہوں' ہمیشہ سمجھتا رہوں گا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "مجھے جو حکم ملا' اس کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔ اپنی پگڑی تمھارے سامنے ڈال دی۔ بیٹی باپ کی عزت ہی ہوتی ہے۔" اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلک اٹھیں گے۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر ماسٹر جی کے پیر پکڑ لے اور انھیں اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر جی نے دل گرفتہ ہو کر کہا: "معلوم ہوتا ہے میری باتیں تمھیں ناگوار گزریں؟"

لالی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا: "ہرگز نہیں جو آپ کا فیصلہ وہی میرا فیصلہ ہے جی۔"

ماسٹر جی تڑپ کر اٹھا اور لالی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ چند لمحے تک لالی کو گلے سے لگائے کھڑا رہا۔ لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ماسٹر جی رو رہا ہے۔ اس کے جسم کی حرارت میں باپ کے پیار کا لاڈ تھا۔ اس نے شفقت سے لالی کے سر پہ ہاتھ پھیرا' اس کی پیشانی چومی۔ "تم نے میری لاج رکھ لی۔ مجھے حکم عدولی کے عذاب سے بچا لیا۔" لالی سر جھکائے نہایت سعادت مندی سے کھڑا رہا۔ ماسٹر جی نے لمحے بھر خاموش رہ کر کہا: "نیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ وظیفے سے فارغ ہوتے ہی مسجد کے ملا جی کے پاس جاؤں گا۔ نمازیوں میں گواہ اور وکیل بھی مل جائیں گے۔ فجر کی نماز کے بعد نکاح ہو جائے گا۔ مجھے بھی یہی بشارت ہوئی تھی۔" یہ باتیں کہنے کے بعد ماسٹر جی لالی کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وظیفے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

لالی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے ماسٹر جی کا دل رکھنے کے لیے حامی تو بھر لی تھی مگر وہ اُسے نباہ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد اس گھر سے دُور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس نے بھوری بھینس چرانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی کسک سے ماسٹر جی بلبلا اٹھے اور نیک دلی اور خدا ترسی سے اس کا اعتبار اٹھ جائے۔

اس رات لالی سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ دو چار لقموں کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پلنگ پہ دونوں پیر لٹکائے خاموش بیٹھا رہا اور بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ اُسے رات تاریک اور گلی کوچے سنسان ہو جانے کا انتظار تھا۔ کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ لالی نے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت گھر کے اندر جانے والے دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے چر چراتا ہوا کھلا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ کوئی دروازے کی اوٹ میں دبکا کھڑا تھا۔ لالی حیران و پریشان بیٹھا اس جانب دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک نوجوان لڑکی آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی اور سر جھکا کر لالی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنا بدن سفید چادر سے چھپائے ہوئے تھی' صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ' تیکھے نقش و نگار' ابھری ہوئی سیاہ آنکھیں۔ وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔ لالی نے اٹکل سے اُسے پہچاننے کی کوشش کی: "تم طاہرہ تو نہیں ہو؟"

اس نے آہستہ سے جواب دیا: "ہاں میں طاہرہ ہوں' ماسٹر جی کی بیٹی۔"

لالی نے گھبرا کر پوچھا: "تم اس وقت یہاں کس لیے آئی ہو؟"

اس دفعہ طاہرہ نے گردن اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ تیوری پہ بل ڈالا اور ایک دم پھٹ پڑی: "تمھیں یہ کہنے آئی ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

لالی سٹپٹا کے رہ گیا۔ حیران ہو کر بولا: "کیوں؟"

"اس لیے کہ میں تمھارے ساتھ شادی وادی کا ڈھونگ رچانا نہیں چاہتی۔" وہ ویسے ہی تیکھے لہجے میں بولی: "تم مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم صورت سے اُجڈ اور لوفر لگتے ہو۔" اس نے غصے سے لالی کو گھور کر دیکھا: "جاؤ' یہاں سے نکل جاؤ۔"

لالی نے پریشان ہو کر کہا: "دھیرے بولو۔ ماسٹر جی آ جائیں گے۔"

"آ جانے دو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے' نہ تمھاری' نہ ابا جی کی۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی' سنا تم نے۔"

لالی جل کر بولا: "مجھے سنانے کیوں آئی ہو۔ جاؤ' جا کر اپنے ابا جی کو سناؤ۔"

"میں اُن کے پاس نہیں جاؤں گی۔" طاہرہ نے گھور کر لالی کو دیکھا۔

"میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔ یہ بتانے آئی ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ نہیں چاہتی۔"

لالی بے نیازی سے بولا۔ "نہ کرو۔ میں نے تمہارے آگے ہاتھ نہیں جوڑے، پیروں پر پگڑی نہیں ڈالی۔ نہ کبھی تمہیں راستے میں چھیڑا، نہ آنکھ ماری، نہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا 'اوے سوہنیو! ہم تو کتل ہو گئے۔' میں نے تو...."

"الے الے۔" طاہرہ اُس کی بات کاٹ کر حیرت سے بولی۔ "تم تو بالکل لفنگے ہو۔" وہ ایک بار پھر دہاڑی۔ "تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔"

پہلی نظر میں وہ طاہرہ کو ایک بھولی بھالی شرمیلی لڑکی سمجھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز اور طرار ہوگی مگر جب وہ اپنی تمام تیزی اور طراری کے ساتھ کھل کر سامنے آگئی تو لالی نے دل ہی دل میں کہا۔ چھوہری تو زوردار ہے۔ اب اُسے طاہرہ کو چھیڑنے میں مزا آنے لگا۔ "میں تو نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ٹانگیں پسار کر بستر پر لیٹ گیا اور طاہرہ کو مخاطب کر کے بولا۔ "کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرو۔"

وہ اسی طرح ناراضی سے بولی۔ "میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ تم سے صاف صاف یہ کہنے آئی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔" چند ثانیے رُک کر اُس نے کہا۔ "ذرا اپنی شکل تو دیکھو کیسی خطرناک غنڈوں کی سی مونچھیں ہیں۔ اونہہ!" طاہرہ نے حقارت سے منہ بگاڑا۔

مگر لالی ذرا نہ بگڑا ہنس کر بولا۔ "کوئی بات نہیں کل صبح منڈوا دوں گا تم چاہو تو اُسترا لا کر ابھی مونڈ دو۔ لے آؤ اسی بات پر اُسترا۔"

طاہرہ نے غصے سے گردن ہلا کر کہا۔ "گویا مونچھیں منڈوا کر تم گل فام بن جاؤ گے اور میں تمہیں اپنا سرتاج بنا لوں گی۔ چغد احمق کہیں کا۔"

"دے لو دے لو جتنی چاہے گالیاں دے لو۔ کل صبح کے بعد تم سے پوچھوں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟"

لالی اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ گردن ذرا سی اکڑا کر نخوت سے بولا۔ "کل صبح میں تمہارا خصم بن جاؤں گا۔"

"خصم!" وہ تلملا کے بولی۔ "تم غنڈے ہو۔ بالکل تھرڈ کلاس غنڈے۔"

لالی نے کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی۔ قمیص کی آستین چڑھائی اور طاہرہ کو اپنے بازو کی ابھری ہوئی مچھلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھ رہی ہو۔ قریب آجاؤ چھو کر دیکھو۔"

"دیکھ رہی ہوں، دیکھ رہی ہوں تم دور ہی سے اچھے خاصے مشٹنڈے نظر آتے ہو۔"

"میں تمہیں اپنے بازو اس لیے دکھا رہا ہوں۔" لالی نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ "کل صبح کے بعد تم نے کڑ کڑ کی تو سمجھ لینا۔ ایک اِدھر سے دوں گا، دوسرا اُدھر سے۔" لالی نے ہاتھ گھما کر بتایا۔ "اور ایک لات بھی لگاؤں گا۔ وہ جاؤ گی گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی۔ ساری کڑ کڑ نکل جائے گی۔"

"کیا کہا؟ تم مجھے مارو گے؟" اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھ کر کہا۔ "وحشی، درندے، بے غیرت! تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟"

لالی نے مصالحت کرنے کے انداز میں کہا۔ "چلو، نہیں ماروں گا۔ اب تو غصہ تھوک دو۔ جو تم کہو گی، وہ کروں گا۔ مونچھیں بھی منڈوا دوں گا۔ ایک دم صفاچٹ۔ بال بھی نئے اسٹائل کے بناؤں گا۔ قمیص اور پتلون تو پہنے ہی بیٹھا ہوں۔" وہ لمحے بھر رُکا۔ "بولو۔ اب تم میری گھر والی بننا منظور کر لو گی؟"

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھکی ہوئی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اِس دفعہ اُس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو جائے گی؟"

"سمجھنا کیا، سولہ آنے پکی بات ہے۔"

طاہرہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "اچھا تو پھر یہ بھی سن لو بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لو۔" اس نے اپنے بدن سے چادر اُتار کر میز پر رکھ دی اور نہایت بے باکی سے اپنا ابھرا ہوا پیٹ دکھا کر بولی۔ "یہ کسی کی امانت ہے اور جس کی یہ امانت ہے، میں اُس کی امانت ہوں۔"

لالی بھونچکا رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر اُس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ "کس کا ہے؟"

"کسی کا بھی ہے۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے، بالکل ہے۔" لالی نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ "زیادہ کڑ کڑ نہ کرو۔ صاف صاف بتاؤ۔"

"چلو یہ بھی سن لو۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ "میں لاہور میں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی۔ وہاں ایک کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج کے ایک پروفیسر مجھے گھر پر پڑھاتے تھے۔ مجھے اُن سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مجھ سے دیوانوں کی طرح محبت کرنے لگے۔" یہ کہتے کہتے وہ یادوں کے سہانے بہت دور نکل گئی۔ "ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ ہوتی۔ گھر اور کالج کے باہر بھی ہم چھپ چھپ کر ملتے۔ کبھی...."

لالی بات کاٹ کر بولا: "تو لیمارا باغ میں اُس کے ساتھ ٹھمک
ٹھمک کر گانے بھی گاتی ہوگی؟" وہ لمحے بھر کے لیے رُکا: "یہ تو فلمی
باتیں ہوئیں۔ آگے کا بتاؤ؟"
"آگے جو کچھ ہوا وہ تمھارے سامنے ہے۔"
"اسے بھی دیکھ لیا اور آگے بتاؤ۔"
طاہرہ بتانے لگی: "پروفیسر کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے،
ایک بچہ بھی ہے مگر مجھے اُس کی دوسری بیوی بننا منظور ہے۔ میں
اُس کی محبت میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں لیکن اباجی تیار نہیں ہیں۔
وہ میری تعلیم ادھوری چھڑوا کر مجھے گھر لے آئے۔ اب تمھارے سر
منڈھنا چاہتے ہیں مجھے تاکہ اُن کی بدنامی نہ ہو۔"
لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا: "میں تو جی تم سے
یہی کہوں گا، تمھیں بھی چاہیے کہ ماسٹر جی کی بدنامی نہ ہو۔ وہ بہت اچھے
آدمی ہیں۔ فرشتے ہیں فرشتے۔ اتنے نیک اور بھلے مانس کہ جی چاہتا ہے
اُن کے پیر دھو کر پیوں۔" لالی نے دل کی بات صاف کہہ دی۔
طاہرہ کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس
میں حیا بھی تھی اور دبا دبا کرب بھی تھا۔ وہ ذرا دیر تک اسی عالم میں
بیٹھی رہی پھر غم کا سایہ آہستہ آہستہ اُس کے چہرے سے ہٹ گیا۔ غصے
اور نفرت کی دھوپ چھا گئی۔ وہ بڑے تیکھے لہجے میں بولی: "تم نرے
احمق ہو۔ تمھیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ میں اُن کی بیٹی ہوں۔ میں اباجی کو اچھی طرح
جانتی ہوں۔ نہ وہ فرشتے ہیں، نہ اتنے بھلے مانس جتنا تم انھیں سمجھ رہے ہو۔"
اُس نے ذرا سا تامل کیا: "وہ ایک نمبر فراڈ ہیں۔ پہلے تو انھوں نے چار سو
بیسی کر کے بوگس کلیم منظور کرا لیا۔ پرائمری اسکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے
زمیں دار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا۔" اُس نے
لالی کو نظر بھر کر دیکھا: "سن رہے ہو؟"
"ہاں جی بالکل سن رہا ہوں۔" لالی نے جواب دیا: "تم کہتی جاؤ۔"
وہ کہنے لگی: "اچھا تو اب یہ بھی سن لو۔ آڑھت کا تو صرف بہانہ
ہے۔ وہ سمگلنگ کرتے ہیں۔ اِدھر سے گندم اور چینی بھیجتے ہیں۔ اُدھر
سے ہندوؤں کی بیمار اور بوڑھی گائیں بھینسیں لاتے ہیں۔ قصائیوں کے
ہاتھ بیچ کر اُن کا سڑیل گوشت لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ دن بھر سمگلنگ
کا دھندا کرتے ہیں۔ رات کو وظیفے پڑھ پڑھ کر اپنے گناہ بخشواتے ہیں۔"
اُس کا لہجہ اور تلخ ہوگیا: "سن لیا تم نے وہ کتنے نیک اور فرشتے ہیں؟"
لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ قلابازی کھا گیا ہے۔ اسے دکھ بھی ہوا،
حیرت بھی ہوئی مگر طاہرہ اُس کے ذہنی خلفشار سے بے نیاز بولتی رہی۔
"اب تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ تمھیں اپنے سمگلنگ کے دھندے
میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کریں گے تاکہ رینجرز اور بارڈر پولیس کے
ساتھ گولی چلے تو تم ہی مارے جاؤ اور پکڑے جاؤ تو بھی [illegible]
یہ سلسلہ بھی چند ہی مہینے چلے گا۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ تمھیں
کسی مقدمے میں پھنسوا کر تم سے طلاق لکھوا لیں گے اور میرا بیاہ اپنے
بھتیجے سے کر دیں گے۔ وہ بدصورت بھی ہے اور ایک ٹانگ سے لنگڑا
بھی مگر بہت بڑی زمیں داری اور جائداد کا اکلوتا وارث ہے۔ اپنی
یہ سکیم وہ آج ہی شام ماں جی کو بتا چکے ہیں۔" وہ چند لمحے خاموش رہی
پھر اُس نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا: "تم نے سب کچھ سن لیا۔
اب بتاؤ، کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جس کے پیٹ میں کسی
اور کا بچہ ہے؟"
"کتنے دن کا ہے؟" لالی نے اُس کے پھولے ہوئے پیٹ
کی جانب دیکھ کر کہا۔
"مجھے نہیں معلوم۔"
لالی نے سوچتے ہوئے کہا: "چھ سات مہینے سے تو کم کا نہیں لگتا۔"
"شاید!" طاہرہ نے مختصر سا جواب دیا۔
لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا: "صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔
پھر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔"
طاہرہ نے نظریں اٹھا کر لالی کو خوں خوار نظروں سے دیکھا اور نفرت
سے منہ بگاڑ کر بولی: "تم عجیب بے غیرت انسان ہو۔ تم ایسا بچہ قبول کر لو گے؟"
"قبول کر لوں گا، ضرور کر لوں گا۔ حرج ہی کیا ہے جی!" وہ نہایت
ڈھٹائی سے بولا: "ویسے سچ پوچھو تو یہ میرا معاملہ بھی نہیں۔ اولاد کے بارے
میں صرف ماں بتا سکتی ہے کہ اُس کا باپ کون ہے۔ میں کس کا بیٹا
ہوں، یہ بات میری ماں بتا سکتی تھی۔ تم کس کی بیٹی ہو، یہ بات بھی ماسٹر
جی نہیں، تمھاری ماں بتا سکتی ہے۔ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں؟"
طاہرہ نے زچ ہو کر کہا: "جو کچھ تم کہہ رہے ہو، ٹھیک ہی کہہ رہے
ہو گے۔" وہ نڈھال ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔
لالی بھی خاموش رہا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب لالی کو
وہاں سے چلا جانا چاہیے تھا۔ اُس نے طاہرہ کو پھر چھیڑا: "تم یہاں کیوں
بیٹھی ہو؟ اندر جاؤ۔ وٹنا ملو، نہاؤ، خوشبو لگاؤ، ریشمی پاٹگل پہنو،
سرخ چنی اوڑھو، سنگھار کرو۔ سویرے سویرے سامنے ایسے نہ آنا۔
ووہٹی بن کے آنا۔ میں تمھارا گھونگٹ اٹھاؤں گا، گلفشہ چکا دوں گا۔"
طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔ پھر
اُس نے بڑی عاجزی سے کہا: "میں تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اُس
نے لالی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے: "کہو تو تمھارے پیروں پر سر رکھ
دوں۔ خدا کے لیے میرے ساتھ شادی کا خیال چھوڑ دو۔"
"اپنے اباجی سے کیوں نہیں کہتیں؟" لالی نے بے نیازی سے

کہا۔ "ویاہ کا گنڈا تو انھوں نے ہی طے کیا ہے۔"

"کہہ چکی ہوں اُن سے بار بار کہہ چکی ہوں۔ اُن کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ ماں جی کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں۔ جب سے سنا ہے بے چاری بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔" طاہرہ تیزی سے بولتے بولتے اچانک دھیمی پڑ گئی۔ اُس نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا اور غم زدہ ہو کر بولی۔ "تم اتنے سنگ دل کیوں ہو؟ تم مجھ سے شادی کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔ تمھیں مجھ سے محبت بھی نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "سیدھی سیدھی معاملے کی بات یہ ہے کہ اب تو میں ماسٹر جی سے اپنا ٹیکس وصول کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے چار سو بیسی جو کی ہے۔"

طاہرہ چونک پڑی۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی۔ جھٹ اپنے کانوں سے سونے کے جھمکے اتار لیے۔ ہاتھوں کے کنگن اتار لیے اور انھیں لالی کی طرف بڑھا کر بولی۔ "لو یہ لے لو۔ یہ تمھارا ٹیکس ہے۔ اب یہاں سے چلے جاؤ۔" لالی نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ طاہرہ تلملا کر کہنے لگی۔ "قسم کھا کر کہتی ہوں زہر کھا لوں گی، خودکشی کر لوں گی مگر تمھارے ساتھ شادی نہیں کروں گی، نہیں کروں گی۔"

"زیور پہن لو۔ تمھیں زہر کھانے اور خودکشی کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" لالی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میں یہاں سے ابھی چلا جاؤں گا، پر ایک شرط پر۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "کیا شرط ہے تمھاری؟" طاہرہ کے چہرے پر خوشی سے پھول کھل اٹھے۔

"مجھے تمھاری نہیں، تمھاری بُوری مج کی ضرورت ہے۔ وہ پکا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے اور تمھارے پیٹ میں ......"

طاہرہ بات کاٹ کر کہنے لگی۔ "ایک نہیں تم دو بھینسیں لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جاؤ، جا کر نکال لاؤ دونوں کو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

لالی نے کہا۔ "میں صرف بُوری مج لوں گا مگر اسے لینے میں نہیں جاؤں گا۔ وہاں رکھوالا موجود ہے۔ تم خود جاؤ اور مج لے کر آ جاؤ۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "مگر بھینس تو وہ مجھے بھی نہیں لے جانے دے گا۔ میں اُس سے کیوں گی کیا؟"

لالی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "یہ میں نہیں جانتا۔ بھینس نکال کر تم لاؤ گی اور میرے ساتھ پنڈ کے آخری سرے تک جاؤ گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟ اگر یہ کام کر سکتی ہو تو جلدی کرو۔ نہیں تو اندر جاؤ۔ مجھے سونے دو۔ صبح نکاح کے بعد تم سے ملوں گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ اُس کا دمکتا ہوا چہرہ ایک بار پھر سونا پڑ گیا۔ "تم یہ تو سوچو۔ میں بھینس کیسے نکال کر لا سکتی ہوں۔" وہ گڑگڑا کر بولی۔ "خدا کے لیے مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟"

لالی نے اُس کا پریشان چہرہ دیکھا اور مسکرایا۔ "تم مجھے بدھو، چغد، احمق اور جانے کیا کیا کہہ چکی ہو پر تم نے یہ بھی سوچا، خود تم میں کتنی عقل ہے۔ اگر تمھارے پاس بھیجا ہوتا تو اس وقت مج کی طرح پیٹ پھلائے نہ بیٹھی ہوتیں۔" اُس نے کچھ تامل کیا پھر منہ بگاڑ کر بولا۔ "ماسٹر جی وظیفے پڑھتے ہیں، بیٹی عشق لڑاتی ہے اور میں بے وقوف ہوں، احمق ہوں۔"

طاہرہ خاموش بیٹھی اُس کی جلی کٹی باتیں سنتی رہی۔ لالی اُسے مخاطب کر کے بولا۔ "اس طرح یہاں بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بتاؤ آس پاس کے کسی پنڈ میں تمھارا کوئی سگا، یار، رشتے دار ہے، چاچا، موسا، تاؤ، کوئی نہ کوئی تو ہوگا؟"

طاہرہ نے جھٹ جواب دیا۔ "ماموں ہیں۔ چھ میل اُدھر ایک گاؤں میں بستے ہیں مگر وہ ہمارے گھر کم آتے ہیں۔ سگے ماموں نہیں ہیں۔"

لالی بولا۔ "سگے، سوتیلے کی چھوڑو۔ عقل سے کام لو۔ عقل سے۔ ماں جی تو تمھاری ہی طرف دار ہیں نا؟"

"بالکل ہیں۔" طاہرہ نے بتایا۔ "انھوں نے ہی تو مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔"

لالی بولا۔ "تو بس تم سیدھی اُن کے پاس جاؤ۔ اُن سے کہو کہ وہ رکھوالے کو ماما کو بلانے بھیج دیں۔ وہ اُدھر جائے اور ادھر تم بُوری مج نکال کر لاؤ۔ بن گیا دونوں کا کام۔"

طاہرہ نے خوش ہو کر گردن ہلائی۔ "یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔" اُس نے موج میں آ کر چٹکی بجائی۔ "بالکل ٹھیک۔"

لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "خالی ٹھیک ٹھیک کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ اور بُوری مج لے کر فٹافٹ آ جاؤ۔" طاہرہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے ٹوک کر آہستہ سے کہا۔ "اور دیکھو ماسٹر جی کی ایک قمیص، پگڑی اور ایک دھوتی بھی لیتی آنا۔ ایک ڈانگ بھی لانا۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "وہ کس لیے؟"

"جیسا کہتا ہوں ویسا کرو۔ بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ مج ایسے ہی نہیں لے جاؤں گا۔ اُس کے ساتھ چاک یا گوجر بن کر جاؤں گا۔ آیا مغز میں؟ اور ہاں، دیکھو جاتے ہی ماسٹر جی کے حجرے کی زنجیر باہر سے چڑھا کر اس میں چپکے سے تالا ڈال دینا۔ ہر کام چوکس ہونا چاہیے۔"

طاہرہ چلی گئی۔ لالی بے چینی سے اُس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد طاہرہ واپس آئی مسکراتے ہوئے بولی۔ "رکھوالا چلا گیا۔ کم بخت بڑی مشکل سے گیا۔ جب میں نے اور ماں جی نے اُسے نوکری سے نکال

...دھمکی دی، تب گیا۔" یہ کہہ کر اُس نے بغل میں دبے ہوئے کپڑے
...دے دیے۔ وہ ایک لاٹھی بھی لائی تھی، وہ بھی دے دی۔
لالی نے ساری چیزیں لے کر کہا: "اب اندر جا کر تھوڑی دیر
...آرام کر لو۔ اتنی دیر میں رکھوالا گاؤں سے دُور چلا جائے گا۔ جلدی نہ
...ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔ سمجھ گئیں؟ اب تم جاؤ۔"
طاہرہ کے جاتے ہی لالی نے جھٹ پٹ کپڑے تبدیل کیے۔ اپنی
...اور قمیص تہہ کر کے بغل میں دبا لی پھر کچھ سوچ کر اُس نے وہ جوتی
...کپڑوں کے اندر رکھ لی جو ماسٹر جی نے عام استعمال کے لیے دی
...لالی نے گھڑی دیکھی، ساڑھے دس بج رہے تھے۔
طاہرہ دوبارہ کمرے میں آئی۔ اُس نے لالی کو دیکھا اور حیرت سے
...لالی: "ارے! تم تو بالکل جانگلی لگ رہے ہو۔" یہ کہہ اُس نے لالی کو دو سو
...روپے کے نوٹ دیے۔ کہنے لگی: "لو، یہ رکھ لو تمھیں ضرورت پڑے گی۔"
لالی نے روپے لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ طاہرہ ذرا
...خاموش کھڑی رہی پھر اُس نے چادر کے اندر سے چمڑے کی چار
...گول تھیلیاں سی نکال کر لالی کو دیں: "یہ کھتے ہیں۔ ماں جی نے کہا
...انھیں بھینس کے چاروں پیروں میں پہنا دینا تاکہ کھوجی بھینس کا سراغ
...لگانے نکلیں تو کھروں کے نشان پہچان نہ سکیں۔ سمجھ گئے؟"
"بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے کسی قدر حیرت سے کہا: "اچھا تو اپنے
...ماسٹر جی رسّہ گیری کا دھندا بھی کرتے ہیں؟"
طاہرہ نے اُس کا سوال نظر انداز کر کے کہا: "اب تم جاؤ، میں تمھارے
...ساتھ نہیں جاؤں گی۔ بھینس سامنے درختوں کے نیچے کھڑی ہے، اُسے
...لے جاؤ۔"
لالی اَڑ گیا: "نہیں، تمھیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ آگے
...بڑھا۔ اُس نے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھولا اور طاہرہ کو مخاطب
...کر کے بولا: "چلو؟ آگے بڑھو۔ جو طے ہوا ہے، وہی ہوگا۔" اُس نے ذرا سا
...توقف کیا پھر کسی قدر تیکھے لہجے میں کہا: "تمھیں بھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔
...ایسا ارادہ ہوتا تو یہاں سے جاتا ہی کیوں۔" طاہرہ نے گھبرا کر دروازے کی
...جانب دیکھا۔ دروازے کی اوٹ میں اُس کی ماں کھڑی تھی۔ لالی نے
...طاہرہ کو خاموش پا کر کہا: "خواہ مخواہ کا نخرا نہ کرو۔" طاہرہ نے مڑ کر لالی کو دیکھا۔
وہ بے رُخی سے بولا: "آگے بڑھو، میرا منہ کیا تک رہی ہو۔"
طاہرہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور لالی کے ساتھ بیٹھک سے باہر
...نکلی۔ بھینس درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ لالی نے اُسے دُور ہی سے
...پہچان لیا۔ وہ بھوری بھینس تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ بھینس کے چاروں
...کھروں میں چمڑے کے کھتے چڑھا دیے، رسّی کھولی اور بھینس کو آگے بڑھانے
...کے لیے دھیرے دھیرے تت تت کی آواز نکالی۔ بھینس آگے بڑھی۔





...کی لاوارث بوڑھیوں اور بیواؤں کی
دیکھ بھال کرتی تھیں۔ اُن کی وسیع دو منزلہ حویلی
مستحق عورتوں کی پناہ گاہ تھی۔ زیبا نام کی ایک ضعیف
خاتون اُن کے ہاں رہتی تھیں۔ اتفاق سے سرسید کی والدہ اور زیبا ایک
ہی نوعیت کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ جن حکیم صاحب سے سرسید کی والدہ
کا علاج کرایا گیا، زیبا بھی انھی کے زیرِ علاج رہیں۔ صحت ہو گئی تو حکیم
صاحب کی تجویز پر سرسید کی والدہ کے لیے ایک قیمتی معجون تیار ہوئی۔ یہ دوا
صرف ایک مریض کے لائق تھی۔
سرسید کہتے ہیں: "میں اُس زمانے میں دلّی میں منصف تھا۔ میں وہ
دوا تیار کرا کے لے گیا اور کہا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے، اس کو استعمال فرمایئے۔
انھوں نے دوا لے لی اور اس خیال سے کہ وہ معجون زیبا کے لیے بھی ایسی
ہی مفید ہو گی جیسی مجھ کو ہے، اُن کو یقین نہ تھا کہ زیبا کے لیے بھی ایسی
معجون تیار کر دی جائے گی اس لیے خود انھوں نے وہ معجون نہیں کھائی اور
خفیہ خفیہ زیبا کو کھلا دی۔ اس معجون سے زیبا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی۔
چند روز بعد میں نے اُن سے کہا کہ اس معجون سے آپ کو بہت فائدہ ہوا۔ وہ
ہنسیں اور کہا: "تمھارے نزدیک بغیر دوا خدا صحت نہیں دیتا۔" میں متعجب
ہوا۔ معلوم ہوا کہ وہ معجون اُن کے عوض زیبا نے کھائی اور خدا نے دونوں کو
صحت عطا کی۔ ایک کو بہ حیلۂ دوا، ایک کو محض اپنے فضل و کرم سے۔

لالی اُس کی رسّی پکڑ کر چلنے لگا۔ طاہرہ بھی اُس کے ساتھ تھی۔ اُس نے
اپنا بدن چادر سے چھپا رکھا تھا۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا ہوا تھا، چاندنی دھندلی
دھندلی اور میلی میلی تھی۔ طاہرہ بہت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ وہ سہمی سہمی
نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر کانپ اُٹھتی۔
کسی قریب کی گلی میں ایک کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اُس کی آواز
سُن کر طاہرہ ایسی بدحواس ہوئی کہ گرتے گرتے بچی۔ لالی نے جھپٹ
کر اُس کا بازو پکڑ کر اُسے سنبھال لیا اور ٹھٹک کر رُک گیا۔ دونوں گھر سے
لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر تھے اور ایک درخت کے نیچے اندھیرے
میں کھڑے تھے۔ طاہرہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی کو اُس پر ترس
آ گیا۔ کہنے لگا: "تم واپس چلی جاؤ۔ زبان کی تم جس قدر فرفٹ ہو، دل کی اتنی
ہی بزدل اور ڈرپوک ہو۔ بالکل چھچھوندر کی طرح، آہٹ ہوئی اور چرچر کرتی
بھاگی۔" طاہرہ نے اُس کی باتوں کا بالکل بُرا نہ مانا، مسکرا کر بولی: "تمھارا
بہت بہت شکریہ۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔"
لالی نے اُس کی جانب ذرا سا جھک کر دھیرے سے کہا: "میں
بالکل اچھا آدمی نہیں ہوں۔ ہاں، تم بہت اچھی ہو۔ نہ شادی ہوئی، نہ
بیاہ اور دہیج میں میرے لیے یہ بھینس لے آئیں اور دو سو روپے نقد۔"

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف مسکرا کر رہ گئی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو لال نے اُسے ٹوکا اور اُس کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اپنے بچے کا نام لال رکھنا۔"

"لال!" وہ حیرت سے بولی۔ "یہ کیا نام ہوا؟"

"میرا نام بھی لال ہے۔" لال نے کہا۔ "میں بھی اپنی ماں کے پیٹ میں بالکل اسی طرح آیا تھا۔ معلوم نہیں میرا باپ کون تھا۔ میری ماں کی شادی کے بعد جو میرا باپ بنا، وہ مجھے ہمیشہ حرامی کہتا۔ ماں کو گالیاں دیتا اور گھر سے مار کر باہر نکال دیتا۔ مجھے اُس سے ملنے نہ دیتا۔" وہ ایک لمحے رُک کر بولا۔ "میرے ساتھ تمہارا بیاہ ہو جاتا تو میں تمہارے بچے کو کبھی حرامی نہ کہتا، تمہیں مار کر کبھی گھر سے نہ نکالتا۔ پر میرے ہاتھ میں تو شادی کی لکیر ہی نہیں ہے۔"

طاہرہ نے نظر بھر کر لال کو دیکھا اور واپس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہیں گاؤں کے نکڑ پہ جا کر رخصت کروں گی۔"

لال نے مسکرا کر کہا۔ "اتنی جلدی جلدی فیصلے نہ بدلا کرو۔ ایک گڑھے سے نکلو گی تو دوسرے میں گر جاؤ گی۔" مغارات کے سناٹے میں قدموں کی آہٹ اُبھری۔ لال نے ہولے سے طاہرہ کو دھکا دیا۔ "جاؤ، کوئی آ رہا ہے۔ جلدی کرو۔" طاہرہ تیز تیز قدم اُٹھاتی اپنے گھر کی جانب چلی۔ آنے والا اُدھر نہیں آیا، کسی اور سمت چلا گیا۔ لال اندھیرے میں کھڑا نظریں اُٹھائے طاہرہ کو اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ گھر کے اندر نہ چلی گئی۔

لال بھینس کو آہستہ آہستہ ہنکاتا ہوا گاؤں سے نکلا اور سڑک پر آ گیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ وہ کبھی سڑک سے اُتر کر کچے میں آ جاتا، کبھی سڑک پر چلتا۔ بھینس بھی سیدھی تھی۔ اُس نے راستے میں لال کو پریشان نہیں کیا۔ سارے راستے اُسے ایک ہی بار لاٹھی استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، وہ بھی اُس وقت جب نہر کا پل عبور کرتے ہوئے کتوں کا ایک غول کھیتوں سے نکل کر زور زور سے بھونکنے لگا۔ بھینس بدکی مگر لال نے اُسے لاٹھی سے قابو میں کر لیا۔

سڑک ختم ہوئی تو وہ بھینس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پگڈنڈی میں اُتر گیا۔ یہ دُور تک پھیلا ہوا بنجر اور ویران میدان تھا۔ دھندلی چاندنی میں اُونچی اُونچی گھاس اور جنگل جھاڑیاں سیاہ دھبّوں کے مانند نظر آ رہی تھیں۔ وہ اُن کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ یہ وہی راستہ تھا جس سے وہ تین روز پہلے بھی گزرا تھا۔

جب وہ جہانگیرہ میں داخل ہو کر شاداں کے گھر کے قریب پہنچا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اُس نے بھینس گھر کے دروازے کے قریب ایک درخت سے باندھی اور دیوار پھاند کر آنگن میں اُتر گیا۔

شاداں دالان کے قریب آنگن میں چارپائی پر سو رہی تھی۔ کمرہ بند تھا۔ لال نے قریب جا کر دھیرے سے شاداں کا کندھا جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ارے تُو ہے۔ تُو تو بالکل جن بھوت لگ رہا ہے۔ میں تو ڈر گئی ... کون آ گیا۔ پر تُو آیا کیوں؟" وہ گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

لال نے مسکرا کر کہا۔ "ڈر مت، میں تجھے اُدھالنے نہیں آیا ..." اُس نے ذرا توقف کیا۔ "یہ بتا تیری بوری کا کیا بنا؟"

"مر گئی۔ ملک نے اُسے مار ڈالا۔" وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ... خاموش رہی پھر شعلے کی طرح بھڑک اُٹھی۔ غصّے سے ہونٹ دانتوں کے نیچے دبا کر کہنے لگی۔ "میں ملک کا خون پی لوں گی۔ اُس کی بوٹیاں چبا ڈالوں گی۔"

لال مسکرا کر بولا۔ "بوری کو ملک نے نہیں میں نے مارا ہے۔ ... بوٹیاں نوچ کر چبا۔"

شاداں جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی۔ "لال! تُو یہاں سے ... مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "میں نے بوری کی خاطر بلے کا گلا کاٹ دیا۔"

لال نے جھٹ اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہستہ سے بولا۔ "تاجی تو کمرے میں نہیں ہے؟"

"نہیں۔" شاداں نے کہا۔ "وہ آج سویرے مجھ سے لڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔"

لال نے شاداں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ "میرے ساتھ آ۔"

شاداں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ "لال! مجھے ... میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے کھوبا توڑی ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے اپنا بدن نوچ ڈالوں۔"

انکار کے باوجود لال اُسے کھینچتا ہوا آنگن کے دوسرے سرے پر لے گیا مگر جب وہ دروازے کی جانب بڑھا تو شاداں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور آنکھیں نکال کر بولی۔ "کیا چاہتا ہے تو؟ میں تیرے سنگ نہیں جاؤں گی۔"

"پاگل نہ بن۔" لال نے مسکرا کر کہا۔ "تیری مرضی کے بغیر تجھے کوئی اپنے سنگ نہیں لے جا سکتا۔ یہ بات تُو بھی جانتی ہے۔ پھر کیوں ڈرتی ہے۔" اُس نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ "دروازے تک تو آ جا۔ یہ تو تیرے ہی گھر کی دلیج ہے۔"

شاداں آہستہ آہستہ دروازے تک چلی گئی۔ لال نے دروازہ کھولا، باہر گیا اور بھینس کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ شاداں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "ہائے! یہ مجھ تُو کہاں سے لے آیا؟"

لالی نے دروازہ بند کیا اور ہنس کر بولا: "اچھی طرح دیکھ لے، لوری
اور دھڑل بھی ہے۔ پکا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے۔ نیلی بار کی
نسل ہے۔ اب تو ہنس دے۔ تیری لوری واپس آگئی۔"
شاداں نے بھینس کی گردن اور پیٹھ پہ ہاتھ پھیرا۔ مسکرا کر بولی "لگتی
تو ویسی ہی ہے۔" پھر اس کی تھوتھنی سہلاتے ہوئے بولی۔ "اٹھارہ ہی سیر
دودھ دیتی ہے نا؟"
لالی چہک کر بولا: "بیٹھ جا تھنوں کے نیچے۔ دوہ کر دیکھ لے۔"
"اس وقت؟" وہ بولی۔ "تیرا مغز تو نہیں پھر گیا۔ اچھا یہ بتا۔ کہاں
سے لایا؟" اس کی نظر بھینس کے کھروں پر پڑی، پوچھنے لگی۔ "چوری کر کے
تو نہیں لایا؟ اس کے کھروں میں کھتے کیوں پڑے ہیں؟"
"اس لیے کہ کھوجی اس کی ترید نہ لگا سکے۔" وہ نہایت ڈھٹائی
سے بولا: "ویسے یہ تجھے دہیج میں ملی ہے۔ گھر والی تو نہیں ملی۔ اس کی مجھے
ضرورت بھی نہیں تھی۔"
"ٹھیک ٹھیک بتا؟"
"میں نے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے۔" لالی نے اسے بتایا۔ "اسے
لاتا تو گھر والی گلے پڑ جاتی۔ تھی تو ایسی سوہنی تجھے کیا بتاؤں۔ لاہور کے
کالج میں پڑھتی ہے۔ پر وہ گبھن رج ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔"
"تیری باتیں اپنے پلے نہیں پڑتیں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "صاف
صاف بات کر۔"
"اطمینان سے تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔" لالی نے کہا۔ "پہلے یہ بتا
اس روز میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟"
شاداں بتانے لگی۔ "تیرے جاتے ہی ملک اپنے بدماشوں کو لے
کر آگیا، مجھے زبردستی پکڑ کر اپنی حویلی لے گیا۔ بڑا لال پیلا ہوا۔ بہت اکڑا۔
مارنے کو بار بار اٹھا۔ مجھے دھمکی دی کہ یہ بات کسی سے نہ کہوں کہ لوری
اس کی گولی لگنے سے مرگئی۔ ہر پنڈ میں یہ بات سب کو معلوم ہے۔" وہ
اپنی بات کہتے کہتے دم بھر کو رکی۔ "لوری کو اس کے کمی اور نوکر اسی وقت
ٹریکٹر میں ڈال کر لے گئے۔ قصائی کو دے دیا ہوگا۔ کسی گڑھے میں
یا دور ڈال دیا ہوگا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "ملک مجھے سو روپے
دیتا تھا۔ میں نے ان پر تھوک دیا۔ خالی ہاتھ گھر چلی آئی۔"
لالی نے کہا: "اچھا ہی کیا تو نے۔ پر اس نے پولیس شلیس تو
نہیں بلائی؟"
"نہیں۔ لوری کے مرنے سے وہ ڈر گیا۔" شاداں نے کہا۔ "پر اپنی
بندوق کے بارے میں بار بار پوچھتا تھا۔ تو نے اس کا کیا کیا؟"
"ادھر حویلی کی ایک جھاڑی میں پھینک دیا۔" لالی نے بے نیازی
سے کہا اور چند لمحے کچھ خاموش کھڑا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ "اب یہ

یہی آدم

امیر تیمور جب بھی کوئی بڑا شہر فتح کرتا، فتح کی یادگار کے طور پر انسانی کھوپڑیوں کا مینار بنا دیتا۔ بغداد فتح کرنے کے بعد اس نے نوے ہزار کھوپڑیوں کا مینار بنایا۔

ایک دفعہ تاتاریوں [illegible] چنگیز خاں سے کسی سلسلے میں پوچھا: "اے خان تاتار! تو نے زندگی میں کبھی کسی پر رحم کیا ہے؟"
چنگیز خاں نے جواب دیا: "ہاں۔ ایک دن میں اپنے گھوڑے پر سوار نیزہ اٹھائے ایک ندی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ایک عورت ندی کے کنارے کھڑی ہوئی مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ننھا بچہ ندی میں ڈبکیاں کھا رہا ہے۔ مجھے عورت پر ترس آگیا۔ بچہ کنارے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں گھوڑے سے اتر کر قریب پہنچا۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر نیزہ اس بچے کے پیٹ میں گھونپ دیا اور اسے نیزے کی انی پر اٹھا کے اس کی ماں کے سپرد کر دیا۔"

ڈرگ کالونی کراچی کے
ریاض احمد کی طرف سے

سوچ۔ کل سب پوچھیں گے یہ برج کہاں سے آئی۔ تو کیا کہے گی؟"
وہ گھبرا کر بولی۔ "ہائے! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ تو بتا کیا کہوں؟"
"تیرا خصم کہہ دے گا کہ یہ برج اس نے تجھے دی ہے؟"
وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "کہہ دے گا ضرور کہہ دے گا۔ جو کہوں گی
وہی کہہ دے گا۔"
"وہ تجھے اتنا پیار کرتا ہے تب بھی تو اس کے پاس نہیں جاتی۔
تو اس سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟"
شاداں بتانے لگی۔ "تو جانتا نہیں، مجھے وہ کیوں اچھا نہیں لگتا۔
مجھے وہ کبھی اچھا نہیں لگا۔" وہ خیالوں میں کھو گئی۔ ذرا دیر خاموش رہ
کر بولی۔ "میری ماں مرگئی تھی۔ سوتیلی ماں تھی۔ وہ مجھے بہت تنگ کرتی
تھی، مارتی تھی۔ کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ ننگی ننگی گالاں نکالتی تھی۔ میں
چھوٹی سی تھی تو اس نے خیر دین سے میرا بیاہ کر دیا۔ میرے گھر والے کا نام
خیر دین ہے۔ تو نے اسے نہیں دیکھا۔ بالکل ادھکڑ ہے۔ آدھے سے زیادہ تو
اس کی داڑھی اور سر کے بال چٹے ہیں۔ ہائے ایسی خراب شکل ہے
اس کی تجھے کیا بتاؤں۔ یہ لمبا منہ اور باہر نکلے ہوئے یہ بڑے بڑے
دانت۔ بالکل دندو ہے۔ غصہ تو اسے آتا ہی نہیں۔ کبھی لڑائی جھگڑا
نہیں کرتا۔ کوئی آنکھ دکھائے تو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب
کہتے ہیں ہائے، خیر دین کتنا نیک ہے، کتنا بھلا ہے۔ فرشتہ ہے
فرشتہ۔ شاداں ہی بری ہے۔" وہ غصے سے ایک دم بپھر گئی۔ "ایسا ہی بھلا
ہے تو اس فرشتے سے اپنی بیٹی، اپنی بہن کیوں نہیں بیاہ دی؟ شاداں
کیوں اس کے گلے میں ڈھول بنا کر ڈال دی۔ ماں نے اس سے

چھکے سے تین سو روپے جو لے لیے تھے۔ ہائے کتنے سستے داموں بیچ دیا ہے مجھے۔"

وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتی مگر لالی نے اُسے روک دیا۔ "تُو اپنی ہی کہے جائے گی یا دوسرے کی بھی سُنے گی؟"

"کہہ کیا کہتا ہے؟"

وہ نرم لہجے میں بولا۔ "میرا کہا مان۔ کل سویرے ہی سویرے اپنے خصم کے پاس چلی جا۔ ہو سکے تو اُسے اور بچوں کو چند روز کے لیے یہاں لے آ۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔" شاداں نے صاف انکار کر دیا۔ "ایک بار اُس کے گھر سے چلی آئی' اب اُس کی دلیج پہ قدم نہیں رکھوں گی۔ اُس نے پہلے بھی بڑی منتیں کیں پر میں نہیں گئی۔ اب کیسے جا سکتی ہوں۔"

"نہ جا۔" لالی جل کر بولا۔ "پکڑی جائے گی۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ "تو کیا سچ مچ یہ مج چوری کی ہے؟"

"باپ کی طرف سے چوری کی ہے' ماں اور بیٹی کی طرف سے دہیج میں ملی ہے۔ یہ دو سو روپے بھی ملے ہیں۔" لالی نے دھوتی کے ڈب سے روپے نکالے اور شاداں کو دے کر بولا۔ "لے یہ رکھ لے۔ مان لے۔ پولیس کوئی چکر شکر چلائے تو کچھ دے دلا کر معاملہ دبا دینا اور دیکھ کل ضرور خیر دین کے پاس جانا۔ وہ تو تجھے اپنے بڑے بڑے دانتوں سے کاٹ تو نہیں کھائے گا۔ ویسے بھی تجھے برسوں کا تنا رہا ہے۔ چند روز اور کاٹ لے گا تو تیرا کیا بگڑ جائے گا۔" پھر لالی نے اُسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ "ضد نہ کر' میرا کہا مان ورنہ گھر آئی مج بھی ہاتھ سے جائے گی اور تو بھی چکر میں پڑ جائے گی۔ بول کیا کہتی ہے؟"

"تو کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔" شاداں نے کہا۔ "سویرے ہی سویرے چلی جاؤں گی۔"

لالی نے کہا۔ "یہ بتا درزی سے کپڑے لے آئی؟"

"نہیں۔" شاداں نے کہا۔ "درزی ہٹ چھوڑ کر شہر چلا گیا۔" اُس نے ذرا سا توقف کیا۔ "برا نہ مان کل شام تک ٹھیر جا۔ میں ضرور تیرے لیے کپڑے سلوا کر لے آؤں گی۔"

"اب مجھے اُن کی ضرورت بھی نہیں۔" لالی نے کہا۔ "اب میں چلوں گا۔ ابھی رات باقی ہے۔ اندھیرے میں نکل جاؤں گا۔ دیکھ' سویرے بودی کے لیے پٹھا دھٹا کر کے اچھی طرح چارہ پانی دے کر خیر دین کے پاس چلی جانا۔"

"تجھ سے کہہ تو دیا' چلی جاؤں گی' ضرور چلی جاؤں گی۔" شاداں نے بھینس کی رسی پکڑی اور لالی کو روک کر بولی۔ "ٹھیر جا۔ بودی کو باندھ لوں۔ تو اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

لالی مسکرا کر بولا۔ "آج نہیں۔ اب تو میرے ساتھ اُس روز چلے گی جس روز میں تیرا دھلا کروں گا۔ تجھے بھگا کر لے جاؤں گا۔ تیار ...

"بکواس نہ کر۔" شاداں منہ بگاڑ کر بولی۔ "تُو تو اڑیل ٹٹو ہے۔"

لالی کھل کر مسکرایا۔ "دیکھ اتنا تو ہوا' کنجر سے تُو نے مجھے ... بنا دیا۔ سیڑھی سیڑھی نیچے اُتر رہی ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ آگے بڑھا اور ... کھول کر باہر چلا گیا۔

گاؤں ابھی تک سو رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ لالی نے لاٹھی کندھے پر رکھی' کپڑوں کی گٹھڑی اُس کے سرے پر لٹکا لی اور تیز قدموں سے چلنے لگا۔ کچھ دُور جا کر وہ ایک موڑ پر مڑا تو ایک شخص کو اپنے سامنے پایا۔ لالی خوف زدہ ہو کر ٹھٹکا مگر وہ شخص اُس سے کچھ نہ بولا۔ آگے بڑھا اور ایک مکان کی دیوار کے نیچے بیٹھ کر اطمینان سے ... کرنے لگا۔ لالی نے آگے بڑھتے ہوئے کئی بار پلٹ کر پیچھے دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا۔

وہ گاؤں کے سامنے کا رڑ عبور کر کے اُس راستے کی جانب بڑھا جو ریل کی پٹڑی کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے وہ پہلے بھی جہانگیرہ آ چکا تھا اور اب اس سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ رحیم داد نہر کے اُس پار ٹیلوں کے درمیان چھپا ہوا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ لالی اپنے وعدے کے خلاف تاخیر سے لوٹ رہا تھا مگر مطمئن تھا کہ وہ رحیم داد کے لیے کپڑے لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا کر لائل پور کی جانب نکل سکتا تھا۔

لالی اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ابھی اُسے دس بارہ میل طے کرنے تھے۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی مگر وہ گاؤں سے کوئی دو ڈھائی فرلانگ ہی گیا تھا کہ ایک موڑ پر قریب سے آواز آئی۔

"چودھری! تیرے پاس ماچس تو ہو گی؟"

لالی سُنی اَن سُنی کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا لیکن اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک آدمی اندھیرے سے نکل کر یہ کہتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ "تُو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" وہ سائیکل پر سوار تھا۔ لالی نے دھندلی دھندلی چاندنی میں فوراً بھانپ لیا کہ یہ سادہ لباس میں پولیس کا کانسٹیبل ہے۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ڈھلتی عمر کے باعث اس کی کمر ذرا سی جھک گئی تھی۔ لالی نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔ "میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں سگرٹ سگرٹ نہیں پیتا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا لیکن کانسٹیبل نے اُسے جانے نہیں دیا۔ پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "چودھری! بات تو سن۔"



"ہمارا قدیم گاہک۔"

لالی ٹھیر گیا مگر خاموش رہا۔ کانسٹیبل نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور جھک کر اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ "ایسا لگتا ہے، تجھے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟" وہ سوچنے کے انداز میں لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

لالی نے جھٹ کہا۔ "تجھے ایسے ہی شبہ ہوا ہے۔ میں تو اس پنڈ میں پہلی بار آیا تھا۔" یہ کہہ کر اُس نے چاہا کہ بڑھ کر آگے نکل جائے۔

لیکن کانسٹیبل نے اُس کا بازو تھام کر روک لیا۔ "بات تو سُن۔" وہ لمحے بھر کے لیے رُکا پھر اُس نے پوچھا۔ "تو لالی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" لالی نے صاف انکار کر دیا۔ "میں نے کہا نہیں کہ تجھے شبہ ہوا ہے۔"

"میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" کانسٹیبل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تو لالی ہی ہے۔ پچھلے دنوں جیل سے نکل کر بھاگا ہے۔"

لالی نے کہا۔ "تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں لالی ہوں۔" اُس نے تیوری پر بل ڈال کر خفا ہو کر اُسے دیکھا۔ "خالی پیلی اپنی تھانے داری جمانے کھڑا ہو گیا۔"

"میں نے کل ہی تھانے میں تیری تصویر دیکھی ہے۔ تو لالی ہی ہے۔" کانسٹیبل نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو میری نظروں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ تیس سال ہو گئے پولیس کی نوکری کرتے۔ ایک سے ایک اونچا مجرم دیکھا ہے اور ایک ہی نظر میں پہچان لیا ہے۔"

لالی نے اُس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چُپ چاپ دس روپے کا ایک نوٹ دھوتی کے ڈب سے نکال کر کانسٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے، رکھ لے۔ بیوی بچوں کو میلے کی سیر کرا دینا۔" کانسٹیبل نے دس روپے کا نوٹ تو لے لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

"تیرے لیے تو دو ہزار کا انعام رکھا گیا ہے۔ تیرا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

لالی نے ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا۔ "میرے پاس اب صرف ریل گاڑی کا کرایہ رہ گیا ہے۔ وہ میں تجھے نہیں دوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے ذرا توقف کیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔ "ساتھ ہی یہ بھی سُن لے۔ میرا رستہ روکا تو بہیں لِٹا دوں گا۔"

لالی نے جھپٹ کر اُس کی گردن دبوچ لی اور ہلکا سا جھٹکا دے کر ہاتھ کا شکنجہ کسا تو ادھیڑ عمر کا دُبلا پتلا کانسٹیبل ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ "میری گردن تو چھوڑ دے۔ میں نے کب تیرا رستہ روکا۔"

لالی نے اُسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ "تیرے ہاتھ تو لوہے کے لگتے ہیں۔ تُو نے تو میری گردن ہی توڑ دی تھی۔" وہ ذرا سا رُکا۔ "جائے گا کہاں اس وقت؟"

"بیکار کی ٹر ٹر نہ کر۔"

کانسٹیبل نرمی سے بولا۔ "ناراض نہ ہو۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ پولیس کی ایک پارٹی ذرا دیر پہلے اِدھر سے گزری ہے۔ سب کے سب مسلح ہیں۔ صوبے دار بھی اُن کے ساتھ ہے۔"

"راؤنڈ پہ نکلے ہیں؟" لالی نے دریافت کیا۔ اُس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"نہیں۔" کانسٹیبل ابھی تک رُک رُک کر اپنی گردن سہلا رہا تھا۔ "پرسوں رات یوسف والا ریلوے کراسنگ پہ زبردست ڈاکا پڑا۔ ڈاکوؤں نے بس لوٹ لی، گولی بھی چلائی۔ ایک زخمی اسپتال جاتے جاتے راستے ہی میں چل بسا۔ جب سے یہ واردات ہوئی ہے، پولیس ہر طرف بھاگ دوڑ کرتی پھر رہی ہے۔ ویسے میں تو اس وقت اپنے بھائی کے گاؤں جا رہا تھا، وہ سخت بیمار ہے۔" اُس نے ذرا سا توقف کیا۔ "مخبروں نے بتایا ہے ڈاکو اسی علاقے میں چھپے بیٹھے ہیں۔"

لالی نے پوچھا۔ "صوبے دار کدھر گیا ہے؟"

کانسٹیبل نے شمال کی سمت ہاتھ اُٹھا کر بتایا۔ "پوری پارٹی اُدھر گئی ہے۔" لالی کو بھی اُسی طرف جانا تھا۔ وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔ اُسے کوئی دوسرا راستہ معلوم نہیں تھا۔ کانسٹیبل اُسے خاموش دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "تجھے کدھر جانا ہے؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "جدھر پولیس پارٹی گئی ہے۔"

"پر تُو تو اسٹیشن جائے گا۔"

"ہاں۔" لالی نے انکار نہیں کیا حالانکہ اُسے اسٹیشن ہرگز نہیں جانا تھا مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ قادر آباد اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اُسے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔

کانسٹیبل کہنے لگا۔ "میری مان تو اس طرف سے نکل جا۔" اُس نے اُس راستے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ "یہ رستہ چھوٹا بھی ہے اور تیرے لیے ٹھیک بھی رہے گا۔ ایسا کر سیدھا سیدھا چلا جا۔ آگے

جا کر چو ملے گا۔ یہ برساتی نالہ چک ۔۔ کے قریب سے گزرتا ہے۔" وہ گردن اُٹھا کر سوچنے لگا پھر بولا: "چو یہاں سے چار میل تو ہو گا۔ اس پہ پہنچ کر تو ایسا کرنا، اُس پار نہ جانا۔ چو کے کنارے کنارے چلا جانا۔ اس رستے پر جھنگر ہے جھاڑیاں بہت ہیں، تجھے کوئی دیکھ بھی نہ پائے گا۔ جہاں چو مڑتا ہے وہاں سے اُلٹے ہاتھ کو مڑ لینا۔ آگے جا کر نہر ملے گی وہ تاندر آباد سٹیشن کے نزدیک سے گزر کر لوئر باری دوآب سے مل جاتی ہے۔ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔" لالی نے آہستہ سے کہا پھر تیوری پر بل ڈال کر بولا: "پر ایک بات تجھے بتا دوں۔ اگر دو ہزار کے انعام کے چکر میں تو نے مجھے پھنسوا دیا اور میں پکڑا گیا تو اتنا سمجھ لے، میں جیل سے سیدھا یہاں آؤں گا، تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" یہ کہہ کر لالی نے منہ پہ ہاتھ پھیرا: "میرا نام لالی ہے۔ اتنا یاد رکھنا۔"

کانسٹیبل مسکرا کر بولا: "تو کس چکر میں پڑ گیا۔ میرا نام عابد ہے۔ اِدھر مجھے سب جانتے ہیں۔ میں پہلے بھی کئی مجرم پکڑوا چکا ہوں۔ دو بار اس چکر میں زخمی ہو کر ہسپتال بھی گیا۔ اُن پہ تجھ سے بھی زیادہ انعام تھا پر ہر بار انعام اُوپر والوں کو ملا۔ کسی کی وردی میں ایک سے دو پھول لگ گئے۔ مجھے کیا ملا؟ کپتان صاحب نے ہاتھ ملایا اور کندھا تھپ تھپا دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میری تنخواہ بیس رُپے سے آگے نہ بڑھی۔ پانچ بچے ہیں، بیوی ہے اور اندھی ماں ہے۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے رُکا پھر بولا: "تو ہی سوچ، اپنے پر کیا بیتتی ہے۔ میری تو ماں اندھی ہے۔ اُوپر والوں کی دونوں آنکھیں ہیں تب بھی اندھے ہیں۔"

لالی بہت متاثر ہوا۔ اُس نے کانسٹیبل کی باتوں پر اعتبار بھی کر لیا۔ ڈب سے دس رُپے کا ایک نوٹ اور نکالا اور کانسٹیبل کو دے کر بولا: "لے یہ بھی رکھ لے، پروا نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ اُس سمت بڑھا جدھر کانسٹیبل نے جانے کی ہدایت کی تھی۔

کانسٹیبل نے چلتے چلتے لالی کو ٹوک کر کہا: "دیکھ بھال کے رستہ چلنا۔ اتنا دھیان رکھنا، ڈاکوؤں کی دھاڑ بھی اسی علاقے میں چھپی بیٹھی ہے۔" لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چُپ چاپ اُس راستے پر چل پڑا جو کانسٹیبل نے بتایا تھا۔ چار ساڑھے چار میل کا راستہ طے کر کے وہ برساتی نالے پہ پہنچا اور اُس کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کانسٹیبل نے ٹھیک کہا تھا۔ اس رستے پہ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، گھنی بھی اور اونچی بھی۔ لالی جھاڑیوں کی اوٹ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھتا گیا۔ وہ مڑ مڑ کر چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا بھی جاتا۔ پولیس کا بھی خطرہ تھا اور ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ کا بھی دھڑکا تھا۔ اُس نے سات آٹھ میل اور طے کر لیے۔ اب چاند ڈوب چکا تھا مگر جھنگر ختم نہیں ہوا



"تم خوب پی چکے ہو۔"

تھا۔ ہر طرف جنگل جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک جگہ ٹھٹکا۔ ایک گھنی جھاڑی کے قریب اندھیرے میں دو سائے لہرائے۔ لالی ابھی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے پیچھے سے اُسے دبوچ لیا اور ایسی مضبوطی سے گرفت میں لیا کہ لالی بے بس ہو گیا۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا، ایک قوی ہیکل آدمی اُسے دونوں ہاتھوں سے دبوچے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ آن کی آن میں اسی وضع قطع کے دو اور آدمی جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کُرتے اور خوب گھیر دار شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے چہرے پر ڈھاٹا بھی بندھا تھا۔ لالی فوراً سمجھ گیا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ وہی ڈاکو تھے جنھوں نے پرسوں رات ریلوے کراسنگ پر بس لوٹی تھی۔ اُن میں سے ایک نے قریب آ کر لالی سے پوچھا: "کون ہے تو؟"

لالی نے آہستہ سے کہا: "سٹیشن جا رہا ہوں۔ مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔"

پیچھے کھڑے ہوئے ڈاکو نے دونوں ہاتھوں سے لالی کو جکڑ رکھا تھا، وہ اونچی آواز سے بولا: "مجھے تو پولیس کا آدمی جان پڑتا ہے۔"

"مخبر ہو گا۔" دوسرے نے کہا۔

لالی نے انکار میں گردن ہلائی: "نہیں۔"

"ٹھیک ٹھیک بتا کون ہے؟" سامنے کھڑے ہوئے ڈاکو نے لالی کے منہ پر زنّاٹے کا تھپڑ مار کر پوچھا۔

لالی کا ایک گال اور کان جھنجھنا کے رہ گئے، آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ اُس نے بے بسی سے کہا: "یارو! مارتے کیوں ہو۔ میں سچ سچ بتا دوں گا۔" اُس نے اپنا گال سہلایا: "میرا نام لالی ہے۔ میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں۔"

چند لمحے وہ تینوں خاموش کھڑے رہے۔ اُن کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنھیں لالی کی بات پر یقین نہیں آیا ہے۔ ایک نے شبہے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا: "اِدھر کس لیے آیا تھا؟"

لالی نے جھٹ جواب دیا: "پولیس کے ڈر سے۔ پولیس میری

تلاش میں ہے۔ دو ہزار کا انعام میری گرفتاری پر رکھا گیا ہے۔"

"دو ہزار کا انعام؟" دوسرے نے حیرت سے کہا۔ "اوئے پھیرو! یہ تو کوئی اونچی چیز معلوم ہوتا ہے۔"

پھیرو نے لالی کے بازو کا گوشت ٹٹولا اور اُس کی مونچھ مروڑ کر اونچی کی پھر مسکرا کر بولا۔ "لگتا جان دار ہے۔"

لالی نے عاجزی سے کہا۔ "یار! میری کمر تو چھوڑ دے۔ میں بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔"

پھیرو نے اونچی آواز سے کہا۔ "دالم! چھوڑ دے اسے۔" دالم نے لالی کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

لالی کہنے لگا۔ "جو پوچھنا ہے پوچھ لو۔ ابھی اندھیرا ہے، میں سٹیشن نکل جاؤں گا۔"

مگر انھوں نے لالی کو جانے نہیں دیا۔ اُسے اپنے نرغے میں لے کر ایک طرف چل دیے۔ انھوں نے خشک برساتی نالہ عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ کر گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

قریب جا کر لالی نے دیکھا، وہاں بھی دو ڈاکو موجود تھے۔ اُن میں سے ایک مٹی کے تودے پر درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کے پاس دیسی ساخت کی کاربین رکھی تھی۔ اپنی آن بان سے وہ اُن کا سرغنہ لگتا تھا۔ اُس نے لالی کو دیکھ کر دُور ہی سے پوچھا۔ "کون ہے یہ؟"

پھیرو نے جواب دیا۔ "ٹھیک سے پتہ نہیں۔ کہتا ہے جیل سے نکل کے بھاگا ہے۔"

دالم بولا۔ "یہ بھی کہتا ہے کہ اس کی گرفتاری پر دو ہزار کا انعام ہے۔"

سرغنہ نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ "سنا تو ہم نے بھی ہے کہ پچھلے دنوں دو قیدی جیل سے نکل بھاگے ہیں۔" اُس نے لالی کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "جیل کس چکر میں گیا تھا؟" اُس نے ذرا سا توقف کیا۔ "قتل کیا تھا؟"

لالی نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"ڈکیتی کی تھی؟"

"نہیں۔" لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

وہ جھنجلا کر بولا۔ "پھر جیل کیوں ہوئی تھی؟ کوئی چھوکری وکری بھگائی تھی؟"

"نہیں جی۔ میں ایسا کام نہیں کرتا۔" لالی نے آہستہ سے کہا۔ "سائیکل چرائی تھی۔"

"اوئے چڈو! اتی بڑی توپ چلائی تو نے۔" وہ کھِل کھلا کے ہنس پڑا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ "سن لو اس نیولے کے۔ جیل سے بھاگنے پر دو ہزار کا انعام رکھا ہے۔ پولیس کی مت ماری گئی ہے۔"

پھر اُس نے ڈانٹ کر لالی سے کہا۔ "اوئے [illegible]"

لالی اُس کے پاس چلا گیا۔ وہ شخص [illegible] کر کے بولا۔ "لے ذرا میری ٹانگیں دبا۔" لالی [illegible] بیٹھ کر ٹانگیں دبانے لگا۔ وہ شخص ذرا دیر [illegible] کو مخاطب کر کے بولا۔ "رشید بلا ابھی تک نہیں لوٹا؟"

دالم نے جواب دیا۔ "اب تو جی مشکل ہی [illegible] ہو گیا ہے۔ شام کو آئے گا وہ۔"

سرغنہ اونچی آواز سے گرج کر کہنے لگا۔ "تم بھی [illegible] چاروں طرف پولیس پھیلی ہے اور تم یہاں کھڑے ہو۔ [illegible] ہوشیاری سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہو۔ خطرہ ہو تو فوراً [illegible]" وہ پاس کھڑے ہوئے ڈاکو سے مخاطب ہوا۔ "فکیرے! [illegible] اونچے درخت پر چڑھ کر دُور دُور تک نظر ڈال لینا۔"

وہ سب چلے گئے۔ صرف لالی رہ گیا۔ وہ گردن جھکائے [illegible] پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد سرغنہ نے لالی سے کہا۔ "اوئے نیولے [illegible]"

اس دفعہ لالی بھڑک اٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال [illegible] "دیکھو جی! مجھے نیولا شیولا مت کہو۔" ڈاکو نے جھٹ کاربین [illegible] اور تیوری پر بل ڈال کر چیخا۔ "کیا کہا؟"

لالی مرعوب نہیں ہوا۔ گردن اونچی کر کے بولا۔ "میرا نام لالی [illegible] نیولا نہیں۔"

"چل لالی ہی سہی۔" وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور کاربین پر [illegible] ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی جان لے میرا نام [illegible] کاکڑ ہے۔ چھ قتل کر چکا ہوں۔ پرسوں رات والا ساتواں تھا۔ تو چوری چکاری کرنے والا مجھے کیا جانے۔ پولیس جانتی ہے مجھے۔ میرے سر کی بولی پانچ ہزار رکھی گئی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے کاکڑ۔ میں تجھے نہیں جانتا۔" لالی اُس کے پیر دباتے ہوئے بولا۔ "تجھے کون نہیں جانتا مگر مجھے گلہ یہ ہے کہ پولیس تو مجھے جانتی ہے، تو نہیں جانتا۔ جانتا ہوتا تو میرا رستہ نہ روکتا۔ مجھ سے تو تجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

کاکڑ ہنس کر بولا۔ "اب تو جا لا بھی پھیل گیا۔ اس وقت نکل کے کہاں جائے گا؟" اُس نے لالی کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔ "تو نے تو اپنا ٹھکانا بھی دیکھ لیا۔ ابھی تجھے نہیں جانے دوں گا۔ دن یہیں کاٹ لے۔ رات کو اپنے ساتھ نکل چلنا۔ رشید بلا آجاتا تو میں آج ہی نکل جاتا۔ مجھے اُسی کا انتظار ہے۔ شام تک آ ہی جائے گا۔"

لالی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا خاموشی سے کاکڑ کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد کاکڑ درخت سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ "لے ذرا

کندھے بھی دبائے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ رات بھر راؤنڈ پر رہا۔ پولیس گھات میں ہے۔ اپنے کو بھی چوکس رہنا پڑتا ہے۔" وہ چند لمحے آنکھیں بند کیے چپ بیٹھا رہا پھر بولا۔ "تو لگتا تو جی دار ہے۔ کہاں پڑ گیا چوری چکاری میں۔ کیا دھرا ہے اس میں۔ پوچھو پکڑا گیا، صرف ایک سائکل۔ ملا کیا، دو سو سے بھی کم اور سزا دو سال سے اوپر ہی ہوتی ہوگی۔" اس نے ذرا توقف کیا۔ "جی چاہے تو لگ جا اپنے ساتھ لین میں۔ ڈکیتی کا مزا بھی دیکھ لے۔ لومڑی سے ایک دم شیر بن جائے گا، شیر۔ کیا سمجھا؟"

لالی نے آہستہ سے کہا۔ "ڈاکے تو میں نے بھی ڈالے ہیں۔ راشن ڈپو لوٹا ہے، ایک پٹرول پمپ بھی لوٹا ہے۔" وہ ذرا اسار کا۔ "پر اس وقت مجھے رحیم داد کے پاس جانا ہے۔"

"کون رحیم داد؟" کاکڑ نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"وہی جو میرے ساتھ جیل سے بھاگا تھا۔"

"گولی مار اسے۔ اپنی سوچ۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ "میں اس سے دغا نہیں کر سکتا۔"

کاکڑ بولا۔ "جیسی تیری مرضی لیکن جب تک اپنا ادھر پڑاؤ ہے تو نہیں جا سکتا۔ دن تو تجھے یہیں کاٹنا پڑے گا۔ رات کی رات کو دیکھی جائے گی۔"

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی مگر ذرا ہی دیر بعد لالی کو اس بیگار سے نجات مل گئی۔ کاکڑ بولا۔ "بس کر۔ نیند آ رہی ہو تو یہیں لیٹ جا۔ پروا نہ کر۔ دوپہر کا کھانا تجھے بھی ملے گا۔"

لالی چپ چاپ اٹھا اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے گٹھڑی مرحلے سکڑ کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ نرم نرم جھونکوں سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کو لالی بیدار ہوا۔ کاکڑ کھیس بچھائے بے خبر سو رہا تھا۔ سامنے فقیرے بندوق سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔ لالی ذرا دیر لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فقیرے اس کے لیے کھانا لے آیا۔ باسی روٹی تھی اور اس کے ساتھ صرف پیاز اور ہری مرچ تھی۔ البتہ پینے کو پانی گلاس بھر کر ملا۔ کھانا کھا کر لالی پھر لیٹ گیا مگر اسے نیند نہیں آئی، وہ پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ نہ اس نے فقیرے سے بات کی نہ فقیرے نے اس سے۔ فقیرا چپ چاپ بیٹھا لالی کو گھورتا رہا۔ والم ایک بار آیا مگر کاکڑ کو سوتا پا کر چپ چاپ واپس چلا گیا۔

لالی پیشاب کرنے اٹھا۔ اس نے کچھ دور آگے جانا چاہا تو فقیرے بھی بندوق سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ اس نے فقیرے سے کوئی بات نہیں کی۔ پیشاب کرنے کے بعد اپنی جگہ آ کر لیٹ گیا مگر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس نگرانی سے لالی سخت پریشان ہوا۔ رات کا جانا بھی اسے مشکل نظر آیا۔

اسی پریشانی میں شام ہو گئی۔ کاکڑ بیدار ہو گیا مگر اس نے بھی لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بیٹھا انگڑائیاں لیتا رہا پھر اس نے فقیرے سے پانی منگوا کر پیا، کاربین سنبھالی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ فقیرے جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔ لالی اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد کاکڑ واپس آیا۔ اس کے ہمراہ پھیرو بھی تھا۔ دونوں کھیس پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ وہ اس قدر آہستہ بول رہے تھے کہ لالی ٹھیک سے کچھ نہیں سن سکا۔ البتہ ان کی باتوں سے اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ رشید بلا ابھی تک واپس نہیں آیا ہے اور اس کے نہ آنے سے کاکڑ بہت پریشان ہے۔

اندھیرا خوب گہرا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی تھی۔ پھیرو جا چکا تھا۔ فقیرے بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ کاکڑ اکیلا بیٹھا تھا اور سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ دھوئیں کی تیز بو سے لالی تاڑ گیا کہ کاکڑ چرس بھری سگریٹ پی رہا ہے۔ لالی اور کاکڑ ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھے تھے مگر دونوں خاموش تھے۔ اسی دوران نالے کے اس پار سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی اونچی آواز سے بول رہا ہو۔ کاکڑ نے سگریٹ بجھا دی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کاربین اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ ذرا دیر بعد اندھیرے میں کوئی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آیا۔ یہ والم تھا۔ کاکڑ نے پوچھا۔ "والم! یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟"

"رشید بلے نے مروا دیا۔"

کاکڑ نے ڈانٹ کر کہا۔ "بات کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتا؟"

"پولیس نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ انسپکٹر منہ سے بھونپو لگا کر بول رہا ہے۔ کہتا ہے ہتھیار ڈال دو۔" یہ کہہ کر والم رکا پھر غصے سے چیخا۔ "کہاں گیا وہ حرام کا تخم؟ میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ پولیس کا مخبر ہے۔" یہ کہتا ہوا والم اندھیرے میں اٹکل سے آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ کر اس نے زور سے اس کی کمر پر لات ماری۔ لالی بلبلا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ لالی کو اور مارتا مگر کاکڑ نے اسے روک دیا۔ "رہنے دے والم! اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔" پھر وہ لالی سے مخاطب ہوا۔ "دیکھ! یہاں سے ہلا تو تیرے لیے فضول ایک کارتوس خراب کرنا پڑے گا۔" والم بولا۔ "مجھے ایک کارتوس خراب ہی کر لینے دو۔ میں اسے

نہیں چھوڑوں گا۔"

کاکڑ نے ڈانٹ کر کہا: "بکواس نہ کر۔ اس چرسی چور کو گولی مار۔ کام کی بات کر۔" اُس نے ذرا تامل کیا۔ "رشید بلا جانے کس چکر میں پھنس گیا۔ راشن پانی اپنے پاس ختم ہو چکا ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہوگا ورنہ کل پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بتا انسپکٹر کدھر ہے؟"

"جوہڑ کے اس پار جھاڑیوں کے پیچھے ہے۔" دالم نے کہا۔ "آواز وہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سُنی ہے۔"

کاکڑ کہنے لگا: "ایسا کر، فقیرے کو میرے پاس بھیج دے۔ تو ملنگی کے ساتھ مورچا لگا کر انسپکٹر کی پارٹی پر فائر کھول۔ پھیرو سے کہہ کہ وہ اور دارا تھوڑے فاصلے سے مورچے لگا دیں۔ دیکھ سمٹ کر رہنا۔ دُور دُور نہ بکھر جانا۔ فائر ایک ساتھ کھولنا۔ ایسا لگے جیسے چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے۔"

دالم کہنے لگا: "اب میں چلوں؟"

کاکڑ زور سے دہاڑا: "پوری بات تو سن۔ زیادہ جلدی دکھائی تو مروا دے گا تو۔" اس نے ذرا سا توقف کیا پھر کہنے لگا: "میں فقیرے کے ساتھ پیچھے سے پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مال پانی اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ جب میری طرف فائرنگ ہلکی پڑ جائے تم چاروں تیز فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کر دینا اور اندھا دھند گولی چلاتے ہوئے نکل جانا۔ میں نہر کی پلیا کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ ہر بات پوری طرح سمجھ گیا؟"

"بالکل پروا نہ کرو۔ پولیس سے پہلی بار مقابلہ نہیں ہے۔ پہلے بھی بہت گولی چلی ہے۔ اس دفعہ صاف نکل جائیں گے۔ کارتوس بھی کافی ہیں۔"

کاکڑ نے کہا: "اب تو جا۔ فقیرے کو بھیج دے۔" دالم چلا گیا۔

کاکڑ کاربین سنبھال کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ لالی زمین پر چپ چاپ سہما ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور کاکڑ کے قریب جا کر کہنے لگا: "سچ کہتا ہوں، میں لالی ہی ہوں، جیل سے بھاگا ہوا قیدی۔ میں پولیس کا مخبر نہیں ہوں۔ نہ جانے کیسے میرے بارے میں تمہیں شبہ ہو گیا۔ تم میری بات کا یقین مان لو۔ جیسی چاہو مجھ سے قسمیں لے لو۔" اُس کے لہجے میں التجا تھی۔

کاکڑ بے نیازی سے بولا: "میں کب کہہ رہا ہوں تُو لالی نہیں ہے۔ پولیس کا مخبر تو تجھے دالم کہتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے اُسے تجھ پر مخبر ہونے کا شبہ ہو گیا۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔"

"میں تو صبح سے تمہارے سامنے ہوں۔ کہیں گیا بھی نہیں۔"

کاکڑ بولا: "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تیرا ادھر آنا ہی کم شبے



کی بات نہیں۔ تو کہتا تھا سٹیشن جانا ہے۔ کون سا سٹیشن؟ ادھر کوئی سٹیشن نہیں ہے۔ تو نے خود ہی شبہ پیدا کیا۔"

لالی عاجزی سے بولا: "سچ کہتا ہوں، میں لالی ہوں، جیل سے..."

کاکڑ نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا: "سن لیا، سن لیا، تو لالی ہے، جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ میں نے تیری بات سچ مان لی۔" اس نے ذرا سا توقف کیا۔ "تو میرا مغز نہ کھا، بکواس بند کر اور چپ چاپ بیٹھ جا۔"

لالی نے اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا، خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا، ذرا ہی دیر بعد فقیرے آ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی کاکڑ درخت کے تنے کے پاس اندھیرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گٹھڑی تھی۔ اس نے گٹھڑی مضبوطی سے فقیرے کی پیٹھ پر باندھی پھر لالی سے کہا: "ادھر آ۔ تُو میرے ساتھ چلے گا۔" لالی لرز اٹھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے لاٹھی وہیں چھوڑ دی مگر اپنی پوٹلی نہیں چھوڑی، اُسے بغل میں دابا اور کاکڑ کے پاس پہنچ گیا۔

تینوں درختوں کے نیچے گھپ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لگ بھگ سو گز طے کرنے کے بعد کاکڑ ٹھہر گیا، لیٹا اور منہ میں انگلیاں ڈال کر اس نے زور سے سیٹی بجائی۔ سیٹی بلند ہوتے ہی رات کے سناٹے میں نالے کے قریب گولیاں گونجنے لگیں۔ کاکڑ اور فقیرے چپ چاپ کھڑے رہے۔ لالی بھی دم بخود کھڑا انتظار میں تابڑ توڑ گولیاں چلتی رہیں۔ لالی نے کاکڑ کی پشت پر لٹکی ہوئی فاضل بندوق دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا: "تمہارے پاس کاربین ہے۔ مجھے بندوق دے دو۔ میں بالکل نہتا ہوں۔ تمہاری مدد بھی کر سکوں گا۔" کاکڑ نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا: "دے دوں گا۔ ضرور دے دوں گا۔" مگر اس نے بندوق دی نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے

لالی کو آہستہ سے دھکا دے کر کہا "آگے چل۔"

لالی آگے بڑھا مگر وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے رہے۔ اُنھیں اپنے ہمراہ نہ پاکر لالی ٹھٹکا اور پلٹ کر دیکھا۔ کالڑے نے ڈانٹ کر کہا۔ "دیکھتا کیا ہے۔ آگے بڑھ۔" یہ کہہ کر اُس نے لالی کو کاربین کی زد پر رکھ لیا۔

لالی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ آگے پولیس تھی، پیچھے کالڑا اور فقیرے تھے۔ اُدھر بھی بندوقیں تھیں، اِدھر بھی بندوقیں تھیں۔ لالی دونوں کے بیچ میں تھا اور بالکل غیر مسلح تھا۔ بھاگنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اُس کی پُشت پر کالڑا اور فقیرے بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ خشک پتے اُس کے پیروں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ آیا، سامنے سے پولیس نے بندوقوں سے باڑھ ماری۔ گولیاں چیختی ہوئی چلیں۔ لالی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ فائرنگ مسلسل ہوتی رہی۔ گولیاں لالی کے سر پر سے سیٹی بجاتی، ٹانگوں پر سے سنسناتی ہوئی گزرتی رہیں۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ موت اُس کے چاروں طرف منڈلاتی رہی۔ وہ رُک رُک کر سانس لیتا رہا۔

کالڑا اور فقیرے نے جوابی فائرنگ نہیں کی۔ کچھ دیر بعد پولیس نے گولی چلانا بند کر دیا لیکن نالے کے آس پاس فائرنگ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ لالی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کوئی گولی اُس کے جسم کے کسی حصے میں لگی بھی ہے یا نہیں۔ اُسے صرف اس قدر ہوش تھا کہ وہ زندہ ہے۔ لالی کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی کہ کالڑے نے اسے تنہا آگے کیوں بڑھایا اور اُسے پولیس کی گولیوں کی بوچھاڑ میں بالکل سامنے کیوں کر دیا۔ اپنے منصوبے کے مطابق نہ اُس نے جوابی فائرنگ کی نہ ہی پولیس کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی۔ لالی ذرا دیر دم سادھے پڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا درختوں کی جانب بڑھنے لگا۔ آخر وہ درختوں تلے اندھیرے میں آ گیا۔ پولیس نے پھر فائرنگ شروع کر دی مگر اب لالی فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ کالڑا اور فقیرے نے اس بار بھی پولیس کے جواب میں گولی نہیں چلائی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ وہ فائرنگ کی زد سے زیادہ سے زیادہ دُور چلا جانا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد وہ ٹھہر گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ پوٹلی ابھی تک اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ہے۔ پولیس رُک رُک کر فائرنگ کرتی رہی۔ پھر لالی نے اپنے بہت قریب قدموں کی آہٹ سُنی۔ ساتھ ہی مدھم لہجے میں باتوں کی آوازیں بھی اُبھریں۔ "لالی مارا گیا۔" یہ فقیرے کی آواز تھی۔ فقیرے کے ساتھ کالڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اُسے تو مارا ہی جانا تھا۔ آگے بھیجا اسی لیے تھا۔ دیکھ، پولیس کیسے چکر میں آ گئی۔"

فقیرے بولا۔ "پولیس ابھی تک اُسی طرف گولی چلا رہی ہے۔"

"چلانے دے۔ چلانے دے۔" کالڑے نے کہا۔ "اپنے لیے اِدھر کا راستہ صاف ہو گیا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر آہستہ سے بولا۔ "میرے پیچھے پیچھے۔"

دونوں دبے دبے قدموں سے آگے بڑھ گئے۔ لالی سانس روکے کھڑا رہا۔ اُن کی آہٹ رفتہ رفتہ دُور ہوتی گئی، پھر ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس طرف بھی گولیاں گونجیں جدھر کالڑا اور فقیرے گئے تھے۔ لالی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کدھر جائے۔ ہر سمت گولیاں تڑا تڑ چیخ رہی تھیں مگر ٹھہرنا بھی خطرناک تھا۔ اُسے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھا اور کچھ دُور تک بڑھتا گیا۔ پھر اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اُسی وقت دُور سے ٹارچ کی روشنی اُبھری۔ لالی نے دیکھا کہ پھیرو خون میں لت پت پڑا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ ٹارچ بجھ گئی مگر اُس کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ لالی جھٹ زمین پر گر پڑا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اُس کے برابر سے گزرتی رہیں۔ قریب ہی پھیرو کی لاش پڑی تھی۔

چاند نکل آیا تھا مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی بہت پھیکی اور دھندلی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ لالی زیادہ دیر اُس جگہ نہیں ٹھہرا۔ جیسے ہی فائرنگ ذرا تھمی، وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے بھاگا اور دُور تک بھاگتا چلا گیا۔ پھر وہ درختوں کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا مگر یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا کہ دھندلی چاندنی میں ایک کانسٹیبل عین اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ کانسٹیبل بھی اُسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ لالی ٹھٹک کر رُکا، پھر نہایت تیزی سے دوڑتا ہوا سامنے کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں وہ کچھ دُور آگے آیا تھا کہ اُس نے سُنا، کانسٹیبل کہہ رہا تھا۔ "نہیں دیوان جی! وہ لالی ہی تھا۔ کانسٹیبل عابد نے کپڑے بتائے تھے، وہی پہنے ہوئے تھا۔ میرے سامنے بالکل اس طرح کھڑا تھا جیسے تم کھڑے ہو۔"

"تم نے جھپٹ کر اُسے دبوچ نہ لیا؟"

"موقع ہی نہیں دیا اُس نے۔ چھلاوے کی طرح نکل گیا مگر خیر، جائے گا کہاں؟"

لالی اُن کی باتیں سُنتا، جھاڑیوں میں دبکتا، گھبرایا ہوا اندھیرے میں تیزی سے چلتا رہا۔ پچاس ساٹھ گز اُس نے جلدی جلدی طے کر لیے۔ اُس کے آس پاس گہری خاموشی تھی لیکن نالے کی طرف ابھی

رُک رُک کر گولیاں چل رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک طرف
ہوا تو قریب سے بھاری قدموں کی آہٹ اُبھری۔ ساتھ ہی آواز بھی
آئی: "محمد خاں! اُدھر اندھیرے میں جھاڑیوں تلے کوئی سفید سفید چیز
ہلتی نظر آتی ہے۔"

لالی نے جھٹ راستہ بدل دیا اور تیزی سے بھاگا مگر ایک
جھاڑی سے اُس کی دھوتی ایسی اُلجھی کہ وہ ننگا ہو گیا اور وہیں دبک
کر بیٹھ گیا۔ اُس نے ہولے ہولے دھوتی جھاڑی سے علیحدہ کی۔ ڈب
سے نکل کر نوٹ گر گئے تھے انھیں ٹٹول ٹٹول کر اکٹھا کیا اور دھوتی کے
پلو میں باندھ لیا مگر دھوتی دوبارہ نہیں باندھی بلکہ جلدی جلدی قمیص
بھی اُتار دی۔ قمیص اور دھوتی کا رنگ سفید تھا اور اُن کا اُجلا پن اندھیرے
میں دُور سے جھلکتا تھا۔ لالی نے جوتے بھی اُتار دیے۔ جوتوں سے آہٹ
پیدا ہوتی تھی اور بھاگنے میں بھی دقت ہوتی تھی، اُس نے قمیص اور جوتے
جھٹ پٹ پوٹلی میں باندھ لیے۔ اب وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

کچھ دیر وہ جھاڑی کے پیچھے دبکا بیٹھا رہا۔ جب قدموں کی آہٹ
دُور ہو گئی تو اُس نے پوٹلی بغل میں دبائی اور جھاڑیوں کے درمیان
چھپتا چھپاتا آگے بڑھا۔ اُسے پولیس والوں کے بوٹوں کی چاپ
برابر سنائی دے رہی تھی۔ کبھی چاپ قریب آجاتی، کبھی دور ہو جاتی۔
کئی منٹ تک وہ اسی طرح جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ بار بار
راستے بدلتا رہا۔ کہیں قدموں کی رفتار تیز کر دیتا، کہیں جھاڑی کی آڑ لے
کر دبک جاتا۔ جھاڑیوں میں کانٹوں کی بہتات تھی۔ لالی کے برہنہ جسم
پر کانٹوں سے جگہ جگہ خراشیں پڑ گئیں اور خون رسنے لگا مگر اِس
برہنگی سے اُسے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اندھیرے میں گھل مل گیا۔ پولیس
کے لیے اُس کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں جھنگر ختم ہو گیا تھا اور
ساتھ ہی جھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ سامنے چٹیل میدان
تھا اور اُس سے آگے کسی قدر بلندی پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔
درختوں کی آڑ سے زرد زرد روشنی کا ایک دھبا نظر آ رہا تھا۔ لالی نے
اِدھر اُدھر دیکھا اور سرپٹ بھاگا۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی
جانب لپکا۔ دُور سے کوئی چیخا "ٹھیر جا لالی!" مگر لالی ٹھیرا نہیں۔
دوبارہ اور زیادہ زور سے چیخنے کی آواز اُبھری: "ٹھیر جا، نہیں تو گولی
چلا دوں گا۔"

لالی پھر بھی نہیں ٹھیرا۔ گولی گہرے سناٹے میں زور سے گونجی اور
نہ جانے کدھر نکل گئی۔ لالی بلندی پر پہنچ گیا اور دوڑ کر درختوں کے
نیچے چلا گیا۔ اُس نے کچھ فاصلے پر کھپریلوں کی چھت والا، پرانی وضع کا
ایک بنگلا دیکھا۔ بنگلے کی ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی
تھی۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ اُسے اپنے عقب میں بھاری
بھاری بوٹ دوڑنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ
جھٹ ایک درخت پر بندر کی طرح پھرتی سے چڑھ گیا اور ایک شاخ
سے جھول کر بنگلے کی چار دیواری کے اندر کود گیا۔

لالی درختوں اور پودوں کی آڑ لیتا ہوا سیدھا اُس کھڑکی پر پہنچا
جس سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اُس نے شیشے سے اندر جھانک کر
دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ چٹخا ہوا تھا۔ لالی نے
اُنگلی چبھا کر شیشہ نصف سے زیادہ توڑ دیا۔ اُس کی اُنگلی کٹ گئی، خون
بہنے لگا۔ لالی نے اُنگلی ہونٹوں میں دبا کر خون چوسا پھر جلدی سے ہاتھ
ڈال کر چٹخنی کھولی اور کھڑکی کے راستے اندر چلا گیا۔

سامنے میز پر لیمپ رکھا تھا۔ اُس کی مدھم روشنی میں ہر چیز
دُھندلی نظر آ رہی تھی۔ لالی سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چار
دیواری کے اُس پار بھاری بھاری قدموں کی آہٹ اُبھر رہی تھی ساتھ
ہی زور زور سے سیٹیاں بھی بجنے لگیں۔ لالی اور سراسیمہ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد
اُس نے چار دیواری کا آہنی پھاٹک کھلنے کی آواز سنی۔ وہ بدحواس ہو
کر آگے بڑھا اور ایک کرسی سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ کرسی اُلٹ گئی۔
کرسی اُلٹنے سے آواز پیدا ہوئی اُس کے ساتھ ہی سامنے کا دروازہ کھلا۔
ایک شخص دھاری دار گاؤن پہنے باہر نکلا۔ وہ گورا چٹا، ڈہرے جسم کا
آدمی تھا۔ چہرے پر بھوری بھوری شان دار مونچھیں تھیں۔ عمر چالیس
پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں پستول دبا ہوا
تھا۔ دوسرا ہاتھ گاؤن کی جیب میں تھا۔ اُس نے حیرت سے آنکھیں
پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ لالی اُس کے سامنے بالکل ننگ دھڑنگ کھڑا
تھا۔ سر کے بال گرد سے اَٹے ہوئے تھے اور جسم پر بھی گرد ہی گرد تھی۔
جگہ جگہ آڑی ترچھی خراشیں بھی تھیں۔ ہونٹوں کے نیچے تازہ تازہ
خون کا دھبا تھا جو ٹھوڑی سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ شخص لالی
کی یہ ہیئت دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا: "کون ہو تم؟ اندر
کیسے آ گئے؟"

ابھی اُس نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ بنگلے کے بڑے دروازے
پر زور زور سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔ لالی دہشت زدہ
ہو کر بولا: "وہ۔ وہ پولیس!" گھبراہٹ میں وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ خوف
اور بھاگ دوڑ سے اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی، وہ زور زور سے
ہانپ رہا تھا۔

اُس شخص نے پوچھا: "کیا پولیس تمھارا تعاقب کر رہی ہے؟"
لالی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اُس شخص نے دریافت کیا: "پولیس
تمھارا تعاقب کیوں کر رہی ہے؟"

لالی نے گڑگڑا کر کہا: "مجھے بچا لیجیے۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔"
ننگا، خاک سے اَٹا ہوا لالی دھندلی روشنی میں بڑا مسکین نظر آ رہا تھا۔
اُس شخص نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور تسلی دینے کے انداز میں بولا: "اچھا، اچھا۔" اُس نے ذرا تامل کیا: "تم یہیں کھڑے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"
وہ جس کمرے سے نکلا تھا پھر اُسی میں چلا گیا۔

لالی ایک کونے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ کمرے میں ہر طرف اونچی اونچی الماریاں ہیں۔ الماریوں کے شیشوں کے پیچھے ترتیب سے رکھی ہوئی طرح طرح کی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی چمکتی ہوئی میز تھی۔ میز پر لیمپ روشن تھا۔ اُس پر دودھیا رنگ کا گول شیڈ تھا۔ اس شیڈ نے روشنی مدھم کر دی تھی۔ میز پر کاغذات اور چند موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔

اب بنگلے کے بیرونی دروازے پر آوازیں بند ہو گئیں تھیں۔ لالی کونے میں سہما ہوا خاموش کھڑا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی نے اُس کھڑکی کی جانب دیکھا جسے پھاند کر وہ کمرے کے اندر آیا تھا۔ کھڑکی کا ایک پٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس اثنا میں بنگلے کا بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سناٹے میں اُبھری۔ لالی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دم بخود اور سہما ہوا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے گھور کر لالی کو دیکھا اور غصے سے بولا: "بیوقوف! کپڑے تو پہن لے۔"

لالی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ گٹھری کھولی اور دھوتی نکال کر کمر کے گرد باندھنے لگا۔ اُس شخص نے پوچھا: "کیا تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو؟"

"ہاں!" لالی نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

وہ کہنے لگا: "میں نے تمھیں پولیس سے بچا لیا ہے اس لیے کہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔" اُس نے ذرا سا توقف کیا: "میں میاں حیات محمد ہوں۔ تم اس وقت میری پناہ میں ہو۔"

لالی نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا: "آپ نے جی مجھ پر بہت بڑا احسان کیا۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا اور عاجزی سے بولا۔ "بات یہ ہے جی۔۔۔"

حیات نے اُس کی بات نہیں سنی، رعب سے بولا: "تم سے صبح بات ہو گی۔ یہ میرے سونے کا وقت ہے۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اُنگلی کے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا: "میرے ساتھ آؤ۔" وہ آگے بڑھا۔ لالی اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دونوں کمرے کا ایک دروازہ کھول کر [illegible]
اور کچھ دور جا کر ایک دروازے کے سامنے [illegible]
حیات نے لالی سے کہا: "اندر جا کر سو جاؤ۔ دروازہ [illegible]
محفوظ ہو۔"

لالی چپ چاپ اندر چلا گیا اور دروازہ [illegible]
کوٹھری تھی۔ اوپر بلندی پر روشن دان تھا۔ اُس [illegible]
سلاخیں لگی تھیں۔ روشن دان سے ہلکی ہلکی روشنی [illegible]
دروازے کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس [illegible]
کے اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ اُس نے دیکھا کہ دیوار [illegible]
چبوترا ہے۔ لالی نے اُس پر ہاتھ پھیرا۔ چبوترا صاف [illegible]
سے چبوترے پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے گٹھری سر کے [illegible]
پھیلا کر لیٹ گیا مگر اُسے نیند نہیں آئی۔ وہ چپ چاپ [illegible]
سوا گھنٹے بعد وہ چبوترے سے نیچے اُترا۔ گٹھری بغل میں [illegible]
چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور کان لگا کر باہر کی آہٹ [illegible]
گہرا سکوت تھا۔ وہ فولادی پٹ والے دروازے کے قریب [illegible]
اُس نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کے دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ
باہر سے بند تھا۔ لالی نے پریشان ہو کر دروازہ دھیرے سے ہلایا [illegible]
کسی کی کھنکار اُبھری۔ لالی ایسا دہشت زدہ ہوا کہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے
بچا۔ اُس نے دیوار کا سہارا لیا اور گہری سانس بھر کر دروازے سے سر ٹکا دیا۔



جانگلوس
خدا کی بستی کے خالق
شوکت صدیقی کے قلم سے
ایک تاریخی تحریر
باقی واقعات آئندہ شمارے
میں ملاحظہ فرمائیے۔

ریلوے اسٹیشن پر دو شناسا اتفاقاً مل گئے۔ پہلا بولا "اخاہ! آپ سے تو اب ناطہ ہی نہیں رہا۔ آج برسہابرس میں زیارت ہوئی۔ کہاں سے آرہے ہیں؟" دوسرے نے بتایا "ایک بارات کے ساتھ میرپور گیا تھا، وہیں سے آرہا ہوں اور آپ؟" پہلا بول اٹھا "میں بھی میرہی پور سے آرہا ہوں۔ کراچی کی یکسانیت سے اکتا کے کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔ وہاں بھی ایک رہائش گاہ ہے اللہ کے فضل سے۔"

اس قسم کے مکالمے اُردو میں آپ نے اکثر سُنے اور پڑھے ہوں گے۔ یہ عام فہم، رواں دواں اور بیک نظر بے عیب معلوم ہوتے ہیں مگر ان صرف تین مکالموں میں پوری چھ خامیاں ہیں۔ ایک مکالمے میں دو خامیاں۔ ناطہ، برسہابرس، بارات، یکسانیت، رہائش گاہ اور "ہی"۔ "ہی" کا استعمال میرپور کے عین درمیان میں ہوا ہے۔ "میں بھی میرہی پور سے آرہا ہوں۔" یہ ایک دل چسپ غلطی ہے۔ اسی طرح ناطہ دراصل ناتا ہے۔ بارات، بَرات ہے اور یکسانیت، یکسانی ہے۔ اب رہ گئے برسہابرس اور رہائش گاہ۔ برس اور رہنا ہندی الفاظ ہیں، انھیں فارسی طریقے سے سالہاسال اور آزمائش یا زیبائش کی طرح استعمال کرنا درست نہیں۔ بولتے اور لکھتے وقت ہم نادانستگی میں نہ جانے کتنی غلطیاں کرجاتے ہیں۔ غلطیوں کی ہمیں اتنی عادت ہوگئی ہے کہ اگر کبھی غلطی سے صحیح لفظ بول جائیں تو وہ نامانوس بلکہ غلط معلوم ہونے لگتا ہے۔ "سب رنگ" میں لسانی اغلاط سے بچنے کی بساط بھر کوشش کی جاتی ہے۔ یہ کوشش بعض قارئین کے لیے بجا طور پر تجسس کا باعث ہوتی ہے لہٰذا آئیے، اس جائزے کے ذریعے ہم ذرا اپنے صحیح و غیر صحیح کی آزمائش کریں۔

زبان نہ صرف بولنے والے کا مبلغ علم ظاہر کرتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، کتنا مہذب ہے اور کن لوگوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ ایک صاحب خود کلامی و خود نویسی کے مبلغ ہونے کے علاوہ غلط کلامی و غلط نویسی کے بھی پُرزور مؤید ہیں۔ اُن کا کہنا ہے "زبان محض ایک ذریعہ ہے خیالات کی ترسیل کا۔ اُس کی نوک پلک سنوارنے اور اُسے نک سک سے دُرست کرنے میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔" یقیناً زبان ایک ذریعہ ہے مگر کیا ذریعہ کوئی غیر اہم چیز ہوتی ہے؟ محبوب و محب ایک دوسرے کے لیے ذہنی یا جسمی آسودگی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ رنگ، روشنی، خوشبو حصولِ راحت کے ذرائع ہیں۔ اونٹ گاڑی، سائکل، اسکوٹر، کار، ریل، بحری جہاز، طیارہ، خلائی سیارہ، یہ سب بھی ذریعے ہیں۔ کیا ان کی کوئی اہمیت نہیں؟ جب تک مقصد حاصل نہ ہو جاتے، جب تک منزل قدموں میں نہ بچھ جاتے، ذریعے اور راستے کو مقصد و منزل پر فوقیت حاصل رہتی ہے۔ آپ کسی معزز مہمان کو پلاؤ کھلانا چاہیں تو مقصد پلاؤ کھلانا ہوتا ہے لیکن آپ برتنوں کے اہتمام میں بھی اُسی نفاست کا خیال رکھتے ہیں جو پلاؤ کے اجزا گوشت، چاول اور مسالے وغیرہ کے انتظام میں آپ کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ حالانکہ برتن، گوشت چاول اور مسالے، یہ سب ذرائع ہیں۔ ان کے علاوہ ترقی کیا ہے؟ تنخواہ کیا ہے؟ مکان کیا ہے؟ کیا یہ سب بجائے خود کچھ ہیں یا محض ذرائع ہیں؟

خیالات کی ترسیل تو اشاروں اشاروں میں بھی ہو جاتی تھی بلکہ اشاروں کی زبان آج بھی بلاغت کی معراج ہے اور بسا اوقات ایک اعجاز ثابت ہوتی ہے پھر یہ زبانیں کیوں تشکیل ہوئیں؟ ان کے قواعد کیوں مُرتب کیے گئے؟ لغات کیوں

قطع کلام

* انور شعور

چھپائی جاتی ہیں ؟ خیالات کا تبادلہ تو پرندے، درندے اور حشرات بھی کر لیتے ہیں۔ نباتات، جمادات اور سیارگان بھی نطق و صوت سے محروم نظر آتے ہیں مگر ہماری سماعت اُن کی سرگوشیوں سے گھن گرج سے اور اُن کی کراہوں سے نا آشنا نہیں اِس کے باوجود مخلوقات میں حیوانِ ناطق اشرف و برتر سمجھا جاتا ہے اور اُس کی برتری حقیقت میں اُس کے ذریعے کی برتری ہے۔ زبان ایک ذریعہ ہے خیالات کی ترسیل کا مگر خود خیالات کی ترسیل کیا ہے ؟ کیا یہ بھی محض ایک ذریعہ نہیں ؟ دنیا جائے اسباب ہے، اسباب سے مُراد ذرائع۔ یہاں کی ساری رونق، ساری جلوہ آرائی ذرائع ہی کی کرشمہ کاری ہے۔

مُروّج	صحیح
سِمت	سَمت
موسِم	موسَم
مکمِّل	مکمَّل
مبارِک	مبارَک
اِخلاق	اَخلاق
اِسرار	اَسرار
موجودگی	موجودی

گاف اور یے یا گاف، الف اور نون کا استعمال صرف اُن الفاظ میں ہوتا ہے جو ہائے ہوز پر ختم ہوتے ہیں مثلاً نغمہ، زندہ، رفتہ، دل زدہ وغیرہ۔ نغمگی، زندگی، رفتگاں، دل زدہ گاں۔

موجودگی، موجودہ کے لیے مستعمل ہے، موجود کے لیے نہیں، مثلاً "میں اُس کی موجودگی میں وہاں پہنچا" مطلب یہ ہوا کہ "میں اُس وقت وہاں پہنچا جب وہ موجود تھا" لہٰذا یہاں موجودگی کے بجائے موجودی استعمال کرنا چاہیے۔ اس اصول کا اطلاق مندرجہ ذیل لفظوں پر بھی ہوگا۔

مُروّج	صحیح	
کرختگی	کرختی	(کرخت سے)
درُشتگی	درشتی	(درشت سے)
ادائگی	ادائی	(ادا سے)
ناراضگی	ناراضی	(ناراض سے)

بعض الفاظ میں اعراب یعنی زبر، زیر، پیش کا غلط استعمال بے حد رائج ہے۔ مثلاً:

مروّج	صحیح
بینُ الاقوامی (نون پر پیش)	بینَ الاقوامی (نون پر زبر)
حتیُّ الامکان	حتیَّ الامکان
مابعدُ الطبیعات	مابعدَ الطبیعات
مافوقُ البشر	مافوقَ البشر
بینُ السطور	بینَ السطور
عِطر	عُطر
عِجز	عَجز
خودکَشی (کاف پر زبر)	خودکُشی (کاف پر پیش)
معزِز (زے کے نیچے زیر)	معزَز (زے پر زبر)

جہاں کسی واحد لفظ کی جمع استعمال ہونی چاہیے وہاں جمع الجمع کی ارزانی بھی قابلِ غور ہے۔

واحد	جمع الجمع	جمع
لازمہ	لوازمات	لوازم
نادر	نوادرات	نوادر
حکم	احکامات	احکام
رسم	رسومات	رسوم
رقم	رقومات	رقوم
وجہ	وجوہات	وجوہ
عجیب	عجائبات	عجائب
عُمدہ	عمائدین	عمائد
اکبر	اکابرین	اکابر
جوہر	جواہرات	جواہر

وہ تراکیب جو لفظوں کی ترتیب اُلٹ کر بنائی جاتی ہیں، اُن میں اضافت باقی نہیں رہتی مثلاً پسِ منظر۔ یہ ترکیب منظرِ پس کی ترتیب اُلٹ کر بنائی گئی ہے۔ ایسی ترکیبوں میں اضافت ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

مُروّج	صحیح	
پیشِ منظر	پس منظر	(منظرِ پس سے)
سرِ ورق	سرورق	(ورقِ سر سے)
شادیٔ مرگ	شادی مرگ	
شہرۂ آفاق	شہرہ آفاق	

(جاری ہے)





مغرب سے ایک اور نازک تحریر

مختصر، تازہ تر، عبرت اثر

نئے عہد کی ایک کہانی   ترجمہ * طارق حمید

از راہ کرم اس شخص کی مدد کیجیے

ایک صاحبِ اولاد کی روداد

میں اخبار پڑھ رہا تھا میری پانچ سالہ بیٹی این میرے پاس سے گزری۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک ڈبا تھا۔ میں نے ڈبے میں جھانک کے دیکھا۔ آدھا ڈبا مٹی سے بھرا ہوا تھا۔ مٹی میں ایک موٹا تازہ کیچوا پڑا تھا۔ میں نے این سے پوچھا "ڈبے میں یہ کیڑا کیوں ہے؟"

"تاکہ بیج کی حفاظت کرے۔" اُس نے جواب دیا۔

"بیج؟ کیسا بیج؟" میں نے پوچھا۔

"مالٹے کا بیج۔" این نے بتایا "وہ مٹی میں دبا ہوا ہے۔" اُس نے جا کر نلکا کھولا اور مجھ سے پوچھا "ڈیڈی! کتنا پانی ڈالتے ہیں؟"

"بہت تھوڑا سا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ خاصا پانی بھر چکی تھی۔ اُس نے ڈبا ترچھا کر کے فالتو پانی گرا دیا پھر احتیاط سے ڈبا اُٹھا کے اُسے حفاظت سے رکھنے کے لیے تہ خانے میں اتر گئی۔ ڈبا اُس نے تہ خانے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ کچھ فاصلے پر آتش دان روشن تھا۔ آتش دان کی وجہ سے تہ خانے میں خاصی گرمی تھی۔ باہر درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے تھا۔ کرسمس میں صرف چار روز باقی تھے۔ کرسمس کی مصروفیات میں کیڑے اور بیج کا ڈبا کسے یاد رہ سکتا تھا۔ اُسے بھلا دیا جاتا اور کوڑے کا ڈھیر اُس کا آخری ٹھکانا ہوتا۔ این کی توجہ کسی اور دلچسپی کی طرف مبذول ہو جاتی۔

رات کو سونے کے وقت این غائب تھی۔ میں نے اُسے گھر کے ہر کمرے میں تلاش کیا۔ وہ نہیں ملی۔ میں تہ خانے میں گیا وہ وہیں تھی، مجھے ڈبے کے اندر جھانکتی ہوئی ملی۔ میں نے پوچھا "اب کیا ہو رہا ہے؟"

اُس نے کہا "ڈیڈی! میں پودا اُگنے کا انتظار کر رہی ہوں۔" اُس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

"خوب" میں ہنسا۔ مجھے اُس کی گہری دلچسپی پر حیرت تھی۔ میں نے اُس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا "پودے جلدی نہیں اُگتے۔ کافی وقت لگ جاتا ہے۔ تم کب تک جاگتی رہو گی۔ پتہ ہے، سونے کا وقت

ہو چکا ہے۔ چلو، اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔"

این نے کہا۔ "ڈیڈی! ہمیں اسکول میں پودوں کی ایک فلم دکھائی گئی تھی۔ اُس میں تو پودے جلدی جلدی اُگ گئے تھے۔"

"بھئی! ایسی فلمیں خاص قسم کی ہوتی ہیں۔ انھیں سائنسی طور پر بنایا جاتا ہے۔" ایک چار سالہ بچی سائنسی باتیں کیسے سمجھتی پھر بھی میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایسی فلمیں چیزوں کی حرکات یعنی چیزوں کی رفتار تیز کر دیتی ہیں۔ فلموں میں ایسا ہو جاتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ تم نے کیڑے کا نام کیا رکھا ہے۔"

"جوکر۔" اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "بڑا اچھا کیڑا ہے ڈیڈی! میں نے اس کا نام جوکر رکھا ہے۔"

"بہت اچھا نام رکھا ہے، شاباش۔ اب جوکر کو شب بخیر کہو اور چل کے سو جاؤ۔" میں نے اُسے تہ خانے سے نکلنے پر رضامند کر لیا۔

سونے سے پہلے این دعائیں مانگ رہی تھی۔ کرسمس کا تہوار قریب تھا اس لیے اُس کی دعائیں خلوص سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ گزشتہ دو روز سے اپنی ایک ہم جماعت مارگریٹ سے لڑی ہوئی تھی مگر آج اُس نے مارگریٹ کے حق میں بھی دعا کی۔ مارگریٹ کے علاوہ اُس کی دعاؤں میں ممی اور ڈیڈی کا ذکر بھی آیا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس کی آخری دعا یہ تھی: "پیارے خدا! میرے جوکر پر بھی اپنا کرم کرنا کہ وہ اطمینان سے میرے بیج کی دیکھ بھال کر سکے اور اے خدا! مہربانی کر کے میرا بیج کرسمس سے پہلے اُگا دینا۔"

"این!" میں نے دخل دیا۔ "کرسمس میں صرف چار روز رہ گئے ہیں۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ کوئی چیز اتنی جلدی نہیں اُگ سکتی۔"

"میں نے خدا سے دعا مانگی ہے، آپ سے نہیں۔" این نے یقین سے کہا۔ "خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔"

کرسمس میں ایک دن رہ گیا تھا۔ دفتر سے واپسی پر مجھے این نظر نہیں آئی۔ میں سیدھا تہ خانے میں گیا۔ میری توقع درست نکلی۔ وہ وہیں تھی اور بہت صبر سے پودا اُگنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "بیج پھوٹا؟"

اُس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "ڈیڈی! شاید خدا نے میری دعا نہیں سُنی۔ آج رات خوب زور سے دعا مانگوں گی تاکہ وہ سُن لے۔"

میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ "سنو این!" میں نے اُسے گود میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے نا کہ خدا کو ایک بہت بڑی دنیا کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے؟"

"جی ہاں۔" اُس نے جلدی سے کہا۔

"لہٰذا خدا نے دنیا کا نظام آسان بنانے کے لیے کچھ طریقے بنا دیے ہیں تاکہ جان دار، درخت اور چاند ستارے اُن طریقوں کے مطابق چلیں اور کائنات میں افراتفری پیدا نہ ہو۔ افراتفری نہیں ہو گی تو دوسرے اہم کاموں کو بھی خدا کی توجہ ملے گی۔ سمجھ رہی ہو نا؟"

"جی ہاں!" اُس نے جواب میں کہا۔

"اچھا تو اب دیکھو۔ سورج کے لیے یہ طریقہ بنا دیا گیا ہے کہ وہ روز صبح طلوع ہو، شام کو یا دوپہر کو طلوع نہ ہو۔ اسی طرح پودوں کے لیے بھی یہ طریقہ ہے کہ وہ بہت آہستہ آہستہ پیدا ہوں، اُن کے بڑھنے کی رفتار بے حد کم ہو، اتنی کم کہ انسان کی آنکھ اُسے محسوس نہ کر سکے۔ سمجھ گئیں؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھارا مالٹے کا پودا کرسمس تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب تم خود سوچو، صرف تمھاری ضد سے تو قدرت کے طریقے میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن ہماری سنڈے اسکول کی ٹیچر نے کہا تھا کہ اگر تم خدا پر پورا بھروسا کرو تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ تمھیں صرف سچے دل سے دعا مانگنی پڑے گی، سچے دل سے مانگی ہوئی ہر دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ ڈیڈی! کیا آپ اس بات پر یقین نہیں رکھتے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ سچے دل سے مانگی ہوئی ہر دعا قبول ہوتی ہے لیکن ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے خدا کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔" مجھے اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا اندازہ ہوا۔

این میری گود سے اُتر گئی۔ "ڈیڈی! یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔" اُس نے عزم سے کہا۔ "کچھ بھی ہو جائے میں آج رات سچے دل سے زور زور سے دعا مانگوں گی تاکہ خدا سُن لے اور میرا مالٹے کا پودا کرسمس سے پہلے پیدا ہو جائے۔"

این چلی گئی۔ میں سخت دشواری میں پڑ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کل وہ اُٹھ کر بہت امید سے بلکہ یقین سے تہ خانے میں جائے گی مگر اُسے مالٹے کا پودا نظر نہیں آئے گا۔ نتیجہ کیا ہو گا؟ ممکن ہے نو عمری ہی میں، خدا سے اُس کا اعتماد اُٹھ جائے اور وہ مذہب سے برگشتہ ہو جائے پھر اُس کا مستقبل کیا ہو گا؟ کیا وہ دنیا اور آخرت سے بے نیاز ہو کر محض مادہ پرست بن جائے گی؟ یا ہپیوں کی صحبت میں عمر گزارے گی؟ میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

دن ڈھلنے تک میں مختلف کاموں میں مصروف رہا۔ مصروفیت میں این کا مسئلہ میرے ذہن سے نکل گیا پھر این کی ممی نے مجھے ناشتے

ضرورت کی ایک فہرست تھما دی۔ آٹھ بج رہے تھے لیکن تہوار کی رات تھی اس لیے دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں کار میں بازار چلا گیا۔ سردی بہت تھی، برف بھی پڑ رہی تھی۔ اس کے باوجود دُکانوں پر انتہائی رش تھا۔ میں خریداری سے رات گئے فارغ ہوا۔ گھر واپس آتے ہوئے مجھے سڑک پر کچھ ہنگامہ نظر آیا۔ میں قریب پہنچا۔ دو کانسٹیبل ایک ہپّی کو کھینچ کھانچ کر پولیس کی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہپّی سردی اور برف باری سے بے نیاز فٹ پاتھ پر مدہوش پڑا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے سوچا کہ نوجوان نسل روز بہ روز لامذہب ہوتی جا رہی ہے اور حقائق سے فرار حاصل کرنے کے لیے منشیات کا سہارا تلاش کر رہی ہے۔ مجھے این کا خیال آ گیا۔ میں نے دل میں کہا، وہ بھی ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ اگر کل تک اُس کا پودا کسی نہ کسی طرح اُگ جائے تو اُس کے دل میں خدا کی محبت راسخ ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں اُس کے مذہبی عقیدے کو شدید ٹھیس لگ سکتی ہے۔ کیا پتہ، وہ بھی بڑی ہو کر اسی طرح سڑکوں پر ماری ماری پھرے۔ میں اُس کے مسئلے پر غور کرنے لگا۔ غور کرتے کرتے ایک حل میری سمجھ میں آ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ حل پہلے کیوں ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں نے کار موڑ لی۔ اب میرا رخ دوبارہ بازار کی طرف تھا۔ بازار پہنچ کے میں نے کار پھولوں کی ایک دُکان کے باہر روک دی اور اُتر کے دُکان میں داخل ہو گیا۔ دُکان دار نے میرے قریب آ کے کہا۔

"فرمائیے کیا خدمت کی جائے؟"

"آپ کے پاس مالٹے کا پودا ہو گا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"آپ غالباً مذاق کر رہے ہیں۔" دُکان دار نے خشک لہجے میں کہا پھر وہ مجھے چھوڑ کے دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"سُنیے تو۔" میں نے اُس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ "میں سنجیدہ ہوں۔ مجھے پودے کی شدید ضرورت ہے، مالٹے کے پودے کی۔"

اُس نے منہ بنا کے کہا۔ "جناب! یہ صرف پھولوں کی دُکان ہے، یہاں پودے نہیں بکتے۔"

باہر آ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور نظر آیا۔ وہاں میری مشکل حل ہو سکتی تھی۔ میں ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گیا اور سیدھا اُس کاؤنٹر پر پہنچا جس پر کرسمس کے پودے وغیرہ رکھے تھے۔ دُکان کی ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "کیا چاہیے جناب!"

"مالٹے کا کوئی چھوٹا سا پودا مل سکے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی؟" لڑکی کی مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ "مالٹے کا پودا؟ معاف کیجیے ہمارے پاس صرف کرسمس کے درخت ہیں۔ کوئی پودا وغیرہ نہیں ہے۔"

"کیا آپ کوئی ایسی دُکان بتا سکتی ہیں جہاں پودے ملتے ہوں؟"

"ٹھہریے۔ ابھی آتی ہوں۔" لڑکی غالباً معلومات کے لیے منیجر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے باہر آ کے کہا۔ "آپ منیجر صاحب کے کمرے میں انتظار کیجیے۔ ہم پودے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک نظر آئی۔ چمک کی وجہ میری فہم سے بالاتر تھی۔ میں منیجر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ منیجر فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اُس کے چند جملے میں نے بھی سُن لیے۔ غصّے سے میرا عجیب حال ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہیلو دماغی اسپتال؟ ہمارے پاس ایک آدمی آیا ہے۔ وہ آدھی رات کو مالٹے کا پودا خریدنے پر بضد ہے۔ جی ہاں، برف باری کے اس موسم میں۔ ٹھیک ہے، میں کسی بہانے اُسے روکتا ہوں۔ آپ ایمبولینس بھیج دیجیے۔"

میں نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ یہ لوگ مجھے پاگل سمجھ رہے ہیں؟ نہ معلوم لڑکی نے منیجر سے کیا کہا ہو گا۔ میں دانت پیستا ہوا منیجر کے کمرے سے نکل کے لڑکی کی طرف بڑھا۔ میرا چہرہ دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خوف نظر آیا۔ اُس نے مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو دہشت سے چلائی اور بھاگ کر مجھ سے بچتی ہوئی منیجر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اُس کی چیخ سُن کر لوگ ہماری طرف متوجہ ہونے لگے۔ بہت نازک وقت تھا۔ میں نے فرار ہونے ہی میں خیریت سمجھی اور بھاگ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے مُڑ کے دیکھا۔ آٹھ دس آدمی میری طرف اشارے کر کر کے بلند آوازوں میں کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید وہ مجھے کوئی چور سمجھ رہے ہوں گے جس نے اسٹور کی لڑکی کو پستول وستول دکھایا ہو گا۔ میں اپنی کار تیزی سے مین روڈ پر لے آیا۔ میں عام حالات میں اس قدر تیز رفتاری کا قائل نہیں ہوں لیکن آج مجبوری تھی۔ خاصی دُور آ کے میں نے کار ایک گلی میں موڑ لی اور عقب نما آئینہ دیکھا۔ یہ دیکھ کے مجھے اطمینان ہوا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں ہے۔ دُور دُور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں مجھے ایک نرسری کا بورڈ نظر آیا۔ بورڈ پر تیر کا نشان تھا۔ نشان سے معلوم ہوا کہ نرسری ذیلی سڑک پر ہے۔ مجھے خیال آیا کہ مالٹے کا پودا نرسری سے ضرور مل جائے گا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں دُکانوں پر ناحق گیا۔ میں نے کار ذیلی سڑک

پر روک لی۔ وہاں سے ایک پگ ڈنڈی شروع ہوگئی۔ میں نے کار سے
اترتے وقت ٹارچ بھی ساتھ لے لی۔ یہ ٹارچ ٹائر وغیرہ بدلنے میں مدد
دیتی تھی۔ میں پگ ڈنڈی پر آگے بڑھتا رہا۔ کوئی فرلانگ بھر کے جھاڑ
جھنکار کے بعد پگ ڈنڈی نرسری کے سال خوردہ دروازے پر ختم ہوگئی۔
میں نے ٹارچ کا رخ دروازے کی طرف کیا۔ بورڈ کے ساتھ گھنٹی کا بٹن
نظر آیا۔ میں نے گھنٹی کئی بار بجائی مگر دروازہ کھلنے کے آثار پیدا نہیں
ہوئے۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ظاہر
ہے نرسری کا مالک کب کا سو گیا ہوگا۔ دروازہ کون کھولتا؟ فرض
کیجیے، اگر وہ دروازہ کھول بھی دیتا تو آدھی رات کو مالٹے کا پودا خریدنے
والے کے متعلق کیا رائے قائم کرتا؟ میرا دل چاہا کہ لوٹ جاؤں
لیکن اتنی دور آکر خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے نرسری
کی چند فٹ اونچی دیوار پر نظر ڈالی۔ میرا اندازہ تھا کہ دیوار کے پیچھے
سینکڑوں پودے رکھے ہوں گے، یہ بھی ممکن ہے کہ اُن میں سے کئی پودے
مالٹے کے ہوں۔ ایسی صورت میں کیا میں خالی ہاتھ لوٹ جاؤں؟ یہ
قطعی ناممکن ہے۔ میں نے ٹارچ جیب میں رکھ لی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔
دُور دُور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے احتیاط سے دونوں ہاتھ دیوار پر
رکھے اور اُچک کر اوپر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنے میں مجھے کوئی
دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے ٹارچ نکال کر جلائی اور اندر کا جائزہ لیا۔
نرسری کے مالک کا مکان ایک کونے میں تھا۔ اُس پر تاریکی مسلط
تھی۔ دوسری طرف گلاس ہاؤس تھا۔ اُسے سردی میں ہیٹروں کے
ذریعے گرم رکھنے کا پورا بندوبست تھا تاکہ بے موسمی پھول پودے بھی
مہیا رہ سکیں۔ میں دبے قدموں گلاس ہاؤس کے دروازے پر پہنچا۔
دروازہ غیر مقفل تھا۔ میں نے آہستہ سے اُسے کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔
ٹارچ کی روشنی سے چھوٹے چھوٹے بورڈ پڑھتا ہوا میں آگے بڑھتا گیا۔
صرف چند بورڈوں کے بعد میری نظر مطلوبہ بورڈ پر پڑی۔ مالٹے کے
چھ چھ انچی پودے رکھے ہوئے تھے۔ اجازت کے بغیر پودا نکالنے پر
میں نے دل میں نرسری کے مالک سے معذرت کی پھر جیب سے
رومال نکال کر اس میں کچھ کھاد رکھی اور پودا بھی رکھ لیا۔ رومال اچھی
طرح لپیٹ کر میں نے جیب میں رکھا اور واپسی کے لیے مڑا۔ میرا
ارادہ تھا کہ کرسمس ختم ہوتے ہی پہلی فرصت میں نرسری کے مالک
سے مل کر اُسے اپنی مجبوری بتاؤں گا، معافی مانگوں گا اور پودے کی
پوری قیمت ادا کردوں گا۔

گلاس ہاؤس سے باہر نکل کے میں نے دروازہ احتیاط سے
بند کردیا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نرسری کے مالک کا مکان بھی
بدستور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے زیرِ لب اُسے الوداع کہا اور
دیوار پر چڑھ کے دوسری طرف کود گیا۔ میرے قدم جیسے ہی زمین پر
ٹکے، اچانک ایک ہنگامہ شروع ہوگیا۔ گھپ اندھیرے سے دو
پولیس والے نکلے، انھوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ساتھ ہی
کوئی آدمی زور زور سے کچھ چیخنے لگا۔ میرے اوسان خطا ہوگئے۔
جب اوسان بحال ہوئے تو میں نے دیکھا کہ چیخنے والا شخص ابھی
تک شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ وہ پولیس سے میرے
متعلق کہہ رہا تھا۔ "اِس نے پہلے گھنٹی بجا کر اطمینان کرلیا کہ گھر
میں کوئی نہیں ہے پھر خاموشی سے دیوار پھاند کر گلاس ہاؤس میں
داخل ہوگیا۔ وہاں سے اس نے قیمتی استوائی پودے چرائے ہوں
گے۔ کانسٹیبل، اس کی تلاشی لو۔ ابھی ثبوت مل جائے گا۔"

میں نے گھبرا کے اُس کا شبہ دور کرنے کی کوشش کی۔
"دیکھیے جناب، آپ کا خیال قطعی غلط ہے۔ میں نے گھنٹی اس
لیے بجائی تھی کہ آپ بیدار ہوجائیں۔ میری بدقسمتی کہ آپ بیدار
نہیں ہوئے۔ مجھے خود پودا حاصل کرنا پڑا۔ میں اسے چرانا نہیں چاہتا
تھا۔ میری نیت یہ تھی کہ کرسمس کے فوراً بعد آپ کو پودے کی قیمت
ادا کردوں گا۔"

نرسری کے مالک کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ کانسٹیبل
سے بولا: "کانسٹیبل اس کی تلاشی لو۔ یہ بہانے کر کے اپنا جرم
چھپانا چاہتا ہے۔"

"جرم کر کے سبھی بے قصور بننے کی کوشش کرتے ہیں۔"
کانسٹیبل مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم نے پودا تو ابھی چرا لیا ہے مگر
قیمت کرسمس کے بعد ادا کرنا چاہتے ہو، خوب۔ ذرا اپنی تلاشی تو دو۔"

میں خاموش رہا۔ بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔ کانسٹیبل نے
میری تلاشی لی۔ آخر میں اُس نے میری جیب سے رومال نکال
لیا اور اُسے نہایت احتیاط سے کھولنے لگا۔ شاید اُسے یقین تھا
کہ رومال سے کوہِ نور ہیرا برآمد ہونے والا ہے۔ رومال کھل گیا۔
تینوں کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ کانسٹیبل نے مجھ سے
کہا: "سنو، اس کا کیا مطلب ہے؟" اُس نے مالٹے کے پودے کی
طرف اشارہ کیا۔

"دراصل مجھے کرسمس سے قبل اِس پودے کی شدید ضرورت
تھی۔ میں اسی کو حاصل کرنے یہاں آیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔
"اچھا ہوا کہ نرسری کے مالک جاگ گئے ورنہ مجھے قیمت ادا
کرنے کے لیے دوبارہ آنا پڑتا۔" میں نے نرسری کے مالک کو
ایک ڈالر کا نوٹ تھمایا اور اپنی کار کی طرف بڑھا۔

"مسٹر اسینے!" کانسٹیبل میری راہ میں حائل ہوگیا۔ "یہ

معاملہ ایسی آسانی سے حل نہیں ہو سکتا۔ آپ کو تھانے چلنا ہوگا۔ نرسری والے کا فون ہمارے انسپکٹر صاحب نے خود ریسیو کیا تھا۔ وہ اس طرح مطمئن نہیں ہوں گے۔ آپ دونوں کو ہمارے ساتھ چل کر معاملے کی وضاحت کرنی ہوگی۔"

ہم تھانے پہنچے۔ معلوم ہوا کہ انسپکٹر گشت پر گیا ہوا ہے۔ مجھے اور نرسری کے مالک کو مجبوراً لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھ کے وقت گزارنا پڑا۔ سردی لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ تھانے میں اس سے بچنے کے لیے کوئی خاص بندوبست نہیں تھا۔ نرسری والے پر سردی بہت اثر کر رہی تھی۔ وہ بیزاری سے بڑبڑا رہا تھا اور مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا۔ میری وجہ سے اس کی نیند جو خراب ہوئی تھی۔ انسپکٹر دو بجے کے قریب لوٹا۔ میری جان میں جان آئی ورنہ کرۂ زمہریر میں نہ معلوم کب تک رہنا پڑتا۔ کانسٹیبل نے انسپکٹر کو پورا واقعہ سنایا۔ انسپکٹر نے میرا سراپا جائزہ لیا لیکن خیریت گزری، میری حالت دیکھ کے اُسے دماغی اسپتال فون کرنے کا خیال نہیں آیا۔ پھر وہ نرسری والے کی طرف متوجہ ہوا۔ "جناب! کیا آپ اِن کے خلاف کوئی رپورٹ درج کرانا چاہتے ہیں؟"

نرسری والے کا بس چلتا تو وہ مجھے بجلی کی کرسی پر بٹھا کے دم لیتا لیکن سردی نے اُس کا برا حال کر رکھا تھا۔ وہ یہ سوچ کے کانپ گیا ہوگا کہ اگر رپورٹ درج کرائی تو نہ جانے کب تک ٹھیرنا اور ٹھٹھرنا پڑے۔ اُس نے فوراً انکار کر دیا۔

"اس صورت میں آپ دونوں جا سکتے ہیں۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ وہ مجھے گھونسا دکھاتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اُس کی بڑبڑاہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کار میں بیٹھ کے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کے میں نے دیکھا کہ میری بیوی پریشانی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "غضب ہے۔ رات کے تین بجنے والے ہیں۔ تمھاری خریداری اب ختم ہوئی ہے؟ آخر اتنی دیر تک تم کہاں تھے؟" اُس کی آنکھوں سے شبہات جھانک رہے تھے۔

میں اُسے کیا بتاتا کہ کن مشکلات سے دوچار ہو گیا تھا۔ میں نے الٹے سیدھے بہانوں سے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ وہ پیر پٹختی ہوئی خواب گاہ میں گئی اور روشنی گل کر کے سو گئی۔ میں موقع غنیمت سمجھ کے اپنا منصوبہ مکمل کرنے لگا۔ سونے کی باری بہت دیر میں آئی۔

[illegible] مصروفیات کے [illegible] نے اُٹھنے کا ارادہ کیا [illegible] اُٹھ کے دیکھا۔ این [illegible] تھوڑی دیر بعد وہ فاتحانہ انداز میں [illegible] سے باہر آئی۔ پودے کی ایک جھلک دکھا کر اُس [illegible]

"ڈیڈی! ڈیڈی! خدا نے میری دعا سن لی۔ رات کو میں [illegible] سے دعا مانگی تھی۔" وہ دروازے کی طرف مڑ گئی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ صبح صبح؟"

"مارگریٹ کے پاس۔" اُس نے کہا۔ "میں اُسے پودا دکھاؤں گی۔"

مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا، یہ بات اسے ہمیشہ یاد رہے گی اور یہ بدعقیدہ نہیں ہونے پائے گی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر ناشتے کی میز پر جا بیٹھا۔ این مجھے دوبارہ نظر آئی لیکن اب وہ خالی ہاتھ تھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "پودا کہاں ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "وہ میں نے مارگریٹ کو دے دیا ہے، ڈیوڈ کے بدلے۔"

میں چونک گیا۔ میرا خیال تھا کہ ڈیوڈ مارگریٹ کے کتے کا نام ہوگا۔ "کہاں ہے ڈیوڈ؟" میں نے پوچھا۔

"بتاتی ہوں۔" این نے کہا۔ "پہلے اس کی ایک بات بتا دوں، بہت خاص بات ہے۔ مارگریٹ کہتی ہے، اتوار کے جشن پر ڈیوڈ ننھے ننھے، پیارے پیارے پلّوں کو جنم دے گا لیکن اس کے لیے بہت ہی زور سے دعا مانگنی پڑے گی۔ میں آج ہی سے دعا مانگنا شروع کر دوں گی۔ بہت زور سے۔"

میں گھبرا گیا۔ ڈیوڈ اگر کتا ہے تو اس سے پلے پیدا کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ این اپنی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ مجھے اس کی حرکات پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ ایک خالی ماچس نکال کے کھولنے لگی۔ ماچس میں ایک کھٹمل بند تھا۔ وہ خوشی سے چلائی۔ "یہ ہے ڈیوڈ۔" میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں ڈیڈی!" این نے مجھے تسلی دی۔ "ہماری سنڈے اسکول کی ٹیچر کہتی ہیں کہ کچھ بھی ناممکن نہیں ہے البتہ اس کے لیے خدا پر بھروسا رکھنا ضروری ہے۔"



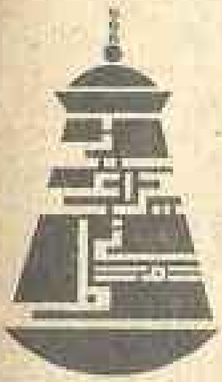
جہانگیر آباد کے نواب، غالب کے رفیق و ہم دم، مومن کے مقلد، مفتی صدرالدین آزردہ اور امام بخش صہبائی کے ہم صحبت، عالم، شاعر، ناقد اور عاشق۔ زندگی کے بوقلموں ہزار ادا کے پرستار، خوش رو، خوش گفتار، مغلی تہذیب و شرافت کی مثال۔ رنگینیوں کے باغی، جاگیردار ایسے کہ نظیر اکبر آبادی کو شاعروں کے دربار میں بے تکلف جگہ تو دیتے ہیں، تسلیم نہیں کرتے۔ ناقد ایسے کہ غالب کو ان کے حاسۂ انتقاد پر ناز، غالب کی نظر ان کی پسند و ناپسند کو معیار ٹھیراتی۔ عالم ایسے کہ آزردہ، صہبائی اور مومن کے ہم چشم، ہم سر، شاعر ایسے کہ حالی ان سے ربط پر متفخر اور عاشق ایسے کہ شیخ عاشقان میں وفا کی علامت، ناز پروردہ اور ناز بردار حسن کے شیوہ آشنا، راہِ سلوک کے کوچہ گرد، راہ جانِ سپاری کے ہراول۔ اسیرِ فرنگ، کلام مختصر مگر اثر انگیز، جیسی شخصیت سحر انگیز۔ میر و مومن کے امکانات بڑھانے والے۔ جدید غزل کے امام حالی کے آدرش اور امام المتغزلین حسرت کے پیش رو۔ ان بے شمار رنگوں کو آمیز کیجیے تو شیفتہ کی تصویر مکمل ہو گئی۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی، والہ و وارفتہ شیفتہ کی۔ زیر نظر تحریر کا تعلق اسی ایک شخص سے ہے۔

اس کی آتش نادیدہ کی کہانی جو ازل سے روشن ہے

سوختہ جانوں کے لیے ایک سوختہ جان کی داستان

بھولے ہوئے دلوں کی ایک یادگار دستاویز

*مقبول جہانگیر



دلی میں میلے کا سماں تھا۔ شہر کی آرائش دیکھنے کے قابل تھی۔ اسے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ لال قلعے سے شہر پناہ تک گرد و تیل کے چراغ جل رہے تھے۔ مغل شہزادے صاحب عالم مرزا جہانگیر کی آمد آمد تھی۔ شہزادہ الٰہ آباد سے رہا ہو کر دلی آ رہا تھا۔ لال قلعے کا گوشہ گوشہ منور تھا۔ محل سرا سے دیوانِ عام تک اور دیوانِ عام سے دیوانِ خاص تک روشنی ہو رہی تھی۔ جھاڑ، فانوس، کنول، قمقموں اور شمعوں نے رات کو دن سے بدل دیا تھا۔

مرزا جہانگیر اکبر شاہ ثانی کا چہیتا بیٹا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ اسے اپنا ولی عہد بنائے مگر انگریزوں نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ بادشاہ کو انگریزوں کی بات ماننی پڑی کیونکہ ہندوستان پر اصل حکمرانی انھی کی تھی نیز بادشاہ کو ان سے دو لاکھ روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ بادشاہ نے مرزا جہانگیر کے بجائے بہادر شاہ ظفر کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا۔ اس کی دانست میں یہ جبری نامزدگی مرزا جہانگیر کی حق تلفی تھی لہٰذا مرزا پر اس کی عنایات اور بڑھ گئیں۔ وہ شہزادے کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتا اور اس کی ہر جا و بے جا بات برداشت کرتا۔ اس لاڈ پیار نے شہزادے کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا۔ اسے کسی کی پروا نہیں رہی۔ قلعۂ معلیٰ میں اسٹین نامی ایک انگریز ریزیڈنٹ کا مستقل قیام تھا۔ بادشاہ اس کی منظوری کے بغیر کوئی حکم جاری نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن ریزیڈنٹ اور مرزا جہانگیر کا آمنا سامنا ہو گیا۔ مرزا نے بے ساختہ کہا: "لُولُو ہے بے لُولُو ہے!"

اسٹین شہزادے کی بات سمجھ تو گیا لیکن اس نے متانت کے ساتھ اس کے حواریوں سے پوچھا: "صاحبِ عالم کیا کہتا ہے؟"

لُولُو کا ایک مطلب موتی بھی ہے۔ شہزادے کے ساتھیوں نے بات بنائی: "حضور! صاحبِ عالم آپ کو لُولُو یعنی موتی فرماتے ہیں۔"

"اچھا!" اسٹین نے زیرِ خندہ سے جواب دیا: "ہم صاحبِ عالم کو لُولُو بنائے گا۔"

صاحبِ عالم کا خیال تھا، والدِ گرامی بادشاہ ہیں، حکومت ہماری ہے، اس فرنگی کی کیا مجال کہ ہمیں لُولُو بنائے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اسٹین پر تمنچا داغ دیا۔ اتفاق سے اسٹین بچ گیا۔ اس نے کمپنی بہادر سے شکایت کر دی۔ انگریزوں نے مرزا جہانگیر کو الٰہ آباد بھیج کے نظربند کر دیا۔ بادشاہ سلامت سے کہا گیا: "شہزادے کو تربیت کی ضرورت ہے



تربیت مکمل ہو جائے گی تو الہ آباد سے واپس آجائیں گے۔ بادشاہ کو چار و ناچار بیٹے کی جدائی گوارا کرنی پڑی۔ مرزا جہاں گیر کی ماں نواب ممتاز محل نے منت مانی کہ مرزا چھٹ کر آئیں گے تو قطب صاحب میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھاؤں گی۔

مرزا جہاں گیر کئی برس کی نظر بندی کے بعد الہ آباد سے دلی آرہا تھا۔

حدِ نگاہ تک شاہی خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ مخملی، باناتی، اطلسی، سبز، سرخ، زرد، ریشمی، کلابتونی اور سوتی طنابوں نے انھیں رنگا رنگ اور پُرشکوہ بنا دیا تھا۔ ان کے سنہرے عکس اور شمشے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ آسمان پر نیلی چادر، زمین پر سبزے کا فرش۔ طلسمات کا عالم تھا۔ خیموں سے قطب صاحب کی درگاہ تک دو رویہ قناتیں کھڑی تھیں کیونکہ ملکہ دوراں مرزا جہاں گیر کو لے کر منت ادا کرنے کے لیے درگاہ میں جانے والی تھیں۔ صبح سے اہتمام ہو رہا تھا۔ دن کے تین بجے ظلِ سبحانی نے کہا "پنکھا چڑھانے کا وقت آگیا۔"

ملکہ دوراں نے اندر سے گولیوں اور حبشنوں کے پچاس خوان آراستہ کیے۔ چاندی کی ایک کشتی میں سونے کا پنکھا رکھا، پنکھے میں پنا، پکھراج، نیلم، یاقوت اور بیچ بیچ موتی جڑے تھے۔ پنکھے کی بالشت بھر نیچی جھالر ملکہ نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھی تھی۔ مرزا جہاں گیر کو دولہا بنایا گیا۔ سہرا، کلغی، طرہ خطوط میں بسا کر اس کے سر پر بندھوایا گیا۔ ملکہ نے بسم اللہ کہہ کر پنکھے کی کشتی اس کے سر پر رکھی اور بلائیں لے کر کہا "جانِ من! میرا منہ نہ تھا کہ تم فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہ جہاں آباد آؤ اور میں تمھیں دیکھوں۔ یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ منت کی کشتی سنبھال کر سرِ ادب و نیاز سے جھکا کر درگاہ چلو۔ آؤ۔"

بادشاہ نے اپنے سر پر غلاف کی سینی، بیگم نے اپنے سر پر صندل اور عطردان اور بادشاہ زادوں نے اپنے سروں پر شیرینی کے خوان رکھے اور آستانے کی راہ لی۔ بیگمات اور شہزادیاں لاکھوں روپے کے زیورات سے لدی ہوئی تھیں۔ شاہی کارخانوں کے ریشمی اور زرّیں لباس زیبِ تن تھے۔ پور پور میں نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی۔ ہر شاہی عورت کے ڈھیلے پائنچے دو دو لونڈیاں اٹھائے ہوئے چلتی تھیں، دو باندیاں پیچھے سے دوپٹا سنبھالتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والی عورتیں چل رہی تھیں۔ چوڑیوں، جھانجن اور پازیب کی جھنکار سے لہریں لیتا ہوا شور اٹھ رہا تھا۔

دلی کی ساری خلقت مہرولی میں اُمڈ آئی تھی۔ یہاں اُمرا کے پُرشکوہ مکانات تھے۔ وہ اپنے مکانوں میں ٹھیرے، غریبوں کو جہاں جگہ مل گئی پڑ گئے۔ شہزادیوں کے ساتھ عورتوں کے غول تھے۔ گوٹے کی چمک اور جواہر کی دمک سے آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھیں۔ نفیری کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ کوٹھوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ تالاب بھرنے، امرتیوں اور ناظر کے باغ تک زنانہ حلقہ ہو گیا۔ جا بجا سراپچے کھنچ گئے۔ سپاہ کے پہرے لگ گئے۔

کرتا ہیاں چڑھ گئیں، پکوان ہونے لگے اور باغوں میں جھولے پڑ گئے۔

ایک خیمے کی آراستگی قابلِ دید تھی۔ اُجلے فرش، زربفتی تکیے، چاندی کے پلنگ، باناتی پردے، مخمل دار نم گیرے، بندیاں، دیواروں گیریاں، آئینے اور جھاڑ فانوس۔ خوش مذاق اور خوش ادا مہمان گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے۔ حقے اور پیچوان لگے تھے۔ خیمے کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ گلاب پاش سے گلاب چھڑکا گیا، موتیا کے گجرے گلوں میں ڈالے گئے۔ چاندی کے خاص دانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹی ہوئی دیسی پانوں کی گلوریاں رکھی تھیں۔ یکایک پہلو کے کمرے سے سبز پشواز پہنے انار رنگ کی ایک حسین عورت خراماں خراماں آئی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے محفل پر ایک نظر ڈالی پھر نہایت ادب سے مجرا عرض کیا۔ یہ دراصل کشمیری بھانڈ تھا۔ پیچھے دو سارنگی والے، ایک طبلہ نواز اور ایک مجیرے والا اُجلی پوشاکیں پہنے کھڑے ہو گئے۔ طبلے پر تھاپ پڑی، سارنگیوں پر لہرا شروع ہوا۔ طبلہ نواز نے پیش کار لگایا، بھانڈ نے گت بھری۔ ایسا معلوم ہوا کہ اندر کے اکھاڑے کی پری اُتر آئی ہے۔ تین سلامیوں کے چکر وار گت ختم ہوئی۔ سب کے منہ سے سبحان اللہ نکلا۔ بھانڈ نے تسلیمات عرض کی۔ ساری رات پھر تھئی تھئی ناچ ہوتا رہا۔

اِرد گرد کے دوسرے خیموں میں بھی ایسی ہی رنگین محفلیں برپا تھیں۔ شہزادہ گل اندام کے خیمے میں ناچ رنگ کے ساتھ جام و مینا بھی گردش میں تھے۔ جہاں گیر آباد کا نوجوان رئیس زادہ مصطفٰے خاں شہزادے کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ سامنے اس کا جگری دوست عباس علی خاں تھا۔ محفل شباب پر تھی۔ اتنے میں اطلاع آئی "شمسی تالاب پر آتش بازی چھٹ رہی ہے۔" مصطفٰے خاں میرِ محفل سے اجازت لے کر خیمے سے نکل کر خراماں خراماں شمسی تالاب کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی عمر بیس بائیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ جوانی اور دولت نے مل کر شوریدہ سری اور عاشق مزاجی کا روپ دھار لیا تھا۔ بھونرے کی صفت پائی تھی۔ کسی مقام پر رُکنے تھمنے کا قائل نہیں تھا۔ دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے۔ اس عمر میں بھی دلی کی کوئی ڈیرے دار طوائف ایسی نہیں تھی جو اس کے ہاں حاضری نہ دے چکی ہو۔ کوئی بالاخانہ ایسا نہیں تھا، جہاں وہ جا نہ چکا ہو۔ وہ اپنے وقت کا ایک مقبول شاعر بھی تھا۔ اس کے دو تخلص تھے۔ شیفتہ اور حسرتی۔ غالب کے عصر حکیم مومن خاں کی شاگردی اور صحبت نے مصطفٰے خاں شیفتہ کی وارفتہ مزاجی اور شوریدہ سری میں اضافہ کر دیا تھا۔ مومن خود بھی حسن و عاشقی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔

شیفتہ ابھی تھوڑی دور گیا تھا۔ راستے میں قریب کے ایک خیمے سے خیمے کا پردہ ہلا اور ایک ہوشربا صورتِ زیبا نظر آئی۔ ہمہ غمزہ، ہمہ عشوہ، ہمہ ناز۔ بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ زلفیں، روشن نگاہیں، برگِ گل سے

زیادہ نازک ہونٹ، پھولوں جیسے رخسار، ستواں ناک، غنچہ دہن، گول گول بلور کی کلائیاں، پنجہ حنا میں یاقوت کی صفائی۔ عمر پندرہ سولہ برس، مہین ریشمی لباس میں سینے سے گردن تک کی باریک رگیں نظر آ رہی تھیں۔ شیفتہ کے قدم زمین پر گڑ گئے۔ دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ جسم کا تمام خون کھنچ کر چہرے پر جم گیا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس پری وش کے یاقوتی لبوں پر حیا اور حیرت کی ملی جلی مسکراہٹ ابھری۔ چند لمحے تک دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ نگاہوں نگاہوں میں دیوان مرتب ہو گیا۔ اتنے میں خیمے کے اندر کسی نے کہا۔ "باجی! کہاں؟" شیفتہ چونک گیا۔ لڑکی ہرن کی طرح کود کر غائب ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے ایک خاص ادا سے سلام کیا تھا۔

شیفتہ کے دل کی دنیا زیر و زبر تھی۔ کیسی تفریح، کیسا شمسی تالاب، کہاں کی خوش فعلیاں۔ وہ بھرے بازار میں لٹ گیا تھا اور رہزن کا نام و نشان نہ تھا۔ شیفتہ تھکے تھکے قدموں سے شہزادہ گل اندام کی محفل میں واپس پہنچا اور خاموشی سے ایک طرف لیٹ گیا۔ دل میں صدہا خیالات آ رہے تھے۔ نہ جانے کون تھی؟ ممکن ہے کوئی شہزادی ہو لیکن شہزادیوں کے خیمے اس طرف کہاں؟ شکل و صورت اور اطوار سے کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی تھی۔ کس سے پوچھوں؟ کہاں جاؤں؟ عباس علی خاں نے پوچھا۔ "شیفتہ! خیر تو ہے۔ طبیعت کیسی ہے؟" شیفتہ نے جواب دیا۔ "سر میں درد ہے۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ایک الگ خیمے میں آ گیا مگر آرام اور چین کافور ہو چکا تھا۔ وہ صورتِ زیبا بار بار نگاہوں میں پھرتی تھی۔ آخر شیفتہ اٹھ کر پھر اسی طرف گیا کہ شاید دوبارہ دیدار ہو جائے لیکن دائیں بائیں آگے پیچھے سینکڑوں خیمے نصب تھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ خیمہ کون سا تھا۔ مایوسی اور اضطراب کی انتہا نہ رہی۔ وہ دیوانہ وار ایک ایک خیمے کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خواب دیکھا تھا۔ شیفتہ خیمے میں واپس آ گیا۔ اس کی حالت غیر تھی۔ سب کو حیرت تھی کہ شیفتہ کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا۔ عباس علی اور شہزادہ گل اندام نے بہت سر پٹخا کہ رازِ دل معلوم کریں لیکن شیفتہ کے ہونٹوں پر تالا تھا۔ اپنے سے زیادہ کسی اور کی رسوائی کا خیال مارے ڈالتا تھا۔ رہ رہ کے بے قراری بڑھنے لگتی۔ کسی کا خیال بار بار بندھتا اور ٹوٹتا۔ آس ابھرتی اور ڈوب جاتی۔ رات عجیب بے چینی میں گزری۔ رات کا سامنا قیامت کا سامنا ثابت ہوا۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ایک سال گزر گیا۔ یہ سال شیفتہ کے لیے ایک صدی کے برابر تھا۔ عشق کی چنگاری خاکستر ہونے کے بجائے شعلہ جوالہ بن گئی تھی۔ وہ مہینوں گوشہ نشین رہا پھر محض اس خیال سے محفلوں میں آنا جانا شروع کیا کہ شاید کہیں اس بدیع الجمال کی دوسری جھلک دکھائی دے جائے مگر مایوسی کے سوا سب نگ

کچھ ہاتھ نہ آیا۔ شہزادہ گل اندام اور عباس علی شب و روز کے جلیس و ہم دم تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شیفتہ کس آزار میں مبتلا ہے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے سب کچھ اگلوا لیا اور جہاں تک ممکن ہوا، اس گوہرِ نایاب کی تلاش میں گھوڑے دوڑائے گئے۔ ماہرِ فن کٹنیاں بھی مقرر کی گئیں۔ وہ مختلف گھرانوں میں جاتیں اور اس کی ٹوہ لیتیں۔ اس تگ و دو میں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا لیکن کامیابی کی کوئی صورت نہ نکلی۔ شیفتہ بیزار ہو کے ایک بار پھر گوشہ نشیں ہو گیا۔ اپنے کلبۂ احزاں میں بند ہو کر وہ ہمہ وقت شعر و سخن میں غرق رہتا۔

ایک برس اور بیت گیا۔ جاڑے آ گئے، دلوں کی انگیٹھیاں گرم ہو گئیں۔ ایک روز شیفتہ اپنی عالی شان حویلی کے دیوان خانے میں تنہا بیٹھا تھا۔ عید الفطر کی رات تھی۔ عباس علی آ گیا۔ شیفتہ نے اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ عباس نے کہا: "میں بیٹھنے نہیں آیا ہوں، تمھیں لینے آیا ہوں۔ اٹھو دیوان جی کے ہاں چلیں گے۔"

"دیوان جی کے ہاں؟" شیفتہ نے بھویں سکیڑ کر کہا: "وہاں کیا ہے؟"

"اٹھو تو سہی، واللہ لطف آ جائے گا۔ وہاں رقص و سرود کی محفل ہے۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ وہاں ہر عید پر محفل ہوتی ہے؟ سنتا ہوں اس مرتبہ نارنول کا ایک طائفہ آیا ہے۔"

"نارنول کا طائفہ؟" شیفتہ نے حقارت آمیز تبسم سے کہا: "بھلا اُسے کیا آنا جانا ہوگا۔ معاف کرنا، مجھے قصباتی طائفوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمھیں نہ سہی مجھے تو ہے۔" عباس علی خاں نے ہنس کر کہا: "وہاں خاصے شرفا آ رہے ہیں۔ کوئی ایسی ویسی طوائفیں نہیں ہیں۔ سارا منظر انھوں نے یہیں دلّی میں رہ کر سیکھا ہے۔ مومن خاں، مرزا غالب اور حد یہ ہے کہ مفتی صدر الدین آزردہ جیسے ثقہ لوگ بھی محفل میں شریک ہوں گے۔"

مومن اور غالب کا نام ایسا نہ تھا کہ شیفتہ کو کشش نہ ہوتی۔ اسی وقت اٹھ کے ہاتھ منہ دھوئے، کپڑے بدلے اور سواری میں بیٹھ کر دیوان جی کی محل سرا کی طرف روانہ ہوئے۔ محل سرا میں دن نکلا ہوا تھا۔ صحن میں تین سرو چراغاں کھڑے کیے گئے تھے۔ دالان در دالان دروں پر پردے پڑے تھے۔ قالینوں کے فرش، زربفت اور کمخواب کے گاؤ تکیے چاروں طرف لگا کے نقرئی کلیاں، پیچوان اور حقے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ سب میں لکھنؤ کا عنبری خمیرہ بھرا ہوا تھا۔ عود سوزوں میں عود جل رہا تھا۔ دور دور تک مہک جا رہی تھی۔ جگہ جگہ کشتیاں رکھی تھیں، اُن پر کارچوبی کشتی پوش پڑے تھے۔ کشتیوں میں سلونے پستے، الائچی دانے اور نقل رکھے تھے۔ مہمانوں کے لیے کشمیری چائے تیار ہو رہی تھی۔ چھت پر جھاڑ ٹنگے تھے۔ بلور کی قلمیں جھل مل جھل مل کر رہی تھیں۔ دیواروں پر دیوار گیریاں آویزاں تھیں۔ فرش پر چاندی کے روشن شمع دان تھے۔ تمام محل سرا جگ مگا رہی تھی۔

اُن کے عکس سے قدِ آدم آئینوں میں عجیب نظارہ تھا۔ معزز مہمان ایک ایک کر کے آ رہے تھے۔ میزبان نے انھیں حسبِ مراتب بٹھایا۔ مصطفیٰ خاں شیفتہ اور عباس علی خاں پہنچے ہی تھے کہ شہزادہ گل اندام کی سواری آ گئی۔ دیوان جی شہزادے کے استقبال کے لیے لپکے اور اُسے لے جا کر مسند پر بٹھایا۔ شیفتہ اور عباس بھی وہیں جا بیٹھے۔ پھر مرزا قربان بیگ سالک آئے۔ بالا قامت، سرخ و سفید رنگ۔ وہ مرزا غالب کے شاگردِ رشید تھے۔ سب کو آداب کہہ کے قرینے سے بیٹھ گئے۔ چند لمحوں بعد اطلاع ہوئی کہ مرزا غالب تشریف لے آئے ہیں۔ غالب فینس میں سوار تھے۔ ترکی لباس زیبِ تن تھا۔ سر پر کلاہِ قبچاق اور جسم پر انگرکھا تھا۔ انگرکھے کی نیم آستین۔ دیوان جی لبِ فرش تک تعظیم کے لیے گئے اور انھیں برابر لا کے بٹھایا۔ اُن کی مزاج پرسی کی اور عید کی مبارک باد دی۔ اتنے میں لوہارو اور فیروز پور جھرکہ کے نوجوان نواب شمس الدین خاں کی سواری آ گئی۔ شمس الدین خاں کا جسم ایسا سڈول تھا کہ بایدوشاید۔ دہلی میں اُس کی وجاہت کی نظیر نہ تھی۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی تھی اور جسم پر اس موسم میں ململ کا انگرکھا، انگرکھے کے اوپر کمخواب کا سینہ بند۔ اس کا رنگ میدہ و شہاب کی مانند تھا۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ وہ بات بات پر داد دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا کی خوشی اسی کے حصے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد حکیم مومن خاں آ گئے۔ سب کی نظریں اُن کی طرف اٹھ گئیں۔ ایسے خوب رُو اور وجاہت زیب آدمی دلّی میں کم ہوں گے۔ کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، دراز پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اُن پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسّی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخشی داڑھی، بھرے ہوئے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی انگلیاں۔ گھونگر والے لمبے لمبے بال کاکلوں کی شکل میں۔ غالب نے اٹھ کر مومن سے معانقہ کیا اور انھیں اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ کچھ دیر میں مفتی صدر الدین آزردہ بھی آ پہنچے۔ گلے سے گھٹنوں تک کرتا تھا، اُس پر مرزائی اور جامہ وار کا چغہ تھا۔ سب نے سروقد کھڑے ہو کر انھیں تعظیم دی۔ دیوان جی نے اُن کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ رقص و سرود شروع ہونے سے پہلے رخصت ہو جائیں گے۔ ایسی محفل میں شرکت اُن کے عہدے اور تقدس کے خلاف تھی۔ دیوان جی کے بلاوے پر محض اُن کی خاطر آ گئے تھے۔

خادم چائے کا سامان چننے لگے۔ دیوان جی نے میر کلو منتظم کو اشارہ کیا۔ میر کلو دوسرے کمرے میں گئے۔ چند لمحوں بعد ریشمی پردہ ہٹا، دو نوخیز و نازک طوائفیں محفل میں نمودار ہوئیں۔ اُن کے عقب میں نائکہ تھی۔ دونوں آفتاب و ماہتاب تھیں۔ نقشہ گویا مصور کے قلم نے کھینچا تھا۔ موتی میں آب کی کمی ہو سکتی تھی مگر اُن کے رنگ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ شہابی رنگ، چمکتی ہوئی فراخ پیشانیاں، اُن پر صاف لڑکی کا جھومر۔ نظر اٹھائے نہیں اٹھتی تھی۔ ق

...خراماں، چال طاؤسی، لباس کی تراش خراش میں بیگموں سے بھی بڑھ کر، ...انی دوپٹوں میں ستارے بھرے ہوئے تھے۔ وہ پائنچے ہاتھوں میں اٹھائے ...لاتی ہوئی محفل میں آئیں۔ ساری محفل پر ان کے حسن کا رعب سا چھا گیا۔ ...یفتہ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے قلب کی حرکت بند ہونے لگی۔ اس نے ...پتی ہوئی انگلیوں سے عباس علی کا بازو تھام لیا۔ عباس علی آنے والیوں کے ...لوے میں گم تھا۔ اس نے شیفتہ کی طرف مطلق توجہ نہیں دی۔ لڑکیاں ...ک کر مجرا بجا لائیں۔ دیوان جی نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا: "بیٹھ جائیے۔" دونوں ...نے نہایت تہذیب سے پھر سلام کیا اور محفل کے بیچ میں بیٹھ گئیں۔ نوکر نے ...ن کے سامنے گنگا جمنی خاص دان رکھ دیا۔ دیوان جی کے ہاں کا پان معمولی ...ان نہیں تھا۔ چھالیا دودھ میں پکی ہوئی تھی۔ ڈلی ڈلی برابر کی کتری ہوئی، ...تھی گلاب میں بسا ہوا۔ ست کی گولیاں بھی خاص دان کے ڈھکنے میں ...وجود تھیں۔ یہ گولیاں خاص دیوان جی کے لیے لکھنؤ سے بن کر آتی تھیں۔ ...یادہ تیز نہیں تھیں مگر خوشبو ایسی تھی کہ کلی کرلے پر بھی منہ مہکتا رہے۔ لڑکیوں ...نے بڑے انداز سے ایک گلوری اٹھائی۔ اس میں سے لونگ نکال اور چھوٹا ...سا منہ کھول کو ہاتھ لچکا کر گلوری منہ میں رکھ لی۔ پھر ست کی گولی نکال کر ...منہ میں ڈالی۔ دیوان جی کہنے لگے: "دو تین کھاؤ، یہ تیز قطعی نہیں ہیں۔"

ان دونوں میں سے ایک نے نہایت دلبرانہ انداز سے انکار کیا۔ "حضور میرے سر میں چکر آ جائے گا۔ ناچنے کے قابل نہ رہوں گی اور پہروں طبیعت ٹھکانے نہ آئے گی۔"

مومن کی نگاہیں تارہ بن کر جمی ہوئی تھیں معلوم ہوتا تھا نظروں نظروں میں ان کا حسن پی رہے ہیں۔ شیفتہ نے ایک مرتبہ دیکھا تھا، دوبارہ نگاہ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بار بار رومال سے چہرہ پونچھتا تھا۔ عباس علی نے لڑکیوں سے کہا: "سبحان اللہ، آپ تو انگلیوں پر نچاتی ہوں گی۔ ہم تو آپ کو دیکھ کر ہی چکرا گئے۔" پھر اس نے مالکہ کی طرف رخ کیا: "سروری خانم! آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ ہم تو سمجھے تھے اب دلی کا رخ نہ کریں گی۔ یہ بچیاں تو آپ نے خوب تیار کیں۔"

سروری خانم نے آداب کیا: "آپ کا حسنِ نظر ہے۔ لونڈی کہاں جاتی؟ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ کبھی کبھی وطن کے کوچوں کی یاد ستاتی ہے تو چھ دن وہاں رہ آتی ہوں مگر ان لڑکیوں کا دل وہاں گھبراتا ہے۔ یہ یہیں پلی بڑھی ہیں۔ آپ حضرات، ماشاء اللہ نگاہ رکھیں تو یہیں ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ بڑی کا نام رجو ہے، چھوٹی کا جگنو۔"

رجو اور جگنو نے اس تعارف پر ادب سے کھڑے ہو کر حاضرین کو سلام کیا۔ شیفتہ کی نگاہیں رجو کی نظروں سے ملیں۔ یک لخت رجو نے بھی شیفتہ کو پہچان لیا۔ اس کے لبوں پر خفیف مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس مسکراہٹ میں ہزاروں معنی خیز اشارے اور گلے شکوے پنہاں تھے۔



مومن کہنے لگے: "اجی دلی میں [illegible] دلی والے خود جوہرِ قابل کی تلاش میں رہتے ہیں۔ [illegible] کا لطف خوب جمے گا۔"

رجو نے ہنس کر جواب دیا: "سرکار! ہماری کیا بساط جو لطف [illegible] ادھر اُدھر کا رخ کریں۔ یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ آپ قدر فرمائیں گے تو لطف بھی جم جائے گا اور چال بھی اچھی نکلے گی۔"

"کیا کہنے ہیں۔" عباس علی نے خوش ہو کر کہا: "تم بڑے داؤ خوب جانتی ہو لیکن سمجھ لو، یہاں بھی اناڑی نہیں کھلاڑی بیٹھے ہیں ایسا نہ ہو کہ مات کھا جاؤ۔"

"آپ تو خواہ مخواہ شہہ دیے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کھلاڑیوں سے کبھی پالا نہیں پڑا ورنہ یوں دعوا نہ کرتے۔ اس آرزو میں کہ ہم سے پالا ماریں نہ جانے کتنوں پر پالا پڑ گیا۔"

"ہم پالا مارنے کا شوق پالتے ہی نہیں۔ ہاں ضرورت پڑے تو جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔"

"خیر آپ جیتے بندی ہاری۔ ہم لوگ تو آپ ہی کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں۔ ہمارا کیا جو آپ کے منہ آئیں۔ اپنے فن میں جناب بھی بڑے نٹ کھٹ معلوم ہوتے ہیں۔ پردیس کا کھٹکا آپ کے خیال میں ہے۔"

عباس علی اس ضلع جگت کا وار نہ سہہ سکے، بغلیں جھانکنے لگے۔

غالب نے مسکرا کر کہا: "میاں! بولو نا۔ اب کیوں بے سُرے ہو گئے۔ ترکی تمام ہو گئی؟"

عباس علی خاں نے جھرجھری لی: "استاد! یہ کیا فرماتے ہیں۔ میں اور بے سُرا؟ میرے آگے تو سرِ وقتی بے سُری ہے۔ بولوں کیا، میرا تو تال سُر ان سے نہیں ملتا۔ ان کے ساتھ سنگت کرنا اپنے بس میں نہیں۔"

خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ رجو کی شوخیاں لپٹے ہوئے قالین کی طرح کھلتی جا رہی تھیں۔ سروری خانم نے اسے آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ متانت سے خاموش ہو گئی۔ یہ محفل ایسی نہ تھی کہ وہ اپنی شوخیِ طبع یہاں آزماتی۔

دیوان جی نے نوکر کو اشارہ کیا کہ سازندے بلا لیے جائیں۔ سازندے آ گئے۔ انھوں نے سب کو سلام کیا۔ سارنگیے نے سارنگیوں سے غلاف اتار کر طربیں ملائیں۔ طبلہ نواز نے بھی اپنی گٹھری کھولی اور دائیں کو چھوٹی ہتھوڑی سے ملانا شروع کیا۔ سارے ساز مل گئے۔ دونوں سارنگیے دائیں بائیں بیٹھے طبلہ نواز پیچھے بیٹھ گیا۔ ایک خادم نے پان پورہ لا کر پیش کیا۔ بی جان نے نزاکت

سے پہلے دایاں کان چھوا، پھر تان پورہ سُر کرنے لگیں۔ سارنگیوں نے شُدھ ٹھاٹ ملایا، بی جان نے پنچم کا تان پورہ ملایا۔ جب چاروں تار مل گئے تو سب نے کہا، "ماشاء اللہ"۔ طبلے والے نے تھاپ دی۔ دونوں کی لے مل گئی۔ بی جان نے سب سے اجازت چاہی اور وقت کا راگ بہاگ الاپنا شروع کیا۔ بھیری آواز۔ در و دیوار سے سُر بہنے لگے۔ الاپ ختم کر کے بلمپت خیال چار دم کے تلواڑے میں گایا۔ سب نے سانس کی تعریف کی۔ اس کے بعد دُرت خیال تین تال میں سنایا۔ ایک تان آتی، ایک تان جاتی۔ مومن نے وجد میں آ کر کہا ـــ

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

استادی گانے کے بعد ٹھمری اور دادرے کی فرمائش ہوئی۔ کھماج کی ٹھمری شروع کی گئی۔ ایک صاحب بولے "اگر زحمت نہ ہو تو بتایئے بھی"۔ لڑکیوں نے بھاؤ بتانے شروع کیے۔ محفل تڑپ اٹھی۔ آخر میں انھوں نے غالب کی طرف اشارہ کر کے اُن کی ایک غزل گائی۔ ایک ایک بول سو سو نرت سے ادا کیا۔ اگر کوئی زبان سے ناواقف ہوتا تو بھی سارا مطلب نرت سے سمجھ جاتا۔ ہر نرت پر غالب کی طرف اشارہ ہو رہا تھا۔ تحسین و آفریں کا غلغلہ تھا۔ سلام کرتے کرتے لڑکیوں کے ہاتھ تھکے جا رہے تھے۔ کچھ دادرا گانے کی تھی۔ کچھ غزل کی۔ سماں بندھ گیا تھا۔

رجو کا پُرکشش راگ گانا ختم ہوا۔ سننے والوں پر سحر طاری تھا۔ غالب اپنی غزل سن کر سسکیاں لینے لگے تھے۔ جانے کون یاد آ گیا تھا۔ مومن مبہوت تھے۔ اُن کی نگاہ رجو کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ شیفتہ ابھی زندہ سلامت تھا لیکن اُس پر شدید حیرت طاری تھی۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ وہ جس شب چراغ کی تلاش میں ہے وہ کیسے اور کہاں ملے گا۔ محبوب کی ہر تان پہ دل کے سو سو ٹکڑے ہو رہے تھے۔ رجو کا بولنا، مسکرانا، لجانا، سمٹنا، شرمانا۔ شیفتہ اُس کی کس کس ادا پر فدا نہ ہوتا۔

رجو کے بعد سرودی خانم نے جگنو کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں سے چند لمحوں بعد پشواز پہن کر ایک ایک سو گھنگرو پیروں میں باندھ کر خاص ناز و ادا سے برآمد ہوئی۔ ناچنے کے لیے کھڑی ہوئی تو عباس علی بے تاب ہو گیا۔ ویسے بھی اُس کا تخلص بے تاب تھا۔ شہزادہ گل اندام نے بھی بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ جگنو عجیب مہارت سے چل رہی تھی۔ ایک گھنگرو کی آواز بھی نہیں نکلی۔ دو مشعلچی مشعلیں روشن کیے حاضر ہوئے۔ مشعلوں کی روپہلی ڈنڈیاں سرخ چھلے میں اڑسی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ایک ہاتھ سے مشعل تھام رکھی تھی، دوسرے ہاتھ میں تیل کی کپی تھی۔ اس پر بڑی لمبی روپہلی تام چڑھی ہوئی تھی۔ جگنو ناچتی ہوئی جدھر جاتی، مشعلچی اُس کے ساتھ ساتھ جاتے۔ پیچھے دو سازندے تھے، ایک کے پاس طبلہ تھا، دو مجیرے والے مجیرے بجا رہے تھے۔ جگنو کی رفتار بے حد تیک

تھی۔ بتاشے بچھا دیے جاتے تو ایک بھی نہ ٹوٹتا۔ گھنگروؤں کا یہ عالم [illegible] گھنگرو چاہتی بجاتی، باقی سب بند رہتے۔ کسی اچھے کتھک کی شاگرد [illegible] ناچ میں ایک ایک ایسی ادا کہ سو سو دل قربان۔ رقص کی یہ محفل آدھی [illegible] تک جاری رہی۔ اس کے بعد رجو کا گانا دوبارہ شروع ہوا۔ اس مرتبہ اس نے مومن کی غزلیں گائیں۔ سب جھومتے رہے۔ آخر میں کسی نے کہا، [illegible] شیفتہ کی بھی کوئی چیز یاد ہے؟"

رجو نے کہا، "کیوں نہیں، کئی غزلیں یاد ہیں۔"

غالب کی طبیعت شگفتہ ہو گئی تھی۔ ہنس کر بولے، "بی جان! کبھی شیفتہ کی زیارت بھی کی ہے؟"

رجو نے جواب دیا، "آج تک یہ حسرت دل میں ہے۔"

عباس علی بے تاب نے جلدی سے بتایا، "لو آج تمھاری حسرت پوری ہو گئی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تمھارے سامنے بیٹھے ہیں، جی بھر کر دیکھ لو انھیں۔" رجو کا دل زور سے دھڑکا۔ طوائف تھی تو کیا ہوا، تھی تو کم سن، الھڑ، کچی کلی۔ حیا کا اثر باقی تھا۔ اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ شام کی شفق ایک دم پھیل گئی۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے پڑ گئے۔ اس کی اور شیفتہ کی نگاہیں چار ہوئیں۔ رجو کا دل بے قرار ہو گیا۔ شیفتہ کی آنکھوں کے پیغام اس کی آنکھوں میں سمانے لگے۔ یہ پیغام کسی نامہ و قاصد کے بغیر آ رہے تھے۔ سوال و جواب ہونے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش میں تھے۔

رجو نے پے بہ پے شیفتہ کی کئی غزلیں گائیں۔

پر طنز وار جلنا دستور ہے ہمارا — اُس شمع رو پہ مرنا مشہور ہے ہمارا

یہ کیسا تفرقہ ہجراں نے ڈالا — کہیں کیا، ہم کہیں ہیں دل کہیں ہے
نہ پوچھو شیفتہ کا حال صاحب — یہ حالت ہے کہ اپنے میں نہیں ہے

ملنے کا مرے اور ترے چرچا نہ کریں گے — گر دوست ہیں اغیار تو رسوا نہ کریں گے

تری خوبیاں غیر کیا جانتا ہے — تُو جیسا ہے بس جی مرا جانتا ہے
اُسے کنجِ خلوت کی کیا ہے ضرورت — جو محفل کو خلوت سرا جانتا ہے

اے شیفتہ اس فن میں ہیں ہم اک پیرِ طریقت — گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

ہر غزل کا انداز نیا تھا۔ رجو نے بھاؤ اور نرت کے ساتھ کلام کا نشہ دو آتشہ کر دیا۔ شیفتہ تو نقدِ دل و جاں پہلے ہی نذر کیے بیٹھا تھا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی اُس نے اس آفتِ ایماں پہ اشرفیاں نثار کیں اور

آخر میں یاقوت کی بیش قیمت انگوٹھی اُتار کر اُس کے قدموں میں رکھ دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپے میں نہیں ہے، کسی اور دُنیا میں ہے۔ حاضرین کو اُس کے داد و دہش پر تعجب نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس معاملے میں اس کا ہاتھ کھلا ہوا ہے مگر طوائفوں سے دل لگانا اور اُن پر اس طرح واری صدقے ہونا اُس کی اُفتادِ طبع کے خلاف تھا۔ اُس پر لوگوں کو تعجب ہوا۔ نواب شمس الدین خاں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ شیفتہ اُسے نیچا دکھانے کے لیے ایسی سخاوت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ دونوں نواب تھے بلکہ ابنِ نواب۔ دونوں کو اُن کے وارثوں نے اپنی زندگیوں ہی میں ریاستوں کا مالک بنا دیا تھا۔ دونوں عیش و عشرت کے دل دادہ اور نہایت کھرے تھے۔ آپس میں مِلنے جُلنے اور بے تکلفی کے باوجود ایسے معاملوں میں کبھی کبھی رقابت تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ چند روز تک طبیعتوں میں ملال رہتا، اس کے بعد پھر پہلے کی طرح مِلتے جُلتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ دل آئینے کی طرح صاف اور سینے بے کینہ ہو جاتے۔ نواب شمس الدین خاں نے دیکھا کہ رجو کی نظریں بار بار شیفتہ کا طواف کر رہی ہیں۔ چشمک اور رقابت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اُس نے اس کا ایک ہی علاج سیکھا تھا۔ ایسے موقعوں پر روپے کا منہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ ان عورتوں کی فطرت یہی ہے، دولت پر پہلے رکھتی ہیں، حُسن اور فن پر بعد میں مگر رجو کے معاملے میں شمس الدین خاں دھوکا کھا گیا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ یہاں دولت اور حُسن کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ فن، فن سے ٹکرا گیا ہے۔ رجو حُسن کی دولت سے مالا مال ہونے کے علاوہ ناچ گانے کے فن میں طاق تھی اور شعر بھی لاجواب کہتی تھی۔ بڑے بڑے اساتذہ اُس کا کلام سُنتے تو حیرت میں آجاتے۔ اُس نے شیفتہ کا نام بچپن سے سُن رکھا تھا۔ شیفتہ کی بہت سی غزلیں اُسے یاد تھیں۔ اکثر تنہائی میں وہ سوچتی تھی کہ شیفتہ کیسے ہوں گے؟ اُس نے دل کے نہاں خانے میں اُن کی سینکڑوں تصویریں سجا رکھی تھیں۔ ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے وہ اُسے چاہتی تھی اور اُس وقت تک اُسے یہ علم نہیں تھا کہ شیفتہ شاعر ہونے کے ساتھ ایک بڑی ریاست جہاں گیر آباد کا بلا شرکتِ غیرے مالک بھی ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں رئیس جہاں گیر آباد اور شاعر شیفتہ اُس کے لیے الگ الگ شخصیتیں تھیں۔ رجو مہرولی کی یادگار شب بھی نہیں بھول تھی۔ اُس شب پچھلے پہر وہ مرزا جہاں گیر کے خیمے سے مُجرا کر کے تھکی ماندی لوٹی تھی اور تازہ ہوا کھانے کے لیے اپنے ڈیرے سے نکلی تھی۔ اچانک ایک جوانِ رعنا، شریف صورت آنکھوں میں شب بیداری کے صد ہزار خمار سمیٹے پرستان کے شہزادے کی طرح سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی بوکھلاہٹ، بدحواسی اور پھر مبہوت ہو کر تکنا۔ یہ سب باتیں رجو کے دل پر نقش تھیں۔ اپنا شرارت سے سلام کرنا بھی اُسے یاد تھا۔ وہ اُس نوجوان کو کسی وقت تک نہیں بھول سکی تھی۔ نہ جانے کون تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کیسا اضطراب تھا، کیسی چبھن اور بے چینی تھی جیسے کسی گم شدہ دولت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو۔ وقت کی گردش نے یہ نقوش دھندلا تو دیے تھے لیکن محو نہیں کیے تھے۔ آج اتنے دنوں بعد وہ ایکا ایکی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ رجو کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ صرف اُسی کے لیے گا رہی ہے۔ اُس نے اپنا سارا فن اُس کے قدموں میں رکھ دیا تھا۔

آخر میں جنگلو کے بجائے خود رجو نے پاؤں میں گھنگرو باندھے اور ناچنے کے لیے کھڑی ہوئی۔ حاضرین سنبھل کر بیٹھے۔ پہلو بدلے گئے اور نگاہیں رقاصہ کے پیروں پر جم گئیں۔ ان حسین نازک پیروں کی دل فریب حرکت کے ساتھ نہ جانے کس کس کا دل ڈانواں ڈول ہو گیا۔ رجو نے تھرکنا شروع کیا۔ نُور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے بدن کا ایک ایک عضو پھڑکنے لگا۔ اُس نے دیر تک کتھک رقص کے مشکل سے مشکل توڑے نکالے۔ پھر لے کی تقسیم ایک سے سولہ تک دکھائی۔ آخر میں تتکار کا کمال دکھایا۔ سب نے جی کھول کر داد دی۔ جنگلو کا ناچ ہیچ ہو کے رہ گیا۔ پھر جب رجو نے مور کا ناچ شروع کیا تو محفل کی محفل لوٹ گئی۔ شمس الدین خاں مست و بے خود ہو کر جھوم رہا تھا۔ مومن پہ وجد طاری تھا۔ غالب اپنے ہوش میں نہ تھے۔ شیفتہ گردن جھکائے بیٹھا تھا، بے جان بُت کی طرح۔ اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ ناچ ختم ہوا تو دیوان جی نے داد دیتے ہوئے کہا۔ ”بی رجو! جی خوش کر دیا۔ یہ فن تم پر ختم ہے۔ ہماری اتنی عمر ہونے کو آئی، بڑے بڑوں کا ناچ دیکھا ہے لیکن مور کا ایسا ناچ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ناچتے ناچتے جب مور اپنے پیر دیکھتا ہے تو اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت جس خوبی اور سچائی سے تم نے ادا کی تمھارا ہی حصّہ ہے۔“

رجو سروقد کھڑے ہو کر آداب بجا لائی اور متانت سے بولی۔ ”آپ کا حُسنِ نظر ہے، لونڈی کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ حضرات کی داد میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ آپ ذرّے کو آفتاب بناتے ہیں۔“ اُس نے پھر جھک کے سلام کیا۔

محفل اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ سازندوں نے ساز باندھنے شروع کیے۔ سرداری خانم نے ایک گوشے میں رکھا جوتیوں کا جوڑا بغل میں دبایا اور آداب و تسلیمات کے بعد جانے کی اجازت طلب کی۔ شہزادہ گل انجام نے اُسے چھیڑا۔ ”بائی جی! اپنا جوڑا مجلس میں بھی بغل میں دبائے رکھتی ہو؟“

سرداری خانم منجھی ہوئی عورت تھی۔ بے ساختہ کہہ اُٹھی۔ ”صاحبِ عالم! خدا سلامت رکھے۔ لونڈی اپنا جوڑا ہمیشہ اپنی بغل میں رکھتی ہے۔ یہ حضور ہی کا جوڑا ہے جو روز و شب خدمت گار کی بغل میں رہتا ہے۔“

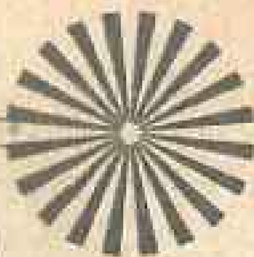
اب شیفتہ کے سامنے ایک نئی اور کٹھن منزل تھی۔ اسے سر کرنا بظاہر آسان لیکن حقیقت میں بہت دشوار نظر آتا تھا۔ اضطراب میں تسکین کو ...

تھے مگر جب اُس رہزنِ تمکین و ہوش کو پایا تو تسکین کے بجائے پھر نظارے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔ بساطِ عیش کچھ عرصے سے اُلٹ گئی تھی اُسے دوبارہ بچھانے کی تیاریاں ہوئیں۔ مطرب و ساقی، نغمہ و مے، چنگ و رباب اور کیف و سرور کی وہ محفلیں جو دو سال قبل چھٹ گئی تھیں وہ پھر آوازیں دینے لگیں۔ محبوب کا حصول دُور نہ تھا تاہم درد و اثر، سوز و گداز اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دیوان جی کی محفل سے بادیدۂ نم واپس آیا تھا، اس شان سے کہ محفل کی محفل اپنے ساتھ لیے ہوئے، تمام مناظر آنکھوں میں سمیٹے ہوئے۔ دوسرا دن پورا اُسی کے تصوّر میں گزرا۔ شام کو سورج غروب ہوا تو طبیعت کی خلش طلوع ہوئی۔ بار بار ارادہ بندھا کہ کوچۂ محبوب کے چکر کاٹے لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بستر پہ لیٹ کر کروٹیں بدلتا رہا مگر بے تابی نے ایک پل چین نہ لینے دیا۔ اتفاق سے موسم صاف تھا۔ شبِ ماہ کی کرنوں نے بام و در جگ مگا دیے تھے۔ صبر و قرار کی عنان اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ کپڑے بدل کے سیدھا عباس علی بے تاب کے گھر پہنچا۔ عباس بے خبر سو رہا تھا۔ شیفتہ کے کوچبان نے اُسے جگایا۔ اُس نے شیفتہ کے پاس آ کے پوچھا۔ ”خیریت؟ اس وقت کیسے تکلیف کی؟“

شیفتہ نے جواب دیا۔ ”خیریت کہاں؟ سب کچھ جان کر بے خبر بنتے ہو؟ آؤ ہمارے ساتھ چلو۔“

چاوڑی کا علاقہ قلعۂ معلّیٰ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ دلّی کی تمام ڈیرے دار طوائفیں چاوڑی کے عقبی گلی کوچوں میں رہتی تھیں۔ اُن کا پیشہ عصمت فروشی نہیں تھا۔ وہ صرف رقص و سرود سے تعلق رکھتی تھیں۔ رجواڑوں اور ریاستوں میں اُن کا آنا جانا تھا۔ ان کے گھروں کی تہذیب مستند تھی۔ اسی سبب سے اُمرا اور شرفا اُن کے ہاں آتے تھے اور اپنے بچّوں کو تہذیب و شرافت سکھانے کے لیے اُن کے گھروں میں بھیجتے تھے۔ اُن کے ٹھکانے تہذیبی ادارے تھے۔ وہاں تمیز، اخلاق اور شائستگی کا درس ہوتا تھا۔ ہر کس و ناکس اُن کے ہاں نہیں جا سکتا تھا، نہ وہ ہر کس و ناکس کے ہاں جاتی تھیں۔ دلّی کے گنے چنے گھرانوں میں جاتی تھیں اور اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ وہ شعر کہتیں اور دلّی کی بیگماتی زبان بولتیں۔ بول چال اور ضلع جگت میں بھی نہیں چوکتی تھیں۔ اگر کبھی باہر سے قابلِ تکریم فن کار آتے تو اُن کی دعوتیں کرتیں۔ سو پچاس شرفا کو بھی بلاتیں۔ پہلے دسترخوان بچھایا جاتا، عمدہ کھانا کھلایا جاتا، پھر پان اور حقّے سے تواضع ہوتی۔ مہمان گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھتے، فقرے بازی ہوتی، پھبتیاں کسی جاتیں، کسی کی نقل، محفل بنایا جاتا، یہ عموماً کوئی تعزّز رنگ ہوتے، برجستہ شعر پڑھے جاتے، ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں مگر کیا مجال جو کسی سے ذرا بھی بے ہودگی ہو جائے۔

شہر کے گلی کوچے اور بازار سنسان تھے لیکن چاوڑی بازار میں دن نکلا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنی تھی، کوٹھوں پر ساز و آواز کا ہنگامہ تھا۔ بازار میں



کلی دانے

انڈالنشا کا واقعہ ہے۔ ایک مذہبی پیشوا کی تقریر ہونے والی تھی۔ ایک وزیر نے تقریر سے پہلے پیشوا کا تعارف نہایت خوب صورت طریقے سے کرایا اور پیشوا کی انتہائی تعریف کی۔ تعارف کے بعد پیشوا تقریر کے لیے کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا۔ ”خدا وزیر موصوف کو مبالغہ آمیزی پر معاف کرے اور مجھے اُن کی تعریف سے لطف اندوز ہونے پر۔“

اعلا تعلیم کے موضوع پر جلسہ ہو رہا تھا۔ ایک مقرر نے تقریر شروع کی۔ ”خواتین و حضرات! میں اعلا تعلیم کا بے مدعا ہوں کیونکہ جب میں اسکول کے ابتدائی درجے میں تھا تو مجھ سے کہا گیا، اچھی ملازمت کے لیے ہائی اسکول میں جاؤ۔ جب میں ہائی اسکول میں پہنچا تو کہا گیا کہ اچھی ملازمت کے لیے ہائی اسکول پاس کر جاؤ۔ پھر جب میں کالج سے گریجویٹ ہو گیا تو ہر شخص نے کہا اچھی ملازمت کے لیے ماسٹرز ڈگری حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں نے ماسٹرز ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد مجھے بتایا گیا کہ کوئی بھی میری ماسٹرز ڈگری اُس وقت تک تسلیم نہیں کرے گا جب تک میں اپنے مضمون میں ماہر نہ ہو جاؤں چنانچہ میں اپنے مضمون میں ماہر ہو گیا۔ مہارت کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلا تو پتہ چلا کہ ملازمت دینے والے ادارے کسی نوجوان آدمی کی تلاش میں ہیں۔“

• • • • • • • • • • • • • • • •

طرح طرح کے تماش بین گھوم پھر رہے تھے۔ امیر، رئیس، عہدے دار، کرخندار چھٹ بھیّے، گرہ کٹ، اچکّے۔ کوئی سواری میں، کوئی پیدل۔ تنبولیوں کی دکانوں پر ہجوم تھا۔ ہار پھول بیچنے والے کثرت سے تھے۔ حلوائیوں کی سجی بنی دکانوں پر گاہکوں کا زبردست ہجوم تھا۔ بازارِ حسن چاوڑی میں دراصل تانبے، پیتل اور کانسی کے برتن بھانڈے بیچنے والوں کی دکانیں تھیں۔ وہ سب بند پڑی تھیں۔ اُن دکانوں کے اوپر دو رویہ آمنے سامنے طوائفوں کے کوٹھے تھے۔ محرابی برآمدوں، چھجوں اور کھڑکیوں میں سر تا قدم غارت گرِ ہوش و ایماں بنی ٹھنی بیٹھی تھیں۔ لالٹینوں اور مشعلوں کی تیز روشنیوں میں ان کے چہرے چاند کی طرح عجب دکھا رہے تھے۔ گالوں پہ غازہ اور ہونٹوں پہ لاکھا تھا۔ ماتھے کی بندیا دل گیروں کو آکساتی۔ عشوہ و ادا مشتاقوں کے دل لوٹ لیتے۔ بالاخانوں پر عیش و نشاط کی محفلیں جمتی تھیں۔ چھنا چھن پائل بجتی، گھنگروؤں کی جھنکار گونجتی، طبلے کی گمک پر سارنگی کی مست تانیں اُٹھتیں۔ موسیقی کے لطیف سیلاب نے ماحول انتہائی رنگین بنا دیا تھا۔ شیفتہ کے لیے یہ گلی کوچے، ساز و آواز کا یہ ہنگامہ اور نوخیز طوائفوں کے عشوے نئی چیز نہیں تھے لیکن آج اِدھر آتے ہوئے اُس کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ چرخے والان کی طرف جاتے ہوئے ایک تنگ گلی کے نکڑ پر اپنی گاڑی سے اُترا اور عباس علی کے ساتھ پیدل گلی میں داخل ہوا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور دل میں ایسا خوف تھا جیسے وہ پہلی بار چوری کی نیت سے نکلا ہو۔ قریب سے کوئی گزرتا تو شیفتہ گردن اور نیچی کر لیتا۔ عباس علی کو سروری خانم کا مکان معلوم تھا۔ وہ

کسی سے راہ پوچھے بغیر سیدھے سروری خانم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ گلی کا سب سے آخری مکان تھا۔ یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ شیفتہ کی جان میں جان آئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مکانوں کی بیرونی کھڑکیوں سے روشنیاں جھانک رہی تھیں اور گھنگرو بجانے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ مکانوں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ پھیکی پھیکی چاندنی میں ایک عجیب سوگوار منظر پھیلا ہوا تھا۔ سروری خانم کے کُھلے دروازے میں ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی کے اندر طاق میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ بان کی کھرّی چارپائی پر ایک بوڑھا شخص حقّہ گڑگڑا رہا تھا۔ آہٹ پا کر اُس نے حقّے کی نے منہ سے نکالی اور دو شریف صورت آدمیوں کو دیکھتے ہی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ "تشریف لائیے۔ کیا حکم ہے؟"

"بائی جی سے کہیے کہ مصطفیٰ خاں رئیس جہانگیر آباد تشریف لائے ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بات کر لیں۔" عباس علی خاں نے کہا۔

"جو حکم۔" دربان نے ادب سے سلام کیا اور اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد سروری خانم سر پر دوپٹا سنبھالتی، کچھ گھبرائی، کچھ خوش خوش ہوتی نمودار ہوئی اور اُن دونوں کو مکان کے اندر لے گئی۔ "زہے نصیب کہ حضور نے قدم رنجہ فرمایا۔ اگر کسی ملازم کے ذریعے سرکار پہلے سے اطلاع فرما دیتے تو آپ کو زیادہ زحمت نہ ہوتی۔ بہرحال آئیے، خانہ بے تکلف ہے۔"

انھیں نچلی منزل کے ایک سجے سجائے وسیع کمرے میں بٹھایا گیا۔ کمرے کی آرائش و زیبائش میں سادگی اور نفاست تھی۔ شیفتہ کو خوشی ہوئی۔ در و دیوار پر عمدہ سفیدی تھی، اُس پر روغن کے رنگین حاشیے، جا بجا قدیم قلمی طغرے اور کتبے تھے۔ چھت میں دو خوش نما جھاڑ، فانوس تھے۔ دہلیز میں پائیدانوں کی جگہ مرگ چھالیں تھیں اور دروازوں پر کھاروے کے پٹاپٹی کے پردے تھے۔ زمین پر دری اور دری پر براق چاندنی تھی۔ چاندنی پر دائیں بائیں اور درمیان میں نرم بیش قیمت ایرانی قالینوں کا فرش تھا۔ دونوں طرف دیواروں کے سہارے پھول دار غلافوں والے گول تکیے رکھے تھے۔ پان دان، پیک دان اور حقّے بھی قرینے سے رکھے تھے۔

"کل دیوان جی کی محفل میں تو آپ نے کمال کر دیا۔ واللہ اب تک اُس کے تصور سے جھوم رہا ہوں۔" عباس علی نے بات شروع کی۔ "بی رجّو نے غضب ڈھا دیا۔ نواب صاحب اُسی وقت سے مضطرب اور بے چین ہیں۔"

"سرکار کی ذرّہ نوازی ہے۔ ہم لوگ تو آپ ہی کے ہاتھ بکنے والے ہیں۔" سروری خانم نے غور سے شیفتہ کو دیکھا۔ وہ شاید اپنے شکار کو نگاہوں میں تول رہی تھی کہ اُسے کس طرح ذبح کیا جا سکتا ہے۔ ایک ٹھنڈی گہری سانس بھر کے وہ بولی: "نواب صاحب! کیا عرض کروں، میں نے ان لڑکیوں پر کتنی محنت کی ہے اور ان کی تربیت پر روپیہ کیسے پانی کی طرح بہایا ہے لیکن اب تو زمانے کا رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہے۔ زور جبر سے کام نہیں چلتا۔

رجّو بی جب سے دلّی آئی ہیں، میں نے بہت کہا کہ بیٹا، یوں کام کب تک چلے گا؟ تم ہر وقت شعر و شاعری میں گم رہتی ہو، کچھ آنکھیں کھولو، ہوش کے ناخن لو۔ بڑے بڑے رئیس اور جاگیردار آگے پیچھے پھرتے ہیں مگر وہ کسی طرف رُخ ہی نہیں کرتی۔ مرزا جہانگیر ملازم رکھنے کو فرماتے تھے، اُس نے صاف انکار کر دیا۔ میں تو دھک سے رہ گئی کہ یہ کیا غضب کیا۔ ہم اُن کی رعایا ہیں۔ بادشاہ زادوں کو یوں کورا جواب نہیں دیا کرتے لیکن رجّو کے کان پر جوں نہ رینگی۔ ابھی آپ کے تشریف لانے سے آدھ گھنٹے قبل مہاراجا پٹیالہ کے چھوٹے بیٹے کنور اجیت سنگھ آئے تھے۔ انھوں نے میرے قدموں میں ہزار اشرفیوں کا توڑا رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اُن کے قدم پکڑے اور عرض کیا، 'سرکار! یہ کیا کرتے ہیں۔ لونڈی کی یہی عزت افزائی کیا کم ہے کہ آپ تشریف لائے۔ میں ہر طرح حاضرِ خدمت ہوں۔' انھوں نے رجّو کا سوال کیا۔ میں نے عرض کیا، 'مجھے بھلا انکار۔ کیا مجال لیکن حضور یہ بات اُسی سے کہیے۔' انھوں نے اُس سے بات کی تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رجّو نے صاف انکار کر دیا۔ پرسوں ترسوں ایک صاحب رئیس رام پور نواب یوسف علی خاں صاحب کا پیغام لے کر آئے تھے۔ کہہ رہے تھے ہزار روپیہ روز دیں گے۔ رام پور چلنا ہو گا مگر اُس لونڈیا کے سر پہ تو نہ جانے کون سا بھوت سوار ہے۔ اِس بُری طرح بے چارے کو ڈانٹا کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے کہا بھی کہ اگر امیروں اور رئیسوں کو یوں دھتکارو گی تو ایک دن سر پہ ہاتھ رکھ کر رو دو گی۔ ہمارا کیا ہے، آج مرے کل دوسرا دن۔ یہ حسن و جمال، یہ ناز و ادا سدا ساتھ تو نہ دیں گے۔"

شیفتہ گردن جھکائے کہتا رہا۔ "بجا ارشاد، بے شک، درست، جو فرمایا۔" عباس علی خاں دل میں کھول رہا تھا۔ وہ اس میدان کا پرانا پھکیت تھا۔ خوب جانتا تھا کہ نائکائیں اپنی نوچیوں کی قیمت بڑھانے کے لیے کیا کیا باتیں کرتی ہیں۔ سروری خانم ایک ہی سانس میں مرزا جہانگیر سے کنور اجیت سنگھ اور نواب یوسف علی خاں تک پہنچ گئی تھی۔ اُس کا مقصد شیفتہ کو یہ جتانا تھا کہ صاحب زادے، رجّو پر نظر رکھتے ہوئے ذرا اپنی حیثیت کا خیال بھی رکھنا۔ باتیں کرتے کرتے وہ یکایک کھڑی ہو گئی۔ "اے لو میں باتوں میں لگ گئی۔ فرمائیے کیا خاطر کروں؟ ٹھہریے، رجّو کو بھیجتی ہوں۔ آج اُس کا جی اچھا نہیں ہے۔ سرِ شام اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی تھی، منہ دھویا نہ کنگھی چوٹی کی۔ اتنے میں آپ اُس سے باتیں کیجیے گا۔ مجھے اجازت دیجیے۔" وہ چلی گئی۔

عباس علی نے زانو پہ ہاتھ مارا۔ "اجی نواب صاحب! سُنا آپ نے؟ یہاں آپ کی دال نہیں گلنے کی۔ مانا کہ آپ بھی ریاست کے مالک ہیں مگر یہ عورت جانتی ہے کہ ریاست چھوٹی سی ہے اور ابھی آپ کے والدِ بزرگوار نواب مرتضیٰ خاں زندہ ہیں۔ بے شک انھوں نے اپنی حیات

ہی ہیں ریاست آپ کے نام کر دی ہے لیکن نگراں بہر حال وہی ہیں اور وہ آپ کو زیادہ الٹے تلّلے نہیں کرنے دیں گے۔ یہی سبب ہے کہ سروری خانم نے دوسرے رؤسا کا نام لیا ہے اور میرا خیال ہے یہ فہرست ابھی نامکمل ہے۔ اس میں لوہارو اور فیروزپور جھرکہ کے بانکے سجیلے نواب شمس الدین خاں کا نام نامی بھی ضرور شامل ہوگا۔ نواب یوسف علی اور کنور اجیت سنگھ سے آپ کا یارانہ ہے ممکن ہے وہ آپ کو آگے بڑھتا دیکھ کر پیچھے ہٹ جائیں مگر شمس الدین خاں کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ ضد پر آجائے تو آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھتا۔ لاکھ کا گھر خاک کر ڈالے گا۔ میں کل ہی دیوان جی کے ہاں بھانپ گیا تھا کہ اس کی نگاہ رجو پر پڑ رہی ہے۔"

شیفتہ کے کلیجے میں ہوک اٹھی۔ یہی شبہ اسے بھی ہوا تھا۔ اب عباس نے اس کا شبہ یقین میں بدل دیا۔ جواب میں وہ کچھ کہنے والا تھا کہ ایک جھونکا آیا۔ جھونکے میں خس کے عطر کی آمیزش تھی۔ رجو کمرے میں داخل ہوئی۔ آج اس کا رنگ روپ ہی اور تھا۔ چہرے پر شوخی اور بے باکی کے بجائے متانت اور نرمی تھی۔ چال میں دل کو پامال کرنے کی ادا افزوں تھی لیکن وقار کے ساتھ۔ حسن کسی بناوٹ کے بغیر تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ چمک اور جھیل کی گہرائی تھی اور ہلکے ہلکے سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے جیسے ابھی رو کر یا سو کر آرہی ہو۔ سرخ ڈوروں میں عجیب زہر آلود مستی تھی گویا یہ آنکھیں کسی کو ڈس لیں تو رگ و پے میں زہر اتر جائے۔ لباس کی سادگی نفاستِ طبع اور ذوقِ سلیم کی گواہ تھی۔ آڑا پاجامہ، چکن کا کرتا اور کلف دار چنا ہوا ململ کا گلابی دوپٹا۔ دوپٹے میں کہیں کہیں ابرق کے ذرّے فانوس کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ کلائیوں میں سونے کے نقشیں کنگن تھے اور بالیاں موتیے کے تازہ پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ستواں ناک میں ہیرے کی لونگ ستارے کی طرح جگر جگر کر رہی تھی۔ ہاتھ پیروں میں مہندی رچی ہوئی تھی اور لباس سے خس کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ شیفتہ اور عباس کھڑے ہو گئے۔

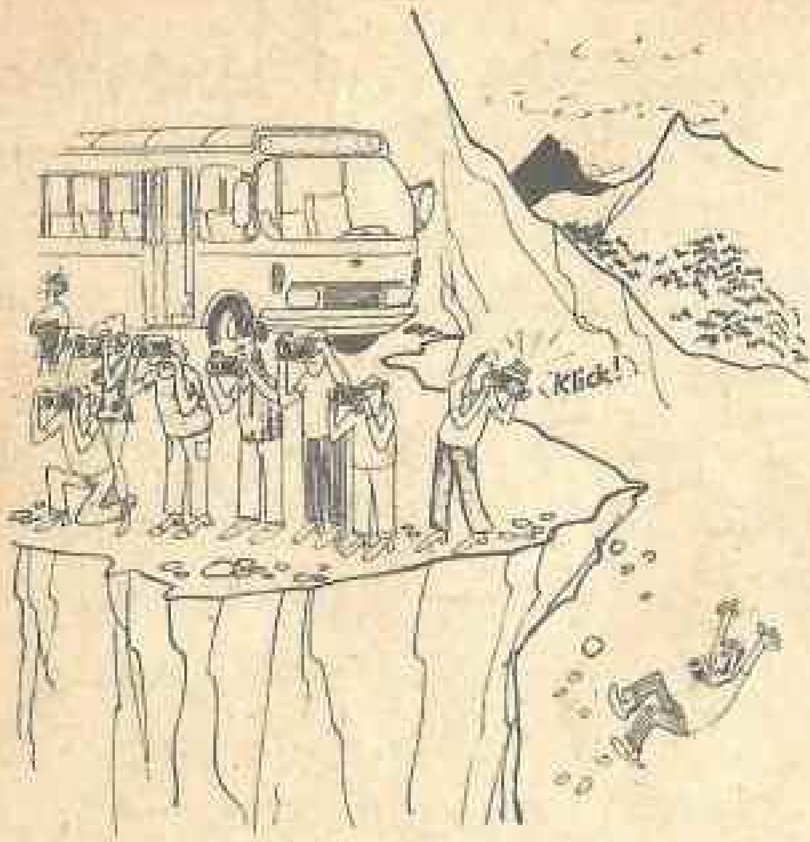
رجو نے نہایت نزاکت سے جھک کر سلام کیا اور ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔" اس نے مسکرا کر شیفتہ سے کہا۔ "دیکھیے کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے ایک مرتبہ مہرولی میں آپ کو دیکھا تھا اور کل دیوان جی کے ہاں دیکھا مگر یہ معلوم نہ تھا کہ آپ ہی شیفتہ ہیں۔"

عباس نے لقمہ دیا۔ "صرف شیفتہ نہیں، یوں کہیے کہ والہ و شیفتہ ہیں۔"

رجو نے خاص ادا سے شیفتہ کی طرف دیکھا اور ہونٹ کاٹنے لگی۔ "اچھا؟ یہ تو مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ آپ شیفتہ کے ساتھ والہ بھی ہیں۔ بھلا کس خوش نصیب پر؟"

شیفتہ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ عباس کچھ اور بولتا، شیفتہ نے آنکھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ عباس نے کہا۔ "اُف۔ نواب صاحب مجھے اشارہ کر رہے



ہیں کہ چپ رہوں۔ چلو صاحب، ہم اب نہ بولیں گے بلکہ کہو تو یہاں سے اٹھ جائیں۔" وہ اٹھنے لگا۔

شیفتہ کہنے لگے۔ "کہاں جاتے ہو؟ بیٹھو بیٹھو۔ ہم نے کب اشارے کیے ہیں۔ ہاں اگر چاندنی رات میں کسی اور کوٹھے پر جانے کا ارادہ ہے تو ضرور جاؤ مگر ذرا جلدی لوٹ آنا۔"

عباس ہنستا ہوا چلا گیا۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر رجو نے زبان کھولی۔ "سرکار! آپ نے لونڈی کو نوازا۔ کرم فرمائی ہے آپ کی۔ میرے پاس تو آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"رجو!" شیفتہ نے کہا۔ "ہم تم سے کچھ لینے نہیں آئے ہیں اور ہم تمھیں جنسِ بازار بھی نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہوتا تو چاوڑی ہی میں بے شمار بالاخانے ہیں، کہیں اور چلے جاتے۔ تمھیں دیکھنا ہمارے لیے قیامت ہو گیا۔ دو سال کس اضطراب میں کٹے، یہ ہمی جانتے ہیں۔"

"میں تسلیم کرتی ہوں۔" رجو ہنسی۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا۔

شیفتہ نے کہا۔ "یہ باتیں تمھارے لیے نرالی نہیں ہیں۔ یہاں آنے والے اکثر لوگ رسماً ایسی باتیں کرتے ہیں مگر ہمیں یقین ہے، تم رسمی اور غیر رسمی باتوں میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ جذبے کی سچائی عشق اور مشک کے مانند ہے، چھپائے نہیں چھپتی۔ ہم تم سے تنہائی میں آج پہلی مرتبہ ملے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ بہت سی باتیں پہلی ملاقات میں کرنے کی نہیں ہوتیں لیکن رجو! اگر سچ پوچھو تو گزشتہ دو برسوں میں ہم تم سے صدہا، ہزارہا ملاقاتیں کر چکے ہیں۔ کم سے کم صدہا ہزارہا ملاقاتوں کے بعد تو ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔"

رجو گم ہو گئی۔ شیفتہ بے قراری سے اس کی صورت تکتا رہا۔ نہ جانے کتنی دیر کی خاموشی کے بعد رجو کی دھیمی آواز نکلی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے

تھے۔" نواب صاحب! مبادا آپ کی محبت محض پسندیدگی ہو؟"
شیفتہ نے بے ساختہ جواب دیا۔ "نہیں رجو! محبت اور چیز ہے، پسندیدگی اور چیز۔ جو چیز آہستہ آہستہ نمودار ہو اور اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی کے لیے ضروری اور مفید ہے، وہ محبت نہیں پسندیدگی ہے۔ لوگ پسند اور محبت میں تمیز نہیں کرتے جس طرح دوستی اور رغبت میں یا پرستش اور عزت میں تمیز نہیں کرتے۔"
رجو پھر خاموش ہو گئی۔ شیفتہ وارفتگی سے مختلف پیرایوں میں محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں شاعری کا لطف تھا۔ رجو اشتیاق و خوشی سے سن رہی تھی۔ اس کا چہرہ کبھی تمتما اٹھتا، کبھی پھیکا پڑ جاتا۔ شیفتہ نے اپنی مجبوری، محرومی اور شوق کی تمام روداد رس کی طرح اس کے کانوں میں گھول دی پھر اس کا ہاتھ تھام کے کہا۔ "ہم تم سے بھی کچھ سننے کے مشتاق ہیں رجو! تم بھی تو کچھ بولو۔"
رجو اداس ہو گئی۔ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "شیفتہ! آپ جانتے ہیں۔ اس کائنات میں حسن و شباب سے زیادہ بے حقیقت اور ناپائدار چیز کوئی نہیں ہے۔ ہر بہار کے مقدر میں خزاں ہے، جوانی رخصت ہو جاتی ہے، حسن کے تو مضمحل ہو جاتے ہیں، رنگ مرجھا جاتا ہے۔ پھر کوئی پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ یہی حال عورت کا ہے خصوصاً وہ عورت جسے معاشرے نے طوائف کا روپ دے دیا ہو۔ وہ تو ایک مسلی ہوئی کلی ہے، اس میں نہ بو ہے نہ باس۔ وہ ویرانوں میں کھلتی ہے، وہیں کمھلا جاتی ہے پھر اس پر کسی کی غلط انداز نگاہ نہیں پڑتی۔ یہ شمع بجھتی ہے تو دھواں بھی بل کھاتا ہوا اٹھتا ہے۔ اس دھوئیں سے زمین و آسماں تاریک ہو جاتے ہیں۔ ہمارا گھر، گھر نہیں سرائے ہے۔ یہاں مسافر آتے ہیں، تھکن دور کرتے ہیں اور تازہ دم ہو کر کسی نئی منزل کی تلاش میں روانہ ہو جاتے ہیں۔ اب اس مسافر کو کیا کہیے جو سرائے والوں سے دل لگا بیٹھے۔"
شیفتہ نے سنبھل کر کہا۔ "رجو! یہ مایوسانہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھ لیں؟ تمہارا سفر تو ابھی شروع ہوا ہے۔ زندگی مایوسی کی باتوں کے لیے نہیں ہوتی۔ اپنے متعلق یہ خیالات بلکہ توہمات فوراً دل و دماغ سے نکال دو۔ تمہاری مثال سرائے کی نہیں، کسی تپتے ہوئے صحرا میں ایک نخلستان کی ہے جہاں گرمی سے بوکھلائے ہوئے کارواں آ کر دم لیتے ہیں۔ تم اندھیری رات میں ایک روشن چراغ ہو جو بھولے بھٹکوں کو منزلوں کا سراغ دیتا ہے یا تم وہ ستارہ ہو جو سورج طلوع ہونے سے پہلے آسمان کی بلندی میں نمودار ہوتا ہے اور ہمیشہ آفتاب کا پیش رو ثابت ہوتا ہے۔"
رجو کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر تلخی آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ "گستاخی کے لیے دست بستہ معافی کی خواستگار ہوں۔ مجھے اپنی حقیقت کا خوب وقوف ہے۔ میں نہ نخلستان ہوں، نہ روشن چراغ، نہ آفتاب، نہ آفتاب کا پیش رو ستارہ۔ میری زندگی شروع سے آخر تک ایک تلخ فریب اور رنگین سراب ہے۔ جادہ ہے نہ منزل۔ جو خود گم کردہ راہ ہو وہ دوسرے کی کیا رہنمائی کرے گا؟ یہ بھی آپ کا حسن ظن ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ میں تو وہ شمع ہوں جو اپنی آگ میں خود جلتی ہے اور خود ایک روز بھڑک کر خاموش ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنے بارے میں نہ کوئی خوش فہمی ہے نہ کوئی مغالطہ۔ ہمیں ابتدا سے یہ سکھایا جاتا ہے کہ تمہیں صرف دولت کمانی ہے اور تماشائیوں کو طرح طرح کے غمزوں سے گرفتارِ بلا کرنا ہے۔ اس کام میں ہم نیک و بد کی تمیز بھی نہیں کرتے۔ اگر کریں تو یہ دکان ایک دن بھی نہ چلے۔"
شیفتہ نے جوش سے پھر رجو کا ہاتھ تھام لیا۔ "رجو! اگر ہم وفا کا عہد کریں اور تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہیں تو تمہارا جواب کیا ہو گا؟"
رجو روہانسی ہو گئی۔ "میں عرض کر چکی ہوں کہ مجھے اپنی ذات پہ ذرہ برابر اختیار نہیں ہے۔ میں اپنی ملکیت نہیں ہوں۔ مجھ پہ دوسروں کا قبضہ ہے، جسم پر بھی روح پر بھی۔ میں ان کے لیے سونا چاندی سمیٹنے والی گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک کل ہوں۔"
"اگر وہ تمہیں قیمت لگا کر ہمارے حوالے کر دیں تو تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" شیفتہ نے عزم سے کہا۔ "ہم جانتے ہیں، مقابلہ سخت ہے۔ بہت سے رئیس، جاگیردار، دولت مند حتیٰ کہ قلعہ معلیٰ کے سلاطین بھی ہمارے حریف ہو سکتے ہیں مگر ہم حوصلہ نہیں ہاریں گے۔"
رجو تلملا گئی۔ "آخر آپ مجھے ہمیشہ کے لیے کیوں اپنانا چاہتے ہیں؟"
"اس لیے کہ ہمیں تم سے محبت ہے اور ہم اپنی محبت میں کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کر سکتے۔"
"گویا آپ مجھے بیوی بنا کر رکھیں گے؟"
شیفتہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "بے شک، بیوی۔" اس نے رجو کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ "اور مطلوبِ دل و نظر بھی۔"
رجو نے پان دان اپنی طرف کھسکا کر نازک نازک گلوریاں بنانے لگی۔ شیفتہ کا دل دھڑکنے لگا۔ رجو کی خاموشی اسے بہت کھل رہی تھی۔ رجو نے گلوری بڑھائی۔ شیفتہ نے جھک کر رجو کی کلائی چوم لی۔ آنسوؤں کے دو قطرے کلائی پہ گرے۔ "جواب دو رجو! کیا تم ہمارا ساتھ دو گی؟ ہم تمہارے لیے اپنا سب کچھ لٹا سکتے ہیں۔"
رجو نے درد بھری آواز میں کہا۔ "میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میرا مقام یہی ہے۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دیجیے۔ میں ایک حقیر بازاری لڑکی ہوں۔ آپ ایک معزز رئیس زادے ہیں۔ چار آدمی احترام سے آپ کا نام لیتے ہیں۔ مجھے اپنی بنا کر آپ کیسے رکھیں گے؟ میں تو اس لائق بھی نہیں کہ آپ کی خواتین کے پیروں کی برابری کر سکوں۔ کبھی ان جیسی حیثیت مجھے حاصل

ہو سکتی ہے آپ بے شک محبت کرتے رہیں گے لیکن میں آپ کو وہ محبت نہ دے سکوں گی جس کے آپ حق دار ہیں۔ بیوی بن جانے کے بعد میں اپنی موجودہ قیمت، اہمیت اور حیثیت سب کچھ کھو بیٹھوں گی۔ میں آپ کی شئیں، ایک مرد کی ملکیت ہو جاؤں گی۔ آپ جب چاہیں گے، جس حالت میں چاہیں گے، مجھے دیکھ سکیں گے۔ پھر مجھ میں وہ سحر آلود کشش نہیں رہے گی جو صرف نہ حاصل ہونے والی چیزوں میں ہوتی ہے یا جنھیں حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی تک لگانی پڑتی ہے۔ تنوع انسانی فطرت ہے۔ خصوصاً مرد ایک ایسی عورت میں، جو اس کی بیوی نہ ہو، نیا حسن تلاش کرتا ہے، اُسے حاصل کرنے کے لیے اپنی خوابیدہ طاقتیں بیدار کرتا ہے، اُس کی ذرا سی توجہ اور ایک غلط انداز نگاہ کے لیے جسم و روح کے تمام امکانات ظاہر کرتا ہے لیکن عورت مرد کی ملکیت میں آنے کے بعد خود مرد کی آرزو مند ہوتی ہے۔ وہ جس قدر اچھی بیوی ہو، اُس کی دل کشی اتنی قدر کم ہو جاتی ہے۔ مرد اور عورت کا مستقل تعلق دونوں کا اشتیاق چھین لیتا ہے۔ وہ مزا فنا ہو جاتا ہے جو وصل کے بعد فراق میں اور آرزو کی تکمیل کے بعد حسرت و ارمان میں ہے۔ ہر نیا دن گزرے ہوئے دن کی نقل ہو جاتا ہے۔ ہر نئی گفتگو سنی ہوئی داستان سے زیادہ موثر نہیں ہوتی۔ رفتہ رفتہ وہ منحوس وقت آ جاتا ہے جب مرد اپنی عورت سے بات کرتے اور اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے بھی گھبراتا ہے۔“

رجو کی اس تقریر سے شفیقہ کے پندارِ عشق کو ٹھیس لگی۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا، دل بھر آیا لیکن وہ سنبھل کر بولا۔ ”تم نے درست کہا، ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ ہم اپنے بارے میں کچھ اور نہیں کہیں گے۔ دراصل ہمیں کہنا ہی کچھ اور چاہیے تھا۔ شاید ہم اپنی بات واضح نہیں کر سکے۔ ہمیں ایک محرم کی ضرورت ہے جو ہماری مسرت سے سرشار اور ہمارے غم سے مغموم ہو، جو ہماری خوابیدہ طاقتیں بیدار کرے اور ہمارا منجمد دل محبت کی حرارت سے گداز کر دے۔ ایسا محرم بیوی کی صورت میں نہ سہی، خواہ کسی صورت میں ملے، ہم ہر طرح اُسے قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔“

”کنیز آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گئی۔ اب آپ مجھ سے جواب چاہیں گے۔ جواب میں ابھی نہیں دوں گی۔ اس کے لیے مجھے اور آپ کو وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔“

”ہم قیامت تک انتظار کریں گے۔“ شفیقہ اپنے آنسو نہ روک سکا۔ اُس نے منہ پر رومال رکھ لیا۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا اور گردن جھکی جا رہی تھی۔ رجو پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ شاید وہ بھی رو پڑتی لیکن اُس میں ضبط و تحمل ایک مرد سے زیادہ تھا۔ شفیقہ کی حالت اور بگڑ گئی۔ خدشہ تھا کہ سرمزی خانم یا گھر کا کوئی اور فرد وہاں نہ آ جائے۔ رجو ایکا ایکی اٹھ کر شفیقہ کے پہلو میں جا بیٹھی۔ اس نے اُس کے چہرے سے رومال ہٹایا۔ شفیقہ کی آنکھیں سرخ

ایک شخص پاگل خانے سے شفایاب ہو کر آیا۔ اُس کے دوستوں نے اُسے گھیر لیا۔ ”کہو بھائی! اب کیا حال ہے؟“
اُس شخص نے جواب دیا۔ ”میرا حال تم سب سے بہتر ہے۔“
”وہ کیسے؟“ کسی نے دریافت کیا۔
”وہ ایسے کہ میری جیب میں دماغی صحت کا سرٹیفکیٹ موجود ہے۔“

ہو رہی تھیں۔ وہ بے تابی سے رجو کے سیاہ لمبے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ رجو کسمسائی، تھرتھرا کے شفیقہ کے سینے سے لگ کے سسکیاں بھرنے لگی۔



شفیقہ نے رجو کا دل کیا جیتا، گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ گزشتہ دو برسوں کی ناکام آرزوؤں کا عوض مل گیا تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھا لیکن کبھی کبھی رات کی اداس تنہائی میں اُسے رجو کی باتیں یاد آتیں اور وہ گھنٹوں سوچا کرتا، کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی محبت میرے دل سے نکل جائے؟ جواب ہمیشہ نفی میں ملتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ رجو کی محبت اُس کے رگ و پے میں اُتر گئی ہے۔ اُسے اُن لمحات پر افسوس ہوتا جو رجو سے دوری میں بسر ہو گئے تھے۔ وہ رجو سے روز ملنے لگا۔ صرف ایک شغل رہ گیا تھا۔ ہر قیمت پر سرمزی خانم اور رجو کے دوسرے متعلقین کی خوشنودی حاصل کرنا۔ ریاست کے معاملات سے بھی اُس کی دل چسپی محدود ہو گئی۔ کارندوں سے جتنا زیادہ روپیہ وصول ہو سکا، وصول کیا اور محبوب کے در پر جا کے لٹا دیا۔ البتہ رجو نے اس سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ فرمائشیں عموماً سرمزی خانم کی طرف سے ہوتی تھیں۔ اس نے فرمائشوں کا ایک انبار لگا دیا تھا۔ کبھی جڑاؤ کنگن کی ضرورت پڑ جاتی، کبھی کشمیری شالوں کی، کبھی مشہد اور اصفہان سے آئے ہوئے قالینوں کی اور کبھی مکان کی آرائش کے لیے شیشے کے آلات اور ظروف کی۔ شفیقہ اپنی استطاعت کی حد تک تمام فرمائشیں پوری کرتا لیکن اس کی خواہش تھی کہ رجو بھی اپنی زبان سے کچھ کہے۔ کئی مرتبہ اُس نے رجو سے کہا۔ ”کیا بات ہے، تم مجھ سے کوئی فرمائش کیوں نہیں کرتیں؟“ رجو یہ کہہ سکتی۔ ”دوسرے فرمائش کرنے والے کیا کم ہیں۔“

شفیقہ اکثر آدھی رات کے بعد اپنی حویلی لوٹتا لیکن اس کا دل کوئے یار ہی میں رہتا۔

کئی بار اشاروں اشاروں میں اس نے سرمزی خانم کا عندیہ لینا چاہا۔ اُسے تجسس تھا کہ اس جہاں دیدہ عورت نے رجو کی کیا قیمت مقرر کر رکھی ہے۔ سرمزی خانم ہمیشہ ٹال جاتی۔ دراصل وہ اپنے داؤ پیچ آزما رہی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شفیقہ سے جس قدر وصول کیا جا سکتا ہو، وصول کر لیا جائے، اس کے بعد دوسروں کو آگے بڑھنے کا موقع ملے۔ اس کی نگاہ ابتدا ہی سے ریاست فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے نواب شمس الدین خاں پر تھی۔ وہ جانتی تھی

کہ شمس الدین خاں موٹی اسامی اور دل پھینک نوجوان ہے۔ اُسے آسانی سے دام میں لایا جاسکتا ہے۔ شمس الدین کے بعد اُس کی نظر رام پور کے نواب یوسف علی خاں پر تھی۔ اگرچہ یوسف علی خاں ابھی مسند نشین نہیں ہوا تھا تاہم کچھ عرصے بعد ریاست اُس کے زیرِ نگیں آنے والی تھی۔ تیسرے درجے پر پٹیالہ کا کنور اجیت سنگھ تھا۔ اجیت جب کبھی چاوڑی میں آ نکلتا، ہزاروں کے نہیں لاکھوں کے وارے نیارے کر جاتا۔ بڑے بڑے بالاخانے کنور اجیت کی ایک ملتفت نگاہ کے ہمیشہ منتظر رہتے اور اُسے بہلا پھسلا کر اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے۔ رجو اور جگنو کی شہرت دلی میں بوئے گل کی طرح پھیل رہی تھی۔ اُن کے فن کا چرچا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں بہنیں چاوڑی کی روشن ترین شمعیں بن گئیں۔ پروانوں کا ہجوم منڈلانے لگا۔ اُن کے حسن نے ہر طرف آگ لگا دی۔ جسے دیکھو اُنھی کا دم بھرتا۔ ایسے ویسوں کی طرف سے مجرے کا بلاوا آتا تو سروری خانم نہایت تکبر سے کورا جواب دے دیتی۔

رفتہ رفتہ اُسے شیفتہ کی شب و روز کی آمد بھی بُری طرح کھلنے لگی۔ اُس نے رجو کو نرمی سے سمجھایا: "رجو! نواب کے ساتھ تعلقات ضرورت سے زیادہ نہ بڑھاؤ۔ کچھ اور رئیس بھی تمھارے طالب ہیں۔ اُنھیں مایوس نہ کرو۔ تمھارا یہ وقت بہت نازک ہے۔ یاد رکھو تم عشق و عاشقی کے لیے پیدا نہیں کی گئی ہو۔ تمھارا پیشہ ان احمقوں سے صرف مال بٹورنا ہے۔ اگر عشق وغیرہ کے چکر میں پڑو گی تو بڑھاپے میں سر پہ ہاتھ رکھ کر رونا پڑے گا۔ ان میں سے کسی کو اپنا مت سمجھو، سب کو دشمن جانو۔ اگر تمھارے پاس حسن کی دولت اور رقص و سرود کا فن نہ ہو تو کوئی تم پر تھوکنے کے لیے بھی تیار نہ ہو۔ یہ خبط دماغ سے نکال دو کہ ان میں سے کوئی تمھیں چاہے گا۔ یہ سب تمھارے شباب کے عارضی گاہک ہیں۔ مطلب نکلتے ہی طوطے کی طرح آنکھ پھیر لیں گے۔ ان کی چکنی چپڑی باتوں پہ کان نہ دھرنا۔ فن کا کمال یہ ہے کہ سب کو اپنی چاہت کا یقین دلاؤ اور انھیں آپس میں حسد، رقابت اور رشک میں مبتلا کر کے دولت سمیٹو۔ یہ اس بازار میں دولت ہی نچھاور کرنے آتے ہیں۔ اگر تم نہ لوگی تو یہ اپنی دولت واپس نہیں لے جائیں گے، یہیں کسی اور کی نذر کر دیں گے۔" سروری خانم کی یہ باتیں نئی نہیں تھیں۔ رجو اور جگنو کم سنی سے یہی کچھ سن رہی تھیں۔ یہ اُن کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم حصہ تھا۔ رجو غور کرتی تو اُسے اپنی ماں کی ایک ایک بات میں سچائی دکھائی دیتی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ طوائف محبت کرنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی، اُس کا کام صرف اپنے پاس آنے والوں کا دل بہلانا اور اُن سے منہ مانگی قیمت وصول کرنا ہے۔ بارہا اُس نے عہد کیا کہ اب وہ شیفتہ پر زیادہ التفات نہیں کرے گی۔ اُس سے نہیں ملے گی۔ طبیعت کی ناسازی کا عذر کر کے اُسے ٹال دے گی مگر ہر بار اُسے عہد توڑنا پڑتا۔ جب تک شیفتہ نہ آجاتا، وہ بے چین رہتی۔ کسی کام میں اُس کا جی نہ لگتا۔ نگاہ بار بار دروازے کی طرف اُٹھتی۔ شیفتہ کے آنے میں دیر ہو جاتی تو اُسے طرح طرح کے وسوسے ستانے لگتے۔ وہ سوچتی شیفتہ کہیں بیمار نہ پڑ گئے ہوں، اُنھیں کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ ہو سکتا ہے اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کے لیے چلے گئے ہوں مگر مجھے بتائے بغیر تو وہ کبھی نہیں جاتے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ ممکن ہے دوست احباب اُنھیں کسی اور جگہ لے گئے ہوں یا... یا کوئی اور اُن کی نگاہ میں آگیا ہو۔ رجو کسل مندی سے اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتی۔ اُس کی آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے۔ شیفتہ کی آمد تک یہی کیفیت رہتی۔ شیفتہ آتا تو رجو اُسے دیکھتے ہی سب کچھ بھول جاتی۔ اُس کا جی چاہتا کہ اس وقت سب چلے جائیں، صرف وہ رہ جائے اور شیفتہ۔ پھر وہ شیفتہ کو تنہائی میں اپنی تازہ غزل سنائے اور شیفتہ کی تازہ غزل سنے۔ دونوں گھنٹوں شعر و سخن میں کھوئے رہیں۔ شہر میں کسی اور نے کوئی اچھی غزل کہی ہو تو اُس پر تنقید و تبصرہ کریں۔ یہ گفتگو ختم ہو تو راز و نیاز میں گم ہو جائیں، خاموشی کی زبان میں بھی گفتگو ہو۔ ایک دوسرے کی دھڑکنیں شمار کریں یا نظریں ملا ملا کر مسکراتے رہیں۔

عموماً ایسے عالم میں جب وہ سرخوشی کی انتہا پر ہوتے، یکا یک سروری خانم کمرے میں داخل ہو جاتی۔ شیفتہ اُس کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ وہ کھڑا ہو کے ادب سے سلام کرتا۔ سروری خانم ندامت اور عاجزی سے کہتی: "حضور! آپ کیوں بندی کو شرمندہ کرتے ہیں۔ میں تو رجو سے یہ کہنے آئی تھی کہ نیچے نواب شمس الدین خاں کا پیغام بر کھڑا ہے۔ نواب صاحب نے مجرے کے لیے پوچھا ہے۔ کیا جواب دوں؟"

رجو تیوری پہ بل ڈال کر کہتی: "اماں جان! یہ بات آپ خود طے کر سکتی تھیں۔ میں مجرے کے لیے حاضر ہوں لیکن دلی سے باہر نہیں جاؤں گی۔ غالباً نواب صاحب کی فرمائش یہ ہوگی کہ میں فیروز پور جھرکہ جاؤں؟"

"اے بیٹی! عقل کے ناخن لے، کچھ ہوش کی دوا کر۔" سروری خانم پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتی: "شرفا کو بھلا ایسے جواب دیا کرتے ہیں؟" پھر وہ شیفتہ سے مخاطب ہوتی: "حضور! کچھ آپ ہی اسے سمجھائیے۔ میں تو بک بک کر کے عاجز آگئی۔ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ نواب شمس الدین خاں کئی دفعہ طلب فرما چکے ہیں۔ پیغام بھیجا ہے کہ ہزار روپے مجرے کے دیں گے اور انعام و اکرام الگ۔ یہ لڑکی ہزار روپے پہ پانی پھیرے دیتی ہے۔"

شیفتہ ہنس کر کہتا: "ہاں واقعی انکار تو نہیں کرنا چاہیے۔ ہزار روپیہ بڑی رقم ہے اور ہم شمس الدین خاں کو خوب جانتے ہیں۔ اُن جیسی قدر کرنے والا کوئی اور رئیس نہیں ہے۔"

رجو کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ شیفتہ کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھتی گویا کہہ رہی ہو، آپ بھی یہ مشورہ دے رہے ہیں؟ پھر وہ بل کھا کر سروری خانم سے کہتی: "ہزار روپیہ کیا، وہ دس ہزار بھی دیں تو نہیں جاؤں گی۔ اُنھیں میرے مجرے کا شوق ہے تو یہیں تشریف لائیں۔ کیا اُنھوں

نے پیروں میں مہندی لگا رکھی ہے؟" سرودی خانم بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔
شمس الدین خاں کو پے در پے انکار میں جواب ملا تو اُس نے بھی ضد پکڑ لی۔ انکار سننا اُس کے آتشیں مزاج کے خلاف تھا۔ مصاحب کہتے "سرکار! رمجو کی کیا مجال جو مجرے سے انکار کرے۔ یہ سب کیا دھرا نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ہے۔ انھوں نے جانے کیا سحر پھونکا ہے کہ رمجو انھی کا کلمہ پڑھتی ہے۔ وہی اُسے یہاں نہیں آنے دیتے۔"

شمس الدین خاں پیچ و تاب کھاتا۔ یہ صریحاً اُس کی توہین تھی۔ آخر اُس کے پاس کیا نہیں تھا؟ دولت، ریاست، عزت، شہرت، جوانی، بانکپن، سبھی کچھ تھا۔ چاوڑی میں اس کی دھوم تھی۔ کون سی پری تھی جسے اُس نے سرفراز نہیں کیا تھا؟ رمجو کو دیوان جی کی محفل میں دیکھنے کے بعد سے اُس کا دل ڈانواں ڈول تھا۔ اُس نے ہزار ہا روپے کے تحائف رمجو کو بھجوائے تھے اور خود بھی کتنی مرتبہ اُس کے در پہ آچکا تھا لیکن یہ دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ وہ جب بھی رمجو کے بالاخانے آیا، شیفتہ کو وہاں پایا۔ یہ بات معیوب تھی لیکن رمجو نے شمس الدین خاں کی طرف مطلق التفات نہیں کیا۔ سلام کر کے مزاج پرسی کی اور پھر یکسو ہو کر شیفتہ کو اپنی غزل سنانے لگی۔ یہ صورت شمس الدین خاں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی مگر بالاخانہ اُس کی جاگیر نہیں تھا۔ وہاں ہر شخص آسکتا تھا جس کے بھی پاس زر و مال ہو۔ بے شک شیفتہ اُس کی ٹکر کا نہیں تھا لیکن بہرحال ایک ریاست کی خود مختاری اُسے بھی حاصل تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے، ایسے دوست جو کئی بار رقیب بھی بن چکے تھے، راز داں بھی۔ بالاخانے ان رؤسا کی لڑائی کے لیے نہیں تھے۔ اس نزاکت کا شمس الدین خاں کو اچھی طرح احساس تھا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ غصہ پی گیا اور مسلسل توہین کے باوجود اُس نے تحائف کا زور باندھ دیا۔

ایک روز سرودی خانم کو اُس کا یہ پیغام پہنچا۔ "ہم رمجو کی نتھ اتارنے کے لیے سوا لاکھ روپیہ دیتے ہیں۔ رمجو صرف ایک شب فیروز پور جھرکہ میں قیام کر لے، سوا لاکھ روپیہ اُس کی نذر۔"

یہ پیغام توپ کے گولے کی طرح چاوڑی میں پھٹا۔ طوائفوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سوا لاکھ روپیہ؟ بڑی بڑی ٹھنٹنے والی نائکائیں رال ٹپکانے لگیں۔ سرودی خانم اور رمجو کے بھاگ کھل گئے۔ مبارک بادوں کا تانتا بندھ گیا۔ برادری کی طرف سے دعوتوں کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ سرودی خانم کی گردن فخر و غرور سے تن گئی۔ وہ سیدھے منہ کسی سے بات نہ کرتی جیسے سوا لاکھ روپیہ مل ہی گیا ہو۔ اُس نے شمس الدین کو جواب بھجوایا کہ "منظور ہے۔ نتھ اُترنے کی تقریب ایسی دھوم سے ہو کہ برسوں تک بچے بچے کی زبان پر اُس کا ذکر رہے۔" یہ جواب ملتے ہی شمس الدین خاں کی باچھیں کھل گئیں۔ رقیب رو سیاہ کو زک دینے کا نادر موقع ہاتھ آگیا تھا۔ سوا لاکھ روپیہ کیا چیز ہے، رمجو کے نام دونوں ریاستیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اُس نے اُسی وقت اپنے جاں نثار مصاحبوں کریم خاں، واصل اور آنیا میو کو ساتھ لیا۔ دلّی کی طرف گھوڑوں کی باگیں اٹھا دی گئیں۔



رمجو کو کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ حسبِ معمول اپنے نواب کے انتظار میں تھی۔ بار بار کھڑکی کا پردہ سرکا کر گلی میں جھانکتی نظریں مایوس ہو کر لوٹتیں۔ نواب کی آمد کا وقت نکلا جا رہا تھا اور اُس کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ رمجو انتظار کی لذت سے خوب آشنا تھی۔ کسی شغلے میں انتظار جیسا لطف نہیں آتا بلکہ لطف تو وعدہ وفا ہونے میں بھی میسر نہیں ہے۔ خصوصاً کسی حسین مہ جبین کا کسی کا انتظار ہو تو گویا قیامت کا سامنا ہے اور غضب یہ کہ جس قدر محبت کا پاس اُسی قدر اضطراب۔ رمجو کی نگاہ اپنے دوپٹے کی ہر چُنٹ پر تھی کہ چینِ جبیں کی طرح کسی کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہے۔ ریشمی پائنچے کی دھاری دھاری کا خیال تھا کہ بے موقع تو نہیں ہے۔ وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے سے جتنی دفعہ نکلی، بے دیکھے نہ رہ گیا۔ اُس کے گول گول بھرے بھرے بازو جن کی بلائیں لینے کو جی چاہے، بالوں کا جوڑا درست کرنے کے لیے کئی بار اُٹھے۔ ایک تو بازو ہی کیا کم دل فریب تھے، اس پر اُن کا قدرِ جاناں کی طرح اٹھنا، کچھ نہ پوچھیے۔ رمجو نے پان دان سلیقے سے رکھا، غلاف جھاڑ کر گاؤ تکیوں کو بے کیسے خبر ہو گئی کہ کوئی آنے والا ہے۔ ہر چیز میں جان آگئی اور جان کے ساتھ زبان آگئی۔ ہاتھوں کی مہندی نے کہا "تنگ انتظار سے خون ٹپکنا مشکل نہیں جس کا انتظار ہے اُس سے اقرار ہے کہ دروازہ آہستہ سے کھولنا۔" اس خیال میں ذرا ذرا سی آہٹ پر کان لگے تھے۔ رمجو نے کانوں کی بالیاں اُتار ڈالیں تاکہ بالیاں آنے والے کی چاپ سننے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ یہ احتیاط غلط سہی مگر وفورِ محبت میں عقل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگرچہ عورت کو زیوروں اور آرائش کا شوق ہوتا ہے مگر رمجو کی سب سے بڑی آرائش اُس کی محبت تھی، اُس کا شیفتہ تھا۔

سرودی خانم بہت خوش تھی۔ اُس کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اُس نے سو مرتبہ دبے پاؤں آ کر رمجو کو جھانکا تھا۔ پھر ایک دفعہ یہ اطلاع دینے آئی تھی کہ نواب یوسف علی خاں آئے بیٹھے ہیں، دو گھڑی اُن کے پاس جا بیٹھو۔ رمجو نے تنک کر کہا تھا۔ "اماں جان! اس وقت مجھے تنگ نہ کیجیے۔ نواب صاحب کو بتا دیجیے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ معافی چاہتی ہوں، وہ پھر کبھی تشریف لائیں۔" سرودی خانم کو اسی جواب کی اُمید تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو رمجو کو بے بھاؤ کی پڑتیں لیکن وقت کی نزاکت دیکھ کر سرودی خانم غصہ پی گئی۔ نہ جانے اُس نے یوسف علی خاں کو کیا پٹی پڑھائی، وہ خوش خوش رخصت ہو گیا۔ دوسری مرتبہ سرودی خانم یہ کہنے آئی کہ قلعے سے مرزا جہاں گیر کا آدمی آیا ہے۔ شہزادے نے دریافت فرمایا ہے کہ آج رات مجرے کی حامی بھر دو تو ہم آئیں۔ رمجو نے لال پیلے دیدے نکال کر سرودی خانم کو گھورا۔



اتنا جواب بہت تھا۔ سروری خانم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رجو کے جھونٹے پکڑ کر دو طمانچے مارنا چاہتی ہے۔ اتنے میں اُستاد شجاعت علی خاں اندر آ گئے۔ وہ بھی یہی پوچھنے آئے تھے کہ شہزادے کو کیا جواب بھجوایا جائے۔ اُستاد کے احترام میں رجو نے گردن جھکالی اور بولی: "بیچ جانیے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک دو روز صبر جانیے۔ پھر جو فرمائیں گے، مان لوں گی۔"

شجاعت علی خاں نے رجو کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور سروری خانم کو آنکھ کا اشارہ کیا کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ چلی گئی۔ شجاعت علی خاں دیر تک رجو کو دُنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے رہے مگر رجو کا دھیان تو شیفتہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ دل میں ہزار اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ کسی دشمن نے چال نہ چلی ہو، ورنہ وہ رُکنے والے نہیں ہیں۔ رجو سر درد کا بہانہ کر کے پلنگ پر جا لیٹی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شجاعت علی خاں چلے گئے۔ رجو اُٹھی اور کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد روٹیاں پکانے والی ماما اندر آئی۔ اُس نے پوچھا۔ کیا لاؤں؟ رجو نے اُسے بھی ٹال دیا۔ بولی: "رات زیادہ ہو گئی ہے جاؤ سو رہو۔ کھانے کے لیے ایک دو پان کافی ہیں۔" ماما لوٹ گئی۔ رجو نہ جانے کیا سوچ کر پان لگانے بیٹھ گئی۔ اُس نے متعدد پان لگا ڈالے۔ انتظار میں یہ مشغلہ دل کو بہت بھایا لیکن جلد ہی اس سے بھی طبیعت اکتا گئی۔ آہستہ آہستہ اُسے کوفت ہونے لگی۔ اگر خود نہیں آ سکتے تھے تو کسی کے ذریعے اطلاع کر دی ہوتی۔ نہ جانے وہ عباس علی خاں بے تاب کہاں مر گئے، کم سے کم وہی آ کر خبر دے دیتے کہ آج نواب صاحب نہیں آئیں گے۔ رجو بے اختیار اپنی بیاض نکال کر ورق گردانی کرنے لگی۔ اُس وقت اُس نے دو ہی غزلیں کہی تھیں۔ وہ نزاکت تخلص کرتی تھی۔ شیفتہ کے علاوہ نزاکت کے شعروں کی داد کون دیتا؟ اور کسی دوسرے کی داد رجو کو کیا مسرور کرتی۔ اُس کے لیے نزاکت تخلص شیفتہ ہی نے چنا تھا۔ رجو شاعری کا بے حد ستھرا مذاق رکھتی تھی۔ در اصل اُس کی اسی خصوصیت نے شیفتہ کو اُس سے اس قدر قریب کر دیا تھا۔ محبت صحیح معنوں میں رفاقت اُسی وقت بنتی ہے جب محبوب و محب میں ہم ذوقی و مزاجی ہو۔ شیفتہ اُسے ولی دکنی کا یہ شعر اکثر سناتا تھا ۔

ہر اک مہ رو سے ملنے کا نہیں ذوق
سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

یکایک رجو چونکی۔ دروازے کا پردہ آہستہ سے ہلا اور نواب شمس الدین خاں اندر داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ جیسے دُور کا سفر کر کے چلا آ رہا ہو۔ بال گرد و غبار میں اَٹے ہوئے، آنکھوں میں نیند کا گہرا خمار لیکن اندرونی خوشی سے چہرے پر خاصی رونق اور چمک دمک۔ رجو کھڑی ہوئی اور جھک کر آداب بجا لائی: "نواب صاحب! آپ؟ اس وقت؟ بے اطلاع کیوں کر تشریف لے آئے؟"

"بے اطلاع آنے کا لطف اطلاع دے کر آنے میں کہاں؟" شمس الدین خاں قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں رجو کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رجو سب کچھ سمجھ گئی۔ شمس الدین خاں کی پھیلی ہوئی مسکراہٹ نے بھی یہی پیغام دیا کہ آج کوئی انکار کوئی عذر قابلِ سماعت نہیں ہے۔ رجو کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ اُس کے اندر کی شاعرہ سو گئی، طوائف جاگ اُٹھی۔ اُس نے طے کر لیا کہ آج شمس الدین خاں کے سامنے آئینہ رکھ دے گی۔ اُس نے ایک بار پھر رسمی انداز سے شمس الدین خاں کو آداب کیا اور قدرے پرے سے ہٹ کر بیٹھ گئی: "آپ کا گھر ہے۔ آپ کو یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے۔ ماشاءاللہ آپ رئیس ابنِ رئیس ہیں۔ ہماری آپ کے سامنے حیثیت ہی کیا ہے۔ نہایت کرم اور قدردانی ہے جو آپ تشریف لائے۔ کہیے، کیا حکم ہے؟"

شمس الدین خاں نے نخوت، حیرت اور غصے سے پہلو بدل کر رجو کو دیکھا: "ہمیں تنہائی میں مخل ہونے کی ندامت ہے۔" اُس نے متانت سے کہا: "بہت دنوں سے جی چاہ رہا تھا کہ تمھیں دیکھیں۔ کئی مرتبہ تمھاری اماں کے پاس پیغام بھیجا کہ فیروز پور جھرکہ آ جائیں۔ ہم سے جہاں تک ممکن ہو گا خاطر کریں گے لیکن معلوم ہوا کہ تم نے ہر بار کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے بات ٹال دی۔ ہماری تو ذرہ برابر توقیر نہ کی بلکہ ہمارے مقابلے میں تم نے ایسے اصحاب کو نوازا جو ہماری حیثیت سے کم تر ہیں۔ کیا ہم اس بے اعتنائی کا سبب جان سکتے ہیں؟"

رجو نے بل کھا کر جواب دیا: "نواب صاحب! اگر آپ ایسا خیال فرماتے ہیں تو مجھے رنج ہے۔ یہ ایک کوٹھا ہے۔ یہاں ہر وہ شخص آ سکتا ہے جس کی جیب میں چار پیسے ہیں۔ یہاں بہت سے لوگ آتے ہیں۔ کھل کر فرمائیے

آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟"

"ہونہہ۔ تم جانتی ہو کہ ہمارا اشارہ مصطفا خاں کی طرف ہے۔" شمس الدین خاں کا پارہ چڑھنے لگا۔ "تم محض مصطفا خاں کی وجہ سے ہمیں ذلیل کر رہی ہو۔ آخر مصطفا خاں تمھیں کیا دے دیتے ہیں جو ہم نہیں دے سکتے؟ ہم اُن سے کس بات میں کم ہیں؟ مال و دولت ہیں؟ شان و شوکت ہیں؟ اثر و رسوخ ہیں؟ یا شکل و صورت ہیں؟ معلوم ہوتا ہے انھوں نے تمھیں سبز باغ دکھائے ہیں اور ہم سے بدظن کیا ہے۔"

"نواب صاحب!" رجو کی آواز بلند ہو گئی۔ "یہ گفتگو آپ کو زیب نہیں دیتی۔ گستاخی معاف۔ مجھے سبز باغ مصطفا خاں نے تو نہیں دکھائے البتہ آپ دکھا رہے ہیں؟ لیکن یاد رکھیے۔ کائی سے آدمی کا پاؤں اکثر پھسل جاتا ہے۔ مصطفا خاں نے کبھی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ ایک سلجھے ہوئے صاف ستھرے انسان ہیں۔ میرا دل اُن سے مل کر خوش ہوتا ہے۔"

"ماشاءاللہ۔ غصّے میں ضلع جگت خوب بولتی ہو۔ طبیعت ہری ہو گئی۔" شمس الدین خاں نے طنز کیا۔

"یہاں بھی دل کے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔" رجو نے ایک گہری سانس لی۔

"اللہ اکبر کیا تیور ہیں۔ خدا کی قسم ہم تمھاری انھی اداؤں پر تو فدا ہوئے ہیں۔ یہ ابروئے سبز رنگ، یہ زمرّدیں صورت، ہم کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہو۔"

"آداب عرض کرتی ہوں۔ اس قدر افزائی پر لیکن معاف کیجیے آپ امرا کا طبقہ ہے بڑا ہرجائی۔ آج ہم پر دم دیے دیتے ہیں کل کسی اور پر مرمٹیں گے۔"

شمس الدین خاں کا غصّہ کافور ہو گیا۔ اُس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "مصطفا خاں کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ کہیں وہ تو ہم جیسے سبز قدم نہیں؟"

"خدا نہ کرے اور میں نے یہ کب کہا کہ آپ سبز قدم ہیں۔ آپ کی پذیرائی کے لیے اس کوچے میں نہ جانے کتنی آنکھیں ہمہ وقت فرشِ راہ رہتی ہیں۔"

سرودی خانم کمرے میں داخل ہوئی۔ شمس الدین خاں سعادت مندی سے اُٹھ کر آداب بجا لایا۔ سرودی خانم نے دعاؤں کا تار باندھ دیا۔ اُس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے کیونکہ وہ کمرے کے باہر کھڑی ہوئی رجو اور شمس الدین خاں کی گفتگو سُن رہی تھی۔ دعاؤں کے بعد اُس نے لال لال دیدے نکال کر رجو کو گھورا۔ "لڑکی! تجھے کبھی عقل بھی آئے گی؟ معلوم ہوتا ہے دماغ پر گرمی بہت چڑھ گئی ہے۔ خبر نا تیری یہ گفتگو سنیں گے تو میرے جنم میں تھوکیں گے کہ خوب لڑکیوں کو اُٹھایا ہے۔ ڈیرے دارنیوں کے ہاں کیا ایسی ہی تہذیب ہوتی ہے؟ تجھے اشراف کی پہچان نہیں رہی بھلا اپنے قدر دانوں سے بھی کوئی یوں دو بدو ہوتا ہے۔ کم بخت! خبر بھی ہے، نواب صاحب نے تجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے؟ آج ایک دنیا تیرے نصیبے پر رشک کر رہی ہے۔" سرودی خانم تھر تھر کانپ رہی تھی۔

ماں کی یہ حالت دیکھ کر رجو کا رنگ اُڑ گیا۔ شمس الدین نے لقمہ دیا۔ "جلیے جانے دیجیے۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گی۔ ابھی اِن کا سن ہی کیا ہے؟ ہم نے اِن کی باتوں کا مطلق بُرا نہیں مانا۔ جائیے کچھ خورد و نوش کا اہتمام کیجیے۔ آج شب ہم یہیں قیام کریں گے۔ کریم خاں وغیرہ سے کہلوا دیجیے کہ وہ اب جائیں اور چاندنی چوک والے مکان میں ٹھیریں۔ چھوٹی بیگم وہاں موجود ہیں۔ وہ اُن کے قیام کا انتظام کر دیں گی۔"

شمس الدین خاں فاتحانہ انداز میں مسکرا کے رجو کی طرف دیکھنے لگا۔ رجو کی سانس حلق میں اٹکنے لگی اور ہاتھ پیروں سے جان نکلنے لگی۔ اُس نے بے بسی سے سرودی خانم کی طرف دیکھا۔ سرودی خانم کی نظروں میں یہ جابرانہ حکم تھا کہ رجو! تجھے شمس الدین خاں کو قبول کرنا ہو گا، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ رجو بے اختیار دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اُس کا بدن خشک پتّے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سرودی خانم نے بڑھ کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ "بیٹی! میں تیری ماں ہوں، تیرا بُرا بھلا سمجھتی ہوں۔ تیرے لیے جو کچھ میں نے مناسب سمجھا، وہی کیا ہے۔ اری تجھے تو نواب صاحب کے پاؤں دھو دھو کر پینے چاہئیں۔ انھوں نے ایسی قدر دانی کی ہے کہ ہر طرف تیرا نام گونج رہا ہے۔ ایسی نعمت ٹھکرائے گی تو ہمیشہ پچھتائے گی۔"

رجو ایک جھٹکے سے الگ ہو کر دور جا کھڑی ہوئی۔ "نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ میں جان دے دوں گی لیکن آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گی۔ میں نواب صاحب کے آگے بھی ہاتھ جوڑتی ہوں کہ خدارا مجھ پر رحم فرمائیں۔ اس بازار میں اُن کی دل بستگی کے بہت سے سامان موجود ہیں۔ مجھ سے زیادہ حسین و جمیل لونڈیاں اُن کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ اللہ مجھے معاف کر دیں۔"

سرودی خانم نے کھا جانے والی نظروں سے رجو کو دیکھا۔ وہ اپنے آپے میں نہیں تھی۔ اُس کی نگاہوں میں سوا لاکھ کے توڑے گردش کر رہے تھے، سونے اور چاندی کے چمکتے دمکتے سکّے۔ رجو کی بے جا ضد اُسے اتنی خطیر دولت سے یک قلم محروم کر دے گی۔ یہ بات سرودی خانم کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس نے پھر رجو کو سمجھانا شروع کیا مگر رجو برابر روئے جا رہی تھی۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ شمس الدین خاں کبھی رجو کی طرف دیکھتا، کبھی سرودی خانم کی طرف۔ آخر عاجز آ کر سرودی خانم نے اپنا سینہ پیٹ کر کہا۔ "اری بے وقوف! معلوم بھی ہے کہ نواب صاحب نے تجھے کیا عطا کیا ہے؟ سوا لاکھ روپیہ۔ اتنی رقم تجھے کون قدر دان دے گا۔ کیا مصطفا خاں میں اتنا دم ہے؟"

رجو کی ہچکیاں رک گئیں۔ اُس کی آنکھیں انگارا ہو رہی تھیں بڑی بڑی

خانم دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ یکایک استاد شجاعت علی خاں اور جنگلو بے پاؤں کرے میں آگئے۔ دمجو دوڑ کر جنگلو سے لپٹ گئی۔ "سنا تو نے جنگلو؟ نواب صاحب تیری بہن کو نتھ اترائی کا سوا لاکھ روپیہ دے رہے ہیں؟ سنا آپ نے استاد جی! سوا لاکھ روپیہ۔ اماں کہہ رہی ہیں کہ نواب صاحب یہ سوا لاکھ روپیہ مجھے دیں گے۔"

"ہاں بیٹی، یہ سچ ہے۔ نواب صاحب توڑے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔ جی چاہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔" استاد شجاعت علی نے کہا۔ "خدا نے ہم سب کے دن پھیر دیے ہیں۔ اتنی قدردانی کوئی نہ کرے گا۔ نواب صاحب نے تمھیں ملازمت بھی عطا کر دی ہے۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ جیب خرچ علیحدہ۔"

دمجو پھٹی پھٹی نگاہوں سے شمس الدین خاں کی طرف تک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ جنگلو نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔ "باجی! تمھارے سر کی قسم۔ اماں اور استاد جی سچ کہہ رہے ہیں۔ تمھیں بہت بہت مبارک ہو۔"

دمجو کے کانوں میں پہلے سائیں سائیں ہوئی پھر اس کی نظروں میں سب کے چہرے دھندلانے لگے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "نواب صاحب! آپ چپ کیوں ہیں؟ کہیے آپ نے میری قیمت سوا لاکھ ہی لگائی ہے نا؟"

"بے شک، اور یہ قیمت ہمارے سوا تمھیں کوئی نہیں دے سکتا۔"

دمجو چلائی۔ "آپ یہ قیمت مجھے نہیں دے رہے ہیں۔ آپ جھوٹے ہیں۔ سوا لاکھ روپیہ آپ مجھے نہیں بلکہ مصطفٰی خاں کی عزت و آبرو کو دے رہے ہیں۔ کیا یہ غلط ہے؟ بولیے؟" دمجو ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس نے جھپٹ کر شمس الدین خاں کا گریبان پکڑ لیا۔ "خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہیے کیا واقعی آپ سوا لاکھ روپے مجھی کو دے رہے ہیں؟"

شمس الدین خاں نے دمجو سے گریبان چھڑا کے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "اگر ایسی گستاخی کوئی اور کرتا تو یہاں ابھی اس کی لاش پھڑک رہی ہوتی لیکن کیا کریں ہم مجبور ہیں۔ رنڈی کے کوٹھے پہ ہیں اور عورت پہ ہاتھ اٹھانا مردانگی کے خلاف ہے۔"

دمجو نے حقارت و نفرت سے قہقہہ لگایا۔ "خوب، عورت پہ ہاتھ اٹھانا نامردانگی کے خلاف ہے لیکن اپنے دوست کی امانت میں نقب لگانا اور اس کی تذلیل کرنا عین مردانگی ہے۔ نواب صاحب! کان کھول کر سن لیجیے۔ دمجو مصطفٰی خاں کی ہو چکی ہے اب آپ کوئی اور ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ دمجو کے لیے جان دے دینا بہت آسان ہے جیسے آپ کے لیے پان کی گلوری کھا کر تھوک دینا۔ لے جائیے اپنا سوا لاکھ روپیہ۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مصطفٰی خاں نادست بھی ہوں تو ان کی محبت میرے لیے کائنات سے زیادہ قیمتی ہے اور یہ بھی سن لیجیے۔ اگر میں آج اشارہ کر دوں تو وہ



کرنے لگے۔

لاہور۔ کیلنڈر سے اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینے خارج کر دیے جائیں تو واللہ لاہور کا جواب نہیں۔

مری۔ ملکۂ کہسار مری۔ صاحب! جلوہ گری میں کوئٹہ سے کم نہیں مگر وہی نقشہ ہے لے اس قدر آباد نہیں

اور دلّی۔ شہر برا نہیں مگر غلط ملک میں آباد ہے۔

جنیوا۔ صحت گاہِ عالم۔ صاحب! مرنے کے لیے اس سے زیادہ پُرفضا مقام روئے زمین پر نہیں۔

کراچی کے متعلق کیا رائے ہے حضور کی؟

"بہت اچھی۔ اگر آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دیکھیں تو کراچی کی ہر چیز سیدھی نظر آئے گی۔" پھر کوئٹہ کی برتری ثابت کرتے کرتے بے دھیانی میں کہنے لگے۔ "ہائے یہ عظیم شہر اگر کراچی میں ہوتا تو کیا بات تھی۔"

اپنی ریاست کی ریاست میرے قدموں میں ڈھیر کر دیں مگر نہیں۔ مجھے اس سے زیادہ بیش قیمت شے مل چکی ہے۔ وہ شے آپ کے نصیب میں نہیں۔ بہتر جانیے محمد یوسف کشمیری ساده کار کی بیٹی چھوٹی بیگم سے جی بہلائیے۔ اسے آپ نے زر دے کر خریدا تھا، اسی سے لو لگائیے۔ یہاں کوئی امید نہ رکھیے۔ یہاں تو مال بک چکا ہے۔ بازار بند ہو چکا ہے۔"

شمس الدین خاں کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا۔ اتنی توہین وہ بھی ایک بازاری عورت کی زبان سے۔ مرزدی خانم، استاد شجاعت علی خاں اور جنگلو سب پتھر ہو چکے تھے۔ دمجو برابر قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی آواز سارے مکان میں گونج رہی تھی۔ پاس پڑوس کی کھڑکیاں ایک ایک کر کے کھلنے لگی تھیں۔ نیچے گلی میں بھی تماشائی کانا پھوسی کر رہے تھے۔ دفعتاً شمس الدین خاں گرجا۔ "کریم خاں! واصل!" آواز دینے کی دیر تھی۔ تڑنگا، سیاہ فام کریم خاں، ہاتھ میں ننگی تلوار لیے آگیا۔ شمس الدین خاں کا دوسرا جاں نثار خادم واصل بھی اس کے ساتھ تھا۔ شمس الدین نے اشارہ کیا۔ کریم خاں نے لپک کر دمجو کو ایک پھول کی طرح اٹھا کر اپنے کندھے پہ لاد لیا۔ مرزدی خانم اور جنگلو چیخ اٹھیں۔ دمجو نے کریم خاں کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی مگر کہاں وہ دیو اور کہاں ایک نرم و نازک پری۔ مرزدی خانم، استاد شجاعت علی خاں اور جنگلو کو کریم خاں کی ایک ہی ڈپٹ نے پرے ہٹا دیا۔ کریم خاں نے شمس الدین خاں سے پوچھا۔ "سرکار! یہ بوجھ کہاں اتاروں؟"

"چاندنی چوک والے مکان میں اور دیکھو اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔ یہ مال ہم نے پورے سوا لاکھ کے عوض خریدا ہے۔ ارادہ ہے کہ اسے چھوٹی بیگم

کی خدمت میں دے دیں گے، یہ اسی لائق ہے۔"

دمجو نے پوری قوت سے کریم خاں کی کلائی میں دانت گاڑ دیے۔ کریم خاں نے گھبرا کر گرفت ڈھیلی کی۔ دمجو اچھل کر فرش پر گری اور اس سے پہلے کہ کریم خاں یا کوئی اور اس پر ہاتھ ڈالتا، وہ لپک کے کھلی ہوئی کھڑکی سے نیچے کود گئی۔ سردی خانم، اُستاد شجاعت علی خاں اور جنگلو کی بے پناہ چیخوں سے پورا محلہ دہل گیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ شمس الدین خاں صورتِ حال بگڑتی دیکھ کر کوٹھے سے اُترا۔ کریم خاں، انیا میو اور واصل اس کے دائیں بائیں تلواریں، بندوقیں تانے ہوئے ساتھ تھے۔ گلی میں چیخ پکار اور افراتفری مچی ہوئی تھی۔ طوائفیں اور ان کے ہاں بیٹھے ہوئے شوقین سب وہاں جمع تھے۔ شمس الدین کو دیکھتے ہی مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ شمس الدین خاں نے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جانا چاہا مگر اسی وقت شہر کا کوتوال مرزا خانی دس بارہ برق انداز وں کے ساتھ اُدھر آ نکلا۔ فرار کی راہ مسدود ہو گئی۔ شمس الدین اور مرزا خانی میں بہت دوستی تھی۔ اس نے شمس الدین خاں سے پوچھا۔ "نواب صاحب! کیا معاملہ ہے؟" شمس الدین نے جواب دینا چاہا مگر اچانک مجمع سے "قتل قتل" کا شور اٹھا۔ سردی خانم اور جنگلو دھاڑیں مارتی ہوئی آئیں۔ انھوں نے کوتوال کے گھوڑے کی باگیں پکڑ لیں۔ کریم خاں نے فتنہ انگیزی کا ارادہ کیا لیکن شمس الدین خاں نے اسے روک دیا۔

دلّی کا ریزیڈنٹ ولیم فریزر، شمس الدین خاں کے باپ کا گہرا دوست تھا۔ شمس الدین خاں اُسے چچا کہتا تھا۔ اس لیے اُسے اطمینان تھا کہ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کوتوال معاملے کی نزاکت بھانپ گیا تاہم اس نے سپاہیوں سے کہا کہ شمس الدین خاں کو جانے دیا جائے۔ سپاہیوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ دمجو اٹھا کر مکان میں لے جائی جا چکی تھی۔ اس کا بدن خون میں لت پت تھا اور نبض مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ کوتوال کے حکم سے فی الفور حکیم احسن اللہ خاں کو بلایا گیا۔ حکیم احسن اللہ نے آ کر دمجو کی حالت دیکھی تو گھبرا کے کہا۔ "مریضہ کی حالت نازک ہے۔ سر پھٹنے سے خون بڑی مقدار میں ضائع ہو چکا ہے۔ قیاس ہے کہ ایک دو پسلیوں کو بھی ضرر پہنچا ہے۔ بہرحال کوشش کرتے ہیں۔"

سردی خانم بے ہوش ہو گئی تھی۔ سارا محلہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ جس جس کو خبر ملتی بھاگا ہوا آتا۔ دیکھتے دیکھتے برادری کے تمام مرد و زن جمع ہو گئے۔ ہر ایک کی زبان پر شمس الدین خاں کا نام تھا۔ حکیم احسن اللہ کی تمام تدبیریں رائگاں گئیں۔ دمجو کو ہوش نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی پھیل رہی تھی۔ سانس انتہائی سست تھی جیسے وہ بس تھوڑی دیر کی مہمان ہو۔ کوتوال کے بھی ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ شمس الدین خاں سے دوستی نبھائے اور کسی نہ کسی طرح یہ قصہ یہیں رفع دفع کر دے مگر دمجو کی حالت دیکھ کر اُسے مجبوراً ولیم فریزر کے بنگلے جانا پڑا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ ولیم فریزر بے خبر سو رہا تھا۔ کوتوال نے پہرے دار کی خوشامد کر کے بہت مشکل سے فریزر کو جگایا اور ساری داستان سنائی۔ فریزر نے جھلا کر حکم دیا کہ شمس الدین خاں کو گرفتار کر کے ابھی حوالات میں بند کر دو۔ کوتوال کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ ہاتھ باندھ کر بولا۔ "حضور! اس حکم پر غور فرمائیے۔ شمس الدین خاں معمولی آدمی نہیں ہیں۔ دو ریاستوں کے نواب ہیں۔ ان کے والد نواب احمد بخش مرحوم....."

"ہم بولتا ہے، حکم کی تعمیل کی جائے۔" فریزر چلایا۔ "ابھی اسی وقت شمس الدین خاں کو ہمارے سامنے پیش کرو۔ ہم اپنے شہر میں کوئی بدمعاشی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ نواب اپنی ریاست میں جو چاہے کرے، ہمیں کچھ دخل نہیں مگر یہاں اُسے ہمارے قانون پر چلنا مانگتا۔"

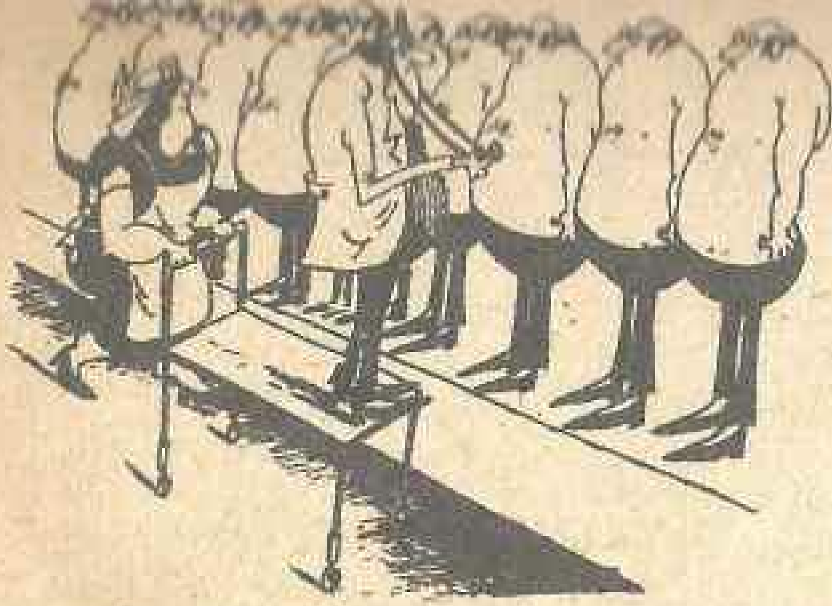
"حضور! کیا نواب کو ہتھکڑی لگائی جائے؟" کوتوال نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

فریزر نے ایک لمحے غور کیا پھر بولا۔ "ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نواب کو بولو، ہم اُسے بلاتا ہے۔ ہاں اگر وہ نہ آئے تو ہتھکڑی لگا کر لانا۔ اب جاؤ، سلام۔"

کوتوال دوکش لے کر سیدھا چاندنی چوک پہنچا۔ شمس الدین محل مکان میں موجود تھا۔ یہ سن کر وہ ہنس دیا کہ اُسے فریزر نے بلایا ہے اور کسی پس و پیش کے بغیر کوتوال کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں فریزر کے بنگلے پہنچ گئے۔ پہرے دار نے اندر اطلاع بھجوائی۔ فریزر ننگے سر ننگے پاؤں باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بوتل تھی اور چہرہ آگ ہو رہا تھا۔ اس نے کوتوال کو جانے کا اشارہ کیا۔ کوتوال چلا گیا۔ فریزر شمس الدین خاں کا جائزہ لے رہا تھا۔ شمس الدین نے کہا۔ "چچا! آپ ہمیں صبح یاد فرما لیتے۔ خود بھی بے آرام ہوئے اور ہمیں بھی بے آرام کیا۔ ہم کہیں بھاگے نہیں جا رہے تھے۔"

"تم بھاگ کر جا کہاں سکتا ہے نواب!" فریزر نے منہ سے جھاگ اڑائے۔ "جو کچھ ہم نے کوتوال سے سنا، وہ بہت افسوس کی بات ہے۔ تمھیں اپنی عزت کا کچھ خیال رکھنا تھا۔ ہم نے تم سے رعایت برتی ورنہ اس وقت لوہے کا زیور تمھارے ہاتھ میں ہوتا پھر کیا آبرو رہ جاتی۔ تم بھول گیا کہ یہ ریاست فیروز پور جھرکہ یا لوہارو نہیں ہے۔ یہ دلّی ہے۔ یہاں ہم رہتا ہے اور یہاں ہمارا قانون چلتا ہے۔ تم نے ہمارا قانون توڑنے کی کوشش کی۔ جانتے ہو، اس کی سزا کیا ہے؟ اگر وہ طوائف مر گیا تو تم پر قتل کا مقدمہ چلے گا۔ تمھاری ریاست جاتی رہے گی اور تم پھانسی کے تختے پر نظر آئے گا۔ بولو، جواب دو۔"

شمس الدین خاں کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ آج اس کے سامنے فریزر کا ایک نیا روپ تھا۔ اُسے اپنے چچا سے ایسے روکھے سلوک کی توقع نہیں تھی۔ فریزر کی بدلی ہوئی نگاہ نے اُسے بتا دیا کہ نواب صاحب پانسا غلط پڑا ہے، بازی ہر گئی ہے، اب بساط الٹنے میں کچھ دیر نہیں ہے۔ موقع ایسا نہیں تھا کہ تیوری پر بل آتا۔ اس نے خاموشی غنیمت جانی۔ خیال ہوا کہ صاحب کو چڑھی ہوئی ہے، نشہ اُترے گا تو حالت اعتدال پر آ جائے گی۔



اُس نے آہستگی سے کہا: ”چچا! ہمیں احساس نہیں تھا کہ معاملہ یہ صورت اختیار کرے گا۔ ہم نے اُس طوائف کی ماں کو سوا لاکھ روپیہ نقد ادا کیا ہے لیکن جہاں گیر آباد کے رئیس مصطفیٰ خاں نے نہ معلوم اُس پر کیا جادو کیا تھا، اُس نے ہماری توہین و تذلیل کی پھر خود رجّو کھڑکی سے کود گئی۔ اب جیسا آپ فرمائیں، ہم کریں گے۔“

فریزر نے بوتل منہ سے لگا کر دو گھونٹ پیے پھر جھومتے ہوئے بولا۔ ”تم سوا لاکھ روپیہ ایک رنڈی پر نچھاور کرتا ہے۔ بہت خوب۔ ریاست کے غریبوں کی کمائی یوں لٹانے کے لیے ہے؟ افسوس تمھارا باپ زندہ ہوتا تو تمھیں ایسا کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ٹھیک ہے، ہم جانتا ہے کہ تم رئیس نواب لوگ رنڈی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا لیکن سوا لاکھ روپیہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتا ہے کہ ریاست میں تمھارے دو چھوٹے بھائیوں کا حصہ بھی ہے۔ تم کس حق کے تحت اُن کی جائداد چاوڑی میں لٹاتا ہے؟ بولو، جواب دو؟“

”بولو، جواب دو“ یہ فریزر کا تکیۂ کلام تھا۔ شمس الدین خاں کو خبر تھی کہ جب فریزر غصے میں ہوتا ہے تو ”بولو، جواب دو“ کی تکرار کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی جواب نہ دے تو اس کا پارہ اور چڑھ جاتا ہے، لہٰذا کچھ نہ کچھ کہنا ضروری تھا مگر فریزر نے وہ بات کہی تھی جو دھری جائے نہ اُٹھائی جائے۔ حقیقت یہی تھی کہ شمس الدین خاں دونوں ریاستوں پر قابض تھا جب کہ باپ کی وصیت کی رُو سے ریاست لوہارو اس کے سوتیلے بھائیوں کو ملنی چاہیے تھی۔ دونوں بھائی بالغ ہونے تک اپنی ریاست طلب نہیں کر سکتے تھے۔ شمس الدین خاں اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر گل چھرّے اُڑانے میں مصروف تھا۔ فریزر گھر کا بھیدی تھا۔ اُس سے شمس الدین خاں کی یہ عیاشیاں چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ گھر کا بھیدی ہونے کے علاوہ وہ اپنے بھتیجے کی ناؤ نوش کی محفلوں میں بھی ایک بے تکلف دوست کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔ اس بنا پر شمس الدین خاں کو اطمینان تھا کہ ”سیاں بھئے کوتوال، مجھے ڈر کاہے کا“۔ جب سے فریزر دلّی کا ریزیڈنٹ بن کر آیا تھا، شمس الدین خاں اور کھل کھیلنے لگا تھا۔ فریزر اس کی حرکتوں سے چشم پوشی کرتا تھا لیکن ”رجّو کا معاملہ اور سوا لاکھ کا چرچا دلّی میں بچے بچے کی زبان پر پھیلنے والا واقعہ تھا، اسے دبانا اور کلکتے کے حکام کو مطمئن کرنا فریزر کے لیے مشکل تھا۔ شمس الدین خاں گردن جھکائے کھڑا تھا۔ دفعتاً فریزر کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ اُسے کچھ یاد آگیا۔ اُس نے شراب کی بوتل ایک طرف پھینک دی اور آگے بڑھ کر شمس الدین خاں کے شانے پر ہاتھ رکھا: ”دیکھو شمس الدین خاں! ہم تمھارا دشمن نہیں، دوست ہے۔ ہم نہیں چاہتا کہ تم کسی آفت میں پھنس جائے۔ اب تم دلّی میں مت رکو، فوراً اپنی ریاست کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ ہم صبح چاوڑی خود جائے گا اور اس طوائف کے رشتے داروں کو سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کرا دے گا لیکن آیندہ تم ہم سے پوچھے بغیر دلّی نہیں آئے گا۔ ہم کوشش کرے گا کہ بات سوا لاکھ روپے ہی پر ٹل جائے اور تمھاری عزت بنی رہے۔ عزت کے سامنے روپیہ کچھ نہیں ہوتا، ٹھیک؟“

شمس الدین خاں نے ممنون نگاہوں سے فریزر کو دیکھا: ”ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔“

”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔“ فریزر نے ہنس کر کہا۔ ”اطمینان رکھو، جب تک ہم زندہ ہے، کوئی تمھارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہاں تمھیں ہمارے اس احسان کا بدلہ چکانا ہوگا۔ چکاؤ گے؟“

شمس الدین خاں نے خیال کیا کہ شاید فریزر اپنی عیاشی کے لیے کچھ طلب کرے گا۔ عورتیں فریزر کی بہت بڑی کمزوری تھیں چنانچہ شمس الدین خاں نے وعدہ کرلیا۔



شیفتہ کی ماں بیمار تھیں۔ اُسے ان کی عیادت کے لیے اکیلا ہی جہاں گیر آباد جانا پڑا تھا۔ جاتے ہوئے وہ عباس علی خاں بے تاب سے کہہ گیا تھا کہ رجّو کو خبر کر دینا، آج ہم نہیں آسکیں گے۔ وہ انتظار نہ کریں لیکن عباس اپنے مشاغل میں گم ہوگیا۔ اُسے پیغام پہنچانا یاد نہ رہا۔ جہاں گیر آباد پہنچ کر شیفتہ کو معلوم ہوا کہ والدہ کی طبیعت بہتر ہے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا، بستر پر لیٹتے ہی غافل ہوگیا۔ رات گئے اچانک آنکھ کھل گئی۔ اُس کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اُس نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ خواب میں وہ اور رجّو اگر سین کی باؤلی کے قریب کھڑے تھے۔ نہایت مہیب منظر تھا۔ ہر طرف تاریکی چھا رہی تھی۔ یکایک رجّو کا پاؤں پھسلا اور وہ گہری باؤلی میں جا گری۔ شیفتہ نے اُسے بچانے کے لیے باؤلی میں کودنا چاہا لیکن کسی نامعلوم ہستی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رجّو ڈوبتے ہوئے چلائی: ”شیفتہ! شیفتہ! مجھے بچائیے، شیفتہ! مجھے بچائیے۔“ لیکن شیفتہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔ چند لمحوں بعد رجّو کی چیخیں مدھم پڑ گئیں۔ یہ خواب دیکھ کے شیفتہ بے چین ہوگیا۔ طرح طرح کے پریشان کن خیال دل میں آنے لگے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے اُٹھ کے منہ ہاتھ دھویا،

کچھ دیر چہل قدمی کی پھر ماں کے پاس گیا۔ وہ جاگ رہی تھیں اور ہشاش بشاش تھیں۔ شیفتہ نے ماں کے قدموں کو بوسہ دیا اور ناشتہ کیے بغیر اصطبل سے ایک تازہ دم گھوڑا لیا اور پوری رفتار سے دلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ جوں جوں وہ دلی کے نزدیک پہنچا، اس کی بے قراری بڑھتی گئی۔ وہ حیران تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اسے گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ گھوڑے کو پر لگ گئے تھے۔

وہ دن چڑھے شہر میں داخل ہوا۔ کاروباری سرگرمی اور چہل پہل معمول کے مطابق تھی۔ کوئی خاص بات دکھائی نہ دی۔ بازار میں تین چار جاننے والے ملے۔ انھوں نے مسکرا کر سلام کیا اور نکل گئے۔ شیفتہ کو ان کے مسکرانے پر تعجب ہوا مگر وہ رکا نہیں۔ وہ سیدھا رجو کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ بلاکشانِ محبت پہلے کوئے یار میں حاضری دیتے ہیں، اس کے بعد کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہیں ؎

علی الصّباح چو مردم بہ کاروبار روند
بلاکشانِ محبت بہ کوئے یار روند

شیفتہ ایک چوراہے پر پہنچا۔ یہاں سے ایک راستہ مٹیا محل کو، دوسرا چاوڑی کے عقب میں تلی ماراں کے قریب نکلتا تھا۔ عجب کشمکش تھی۔ یکایک اس نے سامنے سے عباس علی کو آتے ہوئے دیکھا۔ شیفتہ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ اس وقت اس علاقے میں عباس کا کیا کام؟ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی قیامت گزر چکی ہے۔ شیفتہ ایک دم گھوڑے سے اترا۔
"عباس! عباس! خیر تو ہے؟ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"
عباس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ اس نے بڑی مشکل سے آنسو پینے کی کوشش کی پھر بھرائی ہوئی آواز میں ساری بات بتا دی۔ شیفتہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ رجو چلی گئی؟ زندگی کی سحر اتنی جلد شام میں بدل گئی؟ اب رات کا مہیب، کبھی نہ ختم ہونے والا سنّاٹا ہے، تنہائی ہے اور نامرادیوں کے طویل سائے ہیں۔ عباس نے اداسی سے کہا: "شیفتہ! جو قسمت کو منظور ہے وہی ہوگا۔ آؤ، ایک نظر اسے دیکھ آئیں۔"

گلی میں سنّاٹا تھا۔ بالاخانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ سرودی خانم کے مکان کے باہر ایک چارپائی پر مرزا خانی کوتوال گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ تین چار سپاہی لٹھ لیے کھڑے تھے۔ شیفتہ کو دیکھ کر مرزا خانی اٹھا۔ "اچھا ہوا آپ آ گئے۔ شاید اب اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔"
شیفتہ کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ اندر سے سرودی خانم اور جھنگو کے رونے، بین کرنے کی آوازیں کان میں آئیں۔ شیفتہ اپنے آپ کو سنبھال کے مکان میں داخل ہوا۔ سامنے ہی دالان میں سرودی خانم پچھاڑیں کھا رہی تھی: "ہائے، میں نے لالچ میں آ کر اپنی معصوم بچی کو مار دیا۔ میں اس کی قاتلہ ہوں۔ لوگو! مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔ میں گنہ گار ہوں۔ میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ارے میں خالی رہ گئی۔ یہ منحوس دن بھی دیکھنا تھا۔" شیفتہ کو دیکھ کے سرودی خانم لپک کے آئی اور اس سے چمٹ کے بری طرح رونے لگی۔ شیفتہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ سرودی خانم کو دلاسا دے کے وہ اس کے ساتھ برسوں کے بیمار کی طرح سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ وہی کمرہ تھا، اس کی پہلی اور آخری محبت نے اسی جگہ جلوہ آرائیاں کی تھیں۔ کمرے کے ایک گوشے میں سرخ چادر اوڑھے کوئی سو رہا تھا۔ شیفتہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے چادر کا کونا اٹھایا اور رجو کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید تھا۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور سانس کے زیر و بم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بظاہر وہ ایک لاش تھی۔ شیفتہ کی آنکھوں سے دو قطرے ڈھلک کر اس کے چہرے پر گرے۔ اسی کا شعر ہے۔ ؎

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

بالیں پر بیٹھ کر اس نے رجو کا بے جان ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نبض ٹٹولنا چاہا مگر نبض کی حرکت نہ ملی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ یکایک رجو نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ دو اشکوں نے بہت جلد اثر دکھایا تھا۔ شیفتہ نے جھک کر دوسرا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ "رجو! رجو! دیکھو ہم آ گئے ہیں۔ ہمیں دیکھو۔"
دو بڑی بڑی آنکھیں گھوم کر شیفتہ کے چہرے پر جم گئیں۔ ان آنکھوں میں خوشی کی ایک معمولی چمک نمودار ہوئی۔ "آپ آ گئے شیفتہ، اچھا کیا۔ کہاں چلے گئے تھے اپنی رجو کو اکیلی چھوڑ کر؟ اب عہد کیجیے کہیں نہ جائیں گے۔ میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا مگر آج ایک چیز مانگتی ہوں۔ جس طرح بھی ہو سکے وہ چیز لا دیجیے۔ کہیے لا دیں گے؟"
شیفتہ نے کہا: "تم پر ہماری جان بھی فدا ہے رجو! بولو، کیا چاہیے؟"
رجو کی نگاہیں گھوم کر اپنی ماں کے چہرے پر جم گئیں۔ چند لمحے کمرے میں موت کا سکوت طاری رہا۔ پھر اس نے کانپتی ہوئی کمزور آواز میں کہا۔ "آپ اماں جان کو سوا لاکھ روپیہ لا کر دے دیجیے۔ انھیں مجھ سے اور آپ کی آبرو سے زیادہ سوا لاکھ روپیہ عزیز ہے۔" سرودی خانم پچھاڑ کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔
شیفتہ نے رجو کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ شہر اور بیرونِ شہر کے نامی اطبا، وید اور انگریز ڈاکٹر بھی آئے لیکن رجو کی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شمع اب بجھنے والی ہے۔ شیفتہ کا تمام وقت رجو کے سرہانے کٹتا تھا۔ کھانا پینا، ملنا جلنا سب کچھ فراموش ہو چکا تھا۔ رجو کی محبت پہلے بھی اس کے رگ و پے میں زندگی بن کر دوڑ رہی تھی لیکن اب اس کے بے پناہ ایثار نے شیفتہ کو

عشق اور جنون کی منزل میں داخل کر دیا تھا۔ خاندانی زیور اور زر و جواہر بیچ
کر اس نے اگلے ہی دن سوا لاکھ روپیہ سروری خانم کے قدموں میں رکھ
دیا تھا لیکن سروری خانم اب تمام نائکاپن بھول چکی تھی۔ اس کی جان رجو
میں اٹکی ہوئی تھی۔ اب وہ دن بھر مصلے پر بیٹھی رو رو کر دعائیں مانگتی یا
فقیروں اور محتاجوں میں خیرات تقسیم کرتی رہتی۔ اسے کھانے پینے، پہننے
اوڑھنے کا ہوش بھی نہ تھا۔ یہی حال رجو کی چھوٹی بہن جگنو کا تھا۔ وہ
دن بھر چھپ چھپ کے آنسو بہاتی۔ استاد شجاعت علی خاں کی کمر اس غم نے دہری
کر دی تھی۔ وہ ہر وقت ڈیوڑھی میں بچھی ہوئی چارپائی پر بے سدھ پڑے
رہتے۔ کوئی نوکر حقہ لا کر رکھ دیتا تو گڑگڑا لیتے، کوئی کھانا کھلا دیتا تو کھا
لیتے ورنہ چپ رہتے۔ شیفتہ رجو کے پلنگ کی پٹی سے لگا اس کی
صورت تکتا رہتا۔ طبیبوں اور ویدوں سے مایوس ہو کر وہ پیروں، فقیروں اور
مشائخ کی طرف متوجہ ہوا مگر وہاں کیا دھرا تھا۔ کسی عمل، کسی توجہ، کسی تعویذ،
کسی دعا سے روٹھی ہوئی زندگی واپس نہیں آئی۔ مایوسی کی انتہا ہو گئی۔ اسے
اپنی زندگی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ اس کا دل مضبوط تھا۔ ایسا دل کہ شب
کو موم اور سحر کو آہن بنا لینا آسان تھا لیکن رجو کی حالت نے اسے تیشے کے
مانند چور چور کر دیا تھا۔ بہار جا چکی تھی۔ خزاں کا دور دورہ تھا۔ جدھر نظر جاتی
دھول اڑتی دکھائی دیتی۔ چوبیس گھنٹوں میں بمشکل ایک آدھ بار کروٹ
بدلتی ورنہ ہمہ وقت اس پر غشی طاری رہتی۔ اس کی آواز بے حد نحیف ہو
گئی تھی۔ کچھ سننے کے لیے کان اس کے لبوں کے قریب لے جانا ضروری تھا۔
اس کے ہاتھ پاؤں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے لیکن چہرہ حیرت انگیز طور پر
روشن اور تر و تازہ تھا۔ بڑی مشکل سے پھلوں کا عرق حلق میں ٹپکایا جاتا۔ کبھی
کبھی وہ بھی قے کے ذریعے نکل جاتا۔ کوئی دوا کارگر نہ ہوتی تھی۔ حکیم احسن اللہ
خاں نے آخری مرتبہ آ کر دیکھا تو علیحدگی میں شیفتہ سے کہا "مریضہ کا بچنا
مشکل ہے۔ دق کا آخری درجہ بھی آخری درجے میں پہنچ چکا ہے۔"

اس رات زمین سے آسمان تک بھیانک سکوت چھایا ہوا تھا۔
پچھلے پہر یکایک شیفتہ غنودگی سے چونکا۔ رجو کی سانس زور زور سے چل
رہی تھی۔ شیفتہ نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ رجو نے آہستہ آہستہ
آنکھیں کھولیں۔ ایک ناقابلِ فراموش، دل ٹکڑے کر دینے والی مسکراہٹ
اس کے خشک لبوں پر نمودار ہوئی۔ شیفتہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
لے لیا۔ "رجو! اب کیا حال ہے؟ سو جاؤ۔ کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟"

رجو نے والہانہ انداز سے شیفتہ کی طرف دیکھا اور رواں لہجے
میں بولی۔ "شیفتہ! اس کا حال کیا پوچھتے ہو جس کی امید رخصت ہو چکی ہے
مگر محبت کا نشہ باقی ہے۔ میں گردِ کارواں ہوں، میرے منہ پر خاک اڑتی
دکھائی نہیں دیتی؟ لٹتے ہوئے عیش کی تصویر ایسی ہی ہوتی ہے۔ کیا زمانہ
تھا، میری زلفیں آپ کے شانوں پر بکھری رہتی تھیں لیکن اب یہی زلفیں
بلائے جاں ہیں۔ میری تمنا ہے کہ جب دم نکلے تو آپ اسی طرح میرے
بالیں پر ہوں اور میں آپ کو دیکھتی رہوں۔ اسی حالت میں آنکھیں بند
ہو جائیں۔ اس طرح جان نکلے گی نہیں بلکہ جان آ جائے گی اور پھر آپ مجھ
سے پوچھیں گے کہ رجو! زندگی کا کچھ لطف آیا؟" شیفتہ کا دل دھڑ دھڑ کرنے
لگا۔ اس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ سروری خانم کچھ فاصلے پر سو رہی تھی۔
جگنو پچھلی منزل پر تھی، وہ بھی سو رہی ہوگی۔ دفعتاً رجو کے بدن میں تھرتھری
چھوٹی۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے شیفتہ کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا
جیسے اس کے شانے کا سہارا لینا چاہتی ہو پھر ڈوبتی آواز میں بولی "شیفتہ!
میں رخصت ہو رہی ہوں۔ میرے سب قصور معاف کر دیجیے گا اور دیکھیے،
میری اماں اور بہن کا خیال رکھیے گا، اب آپ کے سوا دنیا میں ان کا کوئی
نہیں ہے۔"

رجو کا ہاتھ بری طرح کپکپانے لگا۔ سانس ایک مرتبہ زور زور سے
چلی پھر آنکھیں چڑھ گئیں اور ناک کا بانسا پھر گیا۔ شیفتہ کی چیخ آنسوؤں
میں ڈوب گئی۔

٥ شمس الدین خاں کو رجو کے معاملے میں ولیم فریزر سے بہت مایوسی
ہوئی۔ فریزر نے دیرینہ مراسم کا خیال بھی نہیں کیا۔ شمس الدین خاں کے دل
میں اس کے خلاف گرہ بیٹھ گئی۔ تاہم کچھ عرصے بعد جب فریزر فیروز پور
جھرکہ آیا تو نواب نے روایتی انداز میں معمول کے مطابق اس کے لیے
ناؤ نوش کی محفلیں برپا کیں۔ فریزر کوئی پہلی مرتبہ نہیں آیا تھا۔ نواب شمس الدین
خاں اور اس کے بھائی فریزر کو چچا کہتے تھے لیکن اسی چچا نے اس رات
شمس الدین خاں کی جوان بہن جہاں گیرہ بیگم کے ساتھ کیا کیا۔ سنیے۔ جہاں گیرہ بیگم
غیر معمولی حسین و جمیل تھی اور اپنے بھائیوں کی طرح فریزر کو چچا کہتی تھی۔ فریزر
اور جہاں گیرہ بیگم کی عمروں میں خاصا فرق تھا۔ فریزر ادھیڑ عمر کی سرحد سے
نکل کر بڑھاپے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، جہاں گیرہ بیگم نوجوانی سے جوانی کی
جانب لپک رہی تھی۔ شمس الدین خاں کے گھرانے میں سخت پردہ ہوتا تھا۔
عورتیں نامحرموں کے سامنے نہیں آتی تھیں لیکن ولیم فریزر ایک تو بڑا افسر
تھا، دوسرے نواب احمد بخش سے اس کے دوستانہ مراسم تھے۔ احمد بخش کی
موت کے بعد وہ شمس الدین کے ساتھ شراب کی محفلوں میں شریک ہونے لگا۔
اس رات فیروز پور جھرکہ میں ایسی ہی محفل جمی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے رات
بھیگتی گئی، فریزر کا نشہ بڑھتا گیا۔ ہم پیالہ اور ہم نوالہ ایک ایک کر کے رخصت
ہو گئے۔ آخر میں صرف میزبان اور مہمان رہ گئے۔ شمس الدین خاں نے دیکھا
کہ فریزر صاحب بالکل بے قابو ہو چکے ہیں۔ اس نے انھیں آرام کرنے کا
مشورہ دیا اور خود زنانے حصے میں چلا گیا۔ فریزر تنہا رہ گیا۔ یکایک اسے
جہاں گیرہ بیگم کا خیال آیا۔ زنانہ محل سرا کی جانب خاموشی طاری تھی۔ وہ اپنے

کمرے سے نکلا اور لڑکھڑاتا ہوا محل سرا کی طرف بڑھا۔ دو ایک پہرے داروں نے اُسے اُدھر جاتے دیکھا تو ڈرتے ڈرتے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک ہی گھُرکی نے انھیں پرے ہٹا دیا۔ فریزر کو محل سرا کے اندر گھسنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بائیں ہاتھ کو پہلا ہی کمرہ جہاں گیرو کا تھا۔ وہ بے خبر اپنی مسہری پر سو رہی تھی۔ ایک لونڈی پائنتی اپنا پلنگ بچھائے پڑی تھی۔ فریزر کھُلے دروازے سے ایکدم اندر داخل ہو گیا۔ شمع کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ فریزر کی آہٹ سے لونڈی کی آنکھ کھلی۔ اُس نے نہ جانے فریزر کو بھوت سمجھا یا پریت، ایک ہولناک چیخ ماری اور دروازے سے نکل بھاگی۔ لونڈی کی چیخ سے جہاں گیرو کی آنکھ بھی کھل گئی۔ فریزر اُس کی مسہری کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ خوف سے جہاں گیرو کی گھگھی بندھ گئی۔ "چچا فریزر! آپ؟" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"آج ہم یہاں سوئے گا، تمھارے کمرے میں تمھارے ساتھ۔" فریزر نے لڑکھڑا کے کہا۔

لیکن اُسے مزید کچھ کہنے کی مہلت نہیں ملی۔ دفعتہً ایک زوردار ہاتھ اس کی گدّی پر پڑا۔ فریزر نے مڑ کر دیکھا، شمس الدین خاں شعلۂ جوّالہ بنا ہوا تھا۔ فریزر پہلے تو ذرا جھجکا، پھر ناراض ہو کر بولا "تم سخت گستاخ آدمی ہے۔ ہم اِس بدتمیزی کا مزا چکھائے گا۔" اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تمنچہ نکال لیا۔ شمس الدین خاں نے اُس کے منہ پہ گھونسا مارا۔ فریزر الٹ کر گرا۔ اُس کی ناک سے خون کا فوّارہ اُبل پڑا۔ حویلی میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ نوکر چاکر، غلام، خدمت گار، سپاہی سب اپنے اپنے ہتھیار لے کر آ گئے۔ اُن کا سرغنہ کریم خاں آگے آگے تھا۔ اُس نے آتے ہی تلوار سے فریزر کا کام تمام کرنا چاہا لیکن شمس الدین کی ماں نے اپنی قسم دے کر اُسے روکا۔ شمس الدین خاں غیظ و غضب کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا تھا۔ فریزر کا نشہ ہرن ہو گیا مگر اُس نے اوٹ پٹانگ اُردو اور انگریزی میں ایسے کلمات کہے جیسے وہ اپنے آپے میں نہ ہو۔ اسی طریقے سے جان بچ سکتی تھی۔ بےشک فریزر نے رجو کے معاملے میں شمس الدین خاں کی مدد کر کے ایک بڑا احسان کیا تھا لیکن احسان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شمس الدین خاں اُسے اپنی بہن پہ ہاتھ ڈالنے کی چھوٹ دے دیتا۔ شمس الدین خاں کی غیرت و حمیت کے لیے یہ بڑا تازیانہ تھا۔ اس نے للکار کر کریم خاں سے کہا "اس مردود کو ابھی میرے سامنے جہنم واصل کر دو ورنہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔"

کریم خاں نے دوبارہ تلوار بلند کی اور فریزر کی طرف بڑھا۔ فریزر دہشت کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ شمس الدین کی بوڑھی ماں فریزر کی حیثیت اور مرتبے سے خوب آگاہ تھی۔ اُسے خوف تھا کہ اگر یہ شمس الدین یا کریم خاں کے ہاتھوں اِس حویلی میں قتل ہو گیا تو انگریز حکمراں حویلی پر ہل چلوا دیں گے اور ایک ایک بچے کو کولھو میں پلوائیں گے۔ اُس نے لپک کر اپنا دوپٹا سر سے اُتارا اور شمس الدین خاں کے پیروں پہ ڈال دیا۔ "بیٹا یہ کیا کر رہے ہو؟ انھیں صحیح سلامت نکل جانے دو۔ آیندہ یہاں مت آنے دینا۔ ایک مرتبہ میرے کہنے سے ان کی جان بخش دو۔ اگر فریزر صاحب مارے گئے تو یہاں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ انگریز پورے خاندان کو چُن چُن کر قتل کر دیں گے۔"

بات شمس الدین خاں کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے ماں کا دوپٹا اُٹھا کر اُس کے سر پر رکھا اور فریزر کو قتل کرنے سے باز آ گیا۔

فریزر بڑی مشکل سے جان بچا کے فیروز پور جھرکہ سے نکل بھاگا اور دلی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دلی پہنچتے ہی اُس نے شمس الدین خاں کے سوتیلے بھائیوں امین الدین اور ضیاء الدین کو اُکسایا کہ تمھارا سوتیلا بڑا بھائی دونوں ریاستوں پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ تم اگر اپنے حق کا مطالبہ کرو تو میں تمھارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ اس وقت موقع اچھا ہے، کلکتے کا گورنر جنرل سر چارلس مٹکاف میرا دوست ہے۔ وہاں اپیل کرو۔ میں سفارشی خط لیے دیتا ہوں۔ کام بن جائے گا۔ اتفاق سے یہ گفتگو خنجر بیگ نامی ایک شخص نے سن لی۔ اس شخص کو شمس الدین خاں نے اپنے بھائی کے ہاں اسی مقصد کے لیے رکھوایا تھا کہ وہ کن سوئیاں لیتا رہے۔ خنجر بیگ نے اس پخت و پز کی خبر فوراً شمس الدین خاں کو پہنچا دی۔

شمس الدین کا سوتیلا بھائی امین الدین کلکتے پہنچا۔ اُس نے معاملات حکّام بالا کے گوش گزار کر دیے۔ فریزر نے سر چارلس مٹکاف کے نام ایک خط بھی اُسے دیا تھا۔ نتیجتہً فیصلہ امین الدین خاں کے حق میں ہو گیا۔ حکم دیا گیا کہ ریاست لوہارو شمس الدین خاں سے لے کر اُس کے چھوٹے بھائیوں کو دے دی جائے۔

اس فیصلے کی خبر شمس الدین خاں تک پہنچی۔ وہ اپنے مصاحبوں سمیت دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ اُس نے ایک دم کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اُس کا چہرہ آگ ہو گیا۔ وہ اُٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ ایک مصاحب نے کہا "حضور! اُس مردود بندر کی اولاد فریزر نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے۔ کسی کی آبرو اُس کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے۔ اُسے کُتّے کی موت نہ مارا تو کچھ نہ کیا۔"

دوسرے نے لقمہ دیا: "اُسے مارنا کیا مشکل ہے۔ نواب صاحب کا اشارہ چاہیے، منٹوں میں چٹ پٹ کیا جا سکتا ہے۔" شمس الدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کریم خاں رسیلے نے کہا "حضور! کس سوچ میں ہیں؟ کھانا کیوں ٹھنڈا کر رہے ہیں؟ ہم جاں نثاروں کے ہوتے ہوئے آپ کو کس بات کا غم ہے؟ اگر دشمن سے آزار پہنچا ہے تو یہ خادم اُس کا خاتمہ کر دے گا۔"

شمس الدین خاں نے گھور کر کریم خاں کو دیکھا "تم لوگ بہت یُوں ہی باتیں بناتے ہیں۔"

کریم خان کا سیاہ رنگ مزید سیاہ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ "نواب صاحب! میں پٹھان ہوں، میرے ساتھ دوسروں کی طرح طعن آمیز گفتگو نہ کیجیے۔"

شمس الدین خان ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ "بہتر ہے۔ ابھی تمھاری جاں نثاری کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جاؤ اور دہلی پہنچ کر فریزر کو جہنم رسید کر دو۔ اپنے ساتھ انیا میو اور واصل کو بھی لے جاؤ۔" کریم خان آداب بجا کر رخصت ہو گیا۔ اُس نے اُسی وقت تیز رفتار سانڈنیاں تیار کیں، انیا میو اور واصل کو ہمراہ لیا اور دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

دہلی پہنچ کر تین ماہ تک تینوں فریزر کی تاک میں لگے رہے کہ جیسے ہی موقع پائیں اُسے موت کے گھاٹ اتار دیں مگر کوئی موقع نہیں ملا۔ آخر تھک کر واپس چلے آئے۔ شمس الدین اس ناکامی پر بہت خفا ہوا۔ اس نے کریم خان کو بہت لتاڑا۔ "اب کہاں گئی تمھاری وہ جاں نثاری؟ پٹھانیت کے دعوے کیا ہوئے؟ جاؤ، اپنا منہ کالا کرو اور دوبارہ مجھے صورت نہ دکھانا۔ اپنے آپ کو پٹھان کہنا بھی چھوڑ دو، تم زنخے ہو۔ فریزر کو مارنے میں خود جاتا ہوں۔"

کریم خان نے جھک کر اُس کے پیر پکڑ لیے۔ "حضور! ایک موقع اور دے دیجیے۔ خدا نے چاہا تو کامیاب ہو جاؤں گا۔"

کریم خان انیا میو کو ساتھ لے کر دوبارہ دہلی روانہ ہوا۔ وہ گھوڑے پر اور انیا میو سانڈنی پر سوار تھا۔ دہلی میں کریم خان نے ایک بندوق لے کر اُس کی نال چھوٹی کرائی تاکہ بندوق آسانی سے چھپائی جا سکے۔ یہ دونوں مزید دو ماہ تک فریزر کے تعاقب میں رہے لیکن وہ بھی حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ اُسے دراصل شمس الدین خان کے چچازاد بھائی فتح اللہ بیگ نے خبردار کر دیا تھا کہ نواب تمھارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے، اُس کے آدمی تمھارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ فتح اللہ بیگ اور شمس الدین خان میں ایک معمولی بات پر مذاق مذاق میں عداوت ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں رہتے تھے۔

ایک شب فریزر راجا بلب گڑھ کی دعوتِ ناؤ نوش سے واپس آ رہا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں دُھت گھوڑے پر سوار تھا۔ رات اندھیری تھی اور چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ دو سوار دلی کے قریب باؤلے کے پیڑ دختوں کی آڑ میں کھڑے تھے۔ دفعتاً وہ جھنڈ سے نکل کر فریزر کے سامنے آ گئے۔ انھیں دیکھ کر فریزر کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ کمر میں بندھا ہوا تمنچا نکال کر فائر کرنا چاہتا تھا مگر انیا میو نے فوراً ایک بھالا تُلا ہاتھ مارا۔ فریزر گھوڑے سے تیورا کر گرا۔ خون کے فوارے بہہ گئے، تمام زمین لہولہان ہو گئی۔ کریم خان نے اُسے تڑپتا دیکھ کر بندوق نکالی اور گولی مار دی۔ جلد ہی فریزر کی لاش ٹھنڈی پڑ گئی۔ کریم خان اور انیا میو بھاگے۔ انیا میو فیروز پور جھرکہ کا رُخ کیا اور کریم خان دلی کی طرف آیا۔ شہر کے تمام دروازے بند تھے۔ وہ رات بھر ادھر اُدھر پھرتا رہا اور علی الصبح




وجودِ زن سے

منیبہ توصیف ہاشمی کی خوش طبعی

1. خوشبوؤں کی دکان پر کسی خاتون نے ایک خوشبو لگانے کے بعد سیلز گرل سے پوچھا: "کیا اس کی بدولت شوہر اپنے اخبار سے توجہ کم کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے؟"
2. لڑکی سہیلی کو اپنی شکل بتا رہی تھی: "دراصل وہ مجھے تنہا پسند کرتا ہے، ہمیشہ کے لیے تنہا۔"
3. محبوب سے ناراض ہو کر جاتی ہوئی لڑکی غصے میں بولی: "اب اگر تمھیں میری شکل کبھی دکھائی نہ دے تو پھر مجھ سے اس کی وجہ مت پوچھنا۔"
4. ایک خاتون انکم ٹیکس کے دفتر میں احتجاج کر رہی تھیں: "جناب! آپ کم سے کم اُس کثیر دولت پر تو ٹیکس نہ لگائیے جو میں خرچ کر چکی ہوں۔"

دلّی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وہ سیدھا دریا گنج میں شمس الدین خان کی کوٹھی پر آیا۔ اس دوران دونوں کا قیام اسی کوٹھی میں تھا۔ کریم خان نے گھوڑا اصطبل میں باندھا اور ستانے کے لیے چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر سونے کے بعد وہ یکایک اٹھا۔ شمس الدین خان کی طرف سے آئے ہوئے تمام خطوط اُس نے جلا ڈالے اور جلے ہوئے پرزے پانی کے حوض میں پھینک دیے۔

انیا میو اُس رات نوے میل کا فاصلہ طے کر کے فیروز پور جھرکہ پہنچا۔ اُس نے شمس الدین خان کو فریزر کے قتل کی اطلاع دی۔ شمس الدین خان [illegible] خوشی سے [illegible] انیا میو کو گلے لگا لیا: "تم واقعی جاں نثار ہو [illegible] اب جاؤ آرام کرو۔"

انیا میو شمس الدین خان [illegible] رشتے دار نے شمس الدین خان کو مشورہ دیا کہ [illegible] نیچ ذات کا آدمی ہے۔ ایسا نہ ہو کل کلاں کسی کے سامنے [illegible] اس کا زندہ رہنا احتیاط کے خلاف ہے۔" شمس الدین خان [illegible]

انیا میو نے یہ بات باہر سے سن لی۔ اتنے میں نواب نے پکار کر [illegible] ابھی باہر نکلا ہے۔ اُس سے کہو ذرا میری ایک بات سن جائے۔"

انیا میو نے حاضر ہونے سے کام [illegible] کر بلند آواز میں جواب دیا: "حضور! ابھی آتا ہوں۔ ذرا اونٹنی باندھ آؤں۔"

اونٹنی باندھنے کے بجائے وہ اُس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا اور برق رفتاری کے ساتھ فیروز پور جھرکہ سے نکل کر اپنے گھر پہنچا۔ پھر وہاں سے مختلف مقامات پر چھپتا چھپاتا، جان بچاتا پھرتا رہا۔ اس کے بعد بریلی چلا گیا۔

فریزر کی لاش دستیاب ہوتے ہی شہر کے دروازے بند کر دیے گئے۔ قاتل کی تلاش شروع ہوئی۔ فریزر کی لاش لا کر قلعۂ معلّیٰ کے دیوان خانے میں رکھی گئی۔ شہر کے رئیس، امیر اور حکام وہاں پہنچے۔ اُن میں فتح اللہ بیگ

بھی تھا۔ فریزر کی لاش دیکھتے ہی وہ اُس پر گرا اور بے اختیار چیخ پڑا۔ "ہائے ہائے شمس الدین خاں نے نہ چھوڑا۔ میں پہلے ہی کہتا تھا کہ کریم خاں آپ کو مارنے کے لیے فیروز پور سے آیا ہوا ہے۔ آپ اکیلے دکیلے نہ پھریں لیکن آپ نے میری بات نہ مانی۔ آخر اپنی جان دی۔"

جان لارنس نے یہ بات سُن لی۔ یہ اُس زمانے میں پانی پت کا مجسٹریٹ تھا۔ فریزر سے اس کی گہری دوستی تھی۔ دوست کے قتل کی خبر ملتے ہی وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دلی پہنچنے والا پہلا انگریز تھا۔ اُس کے علاوہ فریزر کا حقیقی بھائی سیمن فریزر اور ٹامس مٹکاف دونوں بڑے افسر بھی وہاں موجود تھے۔ لارنس اُن دونوں کو ساتھ لے کے شمس الدین خاں کے چاندنی چوک والے مکان پہنچا۔ شمس الدین خاں جب بھی دلی آتا، اسی مکان میں ٹھہرتا۔ انگریز پہنچے تو ایک قوی ہیکل سیاہ فام روہیلہ دروازے پر کھڑا تھا۔ لارنس نے کڑک کر پوچھا "تو کون ہے؟"

اُس نے بے خوفی سے جواب دیا۔ "سپاہی ہوں۔"

"کیا نام ہے؟"

"کریم خاں۔"

"دلی کب آیا؟"

"کوئی دس دن ہوئے۔"

"کیوں آیا تھا؟"

"نواب صاحب نے ایک ضروری کام سے بھیجا تھا۔"

کریم خاں نے ہر سوال کا جواب دلیری اور اطمینان سے دیا۔ لارنس، مٹکاف اور سیمن کے دلوں سے شک دُور ہو گیا۔ وہ واپس جانے کا ارادہ کرنے لگے۔ اتنے میں ایک انگریز سپاہی چند دیسی آدمیوں اور ایک سقّے کو اپنے ساتھ لیے ہوئے وہاں آیا۔ سپاہی کے ہاتھ میں کریم خاں کی بندوق تھی۔ یہ بندوق کریم خاں ایک کنویں میں پھینک آیا تھا۔ بعد میں کنویں سے پانی نکالتے ہوئے کسی شخص کا لوٹا گر گیا۔ اُس نے سقّوں سے کہہ کر لوٹا نکلوایا۔ لوٹے کے ساتھ بندوق بھی نکل آئی۔ لارنس بندوق کا معائنہ کرنے لگا۔ اسی وقت مکان کے اندر سے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ لارنس اپنے ساتھیوں سمیت مکان میں گھس گیا۔ انھوں نے گھوڑا دیکھا۔ رات بھر کے سفر سے گھوڑے کی حالت خستہ اور ابتر تھی۔ وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ لارنس نے اُس کے سُم دیکھے۔ نعل اُلٹے لگے ہوئے تھے۔ باہر نکل کے اُس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ سپاہیوں نے کریم خاں کی مشکیں باندھ لیں۔ مکان کی تلاشی لی گئی۔ سیمن فریزر کو پانی کے ایک ڈول میں کاغذ کے چند پُرزے ملے۔ اُن کی سیاہی دُھل چکی تھی۔

کیمیاوی اجزا سے حروف روشن ہو گئے۔ پُرزے جوڑے گئے۔ فارسی زبان میں یہ مضمون لکھا تھا: "تم خوب جانتے ہو میں نے تمھیں دہلی کس غرض سے بھیجا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ میرے لیے کُتّے [illegible] ہے۔ اگر اب تک کُتّے نہ خریدے گئے ہوں تو بلا توقف یہ کام انجام دو [illegible] کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کتّوں کی خرید کا مطلب ولیم فریزر کا قتل ہے۔ کریم خاں سے پہلے پوچھ گچھ ہوئی۔ اُس نے جرم کا اقبال نہیں کیا۔ [illegible] اُس پر بے پناہ تشدد کیا گیا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا، وہ گوشت پوست کا نہیں فولاد کا بنا ہوا ہے۔

تنگ آ کر انگریزوں نے انیا میو کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ [illegible] کی جان ضیق میں تھی۔ ایک طرف شمس الدین خاں کے آدمی اُسے ٹھکانے لگانے کی فکر میں تھے۔ دوسری طرف انگریز جاسوس اُس کی تاک میں تھے۔ وہ [illegible] جنگلوں اور پہاڑوں میں بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا رہا۔

انگریزوں کی نظر شمس الدین خاں پر بھی تھی لیکن اُس پر ہاتھ ڈالنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لیے تدبیر و سیاست کی ضرورت تھی۔ انھوں نے تانا بانا بُننا شروع کر دیا۔

ولیم فریزر کا قتل معمولی بات نہیں تھی۔ اُس کے مارے جانے سے بہت سے لوگوں کو خوشی ہوئی تھی اور بہت سے لوگوں کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ فریزر کردار اور عمل کے اعتبار سے اچھا آدمی نہیں تھا۔ اُس کی عیاشی اور بدطینتی کی بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ حکومت کے رعب اور زعم میں وہ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے میں ہچکچاہٹ یا حیا محسوس نہیں کرتا تھا، خصوصاً جب اُس پر شراب اثر کرتی تو اپنے بیگانے کو بھی بھول جاتا لیکن وہ ایک بہت بڑا انگریز افسر تھا اور انگریزوں کے لیے یہ سانحہ بھول جانا آسان نہیں تھا۔

کریم خاں کی گرفتاری کے بعد عام طور پر یہ شبہ قوی ہو گیا کہ فریزر کے قتل میں شمس الدین خاں کا ہاتھ تھا چنانچہ مٹکاف، سیمن فریزر اور لارنس نے کلکتے کے حکام سے اجازت لے کر شمس الدین خاں کو فیروز پور جھرکہ پیغام بھجوایا کہ "دہلی تشریف لائیے۔ اِس مقدمے کے سلسلے میں محض چند امور دریافت طلب ہیں۔" شمس الدین خاں دہلی جانے کے لیے تیار ہوا۔ تمام خاندان نے کہا کہ "یہ آپ کیا غضب کرتے ہیں! شیر کی کچھار میں منہ ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے۔"

شمس الدین خاں نے کان نہ دھرا۔ "مجھے دھر لینا مذاق نہیں ہے۔ ابھی دلی کے بادشاہ زندہ و سلامت ہیں۔ انگریزوں کی مجال نہیں کہ مجھے ہاتھ بھی لگائیں۔ نہ جانے سے اُن کا شبہ اور قوی ہو جائے گا اس لیے میرا بے خوفی سے جانا ضروری ہے۔"

نواب احمد بخش کے زمانے کا ایک وفادار سانڈنی سوار آگے آیا اور ہاتھ باندھ کر بولا "حضور! آپ انگریز کی فطرت سے واقف نہیں ہیں۔ میرا

نہیں بدل لیجیے۔ یہ سانڈنی سو کوس سے اِدھر دم لینے والی نہیں ہے بھائی کمر سے باندھیے اور نکل چلیے۔"

شمس الدین خاں نے بوڑھے وفادار کو جھڑک دیا۔ "تجھے ان معاملات میں دخل دینے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تو جانتا نہیں کہ ہم تیری طرح کوئی گھس کھدے نہیں ہیں۔ سلار ڈلیک ہمارے مرحوم والد کے قدموں میں بیٹھتا تھا اور انھیں بھائی بھائی کہتے اس کا منہ سوکھتا تھا۔ کون ہے جو نواب احمد بخش کے بیٹے پر ہاتھ ڈالے گا!"

شمس الدین خاں نے دس سوار اپنے ساتھ لیے اور پالکی میں دہلی روانہ ہو گیا۔ شہر کے قریب پہنچ کے اس نے ایک سوار کو آگے بھجوا دیا۔ ایجنٹ اور انگریز حکام موقع پر موجود تھے۔ کرنل سکنر سے نواب کی گہری دوستی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا: "نواب صاحب! ہتھیار ہمارے حوالے کر دیجیے اور ایجنٹ صاحب بہادر پر بھروسا رکھیے۔ یہ آپ کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں، کریں گے۔"

شمس الدین خاں نے اپنی تلوار اس کے حوالے کر دی۔ اسی وقت مجسٹریٹ نے سامنے آ کر کہا: "سرکار کے حکم سے آپ گرفتار کیے جاتے ہیں۔ اب اپنے آپ کو قیدی تصور کیجیے۔"

شمس الدین خاں نے دبی زبان سے احتجاج کیا لیکن بے سود۔ شمس الدین خاں کی آنکھیں کھلیں۔ عزیزوں اور نوکروں کے مشورے یاد آئے مگر وقت نکل چکا تھا۔ بچ نکلنے کی سب راہیں بند تھیں۔ موت سامنے آ گئی تھی۔

انیا میو کو بریلی میں اطلاع ملی کہ شمس الدین گرفتار ہو گیا ہے۔ نئی نئی جگہ چھپنے اور مارے مارے پھرنے سے وہ سخت عاجز آ چکا تھا۔ اس نے فوراً اپنے بھائی کو دہلی روانہ کیا۔ اس کے بھائی نے دہلی پہنچ کے فرنگیوں کو یقین دلایا کہ اگر انیا میو کی حفاظت کا یقین دلایا جائے تو وہ سارے حالات بتانے کے لیے تیار ہے۔ فرنگیوں نے حفاظت کا وعدہ کیا۔ چنانچہ انیا میو سلطانی گواہ بن گیا۔ اس دوران شمس الدین کے آدمیوں نے انیا میو کو قتل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ انیا میو کا بیان ہوتے ہی کریم خاں کو پھانسی دے دی گئی اور شمس الدین خاں کے لیے بھی پھانسی کا حکم ہو گیا۔ کشمیری دروازے کے باہر اس کے لیے خاص طور پر سولی گڑوائی گئی پھر نو سو فوجیوں کے پہرے میں اسے جیل سے نکال کر سولی دینے کے لیے لے جایا گیا۔ شمس الدین خاں نے پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر سبز لباس پہنا لیکن انگریزوں نے وہ لباس اتروا دیا۔ اس نے سفید کپڑے پہن لیے۔ جب وہ پھانسی کے لیے جا رہا تھا تو راستے میں اس نے ایک کنجڑے کی دکان پر کھیرے دیکھے۔ ایک انگریز افسر پالکی کے ساتھ تھا۔ شمس الدین نے اس سے کہا: "ہمارا جی چاہتا ہے کھیرے کھائیں۔"

افسر نے پالکی رکوائی اور کھیرے خرید کر سامنے رکھ دیے۔ پالکی چلی تو شمس الدین کھیرے کھاتا جا رہا تھا اور چھلکے باہر پھینک رہا تھا۔ تختے پر جلاد نے آ کر چاہا کہ اس کے گلے میں پھندا ڈالے لیکن شمس الدین نے اسے پرے ہٹا دیا اور پھندا خود گلے میں ڈالا۔ پھانسی پر لٹکنے کے بعد اس کی لاش قدم شریف میں دفن کی گئی۔ ریاست انگریزوں نے ضبط کر لی۔



رجو کی موت نے شیفتہ کے رہے سہے حواس بھی زائل کر دیے۔ جس روز اس کا جنازہ اٹھا، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دلی کی ساری آبادی اُمڈ آئی ہے۔ اسے بستی نظام الدین اولیا میں جگہ ملی۔ اس کی موت نے شیفتہ کو بوڑھا کر دیا تھا۔ وہ شب و روز قبرستان میں پڑا رہتا۔ قبر پہ موتیا کے پھول چڑھاتا اور چراغ روشن کرتا۔ ایک بار اس نے قبر پہ سبز ریشمی غلاف بھی چڑھایا۔ اس کے غم میں اسے کپڑے بدلنے کا ہوش بھی نہ رہا۔ داڑھی مونچھیں بے تحاشا بڑھ گئی تھیں۔ دوست احباب اور رشتے دار منت سماجت کر کے اسے قبرستان سے واپس حویلی لاتے، کپڑے بدلواتے، نہلاتے لیکن شیفتہ موقع پا کر پھر وہیں پہنچ جاتا۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہوئی کہ وہ کسی کی صورت پہچانتا، نہ کسی سے بولتا۔ رجو کی قبر کے پاس چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ شہر میں آتا تو اس کی حالت دیکھ کر کوئی پہچان نہ پاتا کہ یہ جہانگیر آباد کے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہیں۔ کپڑے تار تار، داڑھی بڑھی ہوئی، ننگے سر ننگے پاؤں، جسم دھول میں اَٹا ہوا۔ وہ گردن جھکائے دلی کے کوچوں میں دیوانہ وار پھرتا۔ پھر کئی میل پیدل چل کر رجو کی قبر پہ جاتا۔ اس کے نوکروں میں [illegible] پاس بٹھا کر کچھ کھلا دیتا [illegible]۔ ایک مرتبہ غالب پالکی میں بیٹھے کہیں جا رہے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے [illegible] کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ غالب نے دیوانے پہ نظر ڈالی [illegible] میں آنسو آ گئے۔ فوراً پالکی رکوائی اور آواز دی: "مصطفیٰ خاں [illegible] ہماری بات سنو۔"

شیفتہ نے غلط انداز نگاہ سے غالب کی طرف دیکھا، مسکرایا اور آگے چل دیا۔

اس کے عزیزوں نے بارہا مکان میں لا کر پیروں میں زنجیریں ڈال دیں اور کمرے میں قید کر دیا لیکن نہ جانے کیسے زنجیریں ٹوٹ جاتی تھیں اور شیفتہ آزاد ہو کر پھر رجو کی قبر پہ پہنچ جاتا تھا۔ مدتوں اس کی یہی حالت رہی۔



ماٰم، انگریزی ادب کے نام ور ادیبوں میں سے ایک، جولائی ۱۸۷۴ء کینٹربری انگلستان میں پیدا ہوا۔ ۹۱ سال گزار کے دسمبر ۱۹۶۵ء جنوبی فرانس میں چل بسا۔ کچھ لوگ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ماٰم کا شمار بھی انہی چار لوگوں میں ہوتا ہے۔ ماٰم کی کئی کہانیاں آپ سب رنگ میں پڑھ چکے ہیں۔ یوں تو اس نے چند بے حد مقبول، اول درجے کے ناول اور کامیاب اسٹیج ڈرامے بھی لکھے لیکن ماٰم کے فن کے خدوخال اس کے افسانوں ہی میں پوری طرح اجاگر ہوتے ہیں۔ اس نے سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔ شاید ہی کوئی موضوع اس کے سحر آفرین دلنشین قلم سے بچ سکا ہو۔ وہ بیسویں صدی کا آدمی تھا۔ بیسویں صدی کے انسانوں کی کلفتیں، راحتیں رقم کرتا رہا۔ جو دل پہ گزرتی ہے وہ سب کچھ۔ ماٰم کے بیان کی سب سے بڑی خوبی اس کی سلاست ہے۔ شگفتگی، سادگی، ستھرا پن! اس کا پیرایۂ اظہار نکھرا نکھرا دھلا دھلا ہے۔ بے شکن، شفاف اور نازک۔ اس سادگی میں وہ بعض ایسی خوب صورت تحریریں تراش گیا ہے جو زمانے کی گرد باد سے تادیر محفوظ رہیں گی۔ تخلیق جمال اپنی جگہ مگر اس حسن کو اظہار کا کوئی جھلمل پیراہن بھی مل جائے تو اس کا نصیب ہے۔ سونے پر سہاگہ ہے، دو آتشہ ہے۔ اظہار بجائے خود ایک تخلیق ہے۔ حسد، تعصب، تنگ نظری اور نسلی برتری، سماجی پستی و بلندی کے موضوعات پر بطور خاص اس نے انسانی جذبات و احساسات کو بیدار کرنے والی تحریریں لکھیں۔ زیر نظر کہانی ماٰم کے فن کا بڑی حد تک احاطہ کرتی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ترجمے میں ماٰم کا فنی جوہر برقرار رہے لیکن ماٰم کا وہ جوہر تو ماٰم کا ہی وصف تھا۔

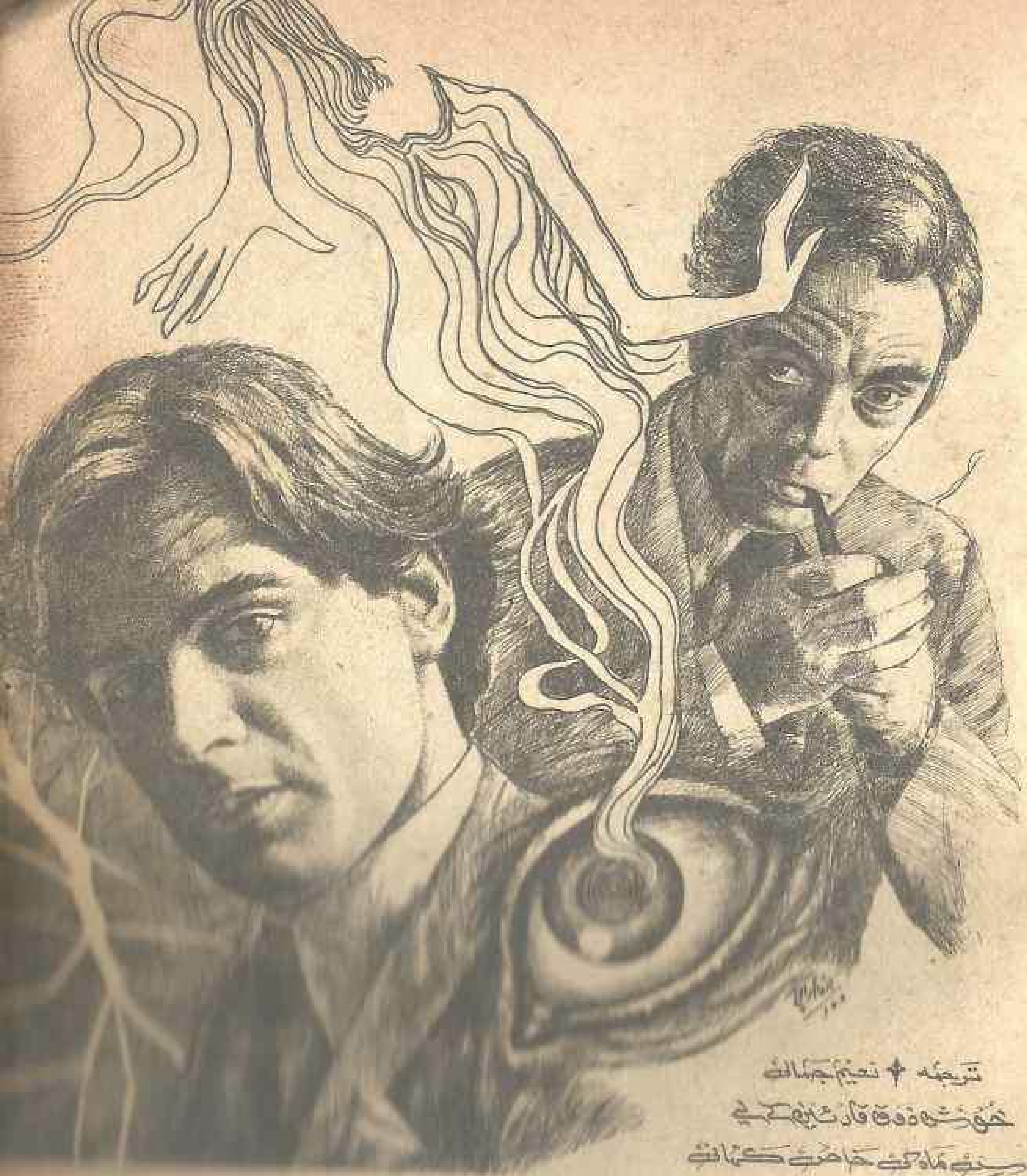


اُس اعلا آدمی کا قصہ جو ادنا خواب دیکھتا تھا

ڈاکٹر آڈلین نے گھڑی دیکھی چھ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس کا مریض لارڈ ماؤنٹ ڈریگو ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ ڈاکٹر کو سخت حیرت ہوئی۔ لارڈ وقت کا بہت پابند تھا اور اُسے اپنی اِس خوبی پر ناز بھی تھا۔ اِس خوبی کے علاوہ اُس کی قوتِ بیان قابلِ رشک تھی۔ اُس کی زبان سے ادا ہونے والی معمولی باتیں فقرے بن جاتی تھیں۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ وقت کی پابندی ایک خراجِ تحسین ہے۔ یہ خراجِ تحسین آپ کسی ذہین شخص کو اُس کی ذہانت پر ادا کرتے ہیں نیز وقت کی پابندی ایک استہزا ہے ایک طنز ہے جو کسی احمق کی حماقت پر کیا جاتا ہے۔ لارڈ نے ڈاکٹر سے ساڑھے پانچ بجے کا وقت لیا تھا۔

ڈاکٹر کی شکل و شباہت میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دبلا پتلا، لمبا، تنگ کندھے، قد کسی قدر جھکا ہوا۔ بال زیادہ تر سفید اور باریک، چہرہ لمبوترا، بیضوی اور نقوش تیکھے۔ ڈاکٹر کی عمر پچاس سے زیادہ نہیں تھی لیکن وہ سن رسیدہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی زردی مائل نیلی آنکھوں میں تھکن کے آثار تھے۔ اُس کے پاس زیادہ دیر بیٹھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کی پتلیاں بہت کم گھومتی ہیں اور بیشتر وقت مخاطب کے چہرے پر جمی رہتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں سے کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن میں ویرانی نظر آتی تھی، نہ چمک تھی، نہ چمک۔ اُس کی آنکھیں اُس کے خیالات کا سراغ نہیں دیتی تھیں۔ گفتگو کرتے وقت اُن میں ایک سپاٹ پن دکھائی دیتا تھا۔ پلکیں بھی عام پلکوں کے مقابلے میں کم جھپکتی تھیں۔ ڈاکٹر کے دونوں ہاتھ لمبے تھے اور انگلیاں کناروں سے قدرے گھومی ہوئی تھیں۔ ہاتھ ملائم ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط بھی تھے۔ ڈاکٹر کا لباس جاذبِ نظر نہیں ہوتا تھا۔ غور سے دیکھے بغیر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا پہنے ہوئے ہے۔ کپڑے عموماً گہرے سیاہی مائل ہوتے تھے۔ اُن پر وہ کالی ٹائی باندھتا تھا۔ اِس لباس کی وجہ سے اُس کے بیضوی چہرے کے تیکھے نقوش اور زرد ہو جاتے تھے۔ زردی مائل آنکھوں کی کمزوری بھی نمایاں ہو جاتی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک بیمار آدمی محسوس ہوتا تھا۔

ایک ماہرِ نفسیات کی حیثیت سے اُس کی شہرت دُور دُور پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پیشہ اُس نے اتفاقاً اختیار کیا تھا اور تذبذب کے عالم میں اسے چلا رہا تھا۔ اُس کی ڈاکٹری جنگِ عظیم کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ پہلے اُس نے متعدد اسپتالوں میں تربیت حاصل کی پھر اپنی خدمات فوجی حکام کو پیش کر دیں۔ کچھ عرصے بعد اُسے فرانس بھیج دیا گیا۔ فرانس میں وہ طبی خدمات انجام دیتا رہا۔ یہیں اُسے اپنی ایک انوکھی



ترجمہ ✦ نعیم جمالی

خوش ذوق قارئین کیلئے

اِس ماہ کی خاص کہانی

صلاحیت کا اندازہ ہوا۔ وہ اپنے مضبوط ٹھنڈے ہاتھوں سے کچھ اقسام کے درد محض چھو کر مٹا دیتا تھا اور بے خوابی کے مریض اس کی نرم گفتگو سن کر سو جاتے تھے۔ ڈاکٹر ایک نرم گفتار آدمی تھا۔ اس کے لہجے میں ایک طرح کی موسیقی تھی، نغمگی تھی۔ اس نغمگی نے سامعین کے لیے لوری کا کام کیا۔ ڈاکٹر مریضوں سے کہتا تھا، ”دیکھیے آپ کو آرام کرنا چاہیے، پریشان نہیں ہونا چاہیے، سوجانا چاہیے۔“ اس کے مریض آرام کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ سکون کی خواب آور کیفیت ان کی پریشانیاں کافور کر دیتی تھی۔ لوگ کسی ایسے شخص کی طرح مطمئن ہو جاتے تھے جو کسی بڑے مجمع میں نہایت دقت سے ایک خالی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ مریضوں کے تھکے ہوئے پپوٹوں پر نیند طاری ہونے لگتی جیسے [illegible]

ڈاکٹر بینی میں صلاحیت بڑھتی [illegible] میں مہارت حاصل ہو گئی۔ وہ اپنی نرم [illegible] آواز سے، زردی مائل خاکستری نگاہوں سے، اپنے [illegible] ہاتھوں پر تھپ تھپانے سے مریضوں کا اضطراب دور کر سکتا تھا، ان کے دماغ و دل سے مایوسیاں کھرچ سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ لاعلاج مریض کا علاج ایک معجزے کی طرح کر دیتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک [illegible] انسان کو گویائی عطا کر دی تھی۔ یہ شخص ایک بم کے دھماکے کے ساتھ زمین میں تقریباً دفن ہو گیا تھا۔ جب اسے نکالا گیا تو اس کی گویائی ختم ہو چکی تھی۔ اسی طرح ایک ہوائی حادثے نے ایک شخص کے بازو

بیکار کر دیے تھے، ڈاکٹر نے اپنے معجزانہ علاج سے اُس کے بازو متحرک کر دیے۔ ڈاکٹر کو ایک معالج کی حیثیت سے بعض حیرت انگیز صلاحیتیں حاصل ہو چکی تھیں اُن کا کوئی منطقی جواز نہیں تھا۔ ان صلاحیتوں پر خود اُسے بھی حیرت ہوتی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر کو اپنے آپ پر اعتماد رکھنا چاہیے۔ وہ خود اعتمادی کا احساس قائم رکھنے میں عموماً ناکام رہتا تھا۔ جب بھی کسی معاملے میں اُسے معجزانہ کامیابی حاصل ہوتی، وہ تعجب زدہ رہ جاتا۔ بے یقینی میں ڈوبے ہوئے ناظر حیران ہو کر بول اُٹھتے "ڈاکٹر کو کوئی مخفی روحانی قوت حاصل ہو گئی ہے، وہ ان ہونے کام انجام دے لیتے ہیں مگر اُن کی وضاحت نہیں کر پاتے۔"

جنگِ عظیم ختم ہو گئی تو ڈاکٹر ویانا چلا گیا۔ یہاں بھی اُس نے پریکٹس جاری رکھی۔ اس کے بعد کچھ مدت وہ زیورخ میں رہا پھر مستقلاً لندن آ گیا۔ لندن اُس کی فنّی مہارت اور شہرت کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ اب لندن میں اُسے پندرہ سال ہو چکے تھے۔ مریضوں میں اُس کی حیرت انگیز کامیابیوں کا زبردست چرچا تھا۔ اُس کی فیس بہت زیادہ تھی پھر بھی مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اُس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ سارے مریضوں کو دیکھ سکے۔ اُس کے علاج کے نتائج غیر معمولی ہوتے تھے۔ اکثر مریضوں کو اُس نے خودکشی سے بچایا تھا اور اکثر کو پاگل خانے جانے سے نجات دلائی تھی۔ اُس نے ایسے دکھی مریضوں کو آسودگی سے مالامال کیا تھا جو پریشانیوں اور تلخیوں سے بھرپور زندگی کا عذاب جھیل رہے تھے۔ اُس نے بہت سی ازدواجی ناخوش گواریاں مسرت میں بدل دی تھیں۔ بعض مریضوں کے ذہن سے اُس نے غیر فطری خواہشیں اکھاڑ پھینکی تھیں۔ وہ بیمار انسانوں کے لیے ایک مہربان مسیحا تھا مگر کبھی کبھی اُسے یہ شبہ ہوتا کہ وہ ایک عطائی معالج ہے۔ ایک بات اُس کی قوتِ برداشت سے باہر تھی، وہ ایک ایسی صلاحیت کا مالک ہو گیا تھا جس کی کوئی عقلی توجیہہ ناممکن تھی۔ مریضوں کے یقین اور اعتماد سے وہ پریشان ہو کے رہ جاتا اور دیانت داری سے سوچتا کہ وہ اس کا اہل نہیں ہے۔ بعض اوقات کام کرتے کرتے اُس پر شدید تھکن طاری ہو جاتی اُس نے بارہا سوچا کہ اب اُسے یہ پیشہ ترک کر دینا چاہیے۔ اُس کے پاس خطیر دولت جمع ہو چکی تھی۔ باقی زندگی وہ عیش و آرام سے گزار سکتا تھا۔ یونگ اور فرائڈ وغیرہ کے نظریات اُسے مطمئن نہیں کرتے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ نظریات بے بنیاد ہیں، ان کے تار و پود بکھر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ان نظریات کی روشنی میں علاج کرنا اُس کے لیے مفید ثابت ہوا تھا۔ گزشتہ پندرہ برسوں میں اُس نے نہایت باریک بینی سے انسانی فطرت پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کے تنگ و تاریک مطب میں بے شمار مریض آتے تھے۔ وہ انسانی کردار اور ذہنی پیچیدگیوں کے متعلق عجیب و غریب انکشافات کرتے، کبھی خوش مزاجی اور آمادگی سے، کبھی غصے اور نفرت سے مغلوب ہو کر اور کبھی محتاط انداز میں شرماتے جھجکتے۔ یہ انکشافات سننا ڈاکٹر کا معمول ہو گیا تھا۔ اب اُسے ان پر حیرت نہیں ہوتی تھی اور ناقابلِ یقین باتیں سن کر کوئی صدمہ بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مرد بہت جھوٹ بولتے ہیں گویا مرد کی فطرت ہی جھوٹ بولنا ہے۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ یہ لوگ اپنی ذہنی صلاحیت کتنی بے دردی سے حماقتوں پر صرف کرتے ہیں۔ اُسے اکثر لوگوں کے بارے میں نہایت خراب اور بدترین معلومات حاصل ہوتی تھیں لیکن اُس کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ منصف بن کر لوگوں کے اعمال کا احتساب کرے۔ مریض اُسے اعتماد میں لے کر جو باتیں بتاتے تھے، انھیں سنتے سنتے ڈاکٹر کے بال سفید ہونے لگے تھے، اُس کے چہرے پر بڑھاپا آ چلا تھا۔ اُس کی ہنسی رخصت ہو گئی تھی البتہ جب وہ دماغ کو سکون پہنچانے کے لیے کوئی ناول پڑھتا تو ڈاکٹر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔ کیا ایک ناول نگار کبھی یہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے بارے میں جو کچھ لکھ رہا ہے، وہ لوگ واقعی ایسے تھے؟ کاش ناول نگاروں کو یہ معلوم ہوتا کہ اُن کے کردار کتنے پیچیدہ اور غیر متوقع ہوتے ہیں اور اُن کی روحوں میں کیسے کیسے تضاد ہیں اور اُن کے ذہنوں میں کس قدر خوف ناک ارادے پرورش پا رہے ہیں۔

ڈاکٹر اپنی زندگی میں ان گنت عجیب و غریب ذہنی مریضوں سے مل چکا تھا مگر لارڈ ماؤنٹ ڈریجو کے مرض کی نوعیت سب سے انوکھی تھی۔ لارڈ ملک کا ایک ممتاز اور لائق ترین شخص تھا۔ اُس نے چالیس سال سے کم عمر میں وزیرِ خارجہ کے مرتبے تک ترقی حاصل کر لی تھی۔ وہ تین سال سے ملک کا وزیرِ خارجہ تھا۔ اُس کی پالیسیاں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ قدامت پسند پارٹی کا سب سے قابل سیاست داں ہے۔ لارڈ خود بھی یہی سمجھتا تھا لیکن اُسے اپنی موجودہ حیثیت میں مزید ترقی کی امید نہیں تھی۔ وہ وزیرِ اعظم کے عہدے تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد اُس کی جگہ دارالامرا کا ممبر نامزد ہو جائے گا، اس طرح دارالعوام میں اُس کی نشست برقرار نہیں رہ سکے گی۔ اُس جمہوری دور میں انگلستان کا وزیرِ اعظم دارالعوام کے بجائے دارالامرا سے منتخب ہونا محال تھا۔ تاہم لارڈ کے لیے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ وہ قدامت پسند پارٹی کے دورِ اقتدار میں

وزیرِ خارجہ کے عہدے پر بدستور فائز رہے گا۔

لارڈ میں کئی اعلیٰ خصوصیات تھیں۔ وہ ذہین بھی تھا، محنتی بھی۔ اُس نے کرۂ ارض کے دور دراز حصّوں کی سیاحت کی تھی۔ وہ دُنیا کی متعدد زبانیں روانی سے بول سکتا تھا۔ جوانی کے آغاز میں اُس نے بین الاقوامی تعلقات اور امورِ خارجہ میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ قابلِ ذکر ملکوں کے معاشی و سیاسی حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ حوصلہ مندی، دُور بینی اور ارادے کی پختگی اُس کے نمایاں اوصاف تھے۔ وہ ایک بے حد عمدہ مقرر تھا۔ عام جلسوں اور دارالعوام میں اُس کی تقریریں نہایت جامع، صاف ستھری اور فہانت سے بھرپور ہوتی تھیں۔ مباحثوں میں اُس کی حاضر جوابی ضرب المثل تھی۔ اُس کی شخصیت کا مجموعی تاثر قابلِ رشک تھا۔ دراز قد، حسین و جمیل اور ذہین و فطین۔ کچھ دنوں سے اُس کے بال اُڑنے لگے تھے اور جسم فربہی کی طرف مائل تھا لیکن اس گنج اور فربہی نے اُس کی شخصیت لوگوں کے لیے مزید ٹھوس، مزید بالغ نظر بنا دی تھی۔

نوجوانی میں وہ ایک اچھا کھلاڑی تھا اور آکسفورڈ یونی ورسٹی میں کشتیاں کھیتا تھا، خصوصًا ایک اچھے نشانے باز کی حیثیت سے اُس کی شہرت پورے انگلستان میں پھیل چکی تھی۔ چوبیس سال کی عمر میں اُس نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکی سے شادی کی۔ لڑکی کا باپ ایک نواب تھا اور ماں امریکہ کے ایک دولت مند خاندان کی تنہا وارث تھی۔ اس طرح معاشرے میں لارڈ کی بیوی کو عزت اور دولت دونوں نعمتیں حاصل تھیں۔ اُس بیوی سے لارڈ کے دو بیٹے تھے کئی برس تک لارڈ اور اُس کی بیوی میں ناچاقی رہی۔ دونوں خفیہ طور پر ایک دوسرے سے الگ رہے لیکن لوگوں کی نگاہ میں اُن کی گھریلو زندگی خوش گوار رہی۔ اُن کی ظاہری حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ دونوں گھر سے باہر کسی اور رابطے میں ملوث نہیں پائے گئے۔ اُن کے ازدواجی تعلقات کے متعلق بے سروپا افواہیں کبھی نہ پھیل سکیں۔ لارڈ کو عزّ و جاہ کی بہت طمع تھی اور اُس کے لیے وہ شدید محنت کا عادی تھا نیز اُس کے دل و دماغ وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ وہ کسی ایسی تفریح یا عیاشی میں بھی نہیں پڑتا تھا جس سے منصبی فرائض میں خلل واقع ہو۔ مختصرًا اُس میں بہ ظاہر وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو کامیابی اور مقبولیت کے لیے ضروری ہیں مگر دوسری طرف اُس کا باطن عیوب اور خامیوں سے بھرا ہوا تھا، وہ خوف ناک حد تک ایک شعبدے باز آدمی تھا۔ غالبًا یہ اُس کی خاندانی خوبی تھی۔ اُس کا باپ ایک شریف وکیل کا بیٹا تھا۔ وکیل صاحب وکالت کے علاوہ شراب کی بھٹی بھی چلاتے تھے لہٰذا اُن کے بیٹے کو زیادہ معزز بننے اور غیر ضروری اہمیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ ڈریگو کے باپ کو لارڈ شپ کا اعزاز برطانوی شہنشاہ چارلس دوم نے دیا تھا۔ یہ اعزاز رکھنے والے لوگ تقریبًا تین سو سال تک انگلستان کے معزز ترین خانوادوں سے وابستہ رہے تھے لیکن لارڈ ماؤنٹ ڈریگو کو اپنے معزز خاندان میں پیدا ہونے کا شدید احساس تھا جیسے ایک نو دولتیے کو اپنی دولت کا احساس ہوتا ہے۔ لارڈ دوسروں پر اپنے خاندانی تفاخر کا اثر ڈالنے کے لیے کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُس میں خوش اخلاقی بہت تھی لیکن اُس کا مظاہرہ وہ صرف اپنے ہم رتبہ افراد کے سامنے کرتا تھا۔ جو لوگ سماجی حیثیت میں اُس سے کم تر ہوتے اُن کے ساتھ وہ سرد مہری اور بد اخلاقی برتتا۔ ملازموں کے حق میں اُس کی طبیعت نہایت سخت گیر تھی۔ وہ بات بات پر اپنے سیکریٹریوں تک کی بے عزتی کر دیتا تھا۔ اُس کے ماتحت اُس سے بُری طرح خوف زدہ رہتے تھے، اُن کے دلوں میں اُس کے لیے انتہائی نفرت بھری ہوئی تھی۔ لارڈ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ وہ اپنے معاونین سے زیادہ ہوشیار اور ذہین ہے۔ لہٰذا یہ بات جتانے، ظاہر کرنے میں اُسے قطعی جھجک نہیں ہوتی تھی۔ غرور و تکبر میں اُس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ انسانی کمزوریوں اور نا ہمواریوں کے لیے اُس کے دل میں کوئی مروّت نہ تھی۔ غیر شعوری طور پر اُسے ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ وہ [illegible] لوگوں سے [illegible] اُس کے [illegible] بخشیں کریں۔ وہ ایک [illegible] غرض کی [illegible] وہ ممنون نہ ہوتا بلکہ یہ سمجھتا [illegible] وہ کسی کا شرمندۂ احسان نہیں تھا [illegible] نہ پا سکی تھی کہ اُسے بھی دوسروں کی خدمت کرنی [illegible] کی ذمّے داری اُسے دوسروں کی ندامت ہی کے [illegible] شخصیت کی ان بُرائیوں نے بہت سے لوگوں کو اُس کا دشمن بنا رکھا تھا۔ دشمنوں کو اُس سے اور اُسے دشمنوں سے نفرت تھی۔ اُس کے حلقے میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے وہ اپنی مہربانی، ہمدردی یا معاونت کا مستحق سمجھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے دوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ اپنے لیڈروں کی نظر میں بھی معتبر نہیں تھا، لیڈر اُس کی وفاداری پر شبہے میں مبتلا تھے۔ وہ غرور اور بد خلقی کے باعث اپنی سیاسی جماعت میں بھی نامقبول تھا مگر اُس کی ذہانت اُس کی لیاقت اُس کی حُبّ الوطنی اور معاملات پر اُس کی گرفت بہت سخت تھی اُس کے ساتھی کارکن اُسے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

ایک بات اور انھیں اس پر آمادہ کرتی تھی۔ بسا اوقات لارڈ کی شخصیت میں ساحرانہ انداز پیدا ہوجاتا تھا۔ جب اُسے ایسے لوگوں کا ساتھ ملتا، جنھیں وہ اپنے برابر کا سمجھتا یا جنھیں مسحور کرنا چاہتا تو اُس کی شخصیت شادمانی، حاضر جوابی، نکتہ سنجی اور سحر انگیزی کی حامل ہوجاتی۔ ایسا عموماً بیرونی سفیروں یا معزز خواتین کی صحبت میں ہوتا تھا۔ اُس کی رگوں میں وہی خون گردش کرنے لگتا جو معروف لارڈ چسٹر فیلڈ کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ وہ اگر کوئی واقعہ بیان کرتا تو انداز بیان فطری، حقیقی اور معقول ہوتا، سامعین انتہائی لطف اندوز ہوتے۔ ہر شخص اُس کی علمی وسعت، عام معلومات اور خوش ذوقی کا لوہا مان کر اُٹھتا۔ لوگوں کو یہ احساس ہونے لگتا کہ آج انھیں دُنیا کے ایک بہترین شخص کی صحبت میسر آئی تھی۔ یہ بات اُن کے ذہن سے محو ہوجاتی کہ کل ہی تو اس بہترین شخص نے اُن کی تحقیر کی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دوسری ہی صبح اُس شخص کا طنزیہ انداز انھیں قتل تک کرسکتا ہے۔

لارڈ نے ایک مریض کی حیثیت سے ڈاکٹر آڈلین سے رابطہ قائم کیا تو اُس پر مایوسی و ناکامی کا غلبہ تھا۔ اُس کے ایک سیکریٹری نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا کہ عزت مآب لارڈ ماؤنٹ ڈرینگو آپ سے مشورہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ انھیں بے حد مسرت ہوگی، اگر آپ کل صبح دس بجے اُن سے ملاقات کے لیے اُن کی اقامت گاہ تشریف لے آئیں۔ ڈاکٹر نے جواباً کہا کہ وہ لارڈ کی اقامت گاہ پہنچنے سے قاصر ہے لیکن اُسے موصوف کو ایک دن کے وقفے کے بعد اپنے مطب میں پانچ بجے شام کا وقت دینے پر مسرت ہوگی۔ سیکریٹری نے پیغام لے لیا اور تھوڑی دیر بعد اُسے مطلع کیا کہ "عزت مآب لارڈ ماؤنٹ ڈرینگو کو اصرار ہے کہ آپ انھیں اُن کی قیام گاہ آکر دیکھیں۔ اِس زحمت کے لیے آپ جو معاوضہ چاہیں طلب کرسکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا کہ وہ مریضوں کو صرف اپنے مطب میں دیکھتا ہے۔ اگر لارڈ اُس کے مطب آنے پر آمادہ نہیں تو وہ معذرت خواہ ہے کیونکہ اس طرح وہ اُن کی طرف مناسب توجہ نہیں دے سکے گا۔ پندرہ منٹ بعد لارڈ کے دفتر سے یہ پیغام ملا کہ وہ پرسوں تو نہیں البتہ کل شام پانچ بجے مطب پہنچ جائے گا۔

لارڈ مطب پہنچ گیا۔ وہ دروازے سے آگے نہیں بڑھا، وہیں کھڑے کھڑے ڈاکٹر کو سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا۔ اُس کی نگاہوں میں تحقیر و تضحیک تھی۔ ڈاکٹر نے ایک نظر میں اندازہ کرلیا کہ لارڈ سخت برہم ہے اور بہت گھور کر اُسے دیکھ رہا ہے۔ اُس کی زبان اور پتلیاں ساکت تھیں۔ ڈاکٹر نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک موٹا تازہ دیو قامت آدمی تھا، اُس کے بال سفیدی کی طرف مائل تھے، گردن اِس طرح تنی ہوئی تھی جیسے وہ کوئی بہت معزز شخص ہو۔ اُس کا چہرہ بھرا ہوا تھا، نقوش تیکھے اور جاذبِ نظر تھے۔ آنکھوں سے رعونت جھلک رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر ڈاکٹر کو اٹھارویں صدی کے لندن بادشاہ یاد آنے لگے۔ یکایک لارڈ کی آواز اُبھری: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محترم ڈاکٹر آڈلین سے ملاقات کرنا اتنا مشکل ہے جتنا برطانیہ کے وزیرِ اعظم سے ملاقات کرنا۔ ڈاکٹر صاحب! میں ایک انتہائی مصروف آدمی ہوں۔"

"کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گے؟" ڈاکٹر نے کہا۔ اُس کے چہرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ لارڈ کے الفاظ سے ذرا بھی متاثر ہوا ہو۔ وہ اپنی کرسی پر معمول کے مطابق بیٹھا رہا۔

لارڈ اب تک کھڑا تھا۔ اُس کی برہمی بڑھ گئی تھی۔ اُس نے نہایت درشت لہجے میں کہا: "جناب! میرا خیال ہے، میں آپ کو بتادوں کہ میں برطانوی سلطنت کا وزیرِ خارجہ ہوں۔"

ڈاکٹر نے اپنا جملہ دہرایا: "کیا آپ تشریف نہیں رکھیں گے؟"

لارڈ کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سر پر پاؤں رکھ کے بھاگنے والا ہو لیکن چند لمحوں بعد وہ خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ایک لمبا رجسٹر کھولا، قلم سنبھالا اور مریض کی طرف دیکھے بغیر دریافت کیا: "آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"بیالیس سال۔"

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"شادی کب ہوئی تھی؟"

"اٹھارہ سال پہلے۔"

"اولاد؟" ڈاکٹر نے مختصراً پوچھا۔

"دو بیٹے ہیں۔" لارڈ کے جوابات میں تیزی تھی۔

ڈاکٹر نے قلم رکھا، رجسٹر بند کیا پھر کرسی کی پشت سے ٹیک کر اپنے مریض کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہے بغیر نہایت سنجیدگی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد اُس نے لارڈ سے پوچھا: "آپ میرے پاس کیسے تشریف لائے؟"

"میں نے آپ کی تعریف سُنی تھی۔ لیڈی کینوٹ آپ کی مریضہ رہی ہیں، انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کا علاج اُن کے لیے خاصا سودمند ثابت ہوا۔"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا، ٹکٹکی باندھ کے مریض کو دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں ہر قسم کے تاثر سے عاری تھیں جیسے وہ مریض کو

دیکھ ہی نہ رہا ہو۔ آخر وہ بولا "میں کوئی معجزانہ علاج کرنے سے قاصر ہوں۔" اُس کی آنکھوں کے کنارے تبسّم سے ہوئے لیکن یہ کوئی واضح تبسّم نہیں تھا۔ "اگر میں کوئی معجزہ پیش کردوں تو ڈاکٹروں کا ڈائل کالج اُسے تسلیم نہیں کرے گا۔"

لارڈ کو معاندانہ رویّہ تبدیل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر کو اُس کی گفتگو میں موانست اور مٹھاس محسوس ہونے لگی۔ "ڈاکٹر آڈلین! آپ اس معاملے میں نہایت معروف حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ایک دنیا آپ کے معجزانہ علاج کی عقیدت مند ہے۔"

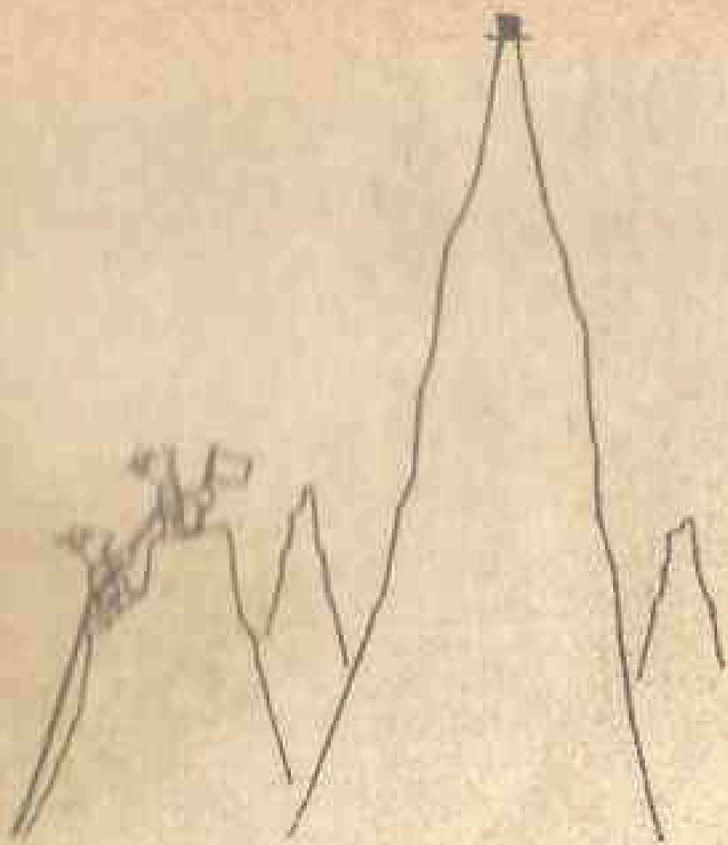
"لیکن آپ علاج کے لیے میرے ہی پاس کیوں آئے ہیں؟"

لارڈ خاموش ہو گیا جیسے اس سوال کا جواب دینا اس کے لیے مشکل ہو۔ ڈاکٹر انتظار کرتا رہا۔ آخر خاصی کوشش کے بعد لارڈ نے زبان کھولی۔ "میں خدا کے فضل سے مکمل صحت مند ہوں۔ میرے ذاتی معالج ڈاکٹر گرسٹس اکثر میرا معائنہ کرتے ہیں۔ معمول کے مطابق چند روز پہلے بھی انھوں نے مجھے دیکھا تھا۔ اُن کے نزدیک میں صحت کے اعتبار سے ایک تیس سالہ نوجوان کے مانند ہوں۔ مجھے سخت محنت کی عادت ہے۔ محنت سے مجھے تھکن کبھی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اپنا کام انجام دینے میں لطف آتا ہے۔ میں تمباکو نوشی شاذ و نادر ہی کرتا ہوں۔ شراب کے معاملے میں بھی اعتدال میری عادت ہے۔ میری زندگی ورزش، نظم و ضبط اور پابندیِ اوقات سے عبارت ہے۔ جسمانی لحاظ سے مجھ میں کوئی نقص نہیں۔ میں پوری طرح تن درست ہوں۔ ان حالات میں یہ واقعی ایک طفلانہ حرکت ہے کہ میں آپ سے مشورہ لینے چلا آیا مگر ڈاکٹر! میں یہاں آنے کے لیے مجبور تھا۔"

ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ اب اُسے لارڈ کی مدد کرنی چاہیے۔ "جناب! آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ بہرحال کوشش کروں گا۔"

"میرے فرائض کی نوعیت آپ کو معلوم ہے۔" لارڈ کے چہرے پر ناراضی سی پیدا ہوئی۔ "جو امور مجھے انجام دینے پڑتے ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ میرے فیصلوں سے پورے ملک کی فلاح پر اثر پڑ سکتا ہے نیز ان سے دنیا بھر کا امن متاثر ہو سکتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ میرے فیصلوں میں توازن ہو اور میرے دل و دماغ میں اُلجھنیں نہ ہوں۔ ملک و قوم کے لیے میری افادیت مسلّم ہے۔ اس لحاظ سے اپنا ذہنی انتشار رفع کرنا بھی میرے منصبی فرائض میں شامل ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک بار بھی اُس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹائی اور ایک تجربہ کار معالج کی حیثیت سے اُس نے بہت کچھ دیکھ لیا۔ لارڈ کے الفاظ پُرشکوہ تھے اور اندازِ بیان تفاخر آمیز تھا پھر بھی ڈاکٹر



نے وہ پریشانی بھانپ لی جسے لارڈ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "وزیرِ محترم! آپ کو یہاں آنے کی زحمت دینے کا ایک سبب تھا۔ تجربے نے مجھے یہ سکھا دیا ہے کہ ڈاکٹر کے مطب کا تاریک ماحول مجھ کو بات کرنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ مریض جس ماحول سے ہمیشہ مانوس رہا ہو، اُس کے مقابلے میں یہاں زیادہ آسانی سے بات کر سکتا ہے۔"

لارڈ نے تلخی سے کہا۔ "واقعی اس مطب کا ماحول بہت تاریک اور تم ہے۔" یہ کہہ کے وہ خاموش ہو گیا۔ وہ ایک ذہین و خود اعتماد شخص تھا۔ تیز فیصلے کرنے میں اُسے مہارت حاصل تھی مگر اس وقت وہ بہت ہراساں تھا۔ لارڈ کو دیکھ کے لیے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سہارا لیے تھی لیکن اس کی آنکھیں ابتلا کی غمازی کر رہی تھیں۔ وہ عجیب بے قراری سے وہ کر رہا تھا۔ "ڈاکٹر آڈلین! مسئلہ بے حد معمولی ہے۔ آپ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے یہ اندیشہ بھی ہے کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ اپنا قیمتی وقت ان حماقتوں میں ضائع نہ کیجیے۔"

"بسا اوقات بعض معمولی باتیں بھی نہایت اہم ہوتی ہیں۔ ان سے ذہنی بے توازنی کا اظہار ہوتا ہے۔ میں معمولی سے معمولی بات نظر انداز کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ آپ بے تکلفی سے سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔" ڈاکٹر کی آواز قدرے دھیمی تھی لیکن اس کا لہجہ حسین تھا۔ اُس کے اندازِ گفتگو سے مریض کو آسودگی محسوس ہوتی تھی۔

آخر لارڈ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی تکلف کے بغیر سب کچھ کہہ دے گا۔ "کچھ عرصے سے میں نہایت پریشان کن خواب دیکھنے میں مبتلا ہوں۔ میرا خیال ہے اُن خوابوں پر توجہ دینا حماقت ہے لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اُن کے تواتر نے میرے اعصاب

جھنجوڑ کے رکھ دیے ہیں۔"

"کیا اپنا کوئی خواب آپ مجھ سے بیان کر سکتے ہیں؟"

لارڈ بے پروائی ظاہر کرنے کے لیے مسکرایا مگر اُس کی مسکراہٹ غم آگیں تھی۔ "خواب اتنے پُر حماقت ہیں کہ اُن کے ذکر سے مجھے اُلجھن ہو رہی ہے۔"

"تردّد نہ کیجیے۔ اطمینان سے کہیے۔"

"لارڈ گویا ہوا۔ "پہلا خواب مَیں نے ایک ماہ قبل دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کونیمارا ہاؤس کی ایک سرکاری ضیافت میں شریک ہوں۔ بادشاہ اور ملکہ کی شرکت بھی متوقع تھی لہٰذا اکثر کا اپنے اعزازات کے تمغے سینوں پر سجائے ہوئے تھے۔ میں نے بھی اپنا رِبن اور ستارہ لگا رکھا تھا۔ کوٹ وغیرہ لٹکانے کے کمرے میں میری ملاقات ایک پستہ قد شخص سے ہوئی۔ اُس کا نام اوون گری فتھ ہے۔ وہ ویلز کے علاقے سے پارلیمنٹ کا رُکن منتخب ہوا تھا۔ اتنی اہم اور مخصوص تقریب میں ایسے کم حیثیت شخص کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے خود سے کہا، اگر میزبانوں نے اسے بھی یہاں مدعو کیا ہے تو دیکھیے اب کس کس سے ملاقات ہوتی ہے؟ وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن میں نے اُس پر کوئی توجہ نہیں دی اور راستہ کاٹ کر سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر چلا گیا۔ میرا خیال ہے آپ وہاں کبھی نہیں گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں، کبھی نہیں گیا۔"

"وہ ایسی جگہ ہے بھی نہیں جہاں آپ کبھی جانا پسند کریں۔ اُس کی سیڑھیاں سفید سنگِ مرمر سے بنائی گئی ہیں۔ سیڑھیوں کے اُوپر میزبان اپنی اہلیہ سمیت مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ میں نے پہلے اُس سے مصافحہ کیا پھر اُس کی اہلیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عجیب عورت تھی وہ۔ اُس نے مجھے حیرت سے گھورتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ میں نے قطعاً توجہ نہیں دی۔ وہ نہایت بیوقوف اور غیر تربیت یافتہ خاتون تھیں۔ اُن کے اطوار اُن کے اُجڈ اور گنوار اسلاف کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ اسی قماش کی ایک عورت کو شاہ چارلس دوم نے ڈچز بنا دیا تھا۔ ایک بات اور واضح کر دوں۔ کونیمارا ہاؤس کے استقبالی کمرے نہایت شاہانہ طور پر آراستہ ہیں۔ میں مہمانوں کے درمیان سے گزرتا رہا۔ کسی سے میں مصافحہ کرتا، کسی کو محض سر ہلا کر سلام کا جواب دیتا۔ معاً میری نظر جرمنی کے سفیر پر پڑی۔ وہ آسٹریا کے آرچ ڈیوک سے محوِ گفتگو تھا۔ میرے لیے سفارتی آداب کے مطابق اُس سے چند باتیں کرنا ضروری تھا چنانچہ میں نے اُس کے سامنے پہنچ کے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ میرے اس عمل پر آرچ ڈیوک کے منہ سے ایک پُر شور قہقہہ نکلا۔ مجھے بہت ہتک محسوس ہوئی۔ میں نے اُسے متانت کے ساتھ سر سے پیر تک دیکھا مگر وہ اور زیادہ قہقہے لگانے لگا۔ میں نے طنز و تمسخر کے حربے سے اُس کی گوشمالی کا ارادہ کیا مگر اچانک منتظمین مہمانوں کو خاموش کرانے لگے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ اور ملکہ کی سواری آچکی ہے۔ میں آرچ ڈیوک کی طرف پشت کر کے ایک قدم آگے بڑھا۔ دفعتہً مجھے اپنے لباس میں کوئی کمی محسوس ہوئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے سخت شرمندہ ہونا پڑا۔ میں اتفاق سے بڑے پائنچوں کی پتلون پہننا بھول گیا تھا۔ میں گہرے سُرخ موزوں کے ساتھ ایک مختصر سا ریشمی انڈرویئر پہنے ہوئے تھا۔ میزبان کی اہلیہ اور ڈیوک کے قہقہوں کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہوئی اور وہ لمحات میرے لیے کتنے سنگین تھے۔ میرا پورا جسم ندامت سے عرق آلود ہو رہا تھا۔ میں شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا پھر جب میں ہوش میں آیا تو سر تا پا ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ اِس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ یہ جان کر میں نے سکھ کی سانس لی کہ یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔"

"اس طرح کے خواب کوئی غیر معمولی حیثیت نہیں رکھتے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے اتفاق ہے۔" لارڈ بولا۔ "لیکن دوسرے دن ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ میں دارالعوام کی لابی میں کھڑا تھا۔ ویلز کے علاقے کا رُکن گری فتھ آہستہ روی کے ساتھ میرے نزدیک سے گزرا۔ اُس نے جان بوجھ کر میری ٹانگوں پر نظر ڈالی پھر مجھ سے نگاہیں ملا کر بھرپور انداز میں مجھے دیکھا۔ میں کامل یقین سے کہتا ہوں کہ اُس نے مجھے آنکھ بھی ماری لہٰذا فوراً یہ مضحکہ خیز خیال میرے ذہن میں آیا کہ گری فتھ نے گزشتہ رات دعوت میں شرکت کی تھی اور وہاں مجھے مضحکہ خیز حالت میں دیکھا تھا اسی لیے اب میرا مذاق اُڑا رہا ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ رات کا معاملہ تو محض ایک خواب تھا۔ میں نے سرد مہری سے اُس کی جانب دیکھا۔ وہ میرے پاس سے گزر گیا۔ گزرتے وقت بھی وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔" لارڈ نے جیب سے رومال نکال کے ہتھیلیاں صاف کیں۔ وہ اپنی اضطرابی کیفیت مخفی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کی نظریں اُس کے چہرے پر بدستور جمی رہیں۔

لارڈ نے کہا۔ "اب دوسری رات کا خواب سنیے۔ یہ خواب پہلی رات کے خواب سے زیادہ احمقانہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں

دارالعوام میں بیٹھا ہوں۔ وہاں امورِ خارجہ کے مسائل پر اجتماعی مشورت ہو رہی تھی۔ اِس مشورت پر نہ صرف ملک بھر کی بلکہ تمام دُنیا کی نگاہیں مرکوز تھیں۔ حکومت اپنی خارجی حکمتِ عملی میں کچھ تبدیلی چاہتی تھی۔ اس تبدیلی کے دُوررَس اثرات مرتب ہونے تھے۔ یہ ایک تاریخی موقع تھا۔ دارالعوام کا ایوان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیرونی ملکوں کے سفرا بھی موجود تھے اور برطانوی عوام کی بھی ایک بڑی تعداد کارروائی سننے آگئی تھی۔ گیلریاں سامعین سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے اچانک حکم ملا کہ میں اجتماع کی سب سے اہم تقریر کروں۔ میں نے اپنی تقریر نہایت غور و فکر کے بعد تیار کی تھی۔ ڈاکٹر آڈلین! آپ جانتے ہوں گے، دُنیا میں اہم شخصیات کے دشمن بہت ہوتے ہیں چنانچہ اجتماع میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو مجھ سے حسد رکھتے ہیں۔ میں نے نہایت کم عمری میں اپنی مستعدی، ذہانت اور مسلسل محنت سے ایک خاص مقام حاصل کیا ہے۔ بیشتر افراد اس مقام سے محروم رہنے پر قناعت کر لیتے ہیں مگر میں اپنا حاصل کیا ہوا مقام کھونا پسند نہیں کرتا لہٰذا میں نے عزمِ صمیم کر لیا تھا کہ میری تقریر نہ صرف موقع کے اعتبار سے اہم ہوگی بلکہ اسے میرے حریفوں کے لیے تازیانۂ عبرت کا درجہ بھی حاصل ہوگا۔ مجھے اس احساس سے بے حد مسرت ہو رہی تھی کہ آج ساری دُنیا میرے ہونٹوں پر معلق ہو کر رہ جائے گی۔ میں ایک شان سے کھڑا ہوا۔ آپ کو کبھی پارلیمنٹ میں جانے کا موقع ملا ہے؟ اگر ملا ہے تو آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ لوگ تقریروں کے دوران کس طرح سرگوشیاں کرتے ہیں اور کاغذات سرسراتے ہیں لیکن یقین کیجیے میں کھڑا ہوا تو وہاں قبر جیسی خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے تقریر کا آغاز کیا۔ اچانک میری نگاہ پست قد گری فتھ پر پڑی۔ اُس نے نہایت گستاخانہ انداز میں منہ سے زبان نکال کر مجھے چڑایا۔ ڈاکٹر آڈلین! ممکن ہے کبھی آپ نے وہ گانا سُنا ہو جو گھٹیا اور پست لوگوں میں گایا جاتا ہے۔ اُس کا عنوان ہے ”سائیکل دو افراد کے لیے بنی ہے“۔ گزشتہ چند برسوں میں یہ گانا بہت مقبول ہوا ہے۔ میں تقریر چھوڑ کے یہی گانا گانے لگا۔ آپ سمجھے میں نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟ گری فتھ کو محض یہ جتانے کے لیے کہ میں اُس سے کس بُری طرح متنفر ہوں۔ میں نے گانا شروع کیا تو سامعین سخت حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ مخالف بنچوں سے داد و تحسین کا شور بلند ہوا۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُنھیں خاموش کیا اور گانے کے ابتدائی بول ختم کر کے درمیانی بول شروع کیے۔ یہ بول نہایت سکوت سے سُنے گئے۔ تعریفوں کی آواز نہیں آئی۔ میں نے محسوس کیا کہ گانا بہتر طریقے سے نہیں گایا جا رہا ہے۔ میں پریشان ہونے لگا۔ میری آواز باریک اور سُریلی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے مناسب داد دیں۔ میں نے اختتامی بول شروع کیے۔ پارلیمنٹ کے تمام ارکان ہنسنے لگے۔ اُن کے قہقہے جنگل کی آگ کی طرح سارے ایوان میں پھیل گئے۔ سفرا، گیلریوں میں بیٹھے ہوئے معززین، مخصوص نشستوں پر فروکش خواتین، اخباری نمائندے اور عوام، سب کے سب بُری طرح ہنس رہے تھے۔ صرف وہ وزیر بُتوں کی طرح ساکت و صامت تھے جن کی نشستیں میری پُشت پر تھیں۔ میں نے ایک نظر اُن کی طرف دیکھا پھر اپنی حماقت کی سنگینی مجھ پر واضح ہو گئی۔ میں سارے زمانے کے سامنے ایک احمق کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اِس مصیبت اور پریشانی کے عالم میں مَیں نے بادلِ ناخواستہ یہ فیصلہ کیا کہ اب مجھے استعفا دے دینا چاہیے۔ اُسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں بستر پر ہانپ رہا تھا۔“

لارڈ کا شاہانہ اندازِ گفتگو مفقود ہو چکا تھا۔ اُس کے چہرے پر زردی، جسم میں لرزش اور حواس میں بے ترتیبی تھی۔ اُس نے بہت مشکل سے حواس پر قابو پایا اور کپکپاتے ہونٹوں پر تبسم کی ایک لکیر بنائی۔ ”ڈاکٹر آڈلین! یہ پورا معاملہ انتہائی حماقت آمیز تھا میں بھی اس سے محظوظ ہوا اور اسے تقریباً بھول گیا۔ دوسرے دن سہ پہر کو میں بہت اطمینان سے پارلیمنٹ گیا۔ میرا موڈ بہت خوش گوار تھا۔ وہاں ایک خشک اور بے رنگ بحث ہو رہی تھی مگر مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ بحث سننے کے بجائے میں نے کچھ دستاویزیں پڑھیں۔ اُن دستاویزوں کو میری توجہ کی ضرورت تھی۔ پڑھتے وقت کسی سبب سے مجھے اوپر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اوپر گری فتھ بول رہا تھا۔ اُس کی آواز اور شکل و شباہت میرے لیے سخت ناگوار تھی۔ لوگ توجہ سے اُس کا بیان سن رہے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کہے گا جو توجہ کے قابل ہوگی۔ میں نے گردن جھکا کر کاغذات پر نظر جمانے کی کوشش کی۔ معاً گری فتھ نے یہ گانا گایا ”سائیکل دو افراد کے لیے بنی ہے“۔ میں نے غیر ارادی طور پر سر اُٹھا کے اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ ایک شرارت آمیز مسکراہٹ سے میرا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ میں نے پریشانی سے اپنے دونوں کندھے اُچکائے۔ یہ بہت بڑی جسارت تھی کہ ویلز کے علاقے کا ایک معمولی رکن مجھے اہانت آمیز نظروں سے دیکھے۔ یہ اتفاق بھی عجیب تھا کہ گری فتھ نے وہی گانا گایا جو میں خواب میں گا چکا تھا۔ میں سر جھٹک کے دوبارہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پڑھنے لگا مگر اب



عباسی خلیفہ منصور دوسری شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُس کی پہلی بیوی نے اُس سے کہا کہ ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں ہیں۔ خلیفہ نے اُس کی تسلی کے لیے امام ابو حنیفہ کو بلوایا اور اُن سے دریافت کیا: "مسلمان کے لیے کتنی بیویاں جائز ہیں؟" امام نے کہا "چار" خلیفہ کی پہلی بیوی قریب ہی پردے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ خلیفہ نے اُس کی طرف دیکھ کے بلند آواز میں کہا "حضرت ابو حنیفہ کی رائے سن لی؟" امام ابو حنیفہ فوراً بولے "مگر خلیفہ منصور کے لیے ایک سے زیادہ شادیاں جائز نہیں ہیں" خلیفہ نے دریافت کیا "یا امام کیوں؟" امام نے کہا "تم نے جس انداز سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا ہے اور جس لہجے میں گفتگو کی ہے، اُس سے ہم قیاس کرتے ہیں کہ تم اس کے ساتھ عدل نہیں کرتے لہٰذا ہمارا حکم یہ ہے کہ تم اسی پر قناعت کرو۔"

کا غذات کا ایک حرف بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میری طبیعت مضمحل تھی۔ کیا میرے پہلے اور دوسرے دونوں خوابوں سے گریس تھورپ کی مطابقت محض اتفاقی تھی؟ یا وہ بھی بعینہٖ وہی خواب دیکھ رہا تھا جو مجھے نظر آرہے تھے۔ سوچتے سوچتے میرا سر چکرا گیا۔ مجھے یہ سوچ احمقانہ معلوم ہوئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ آیندہ اِس موضوع پر اپنی توجہ صرف نہیں کروں گا۔" مطب پر خاموشی طاری ہو گئی۔ لارڈ متفکر نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ ٹھیر کے اُس نے کہا: "لوگوں کے اکثر خواب عموماً بیزار کن ہوتے ہیں۔ میری بیوی کو بھی خواب دکھائی دیتے تھے۔ وہ مجھے جزئیات کے ساتھ اپنے خواب سناتی تھی۔ میں پاگل سا ہونے لگتا تھا۔"

ڈاکٹر نے ہلکے سے تبسم سے کہا: "لیکن مجھے آپ کے خواب سن کر کوئی بیزاری نہیں ہوئی۔"

"اب میں آپ کو اپنا تیسرا خواب سناتا ہوں۔" لارڈ نے کہا۔ "یہ میں نے دوسرے خواب کے کچھ دنوں بعد دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں لائم ہاؤس کے شراب خانے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں داخلے کے بعد سے میں نے کبھی کسی شراب خانے کا رُخ نہیں کیا اور اب تو کسی عام شراب خانے میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر بھی وہ جگہ اور وہ سڑک مجھے جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ میں نے شراب خانے میں جا کر یہ محسوس کیا جیسے وہ میرا گھر ہو۔ میں اُس کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کمرہ شاید پرائیویٹ روم یا سیلون بار کہلاتا تھا۔ وہاں ایک بڑا آتش دان روشن تھا۔ ایک طرف چمڑے کی ایک بڑی سی آرام کرسی پڑی تھی دوسری طرف ایک صوفا تھا اور لوہے کی ملبانی کے ساتھ ساتھ شراب کا کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اوپر ایک کھڑکی سی تھی۔ اُس سے لوگ سارے شراب خانے کا منظر دیکھ سکتے تھے۔ دروازے کے پاس سنگِ مرمر کی ایک گول میز تھی۔ میز کے بازوؤں میں دو آرام کرسیاں رکھی تھیں۔ سنیچر کی رات تھی اس لیے تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ کمرہ بے حد روشن تھا مگر فضا میں دھوئیں کے مرغولے تیر رہے تھے۔ اُن کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں وحشیوں یا عام شہریوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھا۔ میرے سر پر ٹوپی تھی اور گردن میں ایک رومال بندھا تھا۔ زیادہ تر لوگ نشے میں دُھت تھے۔ اُن کی صحبت مجھے بھی سرور پہنچا رہی تھی۔"

"شاید وہاں گراموفون یا ریڈیو بج رہا تھا اور آتش دان کے عین سامنے دو عورتیں ایک پُر جوش ناچ کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اُن کے چاروں طرف تماشائیوں کا مجمع تھا۔ وہ تھرکنے لگا رہے تھے تعریفیں کر رہے تھے اور خود بھی گا رہے تھے۔ میں بھی یہ تماشا دیکھنے کچھ قریب گیا۔ پہلو سے کسی آدمی نے مجھ سے کہا: "بل! تھوڑی سی پی لو۔" میز پر گلاس رکھے تھے۔ اُن میں گہرے رنگ کی شراب بھری ہوئی تھی۔ وہ شراب خانہ برآؤن ایل کہلاتی ہے۔ اُس شخص نے مجھے ایک گلاس پیش کیا۔ میں نے ایک چسکی لے لی، اس لیے کہ وہاں اجنبی لوگوں سے ناچنے والیوں میں سے ایک عورت تھرکتے تھرکتے رُک گئی۔ اس نے بڑھ کر میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور اٹھلا کے بولی کہ یہ میری شراب ہے۔ میں نے جواب دیا، میں بہت شرمندہ ہوں مگر یہ شراب مجھے اس آدمی نے پیش کی تھی اس لیے میں یہ سمجھا تھا کہ یہ اُس کی ہو گی۔ بھی اتنی فراخ دل ہے۔ مجھے ... بولی: اچھا چلو تم بھی پی لو۔ شراب بھی پی لو اور میرے ساتھ رقص بھی کرو۔ آؤ۔ یہ کہتے ہی اس نے مجھے اپنی ... تک نہ کر سکا۔ ہم دونوں رقص کرنے لگے اور ... رقص کر رہے ہیں۔ رقص کے بعد میں نے دیکھا کہ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوں۔ وہ عورت میری آغوش میں ہے۔ ہم دونوں ایک گلاس سے باری باری چسکیاں لے رہے تھے۔ ڈاکٹر آؤلین! میں ایک بات واضح کر دوں، جنسی معاملات نے میری زندگی میں کبھی زیادہ اہمیت اختیار نہیں کی۔ میں نے نوعمری میں شادی کر لی تھی۔ میں ایک امارت با حیثیت نوجوان تھا۔ ایسے نوجوانوں کے لیے یہی بات پسندیدہ بھی جاتی ہے کہ وہ شادی کر لیں۔ میں خود بھی بے راہ روی میں پڑنے کے بجائے جنسی جذبے پر بروقت قابو پا لینا چاہتا تھا۔ شادی کے بعد میرے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلے تو مجھے اُن کی پیدائش سے مسرت ہوئی۔ میں اُنھیں خاصا وقت دینے لگا پھر میں نے یہ معاملہ ترک کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ رفتہ رفتہ میری مصروفیت بڑھتی گئی، پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ مجھے جنسی تقاضے کی نہ خلش رہی، نہ فکر۔ جو زندگی میں

گزار رہا تھا، اُس میں جنسی طور پہ آلودہ ہونا، ہزاروں رُسوائیوں کو دعوت دینا تھا۔ کسی سیاست داں کے اعمال نامے میں عورتوں کے نام نہ ہوں تو لوگ اُسے بہت اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ خود مجھے ایسا آدمی سخت ناپسند ہے جو عورتوں کے چکّر میں اپنی زندگی تباہ کر لے۔ ایسے لوگوں سے میں شدید نفرت کرتا ہوں۔ خیر چھوڑیے، ذکر شراب خانے کا تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ ثّامہ میری آغوش میں تھی۔ وہ نہ خوب صورت تھی، نہ نوخیز، نہ کم سن۔ اُسے پکّی عمر کی ایک چھٹی ہوئی فاحشہ کہنا چاہیے۔ اُس نے اپنی فریفتگی سے مجھے حیران کر رکھا تھا۔ وہ بار بار میرے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ پیوست کر دیتی۔ اُس کے منہ سے شراب کی مہک کے علاوہ بُو بھی آ رہی تھی۔ اُس کے دانت بھی سڑے ہوئے تھے۔ مجھے اُس کی اس محبت سے نفرت ہو رہی تھی۔ پھر بھی نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا، میں اُسے جی جان سے پیار کر رہا تھا، اُس پر فدا ہوا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں اچانک میں نے ایک آواز سُنی۔ بہت عمدہ، بہت صحیح۔ پیارے بیٹے! خوب لطف اُٹھاؤ۔ یہ گری فتھ کی آواز تھی۔ میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا، وہ گری فتھ ہی تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اُچھل کر کرسی سے نکل بھاگوں لیکن اُس خوف ناک عورت نے اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔ اُس نے مجھے نکلنے نہیں دیا۔ کہنے لگی، اونہہ اُس کی طرف توجہ نہ دو۔ وہ یہاں کا پُرانا آنے والا ہے، عجیب آدمی ہے، ہر شخص کا معاملہ سونگھنے لگتا ہے۔ گری فتھ نے فوراً عورت سے کہا۔ ہاں ہاں تم اپنا کام جاری رکھو، تمھیں تو دم سے مطلب ہے۔ عورت بُرا سا منہ بنا کے رہ گئی۔ میں سخت پریشان تھا کہ گری فتھ نے مجھے اِس حالت میں دیکھ لیا ہے۔ اُس نے مجھے پیارے بیٹے کہہ کر مخاطب کیا تھا، یہ بات بھی میرے لیے اشتعال کا باعث تھی۔ میں نے ایکا ایکی عورت کو ایک طرف دھکیلا اور اُٹھ کر گری فتھ کا مقابلہ کرنے لگا۔ میری زبان پہ یہ الفاظ تھے کہ میں تمھیں نہیں جانتا، نہ مجھے یہ جاننے کی خواہش ہے کہ تم کون ہو۔ گری فتھ نے جواب دیا مگر میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں پیارے بیٹے! میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم یا تو اپنی رقم واپس لے لو یا اس عورت سے پورا لطف اُٹھاؤ۔ میز پہ بیئر کی ایک بوتل رکھی تھی۔ میں نے بوتل اُٹھائی اور پوری قوت سے اُس کے سر پہ دے ماری پھر اپنا جسم میں نے اس طرح جھٹکا کہ میری آنکھ کھل گئی۔"

ڈاکٹر آڈلین نے ہنکاری بھری۔ "اِس نوعیت کے خواب ناقابلِ فہم نہیں ہوتے۔ یہ ایک فطری انتقام ہے جو آدمی اُن لوگوں سے لیتا ہے جن سے کھلم کھلا نہیں لے سکتا۔"

"بہر حال یہ خواب تھا نہایت طفلانہ اور شرم ناک۔ مجھے آپ کو نہیں سُنانا چاہیے تھا لیکن سُنانا پڑا کیوں کہ اس خواب کے دوسرے دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سُنیے۔ اُس روز مجھے کچھ عجلت تھی، میں تیزی سے پارلیمنٹ کی لائبریری میں داخل ہوا۔ وہاں کرسی پہ بیٹھتے وقت میں ایک بات نہیں دیکھ سکا۔ گری فتھ ایک قریبی کرسی پہ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی موجودگی مجھے اُس وقت معلوم ہوئی جب ایک تیسرے شخص کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ شخص گری فتھ سے کہہ رہا تھا کہ گری فتھ! آج تم بہت پریشان اور اُداس نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟ گری فتھ نے جواب دیا، میرے سر میں شدید درد ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے میرے سر پہ بوتل توڑ دی ہو۔" لارڈ کا چہرہ نڈھال اور زرد ہو رہا تھا۔ "گری فتھ کا یہ جملہ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خواب صحیح تھا۔ گری فتھ کو بھی وہی چیز نظر آ رہی تھی جو میں دیکھ رہا تھا اور میری طرح اُسے بھی اپنے خواب یاد تھے۔"

"اِسے ایک اتّفاق کہنا چاہیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

لارڈ ڈاکٹر کا تبصرہ سُنی اَن سُنی کر کے بولا۔ "گری فتھ بوتل کا ذکر کرتے وقت اپنے دوست کے بجائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر شکایت اور ناراضی بھی تھی۔"

ڈاکٹر نے دریافت کیا۔ "بار بار صرف ایک شخص آپ کے خوابوں کا مرکز کیوں ہوتا ہے؟ آپ کے پاس اِس امر کا کوئی جواز ہے؟"

"میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے فوراً محسوس کر لیا کہ اُس کا مریض جھوٹ بول رہا ہے۔ اُس نے پنسل سے بلاٹنگ پیپر پہ تین چار ٹیڑھی لکیریں کھینچیں۔ اُس کے اکثر مریض بے حد طویل وقفے کے بعد راہِ راست پہ آ کے سچ بولتے تھے۔ یہ بات انھیں بہت دیر میں محسوس ہوتی تھی کہ جب تک وہ سچ نہیں بولیں گے، ڈاکٹر اُن کے علاج سے قاصر رہے گا۔ ڈاکٹر نے لارڈ کو کریدا... "یہ خواب آپ نے کوئی تین ہفتے پہلے دیکھا تھا۔ اِس کے بعد بھی آپ نے کوئی خواب دیکھا؟"

"جی ہاں دیکھا۔ کوئی رات خواب کے بغیر نہیں گزرتی۔"

"اور ہر خواب میں گری فتھ ہی نظر آتا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ حقیقت ہے۔"

ڈاکٹر نے بلاٹنگ پیپر پہ کچھ اور لکیریں بنائیں۔ اُس کی خواہش تھی کہ لارڈ کے احساسات پہ کمرے کی خاموشی، نمی اور دھیمی روشنی کا مکمل اثر پڑے۔

لارڈ نے اپنے آپ کو کرسی پہ تقریباً گرا لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کی نگاہیں اُس کی نگاہوں سے متصادم نہ ہو سکیں۔ "ڈاکٹر آڈلین! میرا کچھ علاج کیجیے، ضرور کیجیے۔ میں اِن پریشانیوں سے تنگ آ چکا

ہوں۔ اگر یہ خواب مجھے اسی طرح نظر آتے رہے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اب تو مجھے نیند کے تصور سے وحشت ہونے لگی ہے۔ میں تین راتوں سے مسلسل جاگ رہا ہوں۔ بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا ہوں، نیند طاری ہونے لگتی ہے تو کوٹ پہن کر ٹہلنے لگتا ہوں۔ اتنا ٹہلتا ہوں، اتنا ٹہلتا ہوں کہ میری ٹانگیں تھک جاتی ہیں لیکن ڈاکٹر! مجھے نیند کی ضرورت ہے۔ مجھے نیند آنی چاہیے، نیند۔ اپنے منصبی فرائض انجام دینے کے لیے مجھے آرام کی ضرورت ہے، مجھے اپنے حواس و افعال پر مکمل قابو ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے آرام چاہیے لیکن آرام نصیب نہیں ہوتا۔ میں جیسے ہی سوتا ہوں، خواب شروع ہو جاتے ہیں اور خوابوں میں وہ ہمیشہ ہوتا ہے، وہ ذلیل، پست قد گری فتھ۔ وہ میرا مذاق اڑاتا ہے، مجھ سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ میرے لیے اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک شیطانی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ یہ ایک بہیمانہ اذیت ہے، ایک مسلسل عذاب ہے، ایک کڑی سزا ہے جو میں بھگت رہا ہوں۔ ڈاکٹر آڈلین! میں جیسا خواب میں دکھائی دیتا ہوں، یقین کیجیے، ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میرے کردار کا اندازہ خوابوں سے لگانا ناانصافی ہوگی۔ آپ کسی بھی شخص سے میرے بارے میں معلوم کر لیں، ہر شخص یہی کہے گا کہ میں ایک دیانت دار، راست باز اور نفیس انسان ہوں۔ عوامی سطح ہو یا نجی، لوگ میرے کردار پر انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ میری کوئی آرزو ہے تو صرف یہ کہ ملک و قوم کی نمایاں خدمت انجام دیتا رہوں اور ملک و قوم کی عظمت برقرار رکھوں۔ میرے پاس دولت بھی ہے، مرتبہ بھی۔ میں بہت سے کم حیثیت لوگوں کے مانند حرص و طمع کا غلام نہیں ہوں لہٰذا میرے کردار میں پستی آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ناممکن بات ہے۔ میں دعوا کرتا ہوں کہ کسی اعزاز یا کسی ذاتی مفاد کی ہوس مجھے ملکی فرائض انجام دینے سے گمراہ نہیں کر سکتی، بال برابر بھی گمراہ نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا موجودہ مقام پانے کے لیے سب کچھ قربان کر دیا ہے، سب کچھ لٹا دیا ہے۔ میرا نصب العین عظمت حاصل کرنا ہے اور عظمت میری دسترس سے دور نہیں مگر اب میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ میں ویسی عیاش، قابلِ نفرت، بزدل اور درندہ صفت مخلوق نہیں ہوں جیسی وہ پست قد مجھے دیکھتا ہے۔ ابھی میں نے آپ کو صرف تین خواب سنائے ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ مزید خوابوں میں اس آدمی نے مجھے عجیب عجیب حالتوں میں لتھڑا ہوا دیکھا ہے ـــ وہ حالتیں وحشیانہ بھی ہیں، خوف ناک بھی اور شرم ناک بھی۔ میری جان پر بھی بن جاتی تو یہ باتیں بیان نہ کرتا مگر وہ شخص یہ تمام شرم ناک باتیں یاد رکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو تضحیک ہوتی ہے، اس سے میں شرمندہ اور مغلوب ہو کے رہ جاتا ہوں۔ اکثر میں نے سوچا کہ اس



سے گفتگو کروں، پھر خیال آیا کہ یہ کوشش فضول ہوگی۔ اس نے مجھے انتہائی ذلیل کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایسے کام کوئی بھی باعزت انسان نہیں کر سکتا۔ جو ایسا کرتے ہیں، وہ معاشرے سے خارج کر دیے جاتے ہیں اور اکثر انھیں سزا بھی ہو جاتی ہے۔ گری فتھ نے میری زبان سے فحش کلمات تک سنے ہیں۔ اس نے مجھے ایک تو مضحکہ خیز حالات میں دیکھا ہے، دوسرے باغیانہ سرگرمیوں میں بھی ملوث پایا ہے۔ وہ مجھ سے شدید نفرت کرتا ہے اور اب تو اپنی زیرِ لب شیطانی مسکراہٹ سے نفرت کا اظہار بھی کرنے لگا ہے۔ ڈاکٹر آڈلین! اگر آپ نے میرے لیے کچھ نہ کیا تو یقین کیجیے، یا تو میں اپنی جان لے لوں گا یا اُسے مار ڈالوں گا۔"

ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا: "اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو اُسے جان سے نہ مارتا۔ آپ کو تو معلوم ہے، اس ملک میں کسی بھی ہم جنس کو مارنے کے نتائج کتنے عبرت ناک ہوتے ہیں۔"

"نتائج سے اگر آپ کی مراد پھانسی ہے تو مطمئن رہیے۔ مجھے پھانسی نہیں ہوگی۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ اسے میں نے مارا ہے۔ میرے خوابوں نے مجھے جان لینے کا ایک محفوظ طریقہ سکھا دیا ہے۔ میں نے خواب میں اس کے سر پر بوتل ماری تھی تو وہ حقیقتہً سر درد میں مبتلا ہو گیا تھا۔ گویا جو کچھ اسے خواب میں دکھائی دیتا ہے، اس کے اثرات اس کے جسم پر بیداری کے بعد بھی قائم رہتے ہیں۔ اب کے میں اسے بوتل نہیں ماروں گا۔ میں خواب میں خنجر یا پستول لے کر جاؤں گا اور موقع ملتے ہی اسے سور کی طرح ذبح کر دوں گا یا گولی سے کتے کی موت ماروں گا یا اس کا دل چھید دوں گا پھر مجھے اس شیطانی عذاب سے ہمیشہ کے لیے

نجات مل جائے گی۔"

ڈاکٹر کے بجائے کوئی اور ہوتا تو سوچتا کہ لارڈ پاگل ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر برسوں سے روح کے زخمیوں کا علاج کر رہا تھا۔ وسیع تجربے سے اُسے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ بعض دفعہ ایک عاقل اور ایک مجنوں کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ بسا اوقات وہ اشخاص جو بظاہر ذی فہم اور صحت مند نظر آتے ہیں، جو تصورات سے خالی دکھائی دیتے ہیں، عام زندگی میں اپنے متعلقین کو خوش رکھتے ہیں اور اپنے منصبی فرائض بخوبی انجام دیتے ہیں، انھیں اعتماد میں لیا جائے، اُن کا نقاب اُتار دیا جائے تو وہ خوف ناک ذہنی بے توازنی کا شکار ملیں گے۔ اُن کے ذہنی تصرفات اور تخیلی کائنات میں بے انتہا وسعت نظر آئے گی۔ انھیں مخبوط الحواس کہنا غلط نہ ہوگا۔ انھیں پاگل خانے بھیج دیا جائے تو پاگل خانہ ناکافی معلوم ہوگا لیکن لارڈ کا معاملہ ڈاکٹر کے لیے عجیب و غریب تھا۔ کسی معقول شخص کو محض اعصاب جھنجوڑ دینے والے خوابوں کی بنیاد پر پاگل کیسے قرار دے دیا جائے۔ ڈاکٹر نے اب تک جتنے امراض دیکھے تھے، لارڈ کا مرض اُن سے کئی گنا پیچیدہ نظر آتا تھا۔ اُسے تشویش تھی کہ علاج کے جو طریقے اُس نے گزشتہ مریضوں کے لیے استعمال کیے تھے، وہ لارڈ کے لیے کارگر ثابت ہوں گے یا نہیں۔ اُس نے لارڈ سے کہا: "محترم! کیا آپ نے کسی اور نفسیاتی معالج سے مشورہ لیا ہے؟"

"نفسیاتی معالج سے تو نہیں، اپنے خاندانی معالج ڈاکٹر آگسٹس سے مشورہ لیا تھا لیکن اُن سے میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مجھے بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ کام کی زیادتی کے باعث میرا دماغ مضمحل ہے لہٰذا مجھے آرام کے لیے سمندری سفر پر چلا جانا چاہیے۔ یہ ایک بیوقوفی کی بات تھی۔ سمندری سفر کے لیے مجھے وزارت چھوڑنی پڑتی اور موجودہ دور میں وزارت چھوڑنے کا میں تصور تک نہیں کر سکتا۔ آج کل بین الاقوامی حالات پر مسلسل توجہ کی ضرورت ہے۔ میں حکومت کے لیے ناگزیر سا ہوں۔ ملک کے مستقبل کا انحصار میرے عملی اقدامات پر ہے۔ ڈاکٹر آگسٹس نے مجھے سکون کی دوائیں دی تھیں، میں نے وہ کھائیں مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُنھوں نے ٹانک بھی دیے تھے۔ وہ سکون کی دواؤں سے زیادہ بے سود نکلے۔ مجھے تو وہ بڈھا بالکل بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ کو اپنے خوابوں میں ایک ہی شخص نظر آتا ہے، گری تھ۔ کیا مجھے آپ اِس کا کوئی سبب بتا سکتے ہیں؟"

"آپ یہ سوال دوبارہ کر رہے ہیں۔ میں اِس کا جواب دے چکا ہوں۔"

"ابھی آپ نے سزا دینے کی بات کہی تھی۔ بھلا گری تھ ہی آپ کو سزا دینا کیوں چاہتا ہے؟"

"مجھے علم نہیں۔" لارڈ نے نظر چُرا کے کہا۔

ڈاکٹر کو اُس کا جواب جھوٹ معلوم ہوا۔ اُس نے پوچھا: "آپ نے کبھی اُسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

"کبھی نہیں۔"

لارڈ کا جسم بے حرکت تھا لیکن ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ "کبھی نہیں" کہتے وقت اُس کے جسم میں خوف کی ایک لہر گزر گئی ہے۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ اُس کے سامنے ایک مغرور آدمی بیٹھا ہے اور یہ تاثر دے رہا ہے کہ ڈاکٹر! تمھارے سوالات میرے لیے ہتک کا باعث ہیں، ساتھ ہی وہ مغرور شخص شکنجے میں پھنسا ہوا ایک خوف زدہ جانور بھی معلوم ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر نے آگے جھک کے اپنی آنکھوں کی پوری قوت لارڈ کی آنکھوں پر صرف کر دی: "جناب! کیا آپ کو اپنے جواب پر پختہ یقین ہے؟"

"پختہ یقین ہے۔ آپ شاید یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہم دونوں کے راستے قطعاً مختلف ہیں۔ میں یہ بات دوبارہ نہیں کہنا چاہتا کہ میں تاجِ برطانیہ کا ایک غیر معمولی وزیر ہوں۔ گری تھ لیبر پارٹی کا ایک گمنام ممبر ہے۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی معاشرتی تعلق نہیں۔ وہ ایک نہایت ادنا درجے کا شخص ہے۔ اُسے اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے کہ میں پارلیمنٹ کے ایوانوں میں جاؤں تو اُس سے ملاقات کرنا پسند کروں۔ سیاسی اعتبار سے بھی ہمارے مناصب بہت دور اور بہت علیحدہ ہیں۔ ہمارے مابین کوئی مشترک قدر سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔"

"دیکھیے جناب!" ڈاکٹر نے کہا: "جب تک آپ مجھے ہر بات سچ سچ نہیں بتائیں گے، میں آپ کے لیے کوئی علاج تجویز نہیں کر سکوں گا۔"

لارڈ کی بھویں اُوپر چڑھ گئیں۔ "میں اس امر کا عادی نہیں ہوں کہ کوئی شخص میرا بیان مشتبہ سمجھے۔" اُس کی آواز میں غصہ تھا۔ "ڈاکٹر آکولین! اگر میرے ساتھ آپ یہ رویّہ اختیار کریں گے تو آپ کا مزید وقت لینا میرے لیے اپنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ براہِ کرم میرے سیکرٹری کو اپنی فیس سے آگاہ کر دیجیے۔ وہ جلد از جلد چیک بھیجنے کا انتظام کر دے گا۔"

ڈاکٹر کے چہرے سے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس نے لارڈ کی بات سُنی ہی نہ ہو۔ وہ مستقل مزاجی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ "کیا آپ سے کوئی ایسا عمل سرزد ہوا ہے جسے گری تھ اپنا نقصان تصور کرتا ہو؟" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

لارڈ جھجک گیا۔ کچھ دیر تک وہ نظریں ہٹا کے الگ دیکھتا رہا لیکن شاید ڈاکٹر کی نگاہوں میں کوئی قوت پوشیدہ تھی۔ لارڈ دوبارہ اُس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا: "وہ نہایت ذلیل اور دوسرے درجے کا آدمی ہے۔"

"ان الفاظ میں تو آپ اُس کا تعارف کرا ہی چکے ہیں، کوئی اور بات بتائیے؟"

لارڈ نے سرد آہ بھری جیسے وہ شکست کھا گیا ہو۔ ڈاکٹر نے اندازہ لگا لیا کہ اب وہ اصل بات کہنے والا ہے، مزید حجت نہیں کرے گا۔ ڈاکٹر نظریں جھکا کے پھر رائٹنگ پیپر پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا۔ دو یا تین منٹ تک سکوت طاری رہا۔ آخر لارڈ نے زبان کھولی: "ڈاکٹر! میں چاہتا ہوں، آپ کو ہر وہ بات بتا دوں جس سے آپ کچھ استفادہ کر سکیں۔ ابتدا میں یہ باتیں میں نے نہیں بتائی تھیں کیونکہ انھیں میں غیر اہم سمجھتا تھا۔ بہر حال سنیے۔ گری فتھ نے گزشتہ انتخابات میں کسی طرح ایک نشست حاصل کر لی پھر اُس نے فوراً اپنی ذلیل حرکتیں شروع کر دیں۔ اُس کا باپ ایک معمولی کان کن تھا۔ گری فتھ خود بھی بچپن میں یہی کام کر چکا ہے۔ اس کے بعد وہ لبرڈ کے اسکولوں میں ٹیچر بھی رہا پھر اخبار نویس بن بیٹھا۔ وہ ایک ناپختہ دانش ور ہے۔ ایسے دانش ور، اگر انھیں دانش ور کہہ لیا جائے، محنت کش طبقے میں جبری تعلیم کے طفیل برآمد ہوتے ہیں۔ ان افراد کا علم ناکافی ہوتا ہے، ان کے پاس کچھ الٹے سیدھے خیالات اور ناقابلِ عمل منصوبے ہوتے ہیں۔ گری فتھ چہرے سے ایک مریل، دبلا پتلا اور فاقہ زدہ آدمی نظر آتا ہے۔ شکل و شباہت سے بھی نہایت ذلیل معلوم ہوتا ہے۔ نہ جانے آج کل ایوان کے ارکان لباس کی طرف سے بے توجہی کیوں برت رہے ہیں مگر یقین کیجیے، گری فتھ سب سے حقیر، سب سے گندہ لباس پہنتا ہے۔ اُس کا کالر میلا، جیکٹ ہوتا ہے۔ اُس کی ٹائی کبھی درست بندھی ہوئی نہیں ہوتی۔ اُسے دیکھ کر ہمیشہ یہ لگتا ہے جیسے وہ ایک مہینے سے نہایا بھی نہ ہو۔ اُس کے ہاتھ ہر وقت گندے رہتے ہیں۔ لیبر پارٹی کے اگلی نشستوں پر بیٹھنے والے دو یا تین ممبر کچھ لائق معلوم ہوتے ہیں، ان کے سوا ایک بھی ممبر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اندھوں کی سلطنت میں کانے کو بادشاہی مل گئی ہے، اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ گری فتھ کو رائے ظاہر کرنے کا تھوڑا بہت سلیقہ ہے، وہ مختلف موضوعات پر بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اُسے کچھ سطحی معلومات بھی ہیں۔ لیبر پارٹی اسی کو تقریر کے لیے کھڑا کر دیتی ہے۔ ایک دن کا واقعہ سنیے۔ اس نے امورِ خارجہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا پھر



کنواروں کے لیے

ایک شخص کی بیوی نے ٹیلی فون پر اُس سے کہا: "ڈیئر! اگر تم برا نہ مانو تو گھر واپس آتے ہوئے پلیس ریستوراں میں رک سکتے ہو؟ میں وہاں رات کے کھانے پر تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

ٹی وی ٹھیک کرنے والے سے بوڑھی خاتون نے کہا: "بھئی اب ٹی وی بالکل صحیح کام کر رہا ہے۔ دراصل ہماری عینکیں آپس میں بدل گئی تھیں۔"

"کیا آپ کے پاس دُوربین ہے؟" پہلے شوہر نے پوچھا۔
"جی ہاں۔ لیکن اُسے میری بیوی نے کہیں چھپا کر رکھ دیا ہے۔" دوسرے شوہر نے کہا۔

ایک صاحب ناشتے کی میز پر اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اُن کی بیوی نے جلے بھنے انداز میں کہا: "یہ تمھارے ساتھ بڑی مشکل ہے۔ تم ہمیشہ اپنی چھوٹی سی دُنیا میں گم رہتے ہو۔ وہی مشرقِ وسطیٰ کا بحران، مشرقِ بعید کے مسائل، افریقہ کے ہنگامے، یورپ کی اقتصادی مشکلات، چین کی اندرونی حالت، جنوبی ایشیا میں سیاسی تبدیلی۔ جب دیکھو اپنی اسی چھوٹی سی دُنیا میں گم، ہونہہ!"

"ہر صبح میری بیوی اور کافی ایک ساتھ کھولنا شروع کر دیتے ہیں۔"

محمد عارفین مراد آبادی کی تاک جھانک

مجھ سے اُلٹے سیدھے پریشان کن سوالات کرنے لگا۔ میں نے تحمل کا ثبوت دیا لیکن ایک موقع پر اُسے اچھی طرح ڈانٹ پلا دی۔ میں نے کہا کہ صاحب زادے، تم ابھی نو آموز ہو، نوشتہ ہو۔ ڈاکٹر! وہ اسی برتاؤ کا مستحق تھا۔ مجھے اُس سے شروع سے دلی بغض ہے۔ اُس کا سوقیانہ اندازِ گفتگو، اُس کی رٹے ہوئے کتے جیسی آواز، اُس کی ذلت آمیز جسمی حرکات، یہ چیزیں ہمیشہ میرے لیے چڑچڑاہٹ اور نفرت کا سبب بنتی تھیں۔ وہ جب بھی بولتا، نہایت شرمساری سے بولتا، نہایت تذبذب سے بولتا، گویا بولنا اُس کے لیے ایک عذاب ہو لیکن کسی اندرونی جذبے کے تحت وہ اپنے خیالات ظاہر کرنے پر مجبور تھا۔ اکثر وہ انتہائی عجیب اور بے معنی باتیں کہہ جاتا۔ ہاں مجھے اعتراف ہے کہ کبھی کبھی اُس کی تقریر سے ایک ذہین مقرر کی صلاحیت بھی جھلکتی تھی لیکن یاد رہے، کبھی کبھی، ہمیشہ نہیں۔ اپنی پارٹی والوں پر اُس کا بڑا اثر تھا۔ وہ اس کی مستعدی اور معلومات سے بڑے متاثر ہوتے تھے۔ ہوا کریں، مجھے تو اُس کی کھوکھلی جذباتیت سے اذیت ہونے لگتی تھی۔ آپ جانتے ہیں، سیاسی بحثوں میں

جذباتیت کی اکثر ضرورت ہوتی ہے اور اُس پر داد بھی ملتی ہے لیکن جناب! جذباتیت کی بھرمار سے کیا حاصل؟ ایک سیاست داں اپنے نصب العین میں قوم کے لیے کچھ اغراض و مقاصد متعین کرتا ہے۔ تو ہیں اغراض و مقاصد ہی سے زیر بحث رکھی جاتی ہیں۔۔۔ سیاست داں خوب صورت الفاظ اور شان دار محاوروں سے اپنے ووٹروں کو مطمئن کرتا ہے کہ وہ کتنے مشکل مراحل سے گزرتا ہوا ملکی و قومی مفاد کے کام انجام دے رہا ہے مگر گری فنچ جیسے لوگ ایک زبردست غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اُن کے بیانات میں خوب صورت الفاظ اور شان دار محاوروں کی محض ظاہری صورت استعمال ہوتی ہے۔ وہ خود کو مثالیہ پسند یعنی آئیڈیلسٹ گردانتے ہیں اور وہی گھسی پٹی باتیں دُہراتے ہیں جو معروف دانش ور مدتوں پہلے کہہ چکے ہیں اور جنھیں سُن سُن کے ہم بیزار ہو چکے ہیں۔ وہی عدم مزاحمت انسانی برادری وغیرہ وغیرہ۔ آپ اِس بیکار بکواس سے باخبر ہوں گے۔ عجیب مصیبت تھی۔ گری فنچ کی باتوں سے اُس کی مزدور جماعت کے لوگ تو متاثر ہوتے ہی تھے، ہماری قدامت پرست پارٹی کے بعض لوگ بھی بسا اوقات چکر میں آجاتے تھے۔ میں نے یہ افواہیں سُنی تھیں کہ جب لیبر پارٹی اقتدار میں آئے گی تو گری فنچ کسی اعلا منصب پر فائز کیا جائے گا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ شاید وزارتِ خارجہ اُسی کے سپرد کر دی جائے گی۔ یہ بات بظاہر مضحکہ خیز تھی مگر ایسا ہو جانا ناممکن بھی نہ تھا۔ ایک دن گری فنچ نے ایوان میں خارجہ مسائل پر بحث چھیڑ دی۔ مجھے وہ بحث اختتام تک پہنچانی تھی۔ اُس نے ایک گھنٹے تقریر کی۔۔۔ موقع اچھا تھا۔ میں نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا اور اُس کی تقریر کے پرخچے اُڑا کے رکھ دیے۔ میں نے اُس کے دلائل کی خامیاں گنوائیں اور اُس کی کم علمی و نا اہلی پر کاری ضربیں لگائیں۔ اُس کا خوب خوب مذاق اڑایا۔ دارالعوام میں سب سے زیادہ تباہ کن چیز مضحکہ ہے۔ میں اُس دن نہایت اچھے موڈ میں تھا۔ میری تقریر سے ایوان کے تقریباً تمام رکن محظوظ ہو رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اُن کے قہقہوں نے میرے جوش میں اور اضافہ کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ میں گری فنچ پر سبقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ حزبِ اختلاف کے ممبر ساکت و جامد بیٹھے تھے لیکن اُن میں سے بھی ایک آدھ قہقہوں میں ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ بھری پارلیمنٹ میں کبھی اتنا بیوقوف کسی کو نہ بنایا گیا ہوگا جتنا میں نے گری فنچ کو بنایا۔ وہ اپنی نشست میں دھنس گیا اور سکڑ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کا رنگ سفید ہوتے دیکھا پھر فوراً اُس نے شرم سے اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا۔ میں تقریر ختم کرکے اپنی نشست پر بیٹھا تو اُسے گویا ہلاک کر چکا تھا۔ میں نے اُس کی عزت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی تھی۔ اب اگر لیبر پارٹی اقتدار میں آ بھی جائے تو اُسے دروازے کے چوب دار سے زیادہ کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اُس روز اُس کا کان کن باپ اور اُس کی ماں دونوں پارلیمنٹ میں اپنے بیٹے کی فتح مندی کا نظارہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ نہ صرف وہ آئے ہوئے تھے بلکہ اُن کے ساتھ گری فنچ کے انتخابی حلقے کی کچھ تعداد بھی موجود تھی۔ اُنھوں نے اپنے لیڈر کی فتح مندی کے بجائے اُس کی مکمل تحقیر دیکھی۔ گری فنچ اپنے حلقے میں بہت کم ووٹوں سے منتخب ہوا تھا۔ پارلیمنٹ میں اُس پر ایسا ایک سانحہ اور گزر جاتا تو آیندہ انتخاب میں اُس کی شکست یقینی ہو جاتی لیکن اِس امر پر غور کرنا میرا کام نہیں تھا۔"

"شاید آپ کو یہ بات ناگوار گزرے یا مبالغہ آمیز معلوم ہو،" ڈاکٹر نے کہا، "مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اُس کی عمر بھر کی کمائی پر پانی پھیر دیا، اُسے کہیں کا نہ رکھا۔"

"کم سے کم آپ تو یہ نہ کہیے۔" لارڈ بولا۔

"آپ نے اُسے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔"

"اِس صورتِ حال کا ذمے دار وہ خود ہے۔"

"کیا آپ کے ضمیر نے اِس سلسلے میں کبھی آپ کو ملامت نہیں کی؟"

"کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر مجھے اُس کے ماں باپ کی موجودگی پہلے معلوم ہو جاتی تو میں اُس کی تحقیر کا عمل ذرا مدھم کر دیتا۔"

اب ڈاکٹر کے پاس مریض سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اُس نے اُس کے علاج کا طریقہ سوچ لیا اور اُسے مشورہ دیا کہ وہ آیندہ جب بھی کوئی خواب دیکھے، بیدار ہوتے ہی اُسے یکسر فراموش کر دے لیکن لارڈ کی مزاحمتی قوت بہت زبردست تھی۔ وہ ڈاکٹر کے مشورے پر عمل نہ کر سکا۔

لارڈ تقریباً چھ بار ڈاکٹر کے مطب آیا۔ ڈاکٹر نے اُسے مشورے دیے لیکن اُس کا علاج نہ کر سکا۔ بدنصیب مریض کو اُس کے خواب حسبِ معمول ہر رات ستاتے رہے۔ اُس کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ علاج کی ناکامی پر لارڈ کو سخت غصہ تھا لیکن اُس نے علاج ترک نہیں کیا کیونکہ اُسے کم سے کم ایک ایسا ہمدرد تو حاصل تھا جس کے سامنے وہ اپنی تکالیف برملا بیان کر سکے۔ ڈاکٹر نے مسلسل ناکامی کے بعد آخر ایک اور طریقہ سوچا لیکن وہ طریقہ اگر لارڈ کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو لارڈ اُسے ہرگز اختیار نہ کرتا۔ لارڈ کے سر پر مکمل اعصاب شکنی کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ خطرے کے سدباب میں

مزید ناگزیر ناممکن تھی۔ ڈاکٹر چاہتا تھا کہ لارڈ کو کوئی ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا جائے جو اس کے بے جا فخر و غرور کے منافی ہو۔ ڈاکٹر اب تک محض مشوروں سے اس کا علاج کر رہا تھا۔ کبھی بار اس نے یہ بات محسوس کی تھی کہ لارڈ اس کے مشوروں پر شک میں مبتلا ہے۔ آخر ڈاکٹر نے اُسے گہری نیند سلانے اور ترغیب دینے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی نرم، دھیمی اور شیریں آواز سے لارڈ کے اعصاب کا علاج شروع کر دیا۔ وہ ایک جملہ بار بار دُہرا رہا تھا۔ لارڈ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہتا۔ اس کی سانس معمول پر رہتی، رگ پٹھے تناؤ اور تشنج سے آزاد ہو جاتے۔

تاں کار ایک روز تنویمی عمل کے دوران ڈاکٹر نے اُسے ترغیب دی "آپ گری فتھ کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ شرمندہ ہیں۔ آپ نے اُس کی ذات کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آپ مزید یہ کہیں گے کہ آپ ہر ممکن تدبیر سے اس نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کریں گے۔"

ان الفاظ نے لارڈ کو چکرا دیا۔ جیسے کسی نے بھرپور طاقت سے اس کے منہ پر گھونسا مار دیا ہو۔ وہ فوراً ڈاکٹر کے تنویمی عمل سے پیچھا چھڑا کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں آگ برسانے لگیں۔ وہ مغلظات بکنے لگا۔ ڈاکٹر ایسی باتیں اکثر مریضوں سے سُن چکا تھا۔ بعض اوقات اس نے نہایت پارسا اور ممتاز خواتین سے فحش گالیاں سُنی تھیں پھر بھی لارڈ کی تلخ کلامی نے اُسے حیرت میں ڈال دیا۔ لارڈ کہہ رہا تھا "میں اس گندی نال کے کیڑے، ویلز کے ذلیل باشندے سے معافی مانگ لوں؟ ایسا کرنے سے پہلے میں خودکشی نہ کر لوں گا؟"

"صرف اسی طریقے سے آپ کا ذہنی توازن بحال ہو سکتا ہے۔"

لارڈ کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں خول سے باہر اُبل پڑیں گی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا لیکن ڈاکٹر اُسے سکون اور صبر و تحمل سے دیکھتا رہا۔ وہ طوفان گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر طوفان گزر گیا۔ کئی جھٹکوں کے اعصاب شکستہ مریض پر تھکن طاری ہو گئی اور وہ پست ہو گیا۔ ڈاکٹر نے درشتی سے کہا "آپ بیٹھ جائیے۔"

لارڈ خوف زدہ سا ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آہ، آہ۔" وہ کراہا۔ "ڈاکٹر! میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ میری مدد کیجیے۔ میں بس ایک منٹ آرام کر لوں، پھر یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

دونوں پانچ منٹ تک بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ لارڈ کو اس کی کیفیات نے ایک خود دماغ اور دہشت زدہ شخص بنا دیا تھا مگر طبعاً اس میں شرافت بھی موجود تھی۔ اپنے مشتعل حواس پر قابو پا کے اُس نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے ساتھ رُوکھے پن سے پیش آیا۔ اپنے الفاظ پر مجھے سخت ندامت ہے۔ آپ کو میرے رویّے سے یقیناً تکلیف پہنچی ہو گی۔ آپ اگر اب میرا علاج بند کر دیں تو یہ قدم حق بجانب ہو گا لیکن اپنی شرافت کی وجہ سے شاید آپ ایسا نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر! میں جتنی دفعہ آپ سے مشورہ لیتا ہوں، مجھے آرام حاصل ہوتا ہے۔ مجھے اس اذیت سے آپ ہی نجات دلا سکتے ہیں۔"

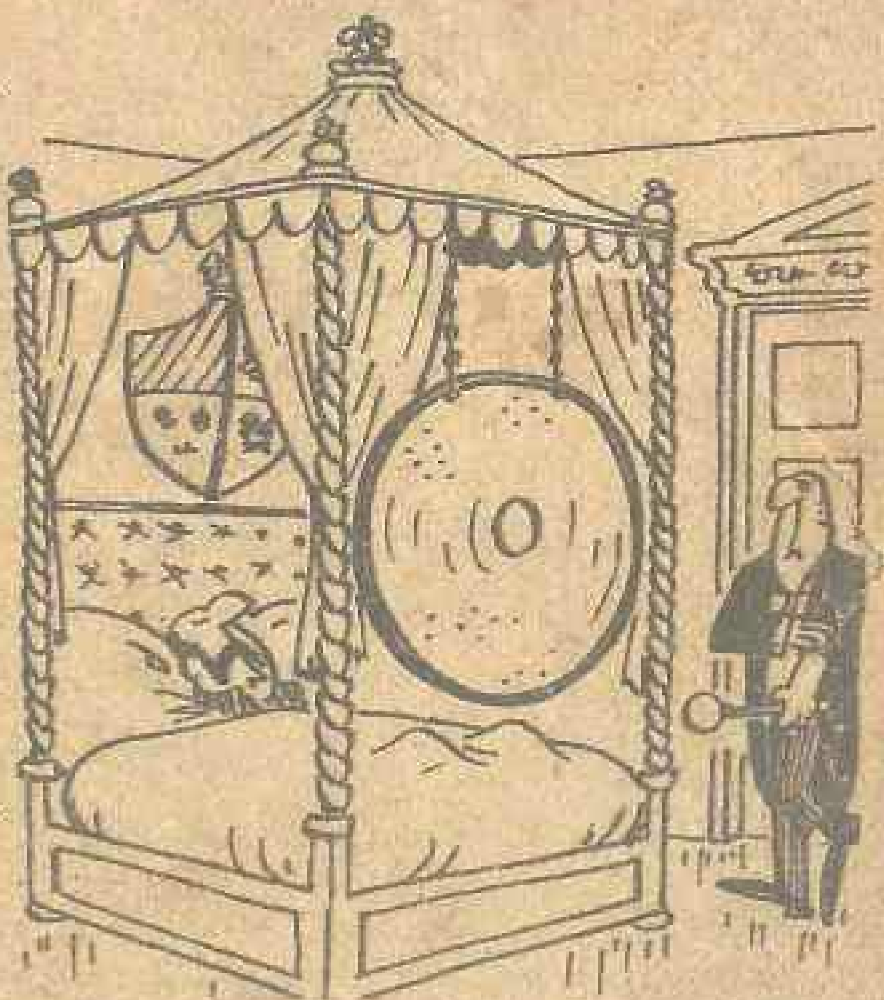
"میں نے آپ کی کسی بات کا بُرا نہیں مانا، قطعی فکر نہ کیجیے۔"

"بہت بہتر۔" لارڈ نے سکون کی سانس لی۔ "لیکن ایک درخواست ہے۔ مجھ سے دوبارہ یہ نہ کہیے گا کہ میں گری فتھ سے معافی مانگ لوں۔"

ڈاکٹر نے کچھ تامّل کیا پھر کہا "میں نے آپ کے مرض پر کافی غور کیا ہے۔ مجھے یہ دعوا تو نہیں ہے کہ میں اسے قطعاً سمجھ چکا ہوں لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کا علاج صرف میرے مجوزہ طریقے میں مضمر ہے۔ ہم سب اپنے اندر بیک وقت مختلف شخصیات رکھتے ہیں۔ اُن مختلف شخصیات میں تصادم بھی ہوتا رہتا ہے لہٰذا آپ کے اندر کی ایک شخصیت نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے کیونکہ آپ نے گری فتھ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ باغی شخصیت ایک سایہ بن کر آپ کو سزا دے رہی ہے۔ آپ کو اپنی بے دردی اور سنگ دلی کا عذاب بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر میں کوئی مذہبی پیشوا ہوتا تو کہتا کہ یہ دراصل آپ کا ضمیر ہے جس نے گری فتھ کا روپ دھار لیا ہے۔ گری فتھ کی شکل میں آپ کا ضمیر آپ کو شرم و ندامت تحقیر و تذلیل کا نشانہ بنا رہا ہے۔"

"میرا ضمیر بے داغ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے گری فتھ کو زندگی بھر کے لیے رُسوا کر دیا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے تو صرف وہ پودا اُکھاڑ پھینکا ہے جو میرے باغیچے کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ مجھے اپنے عمل پر کوئی تاسّف نہیں۔" اتنا کہہ کے لارڈ اچانک رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر نے گھڑی دیکھی۔ ٹھیک چھ بجے تھے۔ عجیب بات تھی کہ لارڈ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر کو خیال آیا کہ اُسے شاید کسی اہم کام کی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ لارڈ کی موجودہ ذہنی حالت اسے ریاست کے اہم امور انجام دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس نے ارادہ کیا کہ وہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم یا کسی اور اہم شخصیت کو لارڈ کی صحیح حالت سے متنبّہ کر دے اور انہیں بتا دے کہ مملکت کے اہم امور لارڈ کے ہاتھوں میں چھوڑ دینا خطرناک ہو



سکتا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ ایک عجیب بات ہوگی، شاید اُسے اپنے خلوصِ نیّت کی صحیح داد بھی نہ مل سکے۔ اُس نے اپنے کندھے زور سے جھٹک دیے اور سوچا سیاست دانوں نے گزشتہ پچیس برس میں دنیا کو کس بدحالی اور انتشار کا شکار بنا دیا ہے اُن میں کبھی ذہنی مریض ہوں گے۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ ملازم حاضر ہوا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "دیکھو اگر لارڈ ماؤنٹ ڈریگو آئیں تو کہہ دینا، مجھے سوا چھ بجے دوسرے مریض کو دیکھنا تھا اس لیے آج انھیں نہ دیکھ سکوں گا۔ کیا شام کا اخبار آگیا ہے؟"

"جاکر دیکھتا ہوں جناب!"

نوکر اخبار دے کر چلا گیا۔ پہلے ہی صفحے پر شہ سرخی کے ساتھ ایک خبر تھی۔ ڈاکٹر چیخ پڑا۔ "وزیرِ خارجہ کی اندوہ ناک موت۔" ڈاکٹر کو جیسے کسی نے سکون کی بلندی سے ایک متلاطم سمندر میں دھکیل دیا۔ سخت صدمہ پہنچا لیکن کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ وہ کئی بار سوچ چکا تھا کہ ایسی ذہنی حالت میں لارڈ خودکشی بھی کر سکتا ہے اخبار میں لکھا تھا کہ "برطانیہ کے وزیرِ خارجہ لارڈ ماؤنٹ ڈریگو ریل کے انتظار میں ایک ٹیوب اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ جیسے ہی گاڑی آئی لوگوں نے انھیں پٹری پر گرتے دیکھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انھیں شاید بے ہوشی کا دورہ پڑا تھا اور وہ اسی عالم میں پٹری پر گر پڑے۔ لارڈ ماؤنٹ ڈریگو چند ہفتوں سے کام کی زیادتی کے باعث ذہنی طور پر مسلسل پریشان نظر آرہے تھے۔ انھیں آرام کی سخت ضرورت تھی مگر بین الاقوامی حالات کی بنا پر انھیں مصروفیات سے مہلت نہ مل سکی۔ لارڈ ماؤنٹ ڈریگو جدید سیاست کی فسوں کاری کا دوسرا شکار ہیں۔ جدید سیاست میں اُن لوگوں کی ذمّے داریاں جان لیوا ثابت ہوتی ہیں جو اُن سے تمام عمر برسرِ پیکار رہتے ہیں۔" آگے متوفی کی مدبرانہ صلاحیتوں، حب الوطنی، دوراندیشی اور شدید محنت کا ذکر تھا۔ نیز وزیرِ اعظم کے نقطۂ نظر کے مطابق نئے وزیرِ خارجہ کے سلسلے میں قیاس آرائیاں کی گئی تھیں۔

ڈاکٹر اگرچہ ذاتی طور پر لارڈ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ تاہم اس بات پر اُسے بے اطمینانی تھی کہ وہ اُس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ شاید اُس سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اُس نے لارڈ کے ذاتی معالج سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ اُس کے حوصلے پست ہوگئے۔ وہ ایک باضمیر انسان تھا۔ اُسے جب بھی کوئی ناکامی ہوتی، وہ اپنے پیشے سے نفرت کرنے لگتا۔ اُس نے بے پروائی سے اخبار کے صفحات پلٹے۔ ایک جگہ وہ پھر چونک پڑا۔ یہ بہت مختصر خبر تھی۔ "پارلیمنٹ کے ایک رُکن کی اچانک موت۔" لکھا تھا۔ "گزشتہ سہ پہر کو ویلز کے رکن اوون گری فتھ اپنے فلیٹ اسٹریٹ کے مکان میں اچانک بیمار ہوگئے۔ انھیں چیرنگ کراس کے اسپتال لے جایا گیا مگر وہ راستے ہی میں فوت ہوگئے۔ اُن کی موت طبعی بتائی گئی ہے پھر بھی موت کے اسباب کے متعلق تحقیقات کی جائے گی۔"

ڈاکٹر نے سوچا کیا یہ ممکن ہے کہ لارڈ نے اپنی موت سے قبل خواب میں کسی دھاردار خنجر یا پستول سے اپنے دشمن کو ختم کر دیا ہو اور اُس کا دشمن اپنے اُن دیکھے زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا ہو؟ یہ بھی ممکن ہے کہ جب لارڈ نے دنیا میں اذیت سے نجات پانے کے لیے موت کے ذریعے راہِ فرار اختیار کی ہو تو اُس کے دشمن گری فتھ نے دوسری دنیا میں اُسے عذاب دینے کے لیے خود بھی موت کا چولا پہن لیا ہو؟ سوچتے سوچتے ڈاکٹر کو خیال آیا، یہ محض ایک اتفاق ہے کہ لارڈ اور اُس کا دشمن ایک ہی دن موت کا شکار ہو کر دنیا سے چلے گئے۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ "مسز ملٹن سے کہو مجھے افسوس ہے، میری طبیعت ٹھیک نہیں، آج میں انھیں وقت نہ دے سکوں گا۔" اُس کا جسم کانپ رہا تھا جیسے وہ لرزے کا مریض ہو۔

